

www.pdfbooksfree.pk

سیاسی جرائم

ماہنامہ
خاتون
کئی

PDFBOOKSFREE.PK

aanchalpk.com aanchalnovel.com

قیمت: 50 روپے
www.pdfbooksfree.pk

ناے افق

وزن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
وزن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز
وزن جے پی آر آف پاکستان



پاکستان (فی پرچہ) 50 روپے

پاکستان (سالانہ) 500 روپے

اشتبہدات اور دیگر معلومات

0300-8264242

aanchalpk.com

aanchalnovel.com

naeyufaqonlinemagazine

aanchal.com.pk/blog

onlinemagazinepk.com/recipes

editorufaqa@aanchal.com.pk



مجلس اعلیٰ
عسکری ہندوستان
قادیان

سابقہ
مجلس اعلیٰ
پنجاب

پنجاب
پنجاب

پنجاب
پنجاب

پنجاب
پنجاب

پنجاب
پنجاب



جلد 39

شمارہ 04

مارچ 2015



ابتدائیہ

10	مشتاق احمد قریشی	دستک
12	عمران احمد	گفتگو
19	طاہر قریشی	اقراء
تفریق کمانیاں		
21	نوشاد عادل	پرف
71	شہناز نسیم	دیپستان
73	فیض الرحمان قادری	نمبر پلس
75	راہیہ خانم	غلابی
129	انور گریو ال	اند بخشش
133	عمر فی روق ارشد	نگہ و من
139	عناصیراں	یارب

یہ کتاب مشتاق احمد قریشی کی تالیف ہے۔ اس کتاب میں 100 سے زائد نثری اور شاعری کے مضامین شامل ہیں۔

165	زریر قمر	لائس آف افغانستان
187	آلیشہ مخدوم	سیاست کی کوکھ
197	نور شہید بی زادہ	غمیر سیاق انٹرویو
211	علی اختر	بھینٹ
229	انجم فاروق سہیل	کالے پتھر کے
سائبر ایماں		
81	امجد جاوید	قلندرات
255	شہیرا نوید	بہت سنگم
مستقل سلسلے		
249	حانہ شہیر احمد	رومانی مساج
251	عفتان احمد	ذوق آجی
253	عمر اسرار	نوشہ بوٹمن
ذہانت سے لکھی ہوئی کتابیں آپ کو سیکھنے کی سہولت فراہم کرتی ہیں۔ 75 روپے 74200 نمبر 021-35620771/2 فیس 021-35620773 سے رابطہ کر کے مفت کاپیوں کی درخواستیں بھیجیں۔ info@anuchal.com.pk		

داستانکے

مشتاق احمد قریشی

ناموس رسالت ﷺ پر حملے کی ایک اور مذموم کوشش؟
گزشتہ دنوں ناموس رسالت ﷺ پر ایک حملوں کے خلاف ہونے والی احتجاجی ریلیوں، جلوس و جلسوں میں تمام مسلمانوں کے جذبات بے قابو ہو گئے تھے اور ہر اہل ایمان نے مقدور بھرا اپنے غم و غصے کا اپنے طور پر اظہار کیا تھا جس میں مغربی دنیا خصوصاً یورپی یونین، اسکیئنڈینیوین ممالک کے خلاف اپنے شدید غم و غصے کا اظہار کیا تھا۔ محسن انسانیت نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالی خاکے شائع کر کے عالمی سطح پر مسلمان عالم کی شدید دل آزاری کی اور ان کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی جس میں وہ سو فی صد کامیاب رہے۔ دراصل یہ دشمنان ایمان اور دشمنان اسلام کا براہ راست عاشقان رسالت مآب پر توہین آمیز حملہ ہے اگر اس حملے کی وجوہات پر غور کیا جائے تو اس کی کڑیاں ان ہی سازشی عناصر سے جا ملیں گی جنہوں نے ناروے اور یورپی ممالک کے اخبارات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاکے شائع کئے تھے۔ درحقیقت اس طرح سازشوں نے ایک بار پھر سرعام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں دردناک عظیم گستاخی کا ارتکاب بھی کیا ہے۔ تمام دنیا کی غیر مسلم قومیں چاہے وہ ہندوہوں عیسائی ہوں کہ یہودی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں کہ مسلمانوں کو کس طرح بے چین و بے آرام کیا جائے کہ وہ سراپا احتجاج بن کر تلگ آمد بچنگ آمد کسی طرح سے دہشت گردی پر آمرا آئیں یقیناً یہ ان کا خیال درست ہے کہ مسلمان اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر والہانہ محبت و عقیدت رکھتے ہیں کہ ان کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دینا تو بہت معمولی بات ہے۔

مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی سازش امریکہ کے یہودیوں کی منصوبہ بندی کا حصہ ہے یہودی جو روز اول سے اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی پر کمر بستہ ہیں اب نئے رنگ ڈھنگ سے میدان عمل میں اترے ہیں۔ اب وہ پس پردہ رہ کر امریکی عیسائیوں اور دیگر اقوام کو اپنے آلہ کار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اپنی اس مہم پر وہ بے دریغ سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ امریکی تحقیقاتی ادارے کی رپورٹس کے مطابق 9/11 کا سانحہ بھی ان کا ہی پیدا کردہ تھا۔ اس کی آڑ میں مسلمانوں کے خلاف کارروائی کا جواز جو پیدا کرنا تھا۔ اس کے رد عمل کے طور پر خالص اسلامی ریاست افغانستان کی ایٹم سے ایٹم بجا دی۔ یہودیوں کے متعلق تو اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ کسی کے دوست نہیں ہو سکتے یہ قوم تو ہمیشہ سے اپنے نبیوں کا قتل کرتی رہی ہے یہاں تک کہ بنی اسرائیل میں آنے والے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ

اسلام تک کو انہوں نے اپنے طور پر تو مار ہی ڈالا ہے۔ یہ قوم اٹلیس ہے جیسا کہ اٹلیس نے حق رسالت اور احترام نبوت کے آگے علم الہی کے باوجود سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ویر سے حضرات انبیاء السلام سے عداوت و دشمنی کا سلسلہ چلا آ رہا ہے جو اب تک جاری ہے۔ شعائر اللہ کی توہین و تعحیک کا سلسلہ جاری ہے۔ حالیہ دنوں میں اشتعال انگیز کارٹون کی اشاعت کے پیچھے بھی توہین انبیاء کا نظریہ ہی کارفرما ہے۔ اس سلسلے میں یہودی منصوبہ سازوں کو متعصب عیسائیوں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ ایک امریکی رسالے میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق گزشتہ دنوں ڈنمارک کے اخبار جیلنڈز پوسٹن کا ثقافتی مدیر فیلمنگ روز جس نے مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لیے وہ اشتعال انگیز کارٹون شائع کئے تھے گزشتہ سال اُسے امریکہ کے اسلام دشمن مہم چلانے والی تنظیم کے سرغنہ اور یہودی مصنف ڈینیئل پاپس نے خصوصی دعوت دے کر امریکہ مدعو کیا تھا یہ وہی ڈینیئل پاپس ہے جس نے اسلام دشمنی پر جہنی متعدد کتب لکھی ہیں اور مسلمانوں کے خلاف کھلے عام زہر اگلتا ہے۔ اس ہی شیطانی ذہن کے مالک نے بڑی کثیر رقم خرچ کر کے یہ اشتعال انگیز کارٹون بنوائے تھے تاکہ مسلمانوں کی دل آزاری ہو سکے اور اس سلسلے میں اُس نے ایک کارٹون بنانے کا مقابلہ بھی منعقد کرایا تھا۔ جس میں پہلے مرحلے میں چالیس افراد نے اپنے نام لکھوائے تھے لیکن جب انہیں اصل منصوبے سے آگاہ کیا گیا تو پھر مقابلے کے میدان میں صرف بارہ تیرہ ہی کارٹون ساز رہ گئے جنہوں نے مختلف کارٹون بنائے اور ان میں سے منتخب کارٹون ڈنمارک کے اخبار نے شائع کر دیے۔ اس طرح یہودی منصوبہ کا سیلاب ہو گیا مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے اور انہوں نے عالمی سطح پر اپنی ناراضگی و اشتعال کا برملا اظہار کیا۔ جس سے ڈنمارک کا ایروں ڈالر کا نقصان بھی ہو ایشتر اسلامی ممالک نے ڈنمارک کی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا اس طرح منصوبہ ساز یہودی تنظیم نے دو ہزار فائدہ حاصل کیا مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے ان کے اپنے ممالک۔ بلکہ ایروں کا نقصان پہنچایا۔ دوسری طرف اپنے حلیف اور مذہبی حریف عیسائیوں و معاشی نقصان پہنچ کر اپنی اہمیت واضح کر دی اور یہودی مصنوعات کے لیے مارکیٹ پیدا کرنی۔ دشمن اسلام ہمیشہ یہ تصور بناتا ہے کہ مسلمان اپنے آقا اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت و حرمت پر ہر قسم کی آج آنے سے پہلے اپنی جانیں نذر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور ہر نابکار اہلیسی قوت کے سامنے سیدہ پلائی دیوار کے مانند جم جاتے ہیں ایک ہو جاتے ہیں تمام مذہبی و مسلکی اختلافات بھول جاتے ہیں ایک اللہ اور آخری رسول کی ایک امت بن کر سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں انشاء اللہ اس بار بھی ایسا ہی ہوگا اور دشمن ایمان دشمن اسلام کو منہ کی کھانا پڑے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔



گفتگو

عمران احمد

”حضرت نعمان بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول آرمسٹی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمانوں کی مثال پھمکتی آہنی ہے جس میں آہنی ہونے میں اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے میں ایسی ہے جیسے ایک لکڑی کے آہنی کے ساتھ ہونے کی کیفیت ہوتی ہے تو بقی سارا جسم بھی بیدار اور بخار میں آسے ساتھ ساتھ ہونے کو پارا کھتا ہے۔“ (مشفق علیہ)

عزیزانِ محترم... سلامت باشد!

مارچ کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے تمام اہل وطن کو یومِ قرارِ داد پاکستان مبارک ہو، وہ قرارِ داد پاکستان جس کی ہر دور میں ہم نے دھجیاں پھیریں جس پر ہم نے بھی عمل ہی نہیں کیا لگتا ہے نہ اس پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں اگر ہم نے اس قرارِ داد پر عمل کیا ہوتا یا اس کو دل سے قبول کیا ہوتا تو آج ملک کے یہ حالات نہ ہوتے یوں ہم ایک دوسرے کے خون میں ہاتھ رنگ کر دشمن پر الزام نہ دہرتے بہر حال اس پر بات بہت ہی ہو سکتی ہے لیکن دل اتنا زخمی ہے کہ بس..... سو آئیں نئے افق کی بات کریں، اس ماہ کا پرچہ سیاسی کرائم یا جرائم نمبر سے ویسے آج کل جو جتنا بڑا سیاست دان ہے وہ اتنا ہی بڑا مجرم ہے، ہم نے کوشش کی ہے کہ اس موضوع پر تجاریر جمع کر کے آپ قارئین تک پہنچی میں اس میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس بارے میں اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیے گا۔ گزشتہ ماہ غلطی سے محترم غلام میراں کے ناول یارب کے پہلے صفحے پر ”آخری حصہ“ لکھ دیا گیا تھا یہ ناول ابھی ختم نہیں ہوا اس شمارے میں اس کی تیسری قسط شامل ہے آئندہ ماہ اس کی آخری قسط ہوگی۔ اب آئیے اپنے محبت ناموں کی طرف۔

عمر فاروق ارشد..... فورت عباس۔ السلام علیکم!

نہ ت مروں جب تک خواجہ بیڑب کی حرمت پر

خدا شاہد ہے کابل میرا ایمان ہو نہیں سکتا

فرانس کے گستاخ میگزین نے جو تے کھانے کے بعد بھی گزشتہ دنوں گستاخانہ خاکے پھر سے شائع کر دیے۔ جب اس کے دفتر پر حملے کے نتیجے میں ایڈیٹر سمیت 15 سے زائد افراد ہلاک ہوئے تو گویا کبرا مچ گیا۔ وہ اس لیے کیونکہ مرنے والے مسلمان نہیں تھے۔ مسلمانوں کا لہو تو ہر روز پانی کی طرح بہتا ہے اور یہ امن کے نام نہاد علمبردار تہ نہیں بولتے فرانس کے صدر کی قیادت میں اس واقعہ کے خلاف لیکن مارچ کیا گیا جس میں عالم کفر کے تقریباً ہر فرعون نے شرکت کی اور دویا مچایا کہ یہ کھلم کھلا دہشت گردی ہے۔ اہل اسلام کا سوال ہے کہ کیا ہمارے

نبی محترم کی توہین کرنا، دہشت گردی نہیں۔ ہمیں دہشت گرد کہنے والوں کو، ہم اس دین کے پیروکار ہیں جو ہمیں تمام انبیا کرام کی عزت و احترام کرنے کی تعلیم دیتا ہے ہمارے دلوں میں کسی ایک بھی پیغمبر کے بارے میں ذرہ برابر بھی بغض نہیں۔ تم اس اسلام کے ماننے والوں کو دہشت گرد کہتے ہو جو حضرت عیسیٰ کا نام لیتے ہوئے علیہ السلام پڑھتے ہیں جو انبیا پر درود و سلام بھیجتے ہیں دہشت گرد وہ ہوتا ہے جو کسی کے مذہبی و معاشی نظام میں اپنے بغض و عناد کے دھماکے کرے اور تاریخ اٹھا کر دیکھ لو، ہمیشہ تم نے دین اسلام اور پیغمبر اسلام کی توہین کے ناپاک منصوبے بنائے اور ان پر عمل کیا۔ تاریخ سچ سچ کہتا ہے کہ آج تک اس دہرتی پر اسلام کے ماننے والوں نے کسی بھی پیغمبر کی توہین کرنا تو دور کی بات اس کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھا ہے تم ہمارے دین کی عصمت پر ڈاکہ ڈال کر ہم سے یہ تو فوج رکھتے ہو کہ ہم خاموش تماشا بنے رہیں تم ہمارے نبی اکرم کا مذاق اڑا کر (نعوذ باللہ) ہم سے یہ مطالبہ کرتے ہو کہ ہم آنکھیں بند کر لیں تم ہماری عزیز ازجان ہستی کی عفت پر فقرے اچھال کر ہمیں صبر و تحمل کی تلقین کرتے ہو۔ تو پھر یہ بات جان لو، اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی اور اپنے گھناؤنے آزادوں اظہار رائے جیسے نظریات کی آڑ میں پیغمبر اسلام کو نشانہ بنانے کا سلسلہ جاری رکھا تو وہ دور نہیں جب امت مسلمہ کے ہاتھ تمہارے گریبانوں سے ہوتے ہوئے تمہارے ایوانوں تک پہنچ جائیں گے نبی اکرم ﷺ کی حرمت پر کت مرنے والے دہشت گردی سے تو مسلمان بڑے شوق سے یہ دہشت گردی کرنے کو تیار ہیں۔ دنیا میں تم سے بڑا کوئی دہشت گرد نہیں جس نے عالم اسلام کی کسی چیز کو بھی نہیں بخشا۔ ہماری معیشت سے بے کرسیاست ہماری آزادی، ہمارا مذہب ہمارے معصوم بچے ہماری خواتین ہماری نوجوان نسل تم نے ان سب کو اپنے غلیظ عزائم کے ذریعے نشانہ بنا رکھا ہے اور پھر جب مظلومیت کی اس راہ میں سے کوئی چنگاری بھڑک اٹھتی ہے تو تم دہشت گردی کا راگ لاتے ہوئے سچ و پکار شروع کر دیتے ہو اے اہل مغرب، امن چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے امت مسلمہ سے نا انصافیاں بند کرو اور جو نا انصافیاں کر چکے ہو ان کا ازالہ کرو اسلام کو ایک حقیقی طاقت سمجھتے ہوئے کھیلے دل سے تسلیم کرو، تو جو اب عالم اسلام تمہیں اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ یہ زمین امن و آسوشی کا ہوا رہ بن جائے گی۔ بصورت دیگر

اسلام کو قدرت نے اتنی چلک دی ہے

اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

اب بڑھتے ہیں پرچے کی جانب، عمران بھیا کیسے احوال ہیں۔ امید برحق ہے کہ ایڈیٹری کی پوشاک زیب تن کر کے سیاسی جرائم نمبر کی تیاری میں مصروف ہوں گے۔ ان شاء اللہ یہ خاص نمبر کامیابیوں کی نئی نئی لہروں کے برآئے گا۔ فروری کا شمارہ دسمواں دھار بارش کے دوران ملا۔ واللہ یہ بات تسلیم نہ کرنا بڑی مخرنی ہوں کہ سرورق کے معاملے میں نئے افق بڑی تیزی سے معیار

کی بلند یوں پر جا رہا ہے۔ اب ہمیں تعریف کے لیے الفاظ اس طرح ڈھونڈنا پڑتے ہیں جیسے پچھلے دنوں پیٹروں ڈھونڈنا پڑا تھا اللہ اللہ، شہر کے ہر پیٹروں پمپ پر گویا محفل پیٹروں منعقد تھے ایکشن کے دنوں میں ہمارے ڈرائنگ روم میں سارا سارا دن بیٹھے رہنے والا ایم این اے بحران کے پہلے دن ہی پہلی دستیاب فلائٹ سے اڑان بھر کر لندن پہنچ گیا اور آج تک وہاں کسی نہایت اہم قومی مسئلے پر ملکہ الزبتھ کے ساتھ گفت و شنید میں مصروف ہے۔ (بابا بابا) اے رب العالمین ان نام نہاد عوامی نمائندوں کو گردن سے دیوچ کر اپنے پاس بلا لے عمران بھائی آپ کی گفتگو سے میں بالکل متفق ہوں ویلنٹائن ڈے کی صبح کو اٹھ کر اگر ہر نو جوان ایک بار یہ تصور کر لے کہ آج اس کی بہن بھی کسی کے ساتھ ویلنٹائن ڈے منانے جا رہی ہے تو امید ہے کہ یہ لعنت ختم ہو جائے گی۔ اس بار بھی کم سماجی محفل میں حاضر ہوئے۔ ادیب ساجد صاحب، آپ ہمارے لیے نہایت محترم ہیں۔ ہم آپ کے جذبات سمجھتے ہیں لیکن بڑے احترام سے عرض کروں گا کہ کوشش کیا کریں۔ تبصرہ صد سے زیادہ طویل نہ ہو آپ جذبات میں بہہ کر اختصار کا دامن چھوڑ بیٹھے ہیں اس طرح دوسرے ساتھیوں کی حق تلفی ہوتی ہے اس کے علاوہ ماضی کی یادوں اور افسانوں کی بجائے اگر تبصرہ نئے افق کی کہانیوں اور پالیسی پر ہو تو زیادہ اچھا لگتا ہے۔ امید ہے کہ آپ آئندہ اس بات کا خیال رکھیں گے۔ ریجانہ سعیدہ، تم اگر تبصرہ نہ ہی کرتی تو کیا تھا ہمارا بھی کسی صدارت کا شوق پورا ہو جاتا۔ بہر حال اچھا لکھا تم نے دعاؤں میں یاد رکھا کرو، مشتاق احمد قریشی صاحب نے بیش قیمت معلومات سے نوازا۔ یقین کریں صرف دستک کی وجہ سے میں نے اس دفعہ نئے افق کو جد کر دیا کر رکھ لیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی ہمارے درمیان موجودگی کسی نعمت سے کم نہیں۔ اگر کوئی سمجھے تو! کہانیوں کی بات کی جائے تو ”یارب“ کا آخری حصہ متاثر کرنے میں کامیاب رہا دیگر کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ سلسلے وار ناول قلندر ذات جمود کا شکار ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ امجد جاوید صاحب کوئی خاص تبدیلی نہیں لے کر آئے۔ دوسری طرف جگت سنگھ مسلسل مثبت تبدیلیوں کی طرف گامزن ہے جبکہ اکثر تاریخی ناولوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ بلاشبہ یہ مصنف مرحوم کے فن کا نقطہ عروج ہے۔ اب آتے ہیں خوشبو سخن کی طرف عمران بھیا ایمان کی بات سے اس دفعہ اپنی غزل دیکھ کر اتنی ہنسی آئی کہ افغانستان کے ہاتھوں روسی فون کی درگت پر بھی نہیں آئی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ عمر اسرار بھائی نے حد ہی کر دی۔ ڈیڑھ سال قبل نئے افق میں شائع ہونے والی میری غزل دوبارہ اٹھا کر چھاپ دی وہ بھی میوزنگ کی بے شمار غلطیوں کے ساتھ جبکہ تین چار نئی غزلیں ارسال کر چکا ہوں ان کا کوئی نام و نشان نہیں مل سکا۔ اب خدا ہی جانے اس میں کیا حکمت پوشیدہ ہے جسے ہماری ناقص عقل سمجھنے سے قاصر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں کچھ بہتری کی ضرورت ہے۔ خیر اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ نئے افق یونہی ترقی کی منازل طے کرتا رہے اور اللہ تمام مسلمان بھائی بہنوں کی مشکلات اپنی رحمت سے ختم

کرے، آمین۔

مہر پرویز احمد..... میاں جنوں۔ سلام مسنون گفتگو میں حاضر ہوں خوش آمدید کا منتظر ہوں۔ سرورق لا جواب سے اتنا خوب صورت منظر تو صرف خوابوں میں دیکھا جا سکتا ہے اتنے خوب صورت گھنے جنگل میں تنہا یہ لڑکی کیا کر رہی ہے اس کو ڈر نہیں لگتا۔ دستک میں مفکرانہ تحریر پڑھ کر جب الوطنی اور ایمان تازہ ہو گیا آخری حصہ غلام میراں کا پڑھا آخری لائن تک پتا نہیں چلا طے کو کس نے معاف کیا امجد جاوید کی تحریر جب الوطنی کی منہ بولتی تھی۔ یہ ہے کاش عملی طور پر بھی ایسے ہی جاں نثار لوگ وطن عزیز کی باگ ڈور سنبھالیں۔ سلیم اختر کی نیا جہنم لا زوال تحریر ہے جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مشرقی عورت کی قربانی کا کیا کہنا اور مشرقی مرد کے ظلم و ستم کو بھی مات دینے کا کیا کہنا۔ طاہرہ جمیل تارا کی تحریر ہوس زدہ حاسد لوگوں کے منہ پر طمانچہ ہے۔ خلیل جبار کی ندامت کا کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں عارف رمضان جتوئی انتقام کے لہو میں ذوبی تحریر لائے۔ ریاض بٹ کوہ نور خوب تلاش کرتے ہیں۔ کاش دو صفحات اشعار کے بھی ہوتے مجھ جیسے بہت سے لوگ نئے افق میں شمولیت کا شکار ہو جاتے۔

ریاض بٹ..... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہ فروری کا شمارہ ایک سرد اور خشک شام کو ملا انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں سرورق کے متعلق بار بار کیا لکھوں؟ اتنا منفرد اور سندر ہوتا ہے کہ تعریف کے لیے الفاظ ہی نہیں ملتے۔ اس بار میری کہانی موجود ہے یہ میری کہانی کچھ وقفے کے بعد شائع ہوئی خیر و برآید درست آید کے مصداق میں ادارے کا شکر گزار ہوں کہ میری سعی کو پذیرائی بخشتے ہیں اور قارئین پسند کرتے ہیں مشتاق احمد قریشی کی تحریر قیام پاکستان میں علماء کرام کا کردار ایک جامع مفصل اور حقیقت پر مبنی تحریر ہے۔ اس بات سے انکار کیا ہی نہیں جاسکتا کہ قیام پاکستان میں علماء کرام کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ہماری نئی پود جو انڈیا کے ڈراموں اور گانوں کی رسیا ہے اور جن کے ذریعے انڈیا ہماری نئی پود کے اخلاق اور کردار کو تباہ کر رہا ہے نئی پود اس سے یا تو بے بہرہ ہے یا پھر جان بوجھ کر اس زہر کو اپنے اندر اتار رہی ہے خدارا سنبھل جائیے۔ اب بڑھتے ہیں گفتگوئی طرف سب سے پہلا خط ابن ریحانہ سعیدہ (لاہور) کا ہے آپ نے بھائی کو بالکل فراموش کر دیا آپ کا تبسم خوب ہے۔ ہمیشہ کی طرح کافی عرصہ بعد بھائی مرفاروق ارشد (نورٹ حبس) تشریف لائے ہیں۔ بھائی ہیں، اب بالکل ٹھیک ہوں اور دوبارہ کہانیاں لکھ رہا ہوں اس بار وہ نور بھائی پرچے میں موجود ہے اس پر تبسم ضرور سمجھے گا بھائی میں نے تو آپ کو یاد کیا تھا اور دل سے یاد کرتا رہا ہوں۔ پھر بھی اگر آپ نے محسوس کیا ہے تو معذرت چاہتا ہوں محمد اسلم جاوید بھائی سانحہ پشاور ہماری برداشت سے باہر ہے۔ یقین کریں تین چار دن میں مضمون رہا۔ نہ تو اخبار کا مطالعہ کیا اور نہ ہی وی کے نزدیک گیا۔ ریاض حسین نمر بھائی شکر یہ کاشکر یہ۔ آپ کو کامیاب اپریشن پر مبارکباد۔ خدا بزرگ و برتر سے دعا گو ہوں کہ وہ

باری تعالیٰ آپ کو ہر دکھ، بیماری اور پریشانی سے محفوظ رکھے، آمین۔ جب آپ کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہو جائیں تو میری دونوں کہانیاں اعتراف جرم اور کوہ نور پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ ادیب سید چمن (حیدرآباد) آپ کا خط کیا ہے آپ کی آپ جی سے آپ نے بہت دکھ دیکھے ہیں۔ لیکن سب سے اچھی بات یہ ہے کہ آپ ہمت والے ہیں آپ کے خط سے جہاں دکھ ٹپک رہا ہے۔ وہاں آپ کے جذبے، جواں مردی اور حالات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرنا بھی ظاہر ہو رہا ہے بھائی ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں۔

خزاں رکھے گی درختوں کو بے ثمر کب تک

گزر ہی جائے گی یہ رت بھی تم حوصلہ رکھنا

کہانیوں میں سب سے پہلے قلندر ذات اور جگت سنگھ پڑھیں جگت سنگھ کے متعلق تو پہلے اپنے کسی خط میں لکھ چکا ہوں کہ یہ کہانی میں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں لیکن اپنے من پسند سہالے میں پڑھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے قلندر ذات کی یہ قسط بھی جاندار سے ظاہرہ جس میں تارا کی کہانی عشق لا حاصل، ایک خوب صورت اور سبق آموز کہانی ہے۔ بہن آپ کی تحریریں دن بدن خوب سے خوب ہوتی جا رہی ہیں۔ خلیل جہاں کی کہانی ندامت حسب معمول اپنے اندر ایک سبق لیے ہوئے تھی جو لوگ اپنی نیویوں کے ہوتے ہوئے نرس جیسی لڑکیوں کی طرف راغب ہو کر ان کے حال میں پھنس جاتے ہیں ان کا انجام شہزاد جیسا ہے۔ ہوتا ہے جاوید احمد صدیقی کی کہانی پرارہ اور ہوں بھی ایک اچھی کہانی ہے۔ بہت خوب، باقی کہانیاں بھی اچھی اور خوب صورت ہیں خوشبو جین میں عمر اسرار، ظاہرہ جس میں تارا، ریحانہ سعیدہ، قدیرانا، عمر فاروق ارشد باری لے گئے۔ رانا حفیظ ناصر، محمد اسلم جاوید نے بھی اچھا لکھا۔ بلکہ خوب لکھا صنفی کھری کھری کھری پرچے میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہیں۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی **داو لپندی** السلام علیکم! کئی رنگوں سے سجا منظر اور انتہائی جاذب نظر، کھیل والے افق ملا اور دلچسپ کہانی نمبر بھی بہا رکھا رہا تھا دستک لازوال اور اقرار دل میں اترنے والی گفتگو میں بھی زبردست رہی۔ محفل قارئین میں حدیث شریف تو ہر مسلمان کے لیے ایک معمول سبق سے بشرطیکہ مسلمان کچھ ذرا بھی احساس کریں تو قسمت ہی بدل جائے۔ گفتگو میں ساحل دعا بخاری کی وضاحت کرنا بھی خوب رہا دعا سے یہ لوگ جندرو کیوں نہ سمجھ گئے میں نے افق کے قارئین کو اتنا بھی کند ذہن نہیں سمجھتا ہوں آپ کے تبصرہ کو ذرا تفصیل میں ہونا چاہیے نا، ریاض بت جی یاد کرنے کا شکر یہ۔ مگر اس دفعہ آپ کی غیر حاضری لگ گئی۔ آپ کا تبصرہ ایک درد دل رکھنے والا ہی کر سکتا ہے دعا ہے کہ اللہ سب کو اپنے امان میں رکھے۔ محمد اسلم جاوید صاحب کا تبصرہ بھی اچھا تھا ضرور آتے رہیں جناب ادیب سید چمن اللہ کریم آپ کی گھریلو اور معاشی مجبوریاں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے

صدقے دور کر دے آمین۔ پڑھائی اور اسکولوں کے متعلق بھی آپ کا تبصرہ زبردست تھا۔ ماریہ، اقر او سیم آپ کی خاموشی شکر ہے کہ ٹوٹی۔ آپ کی مبارک سب کو قبول ہے لیکن یہ کیا صرف 5 تبصرے، بھئی سب لوگ گفتگو میں حاضری جلدی دیں ہم لوگ پر اصرار احتجاج کرتے ہیں۔ اس دفعہ 12 کہانیاں دی گئی ہیں پہلے تو عرض ہے کہ دل چسپ کہانی نمبر میں تین کہانیاں مثلاً مار گزیدہ (اسد علی) ایک رات (شہناز بانو) اور دوسری دنیا (حسیب جواد علی) تو پوری پوری ماورائی اور پراسرار تھیں کسی بھی پہلو سے اس نمبر کے لیے موزوں نہ تھیں اب ایسی کہانیوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ایک اور ظلم یہ ہوا کہ اس کہانی نمبر کے لیے سفر نامہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ دلچسپ ہے بزاز بردست اور پھر مذہبی موضوعات پر مبنی بڑی اچھی رہی مگر اس شمارہ کے لیے بالکل نامناسب اور انجمن فاروق ساحلی کی مسٹر دلچسپ بھی ایسی ہی کہانی رہی کہ انتہائی عملیین موضوع پر یہ تین نکتوں پر مبنی کہانیاں کہاں سے ہمارے لیے دلچسپ ہوئی؟ جی ہاں سسپنس سے بھر پور مذہب کی تفصیل کے لیے انتہائی دلچسپ اور صاف ستھری کہانی کم ہی پڑھنے کو ملتی ہے غلام میراں صاحب ضرور لکھا کریں اور اس کہانی کو تو آگے ضرور لے کر چلیں۔ ہاں ڈیڑھ کا پہاڑہ بھی آپ نے خوب فٹ کیا ہے، زبردست جناب۔ بہترین رہی کھلاڑی اناڑی (محمد اعظم خان) رہتی دلچسپ اور خوشگوار کہانی اور تریاق اور آتش انتقام بھی زبردست تھیں اور مزہ آ گیا پڑھ کر عزت نفس اچھی رہی صرف واقعات وادار بھی پھیلا یا جا سکتا تھا بہر حال خوب تھی۔ دونوں سلسلے بے حد دلچسپ اور پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ دونوں مصنف کو مبارک باد۔ ہاں آپ کا شکر یہ کہ پراسرار لکھی گوئیٹن صفحہ 87 پر شائع کی گئی اور دونوں بدیہی کہانیوں میں اسرار احمد صاحب کی نوآ موز قاری کے لیے بے حد دلچسپ رہی نایافت تو راحیلہ ناز کی دفعہ لے کر آئی ہیں اچھی رہی ذوق آگہی اور خوشبو سخن دونوں ہی بڑے شاندار رہے۔ تمام قارئین دعا میں اور دعا میں۔

ادیب سمیع چمن ... **حیدرآباد**۔ محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ دعا ہے کہ رب تعالیٰ آپ کو ہر آفتت بر مصیبت ہر پریشانی سے ہمیشہ محفوظ و مامون رکھے۔ آپ کا سایہ تادیر سلامت رہے۔ آپ اور آپ کے اہلخانہ سدا خوش اور ہنستے مسکراتے رہیں نیز آپ کے ادارہ کے تمام ساتھی تمام اسٹاف اور ادارت کے صاحبان کراچی کے ہر مصیبت پریشانیوں سے محفوظ رہ کر نئے نئے افق کے نئے نئے ولولے اور جلوے سے سجاتے رہیں آمین۔ بہر کیف نئے افق کا مطالعہ جاری ہے تمام اہل قلم جن میں طاہر قریشی، بہن راحیلہ ناز صاحبہ، جناب اسرار احمد، اسد علی، محمد اعظم صاحب، سلیم اختر صاحب، جناب خلیل جبار، بہن شہناز بانو، انجمن فاروق ساحلی، امجد جاوید، شمیم نوید، عرفان احمد، عمر اسرار صاحب، ساحل دعا بخاری، محترم ریاض بٹ، محمد اسلم جاوید، قد پرانا، ریاض حسین قمر صاحب، یہ سب نئے افق کے گلستان کے وہ پھول ہیں جن سے نئے افق کا گلستان مہک رہا ہے ان میں کئی

تحریریں بلکہ جتنے بھی لکھنے والے ہیں سب کا اپنا اپنا انداز ہے اور یقین جانے سب ہی نئے افق پر ستارے بن کر جگمگا رہے ہیں۔ میری سب سے محترم بہن شاعرہ ریحانہ سعیدہ صاحبہ کی ہر غزل جو سب سے پہلے نمبر پر ہوتی ہے، ان کی بھی خدمات کو سلام پیش کرتا ہوں خدا یہ گلشن ہمیشہ سجائے رکھے۔ نواز شریف صاحب سے گزارش سے کہ محترم وزیراعظم صاحب یہ کیسا پیڑول سستا کیے جا رہے ہیں کہ کھانے پینے کی چیزوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ گوشت، چاول، دالیں، مٹی، دودھ غرض سوائے پیاز اور آلوؤں کے ہر اشیا آپ کا منہ چڑا رہی ہے اور جناب وزیراعظم صاحب پاکستان میں پیسہ کہاں چلتا ہے بلکہ زرداری صاحب اور آپ کی جاوگری سے تاجر، دکاندار، چھاپڑی والا، ہر دکان والا بڑے مزے سے خوف خدا سے عاری ہو کر ساڑھے آٹھ کی جگہ نو روپے، ساڑھے نو کی جگہ 10 روپے وصول کر کے جہنم کی آگ کی طرف بڑھے جا رہا ہے کہ اللہ کے ہاں ذرے ذرے کا حساب ہے حلال میں حرام کس حکومت کردار رہی ہے ابھی غور کیا ہے اس بات پر دکانداروں کو ذرا خدا کا خوف نہیں کہ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ وہ پچاس پیسے زیادہ نہیں تو پچاس پیسے کا مال بھی ملے گا۔ آج پورا پاکستان مصیبتوں اور آفات کی زد میں لھرتا جا رہا ہے۔ خدا کے لیے تو یہ کریں ناپ تول میں می نہ کیا کریں ملاوٹ نہ کیا کریں اور وزیراعظم صاحب سب سے زیادہ پڑ اللہ کے ہاں آپ کی حکومت کی ہوگی۔ اللہ پاکستان پر اور پاکستان کے تمام لوگوں پر رحم کرے اپنی حق صداقت اور ایمانداری کی راہ نصیب فرمائے آمین

۶۱۱

مستثنیوں سے گزارش

۱۔ مسودہ صاف اور خوشخط ہائیں۔
 ۲۔ صفحے کے دائیں جانب سہ ماہی ڈیزائن کا نشان چھوڑ کر لکھیں۔
 ۳۔ صفحے کے ایک جانب اور ایک قطر چھوڑ کر لکھیں صرف نیلی یا سیاہ درشنائی کا ہی استعمال کریں۔
 ۴۔ خوشبو بخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
 ۵۔ مذاق آمیز کے لیے کبھی جانے والی تمام خبروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
 ۶۔ نوٹوں اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہونی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور نوٹوں اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
 ۷۔ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پورا پورا اور صحیح نمونہ نمبر ضرور درج کرنا ضروری ہے۔
 ۸۔ مسودے کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط اور دو ماہ کی ڈیٹا رٹ ٹیکے کی ہمارے پاس ہے۔
 ۹۔ اپنی کہانیاں دفتر کے پناہ دستہ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7 فریڈ پیسیر راجہ عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

مشتاق احمد قریشی
اللہ

اللہ

تفسیر آیت مبارکہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسے تمام سوالات کا جو ذاتِ باری تعالیٰ کے سلسلے میں ملحد اور منکرین کرتے رہتے ہیں سب کا مفصل جواب ہی نہیں دیا بلکہ یہ بات بھی خوب اچھی طرح بتادی کہ اللہ کا نبی جسے شرفِ کلامِ الہی بھی حاصل ہوا ہو جبکہ حضرت موسیٰ سے پہلے نہ بعد کسی نبی کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا کہ وہ براہِ راست رب کا کلمات سے ہم کلام ہوا ہو۔ ایسے جلیل القدر نبی کے ساتھ جو واقع جس طرح پیش آیا وہ اللہ نے اس آیت مبارکہ میں ارشاد فرما دیا ہے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر گئے اور وہاں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان سے براہِ راست گفتگو فرمائی تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا تو انہوں نے اپنے شوق کا اظہار ”رب ارنی“ کہہ کر کیا جس کا جواب اللہ تعالیٰ نے ”لن ترانی“ فرما کر دیا۔ ”یعنی تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا“ اس سے یہ بات پائے ثبوت کو پہنچی اور ثابت ہوا کہ دنیا میں کوئی انسانی آنکھ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذاتِ عالی کو دیکھنے پر سعی طرح بھی قادر نہیں ہے لیکن روزِ آخرت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جب نئی زندگی عطا فرمائے گا اور سب کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گا تو ان آنکھوں میں اتنی قوت بصارت عطا فرمائے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے جلوے کو برداشت کر سکے یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا صرف اہل ایمان متقی لوگوں کو ہی یہ سعادت میسر ہو آیت مبارکہ میں ربِّ ذوالجلال نے واضح فرما دیا ہے اس نے اپنے نبی کی خواہش کو پورا کرنے اور آئندہ آنے والی تمام امتوں اور انسانوں کو آگاہ کرنے کے لئے اپنی تجلی پہاڑ طور پر فرمائی تو وہ پہاڑ رب کی تجلی برداشت نہ کر سکا اور نہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام برداشت کر سکے وہ بھی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

جب انہیں ہوش آیا تو انہیں معلوم ہوا کہ انسانی قوتِ ادراک کی حدود کیا ہیں انہیں عملاً معلوم ہو گیا کہ انہوں نے یہ سوال دیدارِ الہی کا کر کے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے تب ہی انہوں نے فوراً ہی اعتراف کیا کہ اے مالکِ دو جہاں تیری ذات پاک ہے میں تو بہ کرتا ہوں میں نے اپنی حدود سے تجاوز کیا میں پہلا مسلمان ہوں کیونکہ رسول تو پہلا مسلمان ہی ہوا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت پر سب سے پہلے ایمان لاتا ہے سب سے پہلے وہ اپنی رسالت اور اپنے اوپر نازل ہونے والے کلامِ الہی پر ایمان لاتا ہے کیونکہ پیغمبروں کو یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ وہ سب سے پہلے ایمان کا اعلان کریں۔ نبی کا سب سے پہلے ایمان لانے کا اعلان قرآن کریم میں کافی مقامات پر

آیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ تجلّی الہی کیسی تھی! یقیناً کوئی انسان اس پر قدرت نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت بیان کر سکے نہ اس کا ادراک کر سکتا ہے۔ یقیناً وہ ایک بڑا ہی حیران کن اور خوفناک منظر رہا ہوگا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کلمات الہی سن رہے ہوں گے اور ربّ کا کلمات سے ہم کلامی کے شوق میں ان کی روح سمیت الہی بلند ہو رہی ہوگی۔ ایسی حالت میں وہ یقیناً بھول گئے ہوں گے و فوراً شوق الہی ان پر حاوی ہو گیا ہوگا ایسے میں انہوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر فرمائش کر دی ہوگی۔ ان کی یہ فرمائش یا مطالبہ جو اس گزہ بشریت کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔ یہی امر سمجھانے کے لئے کہ اسے اُمر ممکن بنا دیا جائے تو بھی کسی انسان میں وہ طاقت ہی نہیں ہے جو دیدار الہی کو برداشت کر سکے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جسی جلیل القدر ہستی کی فرمائش دیدار الہی جو ان کی حسب الہی اور شوق و امید کا مظہر ہے کہ وہ عالم شہود میں ذات باری کو دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے دو ٹوک دیا۔ ”کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔“

لیکن اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی ان کے ساتھ خصوصی شفقت و محبت کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سمجھا دیا کہ تم میں وہ طاقت ہی نہیں ہے اس بات کو ہی دلیل سے اس طرح سمجھایا اور فرمایا۔ ”ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھو۔ اگر وہ اپنی جد قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکتے گا۔“ کیونکہ پہاڑ انسان کے مقابلے میں زیادہ جسنے والا ہے اور زیادہ متاثر ہونے والا بھی نہیں ہے اور پہاڑ انسان کے مقابلے میں زیادہ قبولیت کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا۔ لیکن جب ”ان کے رب نے پہاڑ پر تجلّی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ (علیہ السلام) غش کھا کر گر پڑے۔“

اس سارے واقعے کو اُتر سمجھا جائے اور سوچا جائے تو یہ ایسی حقیقت ہے جو قرآن کریم کچھ الے سے ربّ کا کلمات نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے تمام عالم انسانی کو سمجھائی ہے۔ اس کے علاوہ ہر انسانی کوشش اس سسٹم میں بے معنی اور صرف لفظوں کے ذریعے ذہن انسانی کو الجھانا ہی ہوگا۔ جس طرح ہم یہ نہیں سمجھ سکتے حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ساتھ کس طرح ہم کلام ہوتے تھے وہ کن ذرائع اور ادراک سے ہدایات اخذ کرتے تھے کلمات کس طرح کے تھے؟ یہ سب تصورات ہم عاجز بندوں کی محدود قوت فکر و فہم کے لئے ناقابل تصور رہیں۔ اس لئے کہ ہماری قوت مدد کہ محدود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اور ربّ کا کلمات کا تعلق خاص کیا تھا؟ کیسے تھا یہ تعلق ہماری محدود سوچ و ادراک میں نہیں سما سکتا اس لئے اس سلسلے میں خاموشی ہی سب سے بہتر ہے۔

(جاری ہے)



حصہ اول

مقدمہ

نوشتاد عادل

انسان کسی زندگی کی اہمیت اب ہمارے ہاں سکھ سے بھی کم رہ گئی ہے اور اس کی وجہ اکثر حکمران ہیں جو اپنی حکومت بچانے اور پیسہ بنانے کے لیے معصوم جانوں سے کھیل کر عوام کو اس طرف الجھا دیتے ہیں اور خود بہت خاموشی سے اپنی چال چل جاتے ہیں۔ مگر ان کی یہی حرکات کئی موضوعات کو جنم دے کر انہیں پھسا دیتے ہیں۔

نوشتاد عادل نے معاشرے میں ہونے والی سرگرمیوں اور دہشت گردی پر بہت غور و فکر کے بعد قلم اٹھایا ہے۔ سیاسی جرائم نمبر کے لیے بطور خاص ایک چشمہ کشا تحریر جسے آپ نظر انداز نہیں کر سکیں گے۔

”یہ کراچی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ لائیں ہی لائیں..... ہر طرف چیخ و پکار اور رونا سنائی دے رہا ہے۔ میڈیا نے الگ طوفان گھاڑ کر رکھا ہے۔ مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ یہ سب کیسے ہوا؟“ ڈی ایس پی زاہد علی نے پریشان لہجے میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے انسپکٹر کریم خان سے کہا۔

”سر! کل رات رئیس علی نواز کے فارم ہاؤس پر پارٹی تھی۔ پارٹی میں سو کے قریب لوگ شریک تھے۔ رات گئے تک پارٹی چلتی رہی اور ساڑھے بارہ بجے تک خوب دھوم دھڑکا ہوتا رہا۔ اس کے بعد لوگوں نے اپنے اپنے گھروں کو ٹھکانا شروع کیا۔ لیکن لگ بھگ بیس افراد ایسے تھے جو ابھی بھی پارٹی میں مست تھے۔ باقی سب اپنے اپنے گھروں کو پہنچ چکے تھے۔ ڈیڑھ بجے تک سب خیریت رہی مگر ڈیڑھ بجے کے بعد پارٹی میں شریک لوگ بارٹ ایک سے مرنے لگے اور دو بجے تک سب ہی موت کی آغوش میں جا چکے تھے۔ شہر کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر بھی حیران ہیں۔ کسی ایک ڈی کو بھی پچایا نہیں جا سکا ان سب کو ایک ساتھ بارٹ ایک کیسے ہوا اس کی توجیہ کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔“ کریم خان نے

تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

”ایک ساتھ سو لوگوں کو بارٹ ایک۔“ ڈی ایس پی گھبرا کر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا اور چہرے سے پریشانی پسینہ بن کر نپک رہی تھی۔

”ہاں سر! اور مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ چند ایک کو چھوڑ کر ان میں سے کوئی بھی دل کا مریض نہیں تھا۔“

”ضرور کھانے میں کچھ ملایا گیا ہوگا۔“ ڈی ایس پی نے اپنا خیال پیش کیا۔

”نہیں سر! ایسا کچھ نہیں ہوا کیونکہ کسی کی بھی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ اس کے باوجود میں نے احتیاطاً وہاں موجود کھانے پینے کی چیزوں کے سپل حاصل کر کے لیبارٹری میں بھیج دیئے ہیں۔“

”جتنے بھی شیف یا وائٹر تھے ان پر بھی تو شک کیا جا سکتا ہے؟“ ڈی ایس پی نے ایک اور خیال پیش کیا۔

”ان پر شک کرنا بالکل بیکار ہے سر۔“

”کیوں کیا تم ان سے تفتیش کر چکے ہو؟“ ڈی ایس پی نے سوالیہ نظروں سے کریم خان کی طرف دیکھا۔

”وہ سب بھی اپنے اپنے کمروں میں مردہ پائے گئے ہیں۔“

چلا اٹھا۔ ”کیا... کیا کہہ رہے ہو۔“ اور بڑبڑا کر کرسی سے اٹھ گیا۔ ڈی ایس پی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔
 ”اوکے میں تھوڑی دیر میں وہیں پہنچتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر کریم خان نے فون ڈس کنیکٹ کر دیا اور تھکا تھکا سا کرسی پر گر گیا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی بچے کا پسندیدہ کھلونا اس کے ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی لوٹ گیا ہو۔

ڈی ایس پی جو کافی دیر سے اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کو دیکھ رہا تھا زیادہ دیر چپ نہ رہ سکا۔ ”کیا ہوا۔ کس کا فون تھا اور یہ تم اتنے پریشان کیوں نظر آ رہے ہو؟“ انہوں نے ایک ہی سانس میں تین سوال کر ڈالے۔

کریم خان کچھ دیر تک ڈی ایس پی کا چہرہ دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”طارق محمود بھی ختم۔“
 ”اوہ۔ یعنی اب اس پر بھی شک نہیں کیا جاسکتا۔“
 ڈی ایس پی کے چہرے پر بھی پریشانی کے بادل چھانے لگے۔

”شک تو کرنا ہی پڑے گا سر! اس پر یا کسی اور پر کیونکہ وہ بارات ایک سے نہیں مرا۔“
 ”تو پھر وہ کیسے مرا؟“
 ”کسی نے اس کی کھوپڑی اڑا دی۔“ کریم خان انتہائی مایوسی سے بولا۔
 ”اوہ مائی گاڈ۔ گوئی کس نے ماری۔ کچھ پتہ چلا۔“
 ”نہیں۔“

اس کے بعد دونوں چپ ہو گئے اور ڈی ایس پی کے کیمین میں خاموشی راج کرنے لگی۔ دونوں ہی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر ڈی ایس پی نے ہی کمرے میں چھائی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیس بہت الجھ گیا ہے۔ تم بغیر کسی دباؤ کے اس کیس پر برکام کر سکتے ہو۔ مگر یہ کیس جلد سے جلد سلجھانے کی کوشش کرنا اور ہاں ہی مدد یا تعاون کی ضرورت ہو تو ہانا بچک بہ سکتے ہو۔“

”کیا کہہ رہے ہو کریم خان۔“ ڈی ایس پی بالکل بوکھلا گیا۔ کچھ دیر میں بوکھلاہٹ مہم ہونے لگی۔ ”اور میں علی نواز کے خاندان والے۔“

”ان کے دو بیٹے۔ ایک بیٹی اور ایک اکلوتی بیوی۔ سب ختم۔ کسی بیماری کی وجہ سے رئیس علی نواز خود پارٹی میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ اب یا تو انہیں خوش نصیب کہہ سکتے ہیں یا۔۔۔“ کریم خان نے اپنی بات اجموری چھوڑ دی۔

”اب رئیس علی نواز کہاں ہے؟“ ڈی ایس پی نے پوچھا۔
 ”وہیں جہاں انہیں ہونا چاہئے۔“
 ”مطلب؟“

”آغا خان اسپتال میں ہیں۔ سنا ہے کہ ان کی حالت بہت نازک ہے۔“ یہ کہہ کر کریم خان کچھ دیر چپ رہا پھر بولا۔ ”شک کی سوئی بار بار ایک ہی آدمی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔“
 ”کیا رئیس علی نواز کی طرف؟“

”نہیں۔“ کریم خان نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔
 ”تو اور کس پر؟“

”پارٹی میں جتنے بھی لوگ شریک تھے ان سب کی لاشیں موجود ہیں۔ صرف ایک آدمی ہے جس کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ وہ کہاں ہے اور زندہ بھی ہے یا مر چکا ہے۔“ کریم خان کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”تو وہ صاحب کون ہیں جن کی طرف تمہارے شک کی سوئی اشارہ کر رہی ہے۔“ ڈی ایس پی نے بحسب سے پوچھا۔

”طارق محمود۔“ کریم خان کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ کریم خان نے اجازت طلب نظروں سے ڈی ایس پی کی طرف دیکھا انہوں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ کریم کال ریسیو کرتے ہوئے بولا۔ ”ہاں بولو۔“

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے سن کر وہ لٹ بٹ

”جو بھی ماگھوں گا آپ دیں گے۔“ کریم خان نے ڈی ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں خوشی سے۔“

”مجھے اعیان چاہئے۔“

کریم خان کی بات سن کر ڈی ایس پی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے کریم خان سے پوچھا۔ ”تم نے ابھی کیا کہا؟“

”سر! مجھے اعیان چاہئے۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ وہ ایک افسر ہے بلکہ ہم سب میں بہترین۔“

”تمہیں پتہ ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“ ڈی ایس پی نے کریم خان کی بات سچ میں کانتے ہوئے کہا۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ کریم خان کوئی ایسا مطالبہ کرے گا جسے وہ چاہتے ہوئے بھی پورا نہیں کر سکتے تھے۔

”ہاں سر! انسپکٹر اعیان کے ساتھ مل کر میں یہ کیس آسانی سے سلجھا سکتا ہوں۔“ کریم خان ابھی تک امید کا دامن تھامے ہوئے تھا۔

”تم جانتے ہو کہ وہ کتنا جنونی اور بدتمیز انسان ہے۔ وہ ہمیشہ قانون کو پاؤں کی جوتی پر رکھ کر کام کرتا ہے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ سینڈ کیس میں اس نے کیا قیامت ڈھائی تھی۔ خون کی ندیاں بہا دی تھیں اس نے۔ سینڈ کیس کے ممبرز کو متنی بے دردی اور بے رحمی سے مارا تھا اس نے۔ اس طرح تو کوئی پاگل بھی نہیں مارے گا کسی کو یاد سے نامیڈ یا نے کتنا وبال مچایا تھا۔ وہ تو کسی طرح اسے معطل کر کے حالات قابو میں کیے تھے۔ ورنہ ہمارے محکمے کو اپنی عزت بچانا مشکل ہو گیا تھا۔“ ڈی ایس پی نے ایک بار اور اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”سر! آپ کو بھی یاد ہونا چاہئے کہ پچھلے پندرہ سالوں سے سینڈ کیس نامی گینگ نے شہر میں مافی دہشت پھیلا رکھی تھی اور ہم لاکھ کوشش کے باوجود ان تک نہیں پہنچ پا رہے تھے۔ وہ اتنا طاقتور گینگ تھا کہ قانون اس کے سامنے بے بس نظر آتا تھا۔ مگر اعیان نے صرف تین مہینوں کی محنت کے بعد وہ کیس ہمیشہ کے لیے حل کر دیا

تھا اور ان کو ختم کرنے کا واحد راستہ وہی تھا جو اعیان نے اختیار کیا تھا۔“ کریم خان نے ایک اور ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”سوری کریم خان! فی الحال تم کو اعیان کے بغیر ہی کام کرنا ہوگا۔ اعیان کا سسپینشن ابھی ختم نہیں ہو سکتا۔“

ڈی ایس پی نے ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے کہا۔

کریم خان مایوسانہ انداز میں باہر نکل آیا اور سیاہی آصف سے بولا۔ ”گاڑی نکالو۔“ اور اسے اس جگہ چلنے کو کہا جہاں طارق محمود کا قتل ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کریم خان وہاں پہنچ کر سب انسپکٹر چراغ دین اور سرفراز سے تفصیل معلوم کر رہا تھا۔ یہ دونوں سب انسپکٹر کریم خان کی میم کا حصہ اور اس کے دو بازو کی مانند تھے۔ بے حد ایماندار اور کریم خان کی دل سے عزت کرتے تھے۔ چراغ دین نسبتاً خوش مزاج جبکہ سرفراز اپنے حال میں مست رہنے والا انسان تھا۔

جبکہ کریم خان کی شہرت پورے محکمے میں بہت اچھی تھی۔ وہ چھ فٹ ایک انچ قد کا مالک تھا۔ رنگ گورا اور آنکھوں سے ذیانت نکلتی تھی۔ اس کی چھ ماہ پہلے ٹوپی سے شادی ہوئی تھی جو ان دنوں اپنے میکے دوسرے شہر گئی ہوئی تھی۔

کریم خان کا ایک ہی دوست تھا اعیان جسے وہ جان سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ کریم خان کا کوئی دوسرا دوست نہیں تھا یا پھر یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ اعیان نے کریم خان کو کسی دوسرے سے دوستی کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا اور اعیان جیسا دوست پا کر ایسے بھی کسی دوسرے دوست کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ جتنی محبت کریم خان کو اعیان سے تھی اس سے زیادہ محبت وہ کریم خان سے کرتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے تھے کچھ بھی۔

کریم خان کی شہرت ایک ایماندار اور ہوشیار پولیس آفیسر کی حیثیت سے پورے محکمے میں زبان زد عام تھی۔ وہ جانتا تھا کہ عزت کروانے کے لیے عزت کرنا بے حد

”سر! پارٹی والی جگہ سے رئیس علی نواز کے فنگر پرنس پاسے گئے ہیں۔ جبکہ سب کا یہ کہنا ہے کہ انہوں نے پارٹی میں بالکل شرکت نہیں کی تھی۔“ چراغ دین نے کریم خان کے سر پر ایک اور ہم پھوڑا۔

”خیر دیکھتے ہیں۔ تم لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو اور پارٹی میں ملنے والے فنگر پرنس ہر لاش سے متفق کرو۔ دیکھو کوئی نئی بات سامنے آتی ہے یا نہیں۔“ کریم خان کی ہدایت ملنے ہی دونوں حرکت میں آ گئے۔

پارٹی میں رئیس علی نواز کے فنگر پرنس کا پایا جانا بہت ہی اچھے کی بات تھی جبکہ اس کے سارے ملازمین اس بات کے گواہ تھے کہ وہ پارٹی میں شریک نہیں ہو سکے تھے کیونکہ وہ ایک دن پہلے ہی اسپتال میں داخل ہو چکے تھے۔ دال میں کچھ نہ کچھ تو کالا ضرور تھا جسے کریم خان نے سفید کرنا تھا۔

کریم خان نے جیب میں بیٹھتے ہی آصف کو آغا خان اسپتال چلنے کا کہا رئیس علی نواز اسی اسپتال میں زیر علاج تھے۔ کریم خان اس سے مل کر کچھ باتوں کی وضاحت چاہتا تھا۔ آصف سڑک پر جیب دوڑانے لگا اور کریم خان کا دماغ کیس کی باریکیوں پر دوڑنے لگا۔

”رئیس علی نواز اس کھیل کا ماسٹر ماسٹر ہو سکتا ہے۔“ یہ کریم خان کی سوچ تھی۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اس کا اپنا خاندان اس کی لپیٹ میں کیوں آتا۔“

”مگر ہو سکتا ہے کہ اپنے خاندان کو بھی اس نے اس لیے نشانہ بنایا ہو کہ کسی کو اس پر شک نہ ہونے پائے۔

ویسے بھی کچھ پانے کے لیے کچھ ہونا بھی پڑتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ رئیس علی نواز کیا پانا چاہتا تھا اتنی بڑی واردات کے ذریعے۔“

”لیکن وہ ایسی کیا چیز پانا چاہتا تھا جس کے لیے اسے ایسا انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اس کی ایک ساتھ اتنے سبازے لوگوں سے دشمنی ہو اور اگر ہوتو اتنے دشمنوں کا اپنے دشمن کی پارٹی میں ایک ساتھ جمع ہونا

ضروری ہے۔ وہ اپنے ماتحتوں سے نہایت محبت اور شفقت سے پیش آتا تھا اس لیے اس کی ٹیم کا ہر ممبر اس پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کی ذہانت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ گزشتہ تین برسوں میں وہ چھوٹے بڑے بیس سے زائد کیسز پر کام کر چکا تھا جنہیں اس نے بنا کسی پریشانی کے حل کر بھی کر لیا تھا۔ اس کے شاندار ریکارڈ سے ذی ایس پی زائد علی بہت خوش تھا اور وہ کریم خان کی بہت عزت کرتا تھا اور پیچیدہ کیسز اسے ہی دیئے جاتے تھے۔

مگر کریم خان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ کیس اس کے لیے کتنی بڑی مصیبت کا باعث بننے والا ہے۔ اسے اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کیس کی وجہ سے اس کی زندگی میں کیسی ہلچل مچنے والی ہے یا شاید یہ ہلچل شروع ہو چکی تھی۔ مگر وہ اس بات سے بے خبر اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔

”سر! اسے صرف ایک ہی گولی ماری گئی ہے وہ بھی سیدھی سر میں۔“ چراغ دین نے بتایا۔

”اس کے بعد گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے چلتی گاڑی میں نشانہ بنایا گیا ہے۔ گولی لگنے سے طارق محمود گاڑی پر قابو نہ رکھ سکا اور گاڑی درخت سے ٹکرا کر رک گئی۔“ سرفراز نے مزید تفصیل سے آگاہ کیا۔

کریم خان نے دیکھا کہ گاڑی کی حالت واقعی بہت بری تھی اور اس سے زیادہ بری حالت طارق محمود کی تھی۔ اس کے سر میں ایک سوراخ تھا۔ باقی جسم پر بھی کئی چوٹیں تھیں جو کہ یقیناً ایکسیڈنٹ کی وجہ سے آئی ہوں گی۔

گاڑی میں خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔

”اس کا مطلب ہے قاتل ماہر نشانہ باز ہے۔“ کریم خان نے جائے وقوعہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”چلتی گاڑی میں سیدھی سر میں گولی اتارنا بہت بڑی بات ہے۔“

”سر! ایک اور سنسنی خیز خبر بھی آپ کو سنائی ہے۔“

چراغ دین نے کہا۔

”وہ کون سی؟“

بھی ناممکن ہے اور غریب شیف اور ویٹر کس دشمنی کا شکار ہوئے۔“ کریم خان خود ہی سوال کر رہا تھا اور خود ہی ان کے جواب بھی دے رہا تھا۔

”مگر پارٹی میں رئیس کے فٹنر پرنس کا پایا جاتا۔ طارق محمود کا گل۔ چھ نہ کچھ اور نہیں تو گزیر ضرور ہے۔“ کریم خان کے شک کا دائرہ سمیٹتے ہوئے رئیس علی نواز پر ہنکڑ بھرا ہوا تھا۔

وہ طرح طرح کے خیالوں کے سمندر میں ڈوبتا بھرتا آغا خان اسپتال پہنچ گیا۔

ابھی وہ اپنی جیب سے اترنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کے دل میں جلنے والی امید کی شمع پھڑ پھڑا کر دم توڑنے لگی۔ اسپتال کے سامنے ہی کسی چیمبل کار پورٹر ایک خبر کی کورتج کر رہا تھا۔

”ناظرین میں اس وقت آغا خان اسپتال کے باہر موجود ہوں اور مصدقہ اطلاعات کے مطابق رئیس علی نواز جو یہاں زیر علاج تھے وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے کہا جا رہا ہے کہ.....“



شام ڈھل چکی تھی اور رات دھیرے دھیرے جوان بونی جا رہی تھی۔ چاند اپنا قدم آسمان کے سینے پر رکھ کر اپنی چاندنی گوزمین پر بھیر رہا تھا۔

کریم خان اس وقت اعیان کے ساتھ ہینس کے ایک پارک میں بیٹھا ہوا تھا۔ غیاں چھ فٹ دوائی کا لمبا چوڑا جوان تھا اس کا کسرتی بدن ہانی ووڈ کے کسی ہیرو کی یاد دلاتا تھا۔ نیلی نیلی نشیلی آنکھیں جن میں اگر کوئی ایک بار دیکھ لے تو اپنے آپ کو بھولنے پر مجبور ہو جائے۔ چوڑی پیشانی اس کے ذہین ہونے کی گواہی دے رہی تھی اور لمبے لمبے بال ہوا میں اڑتے ہوئے اس کی پیشانی کو چوم رہے تھے۔ رنگ روپ ایسا کہ جو دیکھے دیکھتا رہ جائے اور یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ جو اسے ایک بار دیکھے وہ واپس دیکھنے پر مجبور نہ ہو۔ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ کسی یونانی دیوتا جیسا لگتا تھا جو شاہی غلطی سے زمین پر اتر آیا تھا۔

پارک میں کئی حسین لگائیں اعیان کو گھور رہی تھیں۔ گمروہ ان سے سب سے بے نیاز کریم خان سے باتوں میں مصروف تھا جو اسے اپنی آج کے دن کی دوز دھوپ کے بارے میں تفصیل سے بتا رہا تھا۔

”پچھلے تین سالوں میں میں سے زیادہ کیسز حل کر چکا ہوں۔ مگر آج تک اتنا الجھا ہوا کیس نہیں ملا۔ سولوگ ایک ساتھ جیسے ہارٹ ایک کا شکار ہوئے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کھانے پینے کی ہر چیز کا ٹیسٹ کروایا لیکن سب بیکار۔ جس پر شک کرتا ہوں تھوڑی دیر بعد ہی کے مرنے کی خبر مل جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ اس الجھن نے تو میرے دماغ کے سارے ہار بلا کر کھ دیئے ہیں۔“ کریم خان پریشانی سے اپنے بالوں میں الجھیاں پھیرتا ہوا بولا۔

”میرے پاس فخر ہے۔“ اعیان نے کہا۔
”تو میں کیا کروں۔ ڈر جاؤں۔“ کریم خان نے سمجھنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

”ارے تو یہ کرو۔ کسی باتیں کر رہے ہو۔ میں تو اپنے فخر سے تمہارے کیس کے الجھے ہوئے دھاگے کاٹنے کی

بات کر رہا ہوں۔“ اعیان نے صفائی دیتے ہوئے کہا۔
”اوہ! میں سمجھا تم فخر دکھا کر مجھے لونا چاہتے ہو۔“ کریم خان نے تیرکی سے سائیس لیتے ہوئے کہا جیسے اس کی سائیس اعیان کی بات سن کر اکھڑ گئی ہوں۔

”تمہارے پاس لونا کو ہے ہی کیا۔ عزت تو کب کی بھا بھی کے ہاتھوں لونا چھینے ہو۔“ اعیان کی اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ اور اچانک کسی کو دیکھ کر اعیان کی ٹپسی کو بریک سے لگ گئے۔ اس نے فوراً کریم خان کا ہاتھ پکڑا اور اسے گیٹ کی جانب کھینچتا ہوا بولا۔ جلدی نکل رہا ہے۔“



”پیاری بانی! زندگی میں پہلی بار تم سے کچھ کہنے کی ہمت کر رہا ہوں اور دعا ہے کہ یہ پہلا موقع آخری ثابت نہ ہو۔ بچپن میں ایک بار تمہاری گہری سیاہ آنکھوں سے

آنکھیں کیا ملائیں کہ میں تمہاری آنکھوں کے اندھیروں میں کھوسا گیا۔ لوگ زندگی بھر روشنی کی تلاش میں رہتے ہیں مگر جب میں سیاہ آنکھوں کے اندھیروں میں ڈوبا تو پتہ چلا کہ زندگی کتنی حسین ہے۔

گزشتہ آٹھ برسوں سے میں ان اندھیروں میں بھٹک رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ پوری زندگی اسی ایک پل میں بتا دوں۔ بچپن میں جب بچے کھیلنے کودنے اور کھانے پینے کے بارے میں سوچتے ہیں میرے پاس تمہارے علاوہ کسی کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ سوتا تو تمہارے خواب دیکھتا اور جاگتا تو تمہیں ڈھونڈتا رہتا اور ہر روز خدا سے ایک ہی دعا کرتا تھا کہ وہ تمہاری ایک جھلک دکھا دے۔

بانیہ ہر روز کی طرح اس خط کو پڑھے جا رہی تھی جو آج سے نو سال پہلے ملا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں تب ہی اسے اپنے کمرے کے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے جلدی سے خط کو سائیڈ ٹیبل کی دراز میں چھپا دیا۔ پھر وہ اٹھی اور اپنے گلابی گالوں پر سجا نسوؤں کو پونچھ کر دروازہ کھولا۔



”اب بتا بھی دو کہ پارک میں تم نے ایسا کون سا بھوت دیکھ لیا جو مجھے کھینچتے ہوئے یہاں لے آئے۔“ دونوں اس وقت ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کریم خان حیران پریشان سا اعیان کے ساتھ کھپا چلا آیا تھا۔ راستے میں ڈرائیوٹگ کرتے ہوئے بھی اعیان خاموش تھا اور اب جبکہ ہوٹل میں بیٹھ کر ویٹر کو کھانے کا آرڈر دے کر اور تھوڑا بہت کھا کر بھی وہ چپ رہا تو کریم خان کو پوچھنا ہی پڑا۔

”چھ نہیں پار۔ بہت تیز بھوک لگ رہی تھی۔ اس لیے تمہیں لے آیا۔“ اعیان نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا۔“ کریم خان تقریباً چیخ ہی اٹھا۔ اس کی چیخ سن کر قریب بیٹھے ہوئے لوگ مڑ کر انہیں عجیب نظروں سے

دیکھنے لگے۔ یہ دیکھ کر وہ جھینپ گیا۔ ”مگر اس طرح لانے کا کیا مطلب ہے۔ سیدھی طرح نہیں کہہ سکتے تھے کیا۔“ اس کی جھنجھلاہٹ میں کمی نہیں آئی۔

اعیان اس کی باتیں سن کر مسکراتا رہا۔ یہ مسکراہٹ کریم خان کے غصے کو اور ہمیز دینے لگی۔ ”تم..... تم..... تم..... وہ اعیان کو کوئی اچھی سی گالی دینا چاہتا تھا مگر جب اس موقع پر کوئی گالی یا نہیں آئی تو بولا۔ ”تم پاگل ہو۔“

”اس میں کوئی شک ہے کیا۔“

”جو تھوڑا بہت شک تھا۔ وہ بھی آج دور ہو گیا۔“ اس طرح جلتے بجھتے رہو گے تو کالے ہو جاؤ گے اور ہو سکتا ہے ہماری پیاری سی بھابھی اس کالے سائڈ کو چھوڑ کر بھاگ جائے۔“ اعیان پر کریم خان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا جو ابھی تک کھا جانے والی نظروں سے اعیان کو گھور رہا تھا۔ اس نے چائیز راس لے لیے اور اپنے ہاتھوں سے کریم خان کو کھلانے لگا۔ تھوڑا سا خمرہ دکھانے کے بعد کریم خان کو کھانا ہی پڑا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے مزید دیر کی تو اعیان زبردستی اس کے منہ میں نوالہ ٹھونسنے کی کوشش کرے گا۔ پھر کریم خان نے اعیان کو نوالہ کھلایا اور دونوں ایک دوسرے کو کھلانے لگے۔ اس پاس بیٹھے لوگ حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ وہ جب بھی ساتھ کھانا کھاتے تھے تو ایک دوسرے کو کھلا کر ہی کھاتے تھے۔



دانشور کہتے ہیں کہ کبھی کبھی ایک پل ایک لمحہ انسان کی زندگی کو بدل کے رکھ دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی سوچ تک بدل جاتی ہے۔ وہ جینے کا نیا طریقہ سیکھ جاتا ہے اور اتنا کچھ بدل جاتا ہے کہ خود انسان ہی بدل کے رہ جاتا ہے۔

لیکن بانیہ کی زندگی کسی لمحے کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک خط کی وجہ سے بدل کر رہ گئی تھی۔ وہ خط جو اسے نو سال پہلے ملا تھا۔ وہ خط جس نے اسے محبت کے اندھیرے راستوں پر لا کھڑا کیا تھا اور اب وہ اس راستے پر اتنی دور آ چکی تھی کہ اس کا واپس لوٹنا ممکن ہی نہیں تھا۔

اس نے خط دیکھا جس پر اس کے گھر کا پتہ لکھا ہوا تھا مگر وہ تحریر اس کے لیے نامانوس تھی اور نہ ہی سمجھنے والے کا کوئی نام لکھا تھا۔ اس نے لفاظی کھول کر کاغذ باہر نکالا۔ اس پر لکھی تحریر دیکھ کر وہ خوشی سے جھوم اٹھی کیونکہ اس تحریر کو وہ کیسے بھلا سکتی تھی۔ یہ وہ تحریر تھی جسے وہ ہر رات پڑھتی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کی کھوئی ہوئی جنت مل گئی ہو۔ اس خوشی میں وہ یہ بھی بھول گئی کہ لفاظی پر جس تحریر میں پتہ لکھا تھا وہ مختلف تھی اور یہ شاید اس کی بہت بڑی غلطی ثابت ہونے والی تھی۔

زیادہ خوشی غم اور غصہ انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ماند کر دیتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ہانیہ کے ساتھ بھی تھا۔ اس خط کو پا کر وہ ساری دنیا کو بھول چکی تھی۔

اس نے دروازہ بند کیا اور اسٹریپر دروازہ ہو کر خط پڑھنے لگی۔

”پیاری ہانی! تمہارا شہر کیا چھوڑا ایسا لگتا ہے اپنا دل اپنی جان اپنی دنیا سب کچھ وہیں تمہارے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ پہلے دن میں ایک دو بار تمہارا دیدار ہو جاتا تھا تو پوری رات چین سے تمہارے خوابوں میں کٹ جاتی تھی۔ مگر اب تو تم بخت نیند بھی کہیں تم ہو گئی سے اور چین بھی۔ کبھی کبھی تو دل کرتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھوڑ کر تمہارے پاس آ جاؤں۔ مگر یہ بھی ممکن نہیں ہے۔

جب تمہیں دیکھنے کی تڑپ نے میرا جینا حرام کر دیا تو میں تمہارے شہر واپس آ گیا مگر وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ تم بھی وہ شہر چھوڑ کر نہیں جا چکی ہو۔ کہاں کہیں یہ کسی کو پتہ نہیں تھا۔

مجھے ایسا لگا کہ اگر تم کچھ اور دن مجھے نہ ملیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ مر جاؤں گا تم جہاں کہیں بھی ہو۔ پلیز میرے پاس آ جاؤ۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ پاگل ہونا نہیں چاہتا۔ میں تمہاری پاہوں میں اپنی ساری زندگی گزار دینا چاہتا ہوں۔ زندگی کی پتی دھوپ میں تمہاری گھنی زلفوں کا طلبگار ہوں۔ تم آ جاؤ نا۔ مجھے پاگل ہونے سے بچا لو۔ مجھے مرنے سے بچا لو..... بچا لو نا.....

اب اس کی سوچوں کا محور صرف وہ شخص تھا جس کا نہ اسے نام معلوم تھا نہ پتہ اور نہ ہی وہ یہ جانتی تھی کہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔ ایسی گمنام محبت کا شکار ہو چکی تھی ہانیہ۔ صرف وہ خط تھا جو لکھنے والے سے متعلق واحد نشان تھا اور اس خط کے علاوہ وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ پھر بھی ہانیہ نے اس گمنام کو اپنے دل کی اجازت دے دی تھی۔ وہ اس انجان شخص کی محبت میں ڈوب چکی تھی بلکہ محبت کی منزلوں سے بھی آگے نکلتے ہوئے وہ اس سے عشق کرنے لگی تھی۔ اگر اسے شکر کا خدشہ نہ ہوتا تو وہ شاید اسے پونے تک لگتی۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ اس سے جتنی محبت وہ انجان شخص کرتا ہے اتنی محبت دنیا میں اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔

ہانیہ اسے حد سے زیادہ چاہتی تھی مگر پھر بھی اسے اپنی محبت اپنے محبوب کی محبت کے آگے حقیر نظر آتی تھی۔ اتنا کچھ ہو چکا تھا اور وہ بھی صرف ایک خط کی بدولت جو نو سال پہلے اسے ملا تھا۔

پچھلے نو سالوں میں اسے عادت ہی ہوئی تھی کہ جب تک وہ اس خط کو پڑھ نہیں لیتی تھی اسے نیند ہی نہیں آتی تھی۔ حالانکہ ان برسوں میں وہ اس خط کو لاکھوں بار پڑھ چکی تھی لیکن ہر بار وہ تحریر اسے بالکل نئی لگتی تھی اور ہر بار اسے پہلے سے زیادہ خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ اب تو یہ اس کی زندگی کا معمول بن چکا تھا کہ وہ اس خط کو پڑھتی خوش ہوتی اور پھر خدا سے گلہ کرتی جس نے ابھی تک اس کا محبوب اس سے نہیں ملایا تھا اور پھر دعا مانگتے مانگتے سو جاتی۔

مگر آج وہ نہ خدا سے گلہ کر سکتی تھی اور نہ ہی دعا مانگ سکتی تھی اور وہ یہ تھی کہ کوئی دخل اندازی کرتے ہوئے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی اس کی مٹی کھڑی تھی۔

”لو بیٹا! آج شام کو تمہارے نام یہ خط آیا تھا۔ میں دینا ہی بھول گئی۔ اب یاد آ گیا۔ گموزی کیسی یادداشت ہوئی ہے۔“ مٹی خط اسے تھما کر نیچے چلی گئی۔

لکھنے والا کا نام لکھا تھا اور نہ ہی کوئی ایڈریس۔ وہ دیوانوں کی طرح خط کو انٹ پلٹ کرتی رہی جیسے کانڈ کے کسی کونے سے نام پتہ چمڑ کر رہے گا۔ اس نے لفافے کو بھی چھان مارا مگر اس سے بھی کوئی مدد نہیں ملی۔

اس کے چہرے پر گہری مایوسی کے بادل چھانے لگے اور اس مایوسی نے اسے پاگلوں کی طرح چلانے پر مجبور کر دیا۔

”نہیں..... یہ بے ایمانی ہے۔ نو سال پہلے تم مجھے ایک خط لکھا کر غائب ہو گئے تھے اور نو سال بعد پھر صرف ایک خط بھیج دیا۔ خود نہیں مل سکتے کیا کہاں ہو تم میرے پاس کیوں نہیں آتے؟ میں تم کو اپنی ہانہوں میں چھپا لوں گی۔ ایک بار آ جاؤ پھر کبھی تم کو خود سے الگ نہیں ہونے دوں گی۔ صرف ایک بار مل جاؤ نا صرف ایک بار۔“

ہانیہ کی آواز اس لٹنا م محبوب تک تو کیا پہنچتی، نیچے سوئے ہوئے اس کے مٹی پا پاتک ضرور پہنچتی تھی۔ اس کی مٹی دوزتے ہوئے اوپر آ گئی۔

”کیا ہوا کیا ہوا اپنی کیوں چلا رہی ہو؟“

”کب..... کب..... کب..... مہم..... مہم..... وہ ذراؤ نا خواب دیکھ رہی تھی۔ ہانیہ شرمندگی سے بولی۔

اس کی زندگی بھی تو ایک خواب بن کر رہ گئی تھی جس کے نونے نونے ٹکڑے کا اب وقت قریب آ گیا تھا۔ مگر وہ معصوم اس بات سے نجات تھی۔



رات دیر تک کریم خان اور اعیان مستیاں کرتے رہے۔ رات گئی بات گئی کی طرح۔ نئی صبح بہت سی پریشانیاں لیے بڑی بے صبری سے اس کا انتظار کر رہی ہے۔ ویسے بھی اس کیس نے کریم خان کے دل کا پیمان اور سکون ازا کر رکھ دیا تھا۔ مگر رات کی نیند ابھی سلامت تھی۔ کیونکہ اس نے اپنی رات اور راتوں کی نیندیں اپنی پیاری بیوی ثور بیہ کے نام کر رکھی تھیں۔ اگرچہ ثور بیہ ابھی اپنے میسے گئی ہوئی تھی مگر خواب میں کریم خان کا ساتھ نبھانے سے باز نہیں آتی تھی۔

پلیز..... پلیز..... مجھے بچا لو..... بچا لو..... بچا لو.....

ہانیہ کی سانسیں اکھڑنے لگیں اور وہ میں اٹھنے والی ہے چینی اسے پاگل کرنے لگی۔ وہ پورا خط پڑھنے کی ہمت ہی نہیں کر سکی۔ وہ آنکھیں بند کر کے گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ کافی دیر بعد جا اس نے کچھ سنبھالا لیا تو خط کو آگے پڑھنے لگی۔

”پاگل تو شاید میں ہو ہی چکا ہوں۔ تمہیں خط لکھ رہا ہوں اور یہ بھی نہیں جانتا کہ تم کہاں ہو۔ یہ خط اس طرح تم تک پہنچاؤں گا۔ کچھ نہیں جانتا۔ تمہاری کچھ خبر ہی نہیں ہے۔ پھر کبھی یہ خط لکھے جا رہا ہوں۔“

مگر کچھ پتہ ہو یا نہ ہو لیکن ایک بات میں اچھی طرح جانتا ہوں اور یقین بھی ہے کہ کبھی نہ کبھی تم مجھے ملو گی ضرور کیونکہ میری محبت یہی ہے اور قدرت اتنی ظالم نہیں ہے کہ وہ مزید تمہیں ملنے سے روکے۔ ہم ایک ہو کر ہی رہیں گے۔ قدرت کو ہماری محبت کی قدر کرنی ہی ہوگی۔

ہانیہ اٹھتے پتہ ہے۔ اب مجھے روزانہ دینی زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ ساری ساری رات آنسوؤں میں غوطہ زن رہتا ہوں اور صبح ہوتے ہی ایک مصنوعی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجالتا ہوں۔ خود بھی ہستا ہوں اور لوگوں کو بھی ہنساتا ہوں۔ مگر کوئی نہیں جانتا کہ ایک بار ہنسنے کے لیے کتنے دن بنی دن میں تکی ہار دینا پڑتا ہے۔ دن میرے دل کے آنسوؤں و جان بھی پیسے کرتا ہے۔

اور میں خود بھی نہیں چاہتا کہ کوئی انہیں دیکھ یا جان پائے۔ مگر کبھی کبھی اس مصنوعی زندگی سے تنگ آ کر سوچنے لگتا ہوں کہ ایسی زندگی کا کیا فائدہ۔ اس کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے۔ مگر پھر یہ سوچ کر رک جاتا ہوں کہ میری یہ زندگی تو صرف تمہاری امانت ہے اور میں تمہاری امانت میں خیانت کیسے کر سکتا ہوں۔

اس وقت رات کے چارج کر چالیس منٹ ہو رہے ہیں۔ اب میں سونے لگا ہوں..... کچھ بجے سے پہلے پہلے جاگنا ہے ورنہ شام شور مچا دیں گی۔“

خط ختم کر کے ہانیہ نے الٹ پلٹ کے دیکھا نہ تو

لگتا تھا کہ اس کے خوابوں کو بھی شاید قسمت کی نظر لگنے والی تھی اور قسمت کے گتے تو انسان کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ کریم خان اپنے کیمن میں سب انسپکٹرز سرفراز کے ساتھ رئیس علی نواز اور طارق محمود کے کیس پر ڈسکس کر رہا تھا۔ اگرچہ ڈی ایس پی زاہد علی نے کریم خان کو ہر قسم کے دباؤ سے آزاد رکھا ہوا تھا مگر دباؤ ڈالنے کے لیے میڈیا ہی کافی تھا۔ جس کی ہر پانچویں خبر میں پولیس کی دل کھول کر کھپائی کی جا رہی تھی۔

”سر! ساری رپورٹس آپ جکی ہیں۔“ سرفراز نے کہا۔ کریم خان کی نظر میں اسی پر تکی ہوئی تھیں اور وہ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی الجھن کو محسوس کر رہا تھا۔

”ہاں بولو۔ کیا رپورٹس ہیں۔“ کریم خان جلد سے جلد یہ کیس حل کر کے بے چینی سے نجات پانا چاہتا تھا۔

”سر! ان رپورٹس میں کئی باتیں چونکا دینے والی ہیں۔ نمبر ایک طارق محمود کا قتل شام چھ اور سات بجے کے درمیان ہوا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ طارق محمود پارٹی میں شریک ہی نہیں ہوا تھا۔ کوئی ہے جس نے اسے قتل کر کے

اس کی شناخت چرائی اور اس کے دعوت نامے پر پارٹی میں شرکت کی۔ اب وہ کون ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ نمبر دو رئیس علی نواز کی پارٹی سے دو ایسے لوگوں کے فنکٹر پرنٹس ملے ہیں جو کسی بھی لاش کے فنکٹر پرنٹس سے میچ نہیں ہو

رہے۔ نمبر تین پہلے فنکٹر پرنٹ کی پہچان ہو چکی ہے وہ کمال نام کے کسی شخص کے ہیں جو سات سال پہلے مار پیٹ کے جرم میں چھ ماہ کی سزا کاٹ چکا ہے۔ نمبر چار دوسرے فنکٹر پرنٹ کی پہچان نہیں ہو سکی نمبر پانچ۔ جائے وقوعہ سے یہ لاکٹ ملا ہے۔“ سرفراز کچھ اور بھی کہنے والا تھا

کہ اس کا موبائل بچنے لگا۔ سرفراز نے کریم خان سے اجازت لی اور اس کے کیمن سے باہر نکل کر بات کرنے لگا۔ کریم خان نے لاکٹ ہاتھ میں لے کر اس پر ایک سرسری نظر ڈالی تو اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ کیونکہ اس لاکٹ کو تو وہ ہزاروں بار دیکھ چکا تھا اور یہ لاکٹ جس گھلے کی

زیانت بنتا تھا اسے بھی وہ جانتا تھا۔

”نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔ اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

سونے کی چین میں جڑے سونے کے لاکٹ پر چھوٹے چھوٹے پھولوں کے ملاپ سے ایچ کا حرف بنا ہوا تھا۔ جو دیکھنے میں بہت خوبصورت لگتا تھا۔ یہ لاکٹ اسپتال آؤر دے کر بخوایا گیا تھا اور اسے اپنی آنکھوں پر

کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے یہ لاکٹ ہمیشہ اعیان کی گردن میں دیکھا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اس لاکٹ کے بارے میں اعیان سے کئی بار پوچھا تھا مگر اس نے کبھی بھی ڈسٹنگ کا کوئی جواب نہیں دیا تھا بلکہ ہمیشہ ادھر

ادھر کی باتیں کر کے نال دیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے کرسی سے ٹیکہ لگالی اور ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔

”اعیان تم یہ لاکٹ ہر وقت کیوں پہنے رہتے ہو؟“

”کیونکہ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔“ اعیان نے ایک نٹ کھٹ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا مطلب کیا ہے تمہارا؟“ وہ الجھی ہوئی نظروں سے اعیان کو دیکھتا ہوا بولا۔

”مطلب صاف ہے۔ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔“

”میں تم سے لاکٹ کے بارے میں بات کر رہا ہوں اور تم ہو کہ بلو اس ہی کیسے جا رہے ہو۔“ کریم خان جھٹکا گیا۔

”اوہ تو یہ بات ہے۔ میں سمجھا کہ تم نے جوک سنانے کی فرمائش کی ہے۔“ اعیان نے معصوم بننے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

”یار مذاق مت کرو۔ یہ ایچ کون ہے۔“

”تمہارا نام کریم خان ہے نا۔“

”ہاں۔“

”خان میں کئے کے بعد ایچ آتا ہے نا۔“

”ہاں آتا ہے۔“

”بس اسی لیے میں یہ لاکٹ پہنے رہتا ہوں۔“
 اعیان اس لاکٹ کو بڑے پیار سے چھوتا ہوا بولا۔
 کریم خان نہ جانے اور کتنی دیر تک ماضی میں کھویا
 رہتا کہ اس کے موبائل کی سلسل بجتی ٹیل نے اسے ماضی
 سے حال میں آنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ایک ٹھنڈی
 سانس لی اور جیب سے موبائل نکال کر کال ریسیو کی۔
 ”ہیلو..... کیا..... کہاں..... میں ابھی آتا ہوں۔“ اس نے
 اتنا ہی کہا۔ اسے ایک اور کال کی خبر ملی تھی۔



ہانیہ رات کو دیر سے سوئی تھی۔ اس لیے صبح دیر تک
 سوئی رہی۔ جب وہ ناشتہ کر رہی تھی تو اس کے نام ایک اور
 خط آ گیا۔ اس نے خط لیا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔
 ابھی وہ لغافہ کھول بھی نہیں پائی تھی کہ اس کا موبائل
 واہریت کرنے لگا۔ اس نے نمبر دیکھا جو نامعلوم تھا۔
 اس نے کچھ سوچا اور پھر کال ریسیو کر لی۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو۔ کیا آپ ہانیہ بول رہی ہیں۔“ دوسری طرف
 سے پوچھا گیا۔ ہانیہ کو وہ آواز کچھ سنی مٹی سی لگی۔
 ”ہاں میں ہانیہ ہوں۔ مگر آپ کون ہیں؟“
 ”میں تمہارا محبوب۔ کیا تم مجھ سے کل شاہ رکن عالم
 کے مزار کے پاس مل سکتی ہو۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔
 اس بے تکی بکواس نے ہانیہ کا خون کھولا دیا۔ وہ غصے
 سے چلائی۔ ”تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے اس طرح
 بات کرنے کی۔ میں تمہاری جان لے لوں گی۔“

”میں ہی وہ گناہم شخص ہوں جس نے آپ کو وہ خط
 بھیجے تھے۔“ دوسری طرف سے شرارتی لہجے میں بولا گیا۔
 ”کیا..... کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“ اسے جیسے یقین
 ہی نہیں ہوا۔ اسے لگا اس نے سننے میں غلطی کی ہے۔
 ”یار میں ہی ہوں جس نے آچھ سال پہلے آپ کو خط
 بھیجا تھا اور آج کل بھی میں ہی آپ کو خط بھیج رہا ہوں۔
 اب میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”میں ابھی آ رہی ہوں۔ کہاں ہیں آپ۔“ یہ سن کر
 ہانیہ بے تاب سی ہو گئی تھی۔

”ابھی نہیں کل شام پانچ بجے۔ شاہ رکن عالم کے مزار
 پر۔“ اجنبی نے پھر کہا۔
 ”کل نہیں۔ آج اور ابھی ملتے ہیں نا۔“ ہانیہ کے لہجے
 میں برسوں کی تڑپ تھی۔ وہ جلد سے جلد اپنے محبوب تک
 پہنچ جانا چاہتی تھی۔
 ”آج نہیں۔ کل ہی ملیں گے۔“

”اچھا اپنا نام تو بتا دو اور یہ نمبر آپ کا ہی ہے
 نا۔ آپ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔“ ہانیہ بے
 خودی ہو کر کئی سوال ایک ساتھ کرنی لگی۔

”ارے بابا سانس تو لینے دو۔ کل تو ہم مل ہی رہے
 ہیں۔ تم کو سب معلوم ہو جائے گا۔ اوکے ہائے ٹیک کیئر۔“
 اجنبی نے اس کا جواب سنے بغیر ہی لائن کاٹ دی۔
 وہ کچھ دیر تو حیرانی سے اپنے موبائل کو دیکھتی رہی پھر
 پاگلوں کی طرح اسے پوسنے لگی۔



کریم خان کی پولیس جیب پوری رفتار سے سڑک پر
 دوڑی چلی جا رہی تھی۔ اس کا رخ شہر سے باہر کی طرف تھا
 اور تھوڑی ہی دیر میں وہ شہر کو پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ کافی آگے
 آ کر اس نے اپنی جیب کھینچ کر راستے پر ڈال دی اور کوئی دو
 گلو میٹرا سی کچے راستے پر چلتے ہوئے اپنی جیب ایک
 کھنڈر کے آگے روک دی۔ جس کے باہر اس کی پوری نیم
 کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

یہ کھنڈر کسی پرانی حویلی کے تھے۔ جو اب ٹوٹ
 پھوٹ کا شکار تھی۔ پچھلے کچھ سالوں میں یہاں آنے
 والے کئی لوگ پر اسرار طور پر غائب ہو چکے تھے۔ اس لیے
 اب اس کھنڈر کو سیب زدہ تصور کر لیا گیا تھا اور لوگ یہاں
 سے کتر کر نکل جاتے تھے۔

کریم خان اپنی نیم کے ساتھ کھنڈر میں داخل ہو گیا۔
 حویلی کے کمروں میں اناجیرا اچھلا ہوا تھا اور اس اندھیرے
 کی وجہ سے وہ کمرے کافی ہیبت ناک نظر آ رہے تھے۔ اس
 نے سپاہیوں کو باہر رکنے کا اشارہ کیا اور چراغ دین اور سر فرماز
 کے ساتھ اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں مل ہوا تھا۔

”سرفراز تم سپاہیوں کو لے کر کھنڈر کی اچھی طرح تلاشی لو اور چراغ دین تم روشنی کا انتقام کرو۔“ کریم خان نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

ٹھوڑی دیر بعد وہ کمرہ روشن تھا اور کریم خان کے ساتھ چراغ دین اس کمرے میں موجود تھے جبکہ سرفراز ابھی بھی اپنی تلاشی جاری رکھے ہوئے تھا۔

لاش اتنی بری حالت میں تھی کہ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے کسی شیطان نے مارا ہو یا پھر بدلے کی آگ میں جل کر انسان سے حیوان بن چکے کسی شخص نے بھنبھورا ہونے کے بعد بھی لاش کی آنکھوں میں خوف صاف جھلک رہا تھا۔

لاش کے ماتھے پر زخم تھے جس سے لگ رہا تھا کہ اس کا سر زور زور سے دیوار یا فرش سے ٹکرایا گیا ہوگا۔ اس کے کچھ دانت بھی نولے ہوئے تھے جو لاش کے پاس ہی ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ کی تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں اور وہ بھی آس پاس ہی پڑی ہوئی تھیں۔ دوسرا ہاتھ کہنی سے کچھ نیچے سے الگ ہو کر لاش کے پاس پڑا تھا جبکہ ایک کان بھی فرش پر پڑا ہوا تھا۔ سینے پیٹ اور کمر پر پچیس سے زیادہ چھوٹے بڑے زخم تھے جو کسی چاقو یا خنجر سے لگائے گئے تھے۔ جس نے بھی اس شخص کو مارا تھا بہت ہی بے رحمی سے تڑپا تڑپا کے اور نہایت اطمینان سے مارا تھا۔ کریم خان جیسا اسپلٹر بھی لاش کی ایسی حالت دیکھ کر ایک لمحے کے لیے لرز اٹھا تھا۔

پھر اس کی نظر اس کئے ہوئے ہاتھ پر پڑی جس پر سات کا عدد گدرا ہوا تھا۔ وہ چھو دیر تک بے خیالی میں سات کے بند سے گھورتا رہا۔

”اس قتل کی اطلاع کس نے دی تھی۔“ اس نے چراغ دین سے پوچھا۔

”کال کسی پنی سی او سے آئی تھی۔“ چراغ دین نے جواب دیا۔

”اس کی شناخت ہوئی یا نہیں؟“ اس کی آنکھیں لاش پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

اس کمرے کا دروازہ ناپید تھا اور اندھیرے کی وجہ سے اندر کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چراغ دین نے مارچ روشن کر کے اس کا رخ لاش کے چہرے کی طرف کر دیا۔ لاش کا چہرہ دیکھ کر کریم خان کا منہ کھلا اور پھر کھلا ہی رہ گیا۔ وہ تو غیبت تھا کہ کمرے میں اندھیرا تھا جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت دونوں سب اسپلٹر نہیں دیکھ سکے ورنہ وہ ضرور پوچھتے اور کریم خان اس وقت کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

یہ لاش اس شخص کی تھی جسے اس نے گل پارک میں اس وقت دیکھا تھا جب وہ اعیان کے ساتھ وہاں بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ شاید اسی کو دیکھ کر اعیان چونکا تھا اور کریم خان کو کھینچتا ہوا ہوٹل لے گیا تھا۔

اس نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں کو کیا لگتا ہے اس کا قتل کس نے کیا ہوگا۔“

”اس میں لگنا لگانا کیا سر! یہ حویلی آسب زدہ ہے۔ کسی بھوت کے علاوہ۔“

ابھی چراغ دین اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ باہر سے کسی کی چیخ سنا دی۔ وہ تینوں چونکے اور باہر کی طرف بھاگے۔

ایک سپاہی زمین پر گرا ہوا تھا جبکہ باقی سپاہی ڈر سے سہمے اس سے چھو دور کھڑے تھے۔ کریم خان دور سے ہی چلایا۔ ”کیا ہوا؟“

”سر! کسی نے میری ٹانگ پکڑ رکھی ہے۔“ سپاہی بہت گھبرایا ہوا تھا۔

کریم خان اس کی طرف بڑھا۔ سپاہی کی ایک ٹانگ جھاڑیوں کے اندر تھی۔ کریم خان نے ناول کر دیکھا۔

سپاہی کی ٹانگ کسی جنگلی تیل میں پھنسی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر کریم خان کی ہنسی چھوٹ گئی اور اس نے سپاہی کی ٹانگ تیل سے باہر نکالی۔ باقی سب لوگ بھی یہ ماجرا دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ حالانکہ وہ سب اسے کسی بھوت کا کارنامہ سمجھ کر سہمے ہوئے تھے اور اب وہ خود اپنی ہی بے

دقتی پر مسکرا رہے تھے۔

”نہیں سر!“

تنب ہوئی صبح۔ میں ابھی سو کر اٹھا ہوں تو میرے لیے صبح ہی ہوئی نایار۔ اعیان پلکیں جھپکا کر معصومیت سے بولا۔ کریم خان نے کچھ نہیں کہا بس تیکھی نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ اعیان اس کے گھر کے اندر آنے کا انتظار کرتا رہا لیکن جب کریم خان اندر داخل نہیں ہوا تو اسے بولنا ہی پڑا۔

”جلد سے جلد اس کی پوری تفصیل معلوم کرو۔ اس کے دوست دشمن سب ہی کی فہرست کل تک میری میز پر ہونی چاہئے۔“ اس نے چراغ وین کوا روڑ دیتے ہوئے کہا۔

”تھوڑی دیر بعد سر فرما بھی اس کمرے میں آ گیا۔“

”سر! ہم نے پورا کھنڈر چھان مارا لیکن کچھ نہیں ملا۔“

اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”مانا کس آج میں بہت خوبصورت لگ رہا ہوں۔ اس لیے تم مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہے ہو۔ مگر میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا ہوں۔ اندر آ کر آرام سے بیٹھ کر مجھے دیکھتے رہنا۔ ویسے بھابھی سے کہنا پڑے گا کہ تم انہیں طلاق دے کر مجھ سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو۔ مگر میں پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ مجھے تم سے شادی نہیں کرنی۔ نہیں کرنی۔ میں گے نہیں ہوں یار۔“ اعیان نے شرمانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

”لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو۔“ کہتا ہوا کریم خان کمرے سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد شہر پہنچ کر وہ ایک جیولری کی دکان پر اس لاکٹ جیسا دوسرا لاکٹ بنا رہا تھا جس کے بننے میں پورے دو گھنٹے لگ گئے۔ اس نے دونوں لاکٹ ہاتھ میں لے کر دیکھے۔ کوئی پہچان ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ دو لاکٹ ہیں یا ان میں سے کون سا پرانا ہے اور کون سا نیا۔

”بلکومت۔“ کریم خان چھینپتا ہوا بولا اور اندر آ گیا۔

”سچ تو ہمیشہ کڑوا ہی لگتا ہے میری جان۔“ اعیان نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ اندر آ کر اعیان ایک صوفے پر لیٹ گیا اور کریم خان نے اس کے سامنے نشست سنبھالی۔

دونوں لاکٹ لے کر اس نے اعیان کے گھر کا رخ کیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ لاکٹ اعیان کا ہے بھی یا نہیں۔ اگر اعیان کے گلے میں لاکٹ ہوا تو کوئی بات نہیں تھی اور اگر لاکٹ غائب تھا تو پھر اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے پاس جو لاکٹ ہے وہ اعیان کا ہی ہے کیونکہ اعیان کبھی بھی وہ لاکٹ خود سے جدا نہیں کرتا تھا۔

”کیا لوگے۔ ٹھنڈا پانی، موڈا پانی یا لیموں پانی۔“ اب اعیان نے اپنی آنکھیں بھی بند کر لی تھیں۔ ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ جن چیزوں کا نام لے رہا ہے وہ لانے کا ارادہ بھی ہو۔ بلکہ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کریم خان کے منہ سے ”کچھ نہیں“ کہلوانے کے موڈ میں ہو۔

”کافی۔“

کریم خان مسلسل اعیان کے دروازے کی تیل بجا رہا تھا مگر اندر سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اعیان دروازہ کیوں نہیں کھول رہا۔ اتنی بار تیل بجانے کے بعد بھی دروازہ نہیں کھولا گیا تو اس نے جھنجھلا کر آخری بار تیل بجانے کا ارادہ کیا اور اسی وقت دروازہ کھل گیا۔

”کولڈ کافی، وہانت، بلیک یا ٹرین؟“ اس نے آنکھیں موندے ہی پوچھا۔

”اتنی صبح صبح کیسے تا ہوا؟“ اعیان نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

”میرے باپ جیسی بھی بنا لو۔“ کریم خان اس کی تان اسٹاپ چلتی زبان کو روکنے کے لیے بولا۔

اعیان اٹھا اور مسکراتا ہوا کچن میں چلا گیا۔

”بارہ بج چکے ہیں جناب اور آپ کے لیے ابھی صبح ہی ہے۔“ کریم خان نے سے سؤتتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے جانے کے بعد کریم خان کو یاد آیا کہ اس نے اعیان کے گلے میں لاکٹ پر تو دھیان دیا ہی نہیں۔ اعیان نے وہ کہات تو سنی ہی ہوئی کہ جب میں جنگا۔

نظم
 کون..... کس مقام پر چمچڑ گیا
 ہم سے
 کچھ یاد نہیں
 یاد رہا تو بس اتنا
 کہ جو چمچڑ گیا
 ایک بار
 وہ پھر دو بارہ
 ملا نہیں

کاجل شاہ..... خانیوال

خان کی طرف اچھا لٹے ہوئے ہوا۔
 ”اے پین کے تاپار۔“ اس بار کریم خان کا لہجہ
 قدرے ملتی تھا۔ وہ اعیان کو لاکٹ پہناتا چاہتا تھا کیونکہ
 جس طرح وہ جانتا تھا کہ اعیان ہر وقت وہ لاکٹ پہنے
 رہتا ہے۔ تو کوئی اور بھی ضرور جانتا ہوگا اور اعیان کے
 گلے میں لاکٹ نہ دیکھ کر کوئی شک کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا
 اور کریم خان اسے ہر طرح سے بچانا چاہتا تھا۔
 اعیان نے اس کی بات مان لی اور براسا منہ بناتے
 ہوئے وہ لاکٹ پہن لیا۔ کافی ختم کر کے اس نے اعیان
 سے اجازت لی اور باہر نکل گیا۔
 اُمر اعیان کی جگہ کوئی اور یوں کریم خان کے شک
 کے دائرے میں آتا چاہے وہ اس کی بیوی ہی کیوں نہ
 ہوتی تو وہ اب تک اسے لاکٹ میں ڈال چکا ہوتا مگر وہ
 اعیان کو ہر طرح کے شک سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اسی
 لیے اس نے ویسا ہی لاکٹ بنا کر اعیان کو زبردستی پہنا
 بھی دیا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر اب اعیان پر کوئی
 الزام آتا ہے وہ ہر الزام اپنے سر لے لے گا۔ یہی تو اس کی
 دوستی تھی۔

جب اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ اپنے گھر پہنچا تو
 اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اعیان کی وجہ سے

کی باتوں میں الجھ کر وہ اپنے مقصد کی بات بھول گیا تھا۔
 تھوڑی دیر بعد اعیان کافی کے دو کپ بنا کر لے آیا۔
 کافی پیتے ہوئے کریم خان نے غور کیا تو اس نے دیکھا
 کہ اعیان کے گلے میں وہ لاکٹ نہیں تھا۔
 ”اعیان آج تم نے اپنی جان سے پیارا لاکٹ
 کیوں نہیں پہن رکھا۔“ تھوڑی دیر تک کپ رہنے کے
 بعد وہ بولا۔

”سنا جاندی عمر بھر ساتھ نہیں دیتا میری جان۔“
 اعیان نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”تو کیا تم نے اسے اتار کر نہیں رکھ دیا ہے۔“
 ”نہیں وہ تمہارے پاس ہے۔ چلو جلدی سے میرا
 لاکٹ نکالو۔“ اعیان نے کہا۔

اعیان کے جواب سے کریم خان جو نچکا رہ گیا۔ وہ تو
 یہ سوچ رہا تھا کہ اعیان کا جواب یہ ہوگا کہ نہیں کھو گیا۔ مگر
 اعیان تو۔

”میرے پاس..... کیوں ہونا چاہئے۔“ کریم
 خان نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”کیوں اور کیسے جیسے سوال بچوں کے منہ سے اٹھے
 لگتے ہیں۔ چلو جیب میں ہاتھ ڈالو اور نکالو میرا لاکٹ۔“
 ”نہیں پتہ ہے یہ مجھے کہاں سے ملا ہے؟“ کریم
 خان نے کچھ طنز یہ لہجے میں کہا۔

”تم سے جو کہا گیا ہے پسے وہ کرو۔ بعد میں اپنی
 زبان کھولو۔“ اعیان نے پھر شرارتی انداز میں کہا۔

کریم خان نے چپ چاپ نیا والا لاکٹ نکالا اور
 اعیان کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

اعیان اس لاکٹ کو ہاتھ میں لیتے ہی چونکا پھر اسے
 غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یار پولیس والے
 ہو کر دھوکا دیتے ہو۔ یہ میرا لاکٹ نہیں ہے۔“

”وہ میرے پاس ہے۔ تم فی الحال اسے ہی پہنے
 رہو۔“ کریم خان نے کہا۔ وہ حیران تھا کہ دونوں لاکٹ
 ایک جیسے تھے پھر اعیان نے کیسے پہناتا۔

”تو یہ بھی تم اپنے پاس ہی رکھو۔“ اعیان لاکٹ کو کریم

ہوئے لہجے کا ٹانگ کرتے ہوئے بولی۔
 ”میں تمہیں لینے کے لیے اعیان کو بھیج رہا ہوں۔ تم
 کسی بھی بہانے اسے آٹھ دس دن روکے رکھنا۔ اس
 کے بعد اعیان کے ساتھ آجانا۔“ کریم خان نے
 شجیدگی سے کہا۔

”اور کوئی حکم میرے سر تاج؟“ ثوبیہ کی یہ بات اچھی
 تھی کہ وہ کریم خان کی ہر بات بغیر زیادہ سوال کیے مان
 جاتی تھی۔

”اور اعیان کو یہ بھی مت بتانا کہ میں نے تمہیں
 اسے روکنے کے لیے کہا ہے۔“ اس نے تاکید کرتے
 ہوئے کہا۔

”فکر مت کریں۔ اسے ذرا سا بھی شک نہیں ہوگا۔
 امی بلاری ہیں۔ بعد میں کال کرتی ہوں۔ ہائے اور ہاں
 بے بی کھانا وقت پر کھاتے رہنا۔ باہر کی تلی بھنی چیزیں
 مت کھانا بیمار پڑ گئے تو عیادت کی بجائے ناراض
 ہو جاؤں گی۔“ ثوبیہ فون بند کرنے سے پہلے بیویانہ فریضہ
 نبھاتے ہوئے بولی۔

اس نے اپنا موبائل بیڈ پر پھینکا اور نہانے کا ارادہ
 کرتے ہوئے ہاتھ روم کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کا
 موبائل دوبارہ بجنے لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے بیڈ کی طرف
 آیا۔ اس نے جین سوچا کہ ثوبیہ کوئی بات کہنا بھول گئی ہوگی
 اس لیے دوبارہ فون کیا ہے۔ مگر اسکرین پر کوئی انجان نمبر
 بٹنک سر رہا تھا۔ اس نے ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو۔“
 ”کریم خان! میری بات غور سے سنو۔ آج رات بارہ
 بجے فیضی نیوا سٹریٹ نمبر دو ہنگلہ نمبر تین میں کمال کے چار
 سرخیں اکٹھے ہونے والے ہیں۔ تم چاہو تو انہیں گرفتار کر
 سکتے ہو۔ وہ سفید رنگ کا ہنگلہ ہے۔ ہائے۔“ یہ کہتے ہی
 دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی اور کریم خان ہیلو ہیلو
 ہی کرتا رہ گیا۔

ابھی اس نے موبائل کان سے ہٹایا ہی تھا کہ میسج کی
 نون بجی۔ اس نے دیکھا وہی انجان نمبر تھا اور اس پر وہی
 ایڈریس بھیجا گیا تھا جو ابھی فون کرنے والے نے بتایا تھا۔

وہ سارا دن کافی ذہنی اذیت کا شکار رہا تھا جس کی وجہ سے
 وہ خود کو بہت تھکا تھکا سا محسوس کر رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر
 آرام کرنے کی غرض سے بستر پر لیٹا مگر میندا سے اپنی
 آغوش میں لینے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

موبائل کی مسلسل بیل سے اس کی نیند ٹوٹی۔ اس نے
 سائڈ ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھا لیا اور اسکرین
 پر لکھا نامہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے کان سے لگا لیا۔
 ”ہیلو میری ثوبی۔ کیسی ہو۔“ وہ بولا۔

”میں تو ٹھیک ہوں مگر مجھے میرا پیارا پیارا سا بے بی
 کچھ پریشان لگ رہا ہے۔“ دوسری طرف سے ثوبیہ کی
 کھلتی ہوئی آواز آئی۔

وہ تنہائی میں کریم خان کو اکثر بے بی کہہ کر بلاتی تھی
 اور جب زیادہ ہی پیارا تھا تو راجہ کہہ کر پکارتی تھی۔
 ”تم پاس نہیں ہو تو دل پریشان ہی رہے گا نا۔ تم
 آ جاؤ نا۔“ کریم خان نے اپنے لہجے کو ہر ممکن خوشگوار
 بناتے ہوئے کہا۔

”ارے رے رے۔ میرے بے بی کو میری اتنی یاد
 آ رہی ہے کہ یاد میں تڑپ تڑپ کے جھوٹ بھی بولنا لگے
 گیا ہے۔ چلو اب یہ ڈونگی بند کرو اور جیج جی بتاؤ کہ بات کیا
 ہے۔ تم پریشان کیوں ہو۔“ ثوبیہ نے پہلے پیار سے اٹانا
 پھر شجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”یار بے بی کوئی میری بات مان لیتا ہے مگر ایک تم ہو کہ۔“
 ”یہ بیکار کی باتیں کبھی ساتھ بیٹھ کر کریں گے۔ ابھی تو
 یہ بتاؤ کہ بات کیا ہے؟“ ثوبیہ نے بیچ میں ہی اس کی
 بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ وہ سب میں
 تمہیں ابھی نہیں بتا سکتا۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔
 ”اچھا جی ایسا ہے کیا۔“ ثوبیہ چمکی۔

”تم سے ایک کام ہے۔ کر لو گی؟“ اس نے کچھ
 سوچتے ہوئے پوچھا۔

”بے بی تمہارا ایک کیا سارے کام کرنے کو تیار رہوں
 مگر اتنی دور سے کیسے کروں، مجبور ہوں۔“ ثوبیہ دندھے

سادہ لباس میں آنا اور پولیس کی گاڑی کا استعمال مت کرنا۔ وہ بائیک بھی مت استعمال کرنا جس پر پولیس لکھا ہو اور پولیس کے جوتے بھی مت پہننا۔ کریم خان کسی اہجانے شک کی وجہ سے وہاں جا رہا تھا۔ اس لیے وہ کوئی بھی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

”اور کوئی حکم سر!“ چراغ دین نے حیرت سے سنتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ بس میرے آئے تک سب وہاں پہنچ جانے چاہئیں۔ اوکے۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اس نے ہوسٹر میں ریوالور لگایا اور بائیک لے کر فیروز آباد کی طرف دوڑا دی۔ وہ وہاں پہنچ کر لوٹیشن دیکھنا چاہتا تھا۔

میں منٹ بعد وہ اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ اس گلی میں ابھی کنسٹرکشن ہو رہی تھی اور کئی پلاٹ خالی پڑے تھے۔ وہ سفید رنگ کا ہی بنگلہ تھا جس کا صرف گیٹ کالا تھا اور اس پر بھی بڑا سا کالا لگا ہوا تھا۔

اس نے بڑے غور سے آس پاس کا معائنہ کیا اور مطمئن ہونے کے بعد بائیک پر بیٹھ کر سارا گھر اسٹریٹ کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس کی ٹیم اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اس نے ایک نظر اپنی ٹیم پر ڈالی جو اس کی ہدایت کے مطابق سادہ لباس میں تھی۔ پھر اس نے آصف سے کہا۔

”اپنا موبائل مجھے دو۔“

آصف کو کچھ حیرت ہوئی پھر اس نے اپنا موبائل کریم خان کو دے دیا۔ کریم خان اس پر کچھ ٹاپ کرنا رہا پھر موبائل آصف کو واپس دیتے ہوئے بولا۔ ”تم سب کو لے کر اس جے پر پہنچ جاؤ اور کسی کی نظروں میں آئے بغیر اس سفید بنگلے کی ٹکرانی کرو۔ ہم کچھ دیر بعد وہاں پہنچیں گے۔“

”ٹھیک ہے سر! اور کچھ۔“ آصف نے موبائل میں ایڈریس دیکھتے ہوئے کہا۔

”کوئی بھی اس بنگلے میں داخل ہو یا باہر آئے۔ مجھے فوراً اطلاع دینا اور اگر کوئی اس بنگلے سے نکل کر نہیں جائے تو خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے اس کا پیچھا کرنا۔“

کریم خان نے اسی نمبر پر کال بیک کی لیکن موبائل سوچ آف ہونے کی ریکارڈنگ سنائی دی۔ ”آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔ برائے مہربانی تھوڑی دیر بعد کوشش کریں۔ شکریہ۔“

وہ موبائل ایک طرف رکھ کر سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے۔ اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی جو ساڑھے دس بج رہا تھا۔ اسے جو بھی کرنا تھا ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر کرنا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سرفراز کا نمبر ڈائل کیا۔

”السلام علیکم سر!“ سرفراز کی آواز سنائی دی۔

”میں تمہیں ایک نمبر دے رہا ہوں۔ اس کے بارے میں تفصیلی انفارمیشن نکلاؤ اور ہو سکے تو لوکیشن بھی ٹریس کر لو۔“

”اوکے سر! آپ نمبر سینڈ کریں۔“

”ہو سکے تو ایک گھنٹے کے اندر اندر مجھے یہ ساری تفصیل چاہئے۔“

”جی سر! میں کوشش کرتا ہوں۔“ سرفراز نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

اس کے بعد اس نے چراغ دین کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو سر! رات کو ہماری یاد کیسے آگئی۔“ چراغ دین کی شوخ آواز سنائی دی۔

کریم خان نے چراغ دین کو پتہ بتاتے ہوئے کہا۔

”ابھی ابھی مجھے انفارمیشن ملی ہے کہ رات کے بارہ بجے کمال کے چار ساتھی یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ انہیں گرفتار کرنا ہے۔“

”اوکے سر! مگر یہ کمال کون ہے اور کس جرم میں گرفتاری کرنی ہے۔“

”یہ وہی کمال ہے جس کے فنڈ پر نٹ ریکس علی نواز کی پارٹی سے ملے تھے۔“

”اوہ! اس ناچیز کو کیا کرنا ہے۔“ چراغ دین نے حیران ہو کر کہا۔

”تم ٹیم کو لے کر سارا گھر اسٹریٹ پر میرا انتظار کرو۔ میں آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ رہا ہوں اور ہاں تم لوگ

رہتا تھا شاید ساتھیوں میں اس کی عزت کی ایک وجہ یہ بات بھی تھی۔

رکبیس علی نواز کی پارٹی میں دو ایسے لوگوں کے فنلگر پرنٹ پائے گئے تھے جو کسی لاش سے منج نہیں ہو رہے تھے اور ان میں سے ایک کمال کے فنلگر پرنٹ تھے اور کریم خان اس کے ساتھیوں پر نظر رکھ کر کمال تک پہنچنا چاہتا تھا مگر سرفراز کی باتوں نے تو معاملہ ہی کچھ اور کر دیا تھا۔ جس کمال پر اسے شک تھا اس کی لاش وہ صبح ہی دیکھ چکا تھا اور جس نمبر سے انفارمر نے کال کی تھی وہ بھی کمال کا ہی تھا۔

اس نیک بات نے اسے اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا کیونکہ جس طرح سے کوئی ایک کے بعد ایک سارے ثبوت مناتا جا رہا تھا اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے انہیں گرفتار کیے بنا چھوڑ دیا تو ان کا مارا جانا یا پھر غائب ہو جانا یقینی تھا۔

اور یہ بات بھی اسے الجھن میں ڈال رہی تھی کہ کمال کے فون سے اسے کال کرنے والا کون تھا۔ کال کرنے والا ہم از م اعیان تو نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کی آواز تو کریم خان لاکھوں میں بھی پہچان سکتا تھا اور اپنے تجربے کی بنیاد پر اس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ انفارمر نے لہجہ بدلنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اپنی اصلی آواز میں ہی بول رہا تھا۔ خزانفارمر نے کمال کا نمبر ہی کیوں استعمال کیا تھا؟

اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی تھی کہ اسی نے کمال کو قتل کیا تھا اور اب اسی کے نمبر سے اس کے ساتھیوں کے بارے میں اطلاع دی تھی مگر وہ تھا کون اسی بات سے کریم خان سخت جھلاہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔

کیا کمال کا کوئی ایسا ساتھی تھا جو بناوٹ پر آتا تھا اور اسے مارنے کے بعد اب اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی گرفتار کروانا چاہتا تھا یا پھر وہ کمال کا کوئی دشمن تھا۔ جو بھی معاملہ تھا کریم خان کی سمجھ سے باہر تھا۔

اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کریم خان کے لیے کوئی جال بچھا یا گیا ہو۔ یا پھر اسے کسی سازش میں پھنسانے کے لیے بلا یا گیا ہو۔ وہ انہی سوچوں میں مگن تھا

آصف نمیم کو لے کر جانے ہی والا تھا کہ کریم خان نے ایک اور حکم جاری کیا۔ ”سب لوگ اپنے اپنے موبائل واہیریت پر کریں۔“

سب نے ہدایت پر عمل کیا اور چراغ دین کے علاوہ سب وہاں سے روانہ ہو گئے۔

سب کے جانے کے بعد کریم خان نے اپنی بائیک اشارت کی اور چراغ دین کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں آگے پیچھے چل دیئے۔ کچھ دور جانے کے بعد کریم خان نے اپنی بائیک ٹار شہید پارک کے پاس روک دی۔

پارک میں اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ زیادہ تر سنانا تھا۔ وہ ایک طرف گھاس پر آنتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور چراغ دین ابھی بیٹھنے ہی والا تھا کہ کریم خان کا موبائل واہیریت ہونے لگا۔ اس نے اسکرین دیکھی۔ سرفراز کی کال تھی۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو سرفراز!“ دوسری طرف سے سرفراز کی پر جوش آواز آئی۔

”کچھ معلوم ہوا۔“ اس نے ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع کیے بغیر پوچھا۔

”سرفراز! یہ نمبر کمال کا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ کمال وہی شخص ہے جس کی لاش ہمیں صبح کھنڈر میں ملی تھی۔“

”اوہ۔“ پھر وہ بولا۔ ”میں اور چراغ دین ٹار شہید پارک میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تم جلدی سے یہاں پہنچ جاؤ۔“ اس نے لاکن کانٹے کے بعد موبائل میں وقت دیکھا۔ سوا گیارہ ہو رہے تھے۔ اس نے موبائل اپنی جیب میں رکھا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چراغ دین انہی ہونی نظروں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

کریم خان جلد بازی میں گرفتاریاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ان پر نظر رکھ کر کمال کے دوسرے ساتھیوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کی نیم تربیت یافتہ تھی پھر بھی اگر کچھ گزبڑ ہوتی تو وہ ان کے بہت فریب تھا۔

کریم خان کی ایک اور خوبی یہ بھی تھی کہ وہ کبھی اپنی مرضی نہیں چلاتا تھا بلکہ اپنے نیم نمبرز سے بھی مشورے لیتا

کہ اسے سامنے سے سرفراز آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے موبائل میں وقت دیکھا گیا رہنچ کر چھبیس منٹ ہو رہے تھے۔

تھوڑی دیر خاموشی چھانی رہی پھر اس نے سرفراز اور چراغ دین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سازھے دس بجے کسی انجان نمبر سے مجھے ایک کال آئی تھی۔ اس نے مجھے بنگلے کا پتہ سمجھاتے ہوئے بتایا تھا کہ کمال کے چار ساتھی رات بارہ بجے یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ ہم چاہیں تو انہیں گرفتار کر سکتے ہیں۔ اب کچھ دیر پہلے معلوم ہوا کہ جس نمبر سے مجھے کال آئی تھی وہ کمال کا تھا اور کمال کی لاش ہم صبح ہی دیکھ چکے ہیں۔“

”سرفرازی بے رحمی سے کمال کو قتل کیا گیا ہے وہ ضرور بھوت بن گیا ہوگا اور اس کا بھوت چاہتا ہوگا کہ اس کے مارنے والوں کو سزا ملے اسی لیے اس نے کال کی ہوگی۔“

چراغ دین جیسے ضعیف الاعتقاد سے ایسی ہی بات کی امید رکھی جا سکتی تھی۔

چراغ دین کی بات سن کر اتنی پریشانی میں بھی کریم خان کو نہیں آئی۔ اس نے ایک نظر سرفراز پر ڈالی جیسے پوچھ رہا ہو کہ بتاؤ تم کیا کہتے ہو۔

”سرفرازی لگتا ہے کہ کمال کے ہی کسی ساتھی نے اس کا مرڈ کیا ہے۔ اب اسے ڈر ہے کہ اس کے ساتھی اسے کوئی نقصان نہ پہنچائیں وہ انہیں گرفتار کروانا چاہتا ہے۔“

سرفراز نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”وہ کون ہے؟ کون نہیں؟ یہ بعد میں سوچیں گے۔ سوال یہ ہے کہ ابھی ہمیں کیا کرنا ہے۔“

اس سے پہلے کہ چراغ دین یا سرفراز کوئی جواب دیتے اس کا موبائل پھر بج اٹھا۔ اس نے دیکھا اسکرین پر آصف کا نام چمک رہا تھا۔

”ہاں بیلو۔“

”سرفرازی ابھی ایک آئی نیلی مرسدیز میں آیا ہے اور کار باہر ہی کھڑی کر کے وہ بنگلے کے اندر جا چکا ہے۔“

آصف نے رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔

”اوکے۔ ہمارے آنے تک تم لوگ بنگلے سے دور ہی رہو۔ کوئی اور بنگلے میں آئے تو مجھ سے رابطہ کرنا۔“ اس نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔

”ہاں اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔“ اس نے پھر سے وہی سوال اپنے دونوں ساتھیوں کے سامنے رکھا۔

”سرفرازی! اگر وہ سچ سچ کمال کے ساتھی ہیں تو اپن میں سے کوئی بھی سچ کر جانا نہیں چاہئے۔ وہ اس کیس کی گفتیش میں ہمارے بہت کام آ سکتے ہیں۔“ چراغ دین نے اس بات کی بات کی تھی۔

”سرفرازی! چراغ دین کی بات سنا لیں۔ اب ہمیں جلد سے جلد اس بنگلے پر پہنچ جانا چاہئے۔“ سرفراز نے بھی چراغ دین کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

کریم خان کچھ بولنا چاہتا تھا کہ پھر آصف نے کال کیا۔ اس نے بتایا کہ ایک اور آدمی بنگلے میں داخل ہو چکا ہے۔ کریم خان نے نام نہ دیکھا گیا رہنچ کر پچپن منٹ ہو رہے تھے۔ اب اس نے بھی دیر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور گھاس سے اٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ تینوں سفید بنگلے کے پاس پہنچ چکے تھے۔ کریم خان نے نظر دوڑائی تو اس کے ساتھی مختلف جگہوں پر چھپے ہوئے اس بنگلے کی نگرانی کر رہے تھے۔ اس وقت بارہ بجنے ہی والے تھے جب ایک سرخ رنگ کی کار بنگلے کے باہر آ کر رکی جہاں پہلے ہی سے دو کاریں موجود تھیں۔ اس سرخ کار میں سے دو آدمی اتر کر بنگلے میں چلے گئے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ کمال کے چاروں ساتھی اس وقت بنگلے میں پہنچ چکے تھے۔ کریم خان نے اشارہ کر کے اپنی ٹیم کو پاس بلا لیا۔

”پہلے میں بنگلے کے اندر جاؤں گا اور مجھے کور کرتے ہوئے چراغ دین میرے پیچھے آئے گا۔“ پھر اس نے ایک طرف کھڑے تین ممبرز سے کہا۔ ”تم تینوں ایک دوسرے کو کور کرتے ہوئے ہمارے پیچھے آنا۔“ اپنے ساتھیوں کو اس نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں

ان چاروں کے پاس سے جدید ریوالبور برآمد کر لیے گئے۔ ہنگلے کی تلاشی لی گئی مگر انہیں کچھ نہیں ملا۔



انسان سوکھے پتوں کی طرح ہوتا ہے۔ جسے قسمت کی ہوا کب کہاں اڑا لے جائے کوئی نہیں جانتا اور یہ زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔ کبھی کبھی صدیوں تک ایک کے بعد ایک خواب دکھاتی رہتی ہے پھر کسی دن اجانک سب کچھ نکھیر کر رکھ دیتی ہے اور انسان کو اپنے خوابوں کی قبر پر آنسوؤں کے پھول چڑھانے کے لیے زندہ چھوڑ دیتی ہے۔

ایسے ہی کئی خواب زندگی نے ہانیہ کی آنکھوں میں بھی تیار کئے تھے۔ جو پورے ہونے والے تھے یا ٹوٹنے والے تھے۔ کوئی نہیں جانتا۔

اس کی زندگی میں پہلی تبدیلی اس وقت آئی جب اس کے بائی اسکول کا رزلٹ آیا تھا۔ اس نے پورے اسکول میں ٹاپ کیا تھا۔ اس کے ٹھیک چندرہ دنوں بعد اس کے نام ایک خط آیا جسے پڑھ کر اسے پتہ چلا کہ کوئی لڑکا اس سے حد سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔ مگر وہ لڑکا کون ہے۔ کہاں رہتا ہے اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی کیونکہ اس لڑکے نے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

ہانیہ کو وہ خط پڑھنا بہت اچھا لگا تھا۔ وہ روزانہ وہ خط پڑھنے لگی اور خط پڑھتے پڑھتے کب اسے اس لڑکے سے محبت ہوئی وہ خود بھی نہیں جانتی۔

انہی دنوں اس کے پاپا کا تبادلہ دوسرے شہر ہو گیا۔ وہ بہت روٹی بہت چلائی مگر اس کی کسی نے نہیں سنی۔ وہ اپنے محبوب کا شہر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ نئے شہر میں آ کر وہ بروم ادا اس رہنے لگی۔ یہاں کئی لڑکوں نے اس سے دوستی کرنی چاہی مگر اس نے سب کو دھتکار دیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کا محبوب اسے ضرور تلاش کر لے گا۔

ہانیہ نے اپنی گمنام محبت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کیونکہ اگر وہ بتاتی بھی تو لوگ اسے پاگل سمجھ کر اس کا مذاق ہی اڑاتے اور اپنا مذاق بنواتا کسے پسند ہوتا ہے۔

کاروں کے پاس ہی چھپے رہنا اور سرفراز تم ہنگلے کی پچھلی طرف چھپ جاؤ اور آصف تم اس طرف چھپ کر کھڑے ہو جاؤ۔ کریم خان نے سب ساتھیوں کو ان کی پوزیشن سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ہم پر باہر سے بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ان سے سیدھا بھڑنے کی بجائے تم لوگوں کو بس یہ دھیان رکھنا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ہنگلے کے اندر داخل نہ ہونے پائے۔ اندر میں سب سنبھال لوں گا۔ وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر بولا۔ ”چلو سب جلدی جلدی اپنی پوزیشن لے لو۔“ اس کے کہنے کی دیر ہی کہ سب حرکت میں آ گئے۔

وہ ریوالبور ہاتھ میں لے کر ہنگلے کی طرف بڑھنے لگا اور اس کے ساتھی ایک دوسرے کو کور کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے آئے۔ اس نے قریب پہنچ کر اندازہ لگا لیا کہ گیٹ اندر سے لاک نہیں ہے اس نے ہلکا سا دھکا دیا اور گیٹ کھلتا چلا گیا۔

وہ دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ ڈرائنگ روم سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو گیٹ کے پاس ہی رکنے کا اشارہ کیا اور باقی تینوں کے ساتھ آگے چلنے لگا۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ بھی اندر سے بند نہیں تھا۔ شاید انہیں اس طرح کسی کے آنے کی امید ہی نہیں تھی۔ کریم خان نے ایک گہری سانس کھینچ کر دروازے پر زور کی لات ماری اور دروازہ کھلتے ہی وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ اندر موجود چاروں افراد انہیں دیکھ کر ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے اور ان میں سے ایک بولا۔ ”کک..... کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟“

کریم خان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ابھی معلوم ہو جائے گا۔ پہلے اپنے بارے میں تو کچھ بتاؤ۔“ ان کی حیرانی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے کچھ کرنے سے پہلے ہی ان پر قابو پالیا تھا اور جب تک ان کی حیرت دور ہوتی انہیں بے بس کر دیا گیا۔ ورنہ وہ اتنی آسانی سے کریم خان کے ہاتھ آئے ہوتے تھے۔

”اپنے بارے میں کچھ تو بتائیے نا۔“ ہانیہ کا مقصد تو صرف اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ باتیں کرنا تھا۔
 ”کل سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“
 ”مگر مجھ سے کل تک کا انتظار نہیں ہو پارہا ہے۔“
 ”پلیز۔ ابھی مجھے سونے دو۔ بہت سخت خیند آ رہی ہے۔ کل جو دل چاہا ہے پوچھ لینا۔“ یہ کہہ کر دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی۔
 ہانیہ نے اپنا موبائل ایک طرف رکھا اور وہ بھی سونے کی کوشش کرنے لگی۔



کروگے یاد تو ہر بات یاد آئے گی
 گزرتے وقت کی ہر مون چٹھہر جائے گی
 یہ چاند بیٹے زمانوں کا آئینہ ہوگا
 یہ چاند.....

موبائل کی مسلسل بجنے والی بیل نے کریم خان کو خیند کی وادی سے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے آنکھیں بند کئے ہی ادھر ادھر ہاتھ مارا مگر موبائل نہیں ملا تو مجبوراً اس نے آنکھیں کھول دیں۔ موبائل ٹیکے کے نیچے رکھا ہوا تھا جب اس نے موبائل ہاتھ میں لیا تو اس وقت لائن ڈس کنکٹ ہو گئی۔ اس نے کال ہسٹری چیک کی تو اعیان کی دس مس کالیں آ چکی تھیں۔ ابھی وہ اعیان کو کال کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا موبائل پھر سے گنٹانے لگا۔

”ہیلو۔“ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔
 ”ہیلو کو مارو گولی۔ پہلے یہ بتاؤ کال ریسیو کیوں نہیں کر رہے تھے۔ کہیں بھابی کی غیر موجودگی میں کسی اور۔“
 ”کو اس بند کرو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو مجھے۔“
 ”اور تم بھی یہ جان لو کہ تمہیں کال کر کر کے میری انگلیاں بھی دکھنے لگی ہیں۔ تمہیں کچھ احساس بھی ہے اور تم جانتے ہو کہ یہ انگلیاں کتنے کام کی چیز ہوتی ہیں۔ اعیان اپنی عادت کے مطابق شروع ہو چکا تھا۔
 ”سورہا تھا یار۔“ اس نے جمہاہی لیتے ہوئے کہا۔

ہر گزرتے پل کے ساتھ اس کی محبت گہری ہوتی جا رہی تھی اور آخر کار ایک دن اس کا یقین صحیح ثابت ہو گیا۔ پورے نو سال بعد اس کے نام ایک اور خط آیا۔ نئے لفافے میں بند وہ خط ایسا لگتا تھا جیسا آٹھ یا نو سال پہلے لکھا گیا ہو۔ اس سے اگلے دن پھر ایک خط آیا اسے دیکھ کر بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی آٹھ یا نو سال پرانا ہو اور یہ بھی نئے لفافے میں بند تھا۔ دوسرے خط کے بعد اس گناہ محبوب کی کال آئی تو اسے سارے جہان کا خزانہ مل گیا۔ محبوب نے اس کے دیدار کی تمنا پوری کرتے ہوئے اسے ملنے کے لیے بلایا تھا۔ یہ اس کی زندگی کے سب سے زیادہ خوش کن لمحات تھے۔

اس نے دن میں کئی مرتبہ اپنے محبوب کو کال کرنے کے بارے میں سوچا لیکن کال نہیں کر پائی اور آج تو جیسے وقت نے بھی اپنی رفتار انتہائی جیسی کر لی تھی گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ یا شاید ہانیہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جس کے لیے ایک ایک پل کا ٹھنڈیوں برابر لگ رہا تھا۔
 اس رات اسے خیند بھی نہیں آئی اور جب وہ زیادہ ہی بے چین ہوئی تو رات کو ایک بجے کے قریب اپنے محبوب کو کال ملا ہی دی۔ کئی بلیں جانے کے بعد کال ریسیو کی گئی۔
 ”ہیلو۔“ بولنے والے کی آواز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ گہری خیند سے جاگا ہو۔
 ”ہیلو کیسے ہیں آپ؟“ ہانیہ چبکتے ہوئے بولی۔
 ”یہ خیر ریت معلوم کرنے کا کون سا وقت ہے۔“ وہ چڑھ کر بولا۔

”آپ کا نام کیا ہے۔“ ہانیہ نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے ایک اور سوال کر دیا۔
 ”تو اتنی رات کو صرف نام معلوم کرنے کے لیے کال کی ہے۔“ وہ لگ بھگ چیختے ہوئے بولا۔
 ”نہیں بلکہ یہ کہنے کے لیے کہ کل آنا مت بھولنا۔“ وہ معصومیت سے سمجھتے ہوئے بولی۔
 ”ارے میں نے ہی تمہیں بلایا ہے تو میں خود آنا کیسے بھول سکتا ہوں۔“ اس بار اس نے نارمل لہجے میں کہا۔

ابھی بھی اسے بہت گہری نیند آ رہی تھی۔

”کس کے ساتھ۔“

”تمہارے بھوت کے ساتھ۔“ اس نے چڑ کر کہا۔

”پھر بھی ابھی تک زندہ ہو۔ یقین نہیں آ رہا۔“ اس

کے چڑنے کا اعیان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”کل تم فری ہونا۔“ اسے پتہ تھا کہ اعیان کی بکواس

یونہی چلتی رہے گی اس لیے اس نے اپنا ہی سوال کر دیا۔

”یار ابھی میں اتنا بھی فالتو نہیں ہوا ہوں کہ فری میں

بٹنے لکوں۔ چلو تمہاری خاطر بت بھی جاؤں گا۔ پہلے یہ تو

بتاؤ کام کیا ہے۔“

”تم کل اپنی بھابھی کو لینے چلے جاؤ۔ تم جانتے ہو

کہ میں اس کیس میں لٹتا اُلجھا ہوا ہوں۔ ورنہ میں خود

ہی چلا جاتا۔“

”اوہ تو کل بھابھی یعنی تمہاری ہی پرانی بیوی کو واپس

لا تا ہے۔ میں تو سمجھا کہ تم نئی شادی کر رہے ہو۔ میں تو

ابھی کسی نکاح خواں کے پاس بھی جانے والا تھا۔ ویسے تم

فکر مت کرو۔ آج یا کل آپٹیشنل برانچ تم سے یہ کیس لے

لے گی۔ پھر تم ہو گے اور فرصت ہی فرصت۔ آرام سے

لے آنا بھابھی کو۔“

”تمہیں کس نے بتایا۔“ وہ حیران ہوتا ہوا بولا۔

”کس نے بتایا۔ کیسے بتایا یہ مت پوچھو۔ کیونکہ وہ

بات اب گزر گئی۔ مطلب بھوت کال میں چلی گئی اور تم تو

جانتے ہی ہو کہ مجھے بھوتوں سے کتنا ڈر لگتا ہے۔“ اعیان

بناوٹی خوف کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”ہمیشہ الٹی سپر ہی باتیں کرتے رہتے ہو۔ کبھی کوئی

بات ڈھنگ سے نہیں بتا سکتے کیا۔“ کریم خان غصے

سے بولا۔

”بھائی جو پیدا ہی الٹا ہوا ہو۔ اسے تم کیسے

”تم کل ٹو بیہ کو لینے جا رہے ہونا۔“ وہ اعیان کی بات

کو سچ میں ہی کانتے ہوئے بولا۔ وہ جانتا تھا کہ اعیان کی

یہ بکواس کبھی ختم نہیں ہوگی۔

”ارے ہاں بابا۔ کل تمہاری ٹو بیہ کو لینے چلا جاؤں

گا۔“
”تھینکس یار۔“

”اپنے تھینکس کی چٹنی بنا کے ڈبل روٹی یہ لگا کے

کھا لو۔ دوست کو تھینکس بولتے ہو۔ تم میں ذرا سی بھی شرم

حیا ہے کہ نہیں۔ جاؤ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔“

اعیان نے غصہ دکھاتے ہوئے کال کاٹ دی۔ کریم خان

کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑنے لگی وہ جانتا تھا کہ اعیان

بہت بڑا ڈرامے باز ہے۔



”ہانی! بیٹا جلدی سے اٹھ جاؤ۔ ساڑھے نو بجتے

والے ہیں۔“ مٹی کی آوازیں کی اس کی آنکھ کھل گئی۔

”کیا ہے مٹی۔ اتنی صبح کو اٹھا دیا۔“ وہ انگڑائی لیتے

ہوئے بولی۔ مٹی بھی وہ اپنے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔

”آج تمہاری آنٹی کے ہاں جانا ہے۔ پچھلے ایک

مہینے سے تمہارے انکل بلا جا کر تھک گئے ہیں۔ آج

تمہارے پاپا بھی تیار ہو ہی گئے ہیں۔ لیکن تم ہو کہ بستر

چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہو۔“ مٹی نے اسے بستر پر

درازد کہیہ کر پیار سے ڈالتے ہوئے کہا۔

ہانی اپنی مٹی کی بات سن کر گھبرا گئی اور ایک دم بستر سے

اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”اوہ مٹی۔

آنٹی نے اس سٹنڈ کو نہیں۔ اگلے سٹنڈے کو بلایا ہے۔“

”اگلے سٹنڈے کو نہیں۔ آج ہی بلایا ہے۔ صبح سے دو

پار فون بھی کر چکی ہیں۔“ مٹی اس کے چہرے کو عجیب

نظروں سے دیکھ رہی تھی جس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ایسا لگ

رہا تھا جیسے وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔

”کیا مجھے بھی جانا پڑے گا۔“ وہ رو باسی ہو کر بولی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو۔ پچھلے ایک ہفتے سے کوئی

خوش تھی کتا نٹی کے گھر جاؤں گی اور اب۔“

”مٹی آج میرا کیس جانے کا دل نہیں کر رہا۔“ اب وہ

اپنی مٹی کو کیسے بتاتی کتا نٹی اسے اپنے محبوب سے ملنے جانا

ہے پھر آج وہ کہیں اور کیسے جا سکتی تھی۔

”ارے تم چلو تو۔ دل بھی لگ جائے گا تمہارا۔“ مٹی

نے زور دیتے ہوئے کہا۔

”مٹی میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔“ اس نے ایک اور بہانہ بنایا۔

”چلو میں تمہارا سر دبا دیتی ہوں۔ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائے گا۔“ مٹی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

وہ کسی قیمت پر بھی کہیں اور جاتا نہیں چاہتی تھی اس لیے ایک کے بعد ایک بہانہ بنا رہی تھی۔ مگر مٹی نے کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔

”مٹی میری ایک سہیلی کئی برسوں کے بعد باہر سے آ رہی ہے۔ مجھے اس سے ملنے جانا ہے۔ اس لیے آؤ خراکار سے بولنا ہی پڑا۔“

”تو جب سے جھوٹ پہ جھوٹ کیوں بولے جا رہی تھی میں اور تمہارے پاپا جا رہے ہیں۔ شام تک آ جائیں گے۔ کھانا فریج میں رکھا ہے گرم کر کے کھا لینا۔“ مٹی یہ کہتی ہوئی ناراضگی سے اس کے کمرے سے نکل گئی۔

”سوری آئی۔ آپ سے تو کئی بار مل چکی ہوں۔ مگر اپنی زندگی سے پہلی بار ملنے والی ہوں۔ اس سے کیا ہوا وعدہ کیسے توڑ سکتی ہوں۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا اور مسکرائے گی۔



کریم خان نے اعیان کی باتوں کو سبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا وہ جانتا تھا کہ اعیان ایسے ہی ناراض ہونے کا ناکم کرتا ہے اور خود ہی مان بھی جاتا ہے۔ اس نے گھڑی میں ناگم دیکھا ساڑھے نو بج رہے تھے۔

رات کو کمال کے ساتھیوں کی گرفتاری پہنچنے کی سہاٹی اور دوسری کارروائی پوری کرنے میں تین بج گئے تھے اور اسے چار بجے ہی سونا نصیب ہوا تھا۔ اس لیے وہ صبح دیر تک سوتا رہا تھا۔

کمال کے ساتھیوں کے بارے میں سوچ کر وہ خود ہی سینے لگا۔ انہوں نے اتنی تیز رفتاری سے اپنی کارروائی کی تھی کہ بوکھلاہٹ میں وہ بیچارے اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھے اور بکا بکا سے

اپنے ہاتھوں میں پڑی جھکڑیوں کو دیکھ رہے تھے۔ فریض ہونے کے بعد وہ تیار ہو کر آفس پہنچ گیا جہاں چراغ دین اس کے کہمن میں انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ ”انہوں نے کچھ بتایا۔“ اس نے رات کو گرفتار ہونے والوں کے بارے میں پوچھا۔

”جی سر! صرف کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ بتایا ہے۔“ چراغ دین بولا۔

”کیا کیا بتایا۔ اب یہ تم بتاؤ۔“

”سر! ان میں سے ایک کا نام جانوئی ٹی ہے۔ اس کا تعلق کوبرا گینگ سے ہے۔“

”وماٹ... جانوئی ٹی۔ کوبرا گینگ۔ کیا بول رہے ہو۔ صبح صبح نشہ پی کر کتے ہو کیا۔“ کریم خان چلا ہی اٹھا۔ کیونکہ چراغ دین جس گینگ کے بارے میں بتا رہا تھا وہ بہت ہی خطرناک مانا جاتا تھا۔ اور اس گینگ کا دائرہ کار صرف کراچی تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کی دہشت پورے ملک پر مسلط تھی۔

”سر! میں تو پی کے بہک رہا ہوں۔ پوری بات سنیں گے تو آپ کو بن پیئے ہی چڑھ جائے گی۔“ چراغ دین کے لہجے میں ضرور کوئی بات تھی۔

”مگر ہم تو وہاں کمال کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے گئے تھے۔ یہ جانوئی ٹی اور کوبرا گینگ بیچ میں کہاں سے آ گیا۔ کیا کمال بھی کوبرا گینگ سے تعلق رکھتا تھا؟“ اسے اب یہی لگ رہا تھا کہ کمال کا تعلق اسی بدنام زمانہ گینگ سے رہا تھا۔

”یہ معلوم نہیں ہو۔ کا۔“ چراغ دین بولا۔

”تو کیا ہم نے جو گرفتاریاں کی ہیں ان کا کوئی تعلق کمال سے نہیں ہے؟“ اس وقت کریم خان کی حالت دیکھنے لگی تھی۔

”سر! تعلق تو دور کی بات ہے۔ ان میں سے کوئی کمال کو جانتا تک نہیں۔“ چراغ دین نے جواب دیا۔

”جانتا تک نہیں سے کیا مطلب۔ وہ کمال کے ساتھی نہیں ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”جی سر! ان میں سے کوئی بھی کمال کا ساتھی نہیں

ہے۔ ان کو کمال کی تصویر بھی دکھائی گئی مگر انہوں نے کہا کہ اس آدمی کو تو انہوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے اور نہ ہی کمال نامی کسی آدمی کے بارے میں سنا ہے۔

”اس کا مطلب ہے انہوں نے ہمیں غلط اطلاع دی تھی۔“ وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا پھر گویا ہوا۔ ”باقی کے تین کون ہیں؟“

سر دوسرا امان خان ہے جو گولڈن گینگ کے لیے کام کرتا ہے۔ تیسرے کا نام نواز سلیم ہے جو گولڈ گینگ کا آدمی ہے اور چوتھا اجمل ہے جو کس گینگ کے لیے کام کرتا ہے۔ خود اس کو بھی نہیں پتہ۔“ چراغ دین ایک کے بعد ایک ہم کریم خان کے سر پر پھوڑتا جا رہا تھا اور وہ پچھنی پھٹی نظروں سے چراغ دین کو دیکھ رہا تھا۔

اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ جو وہ سن رہا ہے وہ سچ ہے۔ کیونکہ جن گینگ کے نام چراغ دین نے اس کے سامنے لیے تھے وہ تینوں ہی اپنی اپنی جگہ بہت بڑے گینگ تھے اور ان کے بین الاقوامی کنکس کے ساتھ بھی روابط تھے۔ عام آدمی تو ایک طرف سیکورٹی ایجنسیاں بھی ان کنکس کا نام سن کر لرز جاتی تھیں۔ قتل، اسمگلنگ، اغواء برائے تاوان، انسانی اسمگلنگ، انسانی اعضاء کا کاروبار، لڑکیوں کا کاروبار، بلیک میلنگ، اسلحہ کی ترسیل اور منشیات سمیت یہ لوگ ایسی کئی غیر قانونی کارروائیوں میں ملوث تھے۔

کئی ایجنسیاں پچھلے پانچ سالوں سے ان کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں مگر ابھی تک ان کا کچھ نہیں بگاڑا پانی تھیں۔ ان کنکس کے کام کرنے کا طریقہ عام مروجہ طریقہ کار سے یکسر مختلف تھا۔ وہ اپنے ارکان کو فون پر ہدایت دیتے تھے اور ارکان کا کام ان ہدایات پر عمل کرنا ہوتا تھا۔ یہ اتنے خفیہ طریقے سے کام کرتے تھے کہ ایک ممبر کو گینگ کے دوسرے رکن کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں ہوتا تھا۔ بس انہیں ناسک دیا جاتا تھا جسے انہیں پورا کرنا ہوتا تھا۔ انہیں یہ تک پتہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اگر کوئی رکن اپنے گینگ کے بارے میں جانتا تھا تو وہ تھا

صرف اس گینگ کا نام۔ اول تو اس گینگ کا ممبر پکڑا ہی نہیں جاتا تھا اور اگر کبھی کبھار کوئی گرفتار بھی ہو جاتا تھا تو پولیس سے اس کچھ معلوم نہیں کر پاتی تھی۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ ان چاروں کا تعلق الگ الگ گینگ سے ہے۔ کیا وہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔“ کریم خان نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”جب وہ اپنے اپنے گینگ ممبرز کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو ایسے میں الگ الگ گینگ سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”نہیں سر! کل سے پہلے وہ نہ تو آپس میں کبھی ملے تھے اور نہ ہی کبھی بات کی تھی اور تو اور۔ کل سے پہلے وہ ایک دوسرے کا نام تک نہیں جانتے تھے۔“ چراغ دین نے کہا۔

”تم کہتے ہو کہ کل سے پہلے وہ ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ مگر ہم نے ان میں سے دو آدمیوں کو ایک ہی کار میں آتے دیکھا تھا۔“ اس نے اہم سوال چراغ دین پر تھوپ دیا۔

”سر! اجمل اور نواز سلیم ایک ہی کار میں آئے تھے۔ کار اجمل کی ملکیت ہے۔“

”کار کس کی تھی اور کون کون ایک ہی کار میں آیا میں نے پوچھا کیا۔ تم مت جتنا پوچھا جائے اتنا بولا کرو۔ یہ بتاؤ وہ ایک ہی کار میں کیوں آئے جبکہ وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے۔“ کریم خان نے غصے سے کہا۔ عام طور پر وہ کبھی اپنے ماتحتوں پر اس طرح غصہ نہیں کرتا تھا بلکہ ان کی بات بڑے سکون سے سنتا تھا۔ اس لیے چراغ دین اپنی شوخ طبیعت کی وجہ سے کبھی کبھی اس سے مذاق کر لیا کرتا تھا۔ مگر آج کریم خان کچھ زیادہ ہی غصے میں لگ رہا تھا اور اس کا غصے میں آنا فطری عمل تھا کیونکہ بے درپے ہونے والے مختلف واقعات نے اسے گھن پکڑ بنا کر رکھ دیا تھا۔

”سر! ان سب کو ایک دوسرے کی فونو بھیجی گئی تھی تاکہ وہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں اور اجمل کے پاس نے اسے

ان باتوں نے کریم خان کی جھنجھلاہٹ میں اور اضافہ کر دیا تھا اور اس نے اشارے سے چراغ دین کو جانے کا کہا۔
چراغ دین کمرے سے نکل گیا مگر تیس سیکنڈ بھی مشکل سے گزرے ہوں گے کہ وہ کیمین میں آ گیا۔

”ہاں۔ کیا بات ہے؟“ کریم خان نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”سر! ایک بات تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔“

”کون سی بات۔“

”سر! ان سب میں ایک بات مشترک ہے۔“ چراغ دین نے کہا۔

”کون سب میں؟“

”جن چاروں کو ہم نے رات کو اریسٹ کیا تھا۔“

”کیا بات مشترک ہے؟“

”سر! ان سب کی کلائی پر سات نمبر کا عدد گدا ہوا ہے اور ایسا ہی سات نمبر میں نے کمال کی کلائی پر بھی دیکھا تھا۔“ اتنا بتاتا کہ چراغ دین دوبارہ باہر نکل گیا۔

”یہ سات نمبر کا کیا امر ہے۔“ کریم خان نے اپنی پیشانی کو گڑگڑتے ہوئے سوچا۔ آج صبح سے ہی اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔

وہ اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ موبائل کی رینگ سے واپس حقیقت میں کھینچ لائی۔ اس نے اسکرین دیکھی یہ کوئی اور ہی انجان نمبر تھا۔ ”ہیلو۔“ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

”نیشنل ہائی وے پر جو جنگل ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

کریم خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
”کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو۔“

”وہاں تالاب کے پاس جو۔“ دوسری طرف سے کریم خان کی بات پر توجہ دیئے بغیر مزید بولا گیا۔

کریم خان نے بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا اور اس کی بات سچ میں کانتے ہوئے بولا۔ ”تم لوگوں کو کیوں مار رہے ہو۔“

بتایا تھا کہ فواد سلیم کو کس جگہ سے پک کر کے سفید بنگلے پر پہنچاتا ہے۔ اس کی ہی کچھ ہدایات فواد سلیم کو اپنے پاس سے ملی تھیں۔ ”اس بار چراغ دین کا لہجہ مریحیابا ہوا تھا۔“

”مگر ان کے پاس نے ایسا کیوں کیا؟“ وہ بولا۔
”سر! یہ تو ان کو کبھی نہیں معلوم۔ کیونکہ ان کو جتنا بتایا جاتا ہے اسی پر انہیں عمل کرنا ہوتا ہے۔ کچھ پوچھنے کا شان کو حق ہے اور نہ ہی ان کی ہمت۔“ چراغ دین نے جواب دیا۔

”ہوں۔“ وہ ہنکار کر بولا۔ ”یہ معلوم ہوا کہ وہ چاروں سفید بنگلے میں کس لیے جمع ہوئے تھے؟“

”وہاں کوئی پانچواں بھی بیٹھنے والا تھا۔ جو انہیں بتاتا کہ انہیں کیوں بلایا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے ہماری

بھٹک مل گئی ہو اور وہ وہاں نہیں پہنچا۔“ چراغ دین نے کہا۔
”جس طرح ان چاروں کو ایک دوسرے کی تصویر بھیجی گئی تھی تو اس پانچویں فرد کی فونو کھی بھیجی گئی ہوگی؟“ کریم

خان نے ایک اور نکتہ اٹھاتے ہوئے کہا۔
”نہیں سر! اس پانچویں آدمی کے بارے میں انہیں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔“

”تو پھر وہ اسے کیسے پہچانتے؟“
”وہ انہیں کوئی خاص قسم کا کوڈ بتاتا۔“

چراغ دین کی بات سن کر کریم خان پھر چپ ہو کر سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ ”تمہیں کیا لگتا ہے۔ کیا انہوں نے سب کچھ سچ بتایا ہے۔“

”سر! آپ کو کوئی شک ہے۔“ تفتیش سرفراز نے کی ہے۔
”چراغ دین نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر بعد چراغ دین مسکرایا تھا۔“

کریم خان جانتا تھا کہ جب سرفراز تفتیش کرتا تھا تو مردے بھی زبان کھولنے پر مجبور ہو جاتے تھے وہ چاروں تو پھر بھی زندہ انسان تھے۔

”وہ سفید بنگلے کس کا ہے۔“ چراغ دین کے جواب سے مطمئن ہو کر کریم خان نے پوچھا۔

”اس بنگلے کا مالک دو مہینے پہلے ایک حادثے میں ہلاک ہو چکا ہے۔“

کہ ان کا کمال سے کوئی نہ کوئی تعلق رہا ہے۔ جو اس بات کی طرف بھی اشارہ کر رہا تھا کہ وہ چاروں جھوٹ بول رہے ہیں۔

دوسری بات یہ تھی کہ وہ انفارمر کمال کے موبائل سے کال کر رہا تھا جس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی تھی کہ اس کا کمال کے قتل سے کسی نہ کسی طرح تعلق رہا ہوگا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ قتل خود اسی نے کیا ہو۔

کریم خان کو انفارمر کی بات پر کچھ کچھ یقین بھی ہو رہا تھا کیونکہ انفارمر نے بتایا تھا کہ ان سب کا تعلق سیون اسٹار گینگ سے ہے اور کلہاٹیوں پر گدا ہوا ساسات کا عدد اسی بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے سوالات گردش کر رہے تھے جن کا جواب فی الحال اس کے پاس نہیں تھا۔

لیکن ابھی جو انفارمیشن ملی تھی اس پر بھی عمل کرنا تھا۔ کریم خان نے سرفراز کو اپنے یہاں بلایا۔

”سرفراز! معلوم کرو کہ یہ کس کا نمبر ہے اور ہو سکے تو لوکیشن بھی ٹریس کرنا۔“

پھر کچھ دیر بعد اس کی میمیشنٹل ہائی وے کے جنگل میں داخل ہو رہی تھی۔ سب سے آگے کریم خان کی گاڑی تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں اکیلا ہی تھا۔ اس کے باقی ماتحت اس کے پیچھے دو گاڑیوں میں آ رہے تھے۔ تینوں گاڑیوں کی رفتار بہت تیز تھی جیسے انہیں منزل پر پہنچنے کی بہت جلدی ہو۔ لیکن پیچھے والی گاڑیاں کریم خان سے بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔

چند منٹوں کے بعد وہ مطلوبہ کانسٹیبل کے پاس پہنچ چکا تھا جس کے باہر دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ کریم خان نے اپنی گاڑی تھوڑی دور روک کر کانسٹیبل کے گیٹ پر اتر ڈالی۔ اسے کسی کا ہاتھ گیٹ کو بند کرنا دکھائی دیا۔ وہ جلدی سے اپنی گاڑی سے نیچے اتر کر کانسٹیبل کی طرف دوڑنے لگا اور ساتھ ہی ہولسٹر سے اپنا ریولور بھی نکال لیا تھا۔ گیٹ پر پہنچتے ہی اس نے زور سے آلات مار کر گیٹ کھول کے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے فرسٹ فلور سے ایک آدمی کو جنگل کی

مگر دوسری طرف اس بات کا کوئی اثر نہیں لیا گیا۔ بلکہ جہاں بات چھوڑی گئی تھی اس سے آگے بتانے لگا۔ ”کڑی کا بنا ہوا ایک کانسٹیبل ہے۔ اس میں تمہیں۔“

”تم بہرے ہو کیا۔ میں اتنی دیر سے تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔“ اس نے پھر بات کا سنتے ہوئے چیخ کر کہا۔ اس بار وہ اپنے غصے پر قابو نہیں پا سکا تھا۔

”کمال کے پاس شفقت چینی عرف ریڈ 001 کی پیش کش تھی جس کا تعلق سیون اسٹار گینگ سے ہے۔“ دوسری طرف سے پھر کہا گیا۔

اس بار کریم خان نے اس کی بات سنانے میں نہیں کافی۔ جب دوسری طرف سے بات پوری کی گئی تو وہ بولا۔ ”تم ہمیں غلط انفارمیشن کیوں دیتے ہو۔“

”یعنی آپ کو مجھ سے زیادہ ان مجرموں کی باتوں پر یقین ہے۔ تو کرتے رہو۔ میرا کیا جاتا ہے۔“ دوسری طرف سے اتنا کہہ کر ان کا ٹوٹی گئی۔

وہ حیران پریشان بیٹھا کچھ دیر تک بے خیالی میں اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل کو گھورتا رہا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ پہلی بار کی طرح اس مرتبہ اس نے اس نمبر پر کال بیک کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ موبائل سوچ آف کر دیا گیا ہوگا۔

اس نے آواز سنتے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ وہی پہلے والی ہی آواز تھی جس نے اسے سفید بیٹھے کے بارے میں انفارم کیا تھا۔ اس لیے کریم خان نے اس کے بارے میں جاننا چاہا تھا مگر وہ جو بھی تھا بہت ہی کانیاں تھا۔ کریم خان اس سے سوال کرتا رہا اور وہ اپنی ہی بات پوری کرتا رہا اور اس نے کریم خان کی کسی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا اور جواب دیا تو اس کے لیے ہی نئی سوال چھوڑ گیا۔ اب کریم خان کو فیصلہ کرنا تھا کہ کون سچا تھا اور کون جھوٹا۔ وہ چاروں جو بہت ہی بگے مجرم تھے یا یہ انفارمر۔

چراغ دین اسے بتا چکا تھا کہ ان چاروں کی کلانی پر بھی مردہ پائے جانے والے کمال کی طرح ساسات نمبر کا عدد گودا ہوا تھا۔ جس سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی

طرف کھلنے والی کھڑکی سے باہر کودتے ہوئے دیکھا۔ وہ بھی تیزی سے بیڑھیوں کی طرف بھاگا۔

اس کا سارا دھیان اوپر کی طرف تھا۔ اس لیے وہ نیچے نہیں دیکھ پایا اور اس کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ زور سے گراؤ یو الور بھی اس کے ماتھ سے پھوٹ کر دور جاگرا۔

گرتے ہوئے اس کی پیشانی ٹوٹے کی ٹرل سے ٹکرائی جس سے اس کے ماتھے سے خون نکلنے لگا۔ اس کے گھٹنوں میں بھی چوٹ آئی تھی۔ اسے سنبھال کر اٹھنے میں تھوڑا وقت لگ گیا۔ اٹھتے ہی وہ پھر کھڑکی کی طرف بھاگا اور باہر کی طرف چھلانگ لگا دی۔

دوسری طرف ایک چٹان تھی جس کی وجہ سے کھڑکی سے صرف پانچ فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس نے کودنے کے بعد ادھر ادھر دیکھا۔ مگر اسے کسی ذی نفس کا کوئی نام نہ نہ نشان نہیں ملا۔ اس کے گھٹنوں کی چوٹ اس کے مزید تیز بھاگنے میں مانع ثابت ہو رہی تھی اس لیے اس نے جنگل میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔ دوسرا یہ کہ اسے کچھ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ آدمی کس سمت کو بھاگا ہوگا۔ مایوس ہو کر اس نے اپنے قدم واپس کاٹیج کی طرف موڑ لیے۔

چلتے ہوئے اسے کافی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ ہمت کر کے کاٹیج کے سامنے کی طرف آ گیا۔ اس کے ماتحت گاڑیوں سے اتر کر اسی کی سمت آ رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر چیخا۔

”آصف! تم سپاہیوں کو لے کر جنگل کی تلاشی لو۔ ابھی ابھی اس کھڑکی سے کوئی کوہر بھاگا ہے۔“

یہ ہدایت سن کر چراغ دین کے علاوہ باقی سب کریم خان کی بتائی ہوئی سمت کی طرف دوڑ گئے۔

چراغ دین بڑے غور سے کریم خان کے ماتھے کی چوٹ کو دیکھ رہا تھا جس سے تھوڑا تھوڑا خون بھی بہ رہا تھا۔ ”سر! آپ کو یہ چوٹ کیسے لگی؟“

کریم خان نے اسے پوری بات بتا کر جیب سے روماں نکال کر ماتھے کے زخم کو دیا اور پھر اسے ہاندھ لیا اور چراغ دین کو اشارہ کرتا ہوا ایک بار پھر مین گیٹ کی

طرف بڑھنے لگا۔ ابھی انہوں نے کاٹیج کے اندر دوسی قدم رکھے تھے کہ اپنے سامنے کا نظارہ دیکھ کر ٹھنک گئے۔

کریم خان اس آدمی کا پیچھا کرنے کے چکر میں اس لاش پر دھیان نہیں دے پایا تھا اور لاش کی اتنی بری حالت تھی کہ دیکھنے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

ایک کٹنا ہوا سر کرسی پر رکھا ہوا تھا اور باقی جسم کچھ ہی دور زمین پر پیٹ کے بل گرا ہوا تھا۔ اس نے صرف ایک پیٹ ہی پہنی ہوئی تھی۔ جبکہ بالائی دھڑ برہنہ تھا اور پیٹھ کی کھال جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھی اور کھال کے کچھ ٹکڑے اس پاس بکھرے ہوئے تھے اور جس جس جگہ کھال ادھڑی ہوئی تھی وہاں وہاں نمک اور سرچیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ تشدد کی انتہا تھی۔ کریم خان جیسے مضبوط اعصاب کے مالک کی بھی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اسے سیدھا کر کے دیکھے کہ پیٹ کا کیا حال ہے۔

اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ اسے ایک کھڑکی پر پردہ لگا ہوا نظر آیا جسے اس نے ایک جھٹکے سے کھینچ کر اتار لیا اور لاش کے اوپر ڈال دیا۔ وہیں ایک طرف اس کا ربا الور بھی گرا ہوا تھا جسے اس نے اٹھا کر واپس ہوسٹر میں رکھ لیا۔

پھر دونوں نے مل کر پورے کاٹیج کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ کاٹیج میں کافی توڑ پھوڑ نظر آ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے مقتول نے مرنے سے پہلے قاتل کے ساتھ کافی مزاحمت اور مقابلہ کیا ہو اور اس بکھرے ہوئے سامان سے الجھ کر ہی کریم خان گرا تھا۔ ورنہ بھاگنے والا اس وقت اس کی حراست میں ہوتا۔

کریم خان نے سپاہیوں کو جنگل کی تلاشی کے لیے بھیج تو دیا تھا مگر اتنے عین تھا کہ ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگنے کا اور وہ ناکام ہی لوٹیں گے۔ کاٹیج کی تلاشی کے دوران بھی انہیں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جو انہیں کسی قسم کی مدد فراہم کرے۔ بھاگنے والا شخص کون تھا۔ یہ بات بھی کریم خان کو بری طرح الجھا رہی تھی۔ اس کی سوچ یہی بتا رہی تھی کہ وہ انڈر مر تو نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اتنا باطل ہرگز نہیں تھا کہ انہیں خبر دینے کے بعد کاٹیج میں بیٹھ کر ان کا

اب کریم خان کو اپنی بے وقوفی پر افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر کمال بیک نہیں کی تھی کہ انفارمر نے موبائل سوچ آف کر دیا ہوگا اور شاید یہ بات انفارمر بھی جانتا تھا جس کا فائدہ اٹھا کر اس نے موبائل پولیس اسٹیشن کے میدان میں پھینک دیا تھا۔ مگر اس نے یہ کیسے کیا ہوگا۔ اس کی سوچ کو نتیج کی ٹون نے توڑا۔ اس نے دیکھا کہ سرفراز نے ایم ایم ایس کے ذریعے شفقت چینا کی تصویر سینڈ کر دی تھی اور یہ تصویر اسی شخص کی تھی جس کا کٹا ہوا سر اس کے سامنے کرسی پر رکھا ہوا تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ انفارمر سچ کہہ رہا تھا اور اب تک اس نے جو بھی بتایا تھا وہ بھی سب سچ تھا۔ وہ چاروں مجرم کمال کے ہی ساتھی تھے اور یہ شفقت چینا عرف ریڈ 001 ان سب کا باس تھا جس کا تعلق سیون اسٹار گینگ سے تھا۔ اگر ایسا تھا تو اس کی کلائی پر بھی سات کا ہندسہ ہونا چاہئے۔

یہ سوچ کر وہ آگے بڑھا اور لاش کا دایاں ہاتھ اٹھا کر دیکھا اس کی کلائی پر کچھ بھی نہیں تھا پھر اس نے پایاں ہاتھ اٹھا کر دیکھا اس پر سات کا عدد گدا ہوا تھا۔ اب اسے یقین ہو رہا تھا کہ انفارمر نے اب تک انہیں بالکل صحیح معلومات فراہم کی تھیں اور وہ چاروں جھوٹ بول رہے تھے۔

اسی دوران کہیں سے موبائل بچنے کی آواز آنے لگی۔ اس نے غور کیا تو اسے آیا داز لاش کے پاس سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ لاش کے پاس گیا اور پردہ ایک طرف بنایا۔ موبائل اس لاش کی پینٹ کی جیب میں تھا۔ اس نے نمبر دیکھا تو وہ نمبر اسے کچھ جانا پہچانا لگا۔ ”ہیلو۔“ وہ بولا۔

”ہاں ہیلو۔ کون بول رہا ہے۔“ دوسری طرف سے آنے والی آواز کو پہچاننے میں اس نے کوئی غلطی نہیں کی۔

”سرفراز تم۔“ اس نے حیرت سے کہا۔

”سر! آپ... آپ کے پاس یہ نمبر کیسے آ گیا۔“ سرفراز نے بھی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ہمیں شفقت چینا کی لاش کی جیب سے ملا ہے۔“

”مگر تم کو یہ نمبر کہاں سے ملا۔“ وہ ابھی تک حیران تھا۔

انتظار کرتا رہے کہ کب پولیس آئے اور کب وہ بھاگے۔ جبکہ کمال کے قتل میں کریم خان کو پورا یقین تھا کہ اس میں انفارمر کا ہی ہاتھ ہو سکتا تھا۔

وہ ابھی انہی سوچوں میں الجھا ہوا ہی تھا کہ اس کے موبائل پر سرفراز کی کال آ گئی۔

”ہاں سرفراز! کیا خبر ہے۔“ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے پوچھا۔

”سر! یہ نمبر شفقت چینا کا ہے۔“ دوسری طرف سے سرفراز نے بتایا۔

”تم شفقت چینا کی تصویر میرے نمبر پر سینڈ کرو۔“

”اوکے سر! میں ابھی اس کی تصویر آپ کے موبائل پر سینڈ کرتا ہوں۔“ پھر اس سے پہلے کہ کریم خان لائن ڈس کنکٹ کرتا دوسری طرف سے سرفراز چختا ہوا بولا۔

”سر! ایک بات تو سنیں۔“

”ہاں بولو کیا بات ہے۔“

”سر! ہم نے شفقت چینا والے نمبر کی لوکیشن ٹریس کی تھی۔ وہ ہمیں پولیس اسٹیشن کے عقب میں میدان سے ملا ہے۔“ سرفراز نے کریم خان کے لیے ایک اور الجھن کا اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا کہہ رہے ہو تم۔“ وہ تقریباً چلاتے ہوئے بولا۔

”جی سر! ہمارے ہی پولیس اسٹیشن کے عقب والے میدان سے یہ موبائل ملا ہے۔“

”تم نے وہاں آس پاس کسی کو دیکھا؟“

”نہیں سر! وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔“ سرفراز نے بتایا۔

”ٹھیک سے یاد کرو۔ کوئی تو ادھر ادھر سے آ جا رہا ہوگا۔“ کریم خان نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”سر! جب ہم میدان کی طرف جا رہے تھے تو ہم نے ڈی ایس پی زاہد علی کو وہاں سے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے علاوہ پورے میدان میں کوئی بھی نہیں تھا۔“

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد سرفراز نے جواب دیا۔

”اوکے۔ چلو تم شفقت چینا کی تصویر تو سینڈ کرو۔“

اتنا کہہ کر اس نے لائن کاٹ دی۔

میں گھوم کر اسے گھمرا دیا تھا۔
چراغ دین نے لاش کی تلاشی لینے کے چکر میں اسے
سیدھا کر دیا تھا۔ لاش کے پیٹ کی حالت اس کی پٹھ
سے بھی زیادہ بری تھی۔ اتنی بری کہ کریم خان سے بھی
نہیں دیکھی تھی۔

لاش کے پیٹ سے چھ سات جگہوں سے گوشت کی
بونیاں کاٹی گئی تھیں۔ کریم خان نے آگے بڑھ کر پردہ
واپس لاش کے اوپر ڈال دیا۔

پورے کالج کی تلاشی تو وہ لے ہی چکے تھے اب دو
کاروں کی تلاشی باقی تھی جو کالج کے باہر کھڑی تھیں۔ اس
لیے وہ دونوں کالج سے نکل کر کاروں کے پاس آ گئے۔
دونوں کاروں کے دروازے لاک نہیں تھے۔ ایک کار کی
تلاشی کریم خان اور دوسری کی تلاشی چراغ دین لینے لگا۔

”سر! مجھے اس کار سے یہ لفافہ ملا ہے۔“ اسے اپنے
پیچھے چراغ دین کی آواز سنائی دی۔

وہ پیچھے گھوما اور چراغ دین سے وہ لفافہ لے کر کھولا
تو اس میں سے تین سفید لفافے اور برآمد ہوئے۔ اس نے
پہلا لفافہ کھولا تو اس میں کمال کی تین تصاویر تھیں۔ دوسرے
لفافے میں ان چاروں مجرموں کی تصویریں تھیں جو اس
وقت پولیس کی حراست میں تھے۔ جب اس نے تیسرا
لفافہ کھولا تو اس میں موجود تصویریں دیکھ کر اس کی آنکھیں
حیرت سے پھٹی گئیں۔ اس لفافے میں ڈی ایس
بی زاہد علی کی دو تصویریں تھیں۔ چراغ دین بھی ان تصویروں
کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ چھٹا لفافہ اس نے
بزدن اٹھائی تو اسے اپنے ماتحت واپس آتے ہوئے دکھائی
دیئے۔ جو ابھی ان سے کافی فاصلے پر تھے۔

کریم خان نے وہ تینوں سفید لفافے دوبارہ بڑے
لفافے میں ڈال کر چراغ دین کو تھماتے ہوئے کہا۔ ”تم
یہ تصویریں لے جاؤ اور ان کا ذکر سر فرزاد کے علاوہ کسی سے
مت کرنا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی گاڑی کی چابی
چراغ دین کو دی اور وہ فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا۔



”سر! آپ نے رات کو جو نمبر دیا تھا۔ میں نے سوچا
اسے بھی لاش کے دیکھتا ہوں شاید شفقت چینا کی
طرح یہ بھی سوچ آئن مل جائے۔“ سر فرزاد نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے یہ کمال کا نمبر ہے۔“ وہ بولا۔
کیونکہ اس نے رات کو معلومات حاصل کرنے کے لیے
کمال کا ہی نمبر دیا تھا۔

”جی سر!“

”سر فرزاد! تم نے ان چاروں مجرموں سے ان کی کلائی
پر گدے ہوئے سات کے عدد کے بارے میں نہیں پوچھا
تھا کیا؟“ وہ بولا۔

”جی سر! پوچھا تھا۔“

”انہوں نے کیا بتایا تھا؟“

”سر! ایک نے بتایا کہ وہ سات سال سے اس گینگ
کے لیے کام کر رہا ہے۔ پانچ سال پہلے اس کے پاس نے
ایک آدمی کو اس کے پاس بھیجا جس نے اس کی کلائی پر
سات کا عدد گود دیا تھا۔“

مگر اس کے پاس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کی کلائی پر
سات کا بندہ کیوں گدوایا گیا ہے۔ باقی تینوں نے بھی
لگ بھگ ایسے ہی جواب دیئے تھے۔

”اوکے۔“ اس نے لائن کاٹ کر موبائل چراغ دین
کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ”اس لاش کی تلاشی لو اور
دیکھو کہ اس کی جیب سے اور کچھ ملتا ہے یا نہیں۔“

کریم خان کی ہدایت پر چراغ دین نے اچھی طرح
تلاشی کی مگر اس لاش کی جیبوں سے اور کوئی چیز نہیں ملی۔

شفقت چینا کی جیب سے کمال کا موبائل ملنے سے
ایک بات تو واضح ہو رہی تھی کہ اس کا فعل بھی انظار مرنے
ہی کیا تھا۔ کیونکہ یہ موبائل اسی کے قبضے میں تھا جس سے

اس نے گزشتہ رات کریم خان کو فون کیا تھا۔ ویسے اس
انظار مرنے کی ہمت پر اسے سخت حیرت ہو رہی تھی۔ ایک اور
بات بھی واضح ہو رہی تھی کہ کالج سے بھاگنے والا انظار مرنے
نہیں تھا کیونکہ وہ تو اس میدان میں موبائل پھینک رہا
تھا۔ مگر بھاگنے والا کون تھا۔ رہ رہ کر یہ سوال اس کے دماغ

تو لڑکے لڑکیاں بھی آہیں بھرتی تھیں۔ لگتا تھا قدرت نے اسے فرصت میں بنایا تھا اور حسن کی ہر خوبی اس کے انگ میں بھردی تھی۔

کانچ میں ہر دوسرا لڑکا اس کا دیوانہ تھا مگر وہ تو اپنے اس انجان شہزادے کی دیوانی تھی جس کے انتظار میں اس نے اتنے برس گزار دیئے تھے اور آج پورے نو سال بعد ان کے مٹن کی گھڑی آ رہی تھی۔

وہ کافی دیر تک یونہی آکھنے میں اپنے سراپا کو دیکھتی رہی اور پھر خود ہی شرما کر رہ گئی۔ وہاں سے ہٹ کر وہ الماری کے پاس آئی اور ایک لباس نکال کر داش روم میں چلی گئی۔

جب وہ باہر آئی تو اس نے گلابی رنگ سوٹ پہن رکھا تھا جس پر بہت ہی نازک کام کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجامہ اور سفید چار جٹ کا دوپٹہ۔ قدرت نے اسے اتنی خوبصورتی سے نوازا تھا کہ کبھی میک اپ کی حاجت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

میک اپ کے نام پر اس نے آج اپنے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا اور اب وہ اپنے محبوب سے ملنے کے لیے بالکل تیار ہو چکی تھی۔

اس نے مڑ کر وال کلاک میں دیکھا ابھی ایک ہی بجھا تھا۔ یعنی ابھی بھی وصال کی گھڑیاں ختم ہونے میں چار گھنٹے باقی تھے۔ وہ بے ہم ہو کر بینڈ پر بیٹھ گئی اور گھڑی کی سوئیوں کو مچھر مچھا آگے بڑھتا ہوا دیکھنے لگی۔



اب آصف اور باقی سپاہی کریم خان کے نزدیک آ گئے تھے۔

”سر! ہم نے پورا جنگل چھان مارا۔ مگر ہمیں کوئی نہیں ملا۔“

”کوئی بات نہیں تم سب اس کا بیج کی تلاش اس طرح لو کہ ایک سوئی جتنی چیز بھی تمہاری نگاہوں سے بچ نہ پائے۔“ وہ بولا۔

حالانکہ وہ چراغ دین کے ساتھ تلاش لے چکا تھا مگر

مٹی اور پاپا کے چلے جانے کے بعد ہانیہ گھر میں اکیلی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ کچھ دیر تک ٹی وی دیکھتی رہی۔ حالانکہ اس کا دھیان ٹی وی پر بالکل بھی نہیں تھا۔ اس نے بیزار ہو کر ٹی وی بند کیا اور بے مقصد پورے گھر میں ادھر سے ادھر چکرانی رہی۔ مگر آج وقت کی رفتار کل سے بھی زیادہ سست لگنے لگی تھی۔ اسے ایک ایک لمحہ ایک صدی سے بھی طویل محسوس ہو رہا تھا۔

کافی دیر تک چکرانے کے بعد اس نے اپنا لپ ٹاپ آن کیا اور میلز چیک کرنے لگی۔ مگر جلد ہی وہ اس کام سے بھی استغناء اور اس نے لپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کر کے رکھ دیا۔ اس کا آج کسی کام میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی اسے گھیرے ہوئے تھی۔

وہ ہر پانچ منٹ بعد نائم دیکھ رہی تھی۔ لیکن لگتا تھا جیسے وقت بھی اس سے کسی وقت کی ذمہ نگیں نکال رہا تھا۔ گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ایک بار تو اس کے دل میں آیا کہ وہ گھڑی کی سوئیوں کو آگے بڑھا دے۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ کیا ایسا کرنے سے نائم آگے بڑھ جائے گا؟ خدا خدا کر کے کسی طرح دوپہر ہوئی اور اس نے بارہ بجے ہی بیچ لینا شروع کر دیا۔ ویسے عام طور پر وہ دو بجے ہی بیچ کرتی تھی۔ مگر آج تو بات ہی کچھ اور تھی۔ بیچ کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ پھر بے چین ہو کر اٹھی اور قہراً دم آکھنے میں اپنے سراپا کا جائزہ لینے لگی۔

سیاہ بڑی بڑی آنکھیں۔ آنکھوں پر لمبی گھنی چکلوں کا پردہ۔ ایسی آنکھیں جو جیسے دیکھیں اس پر بجلی سی گرا دیں۔ ستواں ناک۔ پتلے پتلے گلابی ریسے ہونٹ اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا رہے تھے۔ چہرہ گول اور بیکے گلابی رخسار جن پر سیاہ تل قیامت ڈھار ہاتھ اور است زنجی کر وہ شعر بالکل سچ ثابت ہو رہا تھا کہ

اب میں سمجھا تیرے رخسار پہ تل کا مطلب
دولتِ حسن پہ دربان بٹھا رکھا ہے
سراتی دار گرن۔ کمر تک لمبے گھنے ریشمی بال۔ غرض
وہ حسن کا چلتا پھرتا شاہ کار تھی۔ ایسا حسن جسے دیکھ کر لڑکے

اپنے اطمینان کے لیے اس نے یہی بہتر سمجھا۔ سب اندر چلے گئے اور وہ کار سے نیک لگا کر پھر سوچ میں پڑ گیا۔

اگر یہ تصویر کار میں انفارمر نے رکھی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ڈی ایس پی زاہد علی بھی سیون اسٹارٹنگ کارکن ہے اور وہ ہمیں اپنے اگلے شکار کے بارے میں پیشگی اطلاع دے رہا ہے۔ یا وہ ہمیں چیلنج کر رہا ہے کہ اگر ڈی ایس پی کو بچا سکتے ہو تو بچالو۔

اور جس طرح پچھلے دو دنوں سے ڈی ایس پی بیماری کا بہانہ کر کے برائے نام ہی آفس آ رہا تھا جبکہ وہ اس کیس میں زیادہ دلچسپی بھی نہیں لے رہا تھا تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی انفارمر ہو۔ وہ شکار سے یا شکاری۔ یہ تو اب اس کی کھانی دیکھ کر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

پوری نیم آدھے گھنٹے سے زیادہ کامیج کی تلاشی لیتی رہی لیکن وہاں کچھ ہوتا تو انہیں ضرور ملتا۔ وہ نامراد باہر نکل آئے۔ اس نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے نتیجہ دی اور شہر آ کر وہ ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے اترتے ہوئے آصف سے بولا۔ ”تم آرنی او جا کر ان دونوں کاروں کی تفصیل نکلاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ مارکیٹ کے اندر چلا گیا جہاں اس نے ایک خوبصورت سی مردانہ رست واقع خریدی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر پولیس اسٹیشن آ گیا۔

اس نے سرفراز سے ڈی ایس پی صاحب کا معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی کہیں گئے ہیں۔ دو تین گھنٹے میں لوٹنے کا کہہ گئے ہیں۔ اب وہ ان کے لوٹنے کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔



بانیہ نظریں نکالنے گھڑی کی سوئیوں کو دیکھتی رہی مگر پانچ منٹ میں ہی بیزار ہو گئی۔ پھر اس نے موبائل نکال کر اپنے محبوب کا نمبر ڈائل کیا۔ ”ہیلو۔ کہاں ہیں آپ؟“ اس نے دوسری طرف سے ہیلو سننے کے بعد کہا۔

”گھر پہ ہی ہوں۔ کیوں۔“

”آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔“

”پوچھو۔“ دوسری جانب سے سرسری انداز سے کہا گیا۔

”آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں نا؟“
”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ہاں بالکل کرتا ہوں۔“

”تو پھر پانچ بجے ہی ملنے کی شرط کیوں لگا رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کی پھر بولی۔ ”اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔“

”ارے بس چار گھنٹے ہی تو باقی ہیں۔ جہاں نو سال انتظار کیا ہے وہاں چار گھنٹے اور سہی۔“ دوسری طرف سے نارمل آواز سنائی دی۔

”ان چار گھنٹوں میں ہم کتنے ہی لمحات ساتھ گزار سکتے ہیں۔ جو آپ کی بے جا ضد کی وجہ سے یونہی ضائع ہو جائیں گے۔“ وہ تڑپ کر بولی۔

بانیہ کی بات سن کر دوسری طرف کچھ خاموشی چھا گئی۔ وہ پھر بولی۔ ”کیا آپ نے کسی عامل سے مبارک گھڑی نکلوائی ہے۔ جو پانچ بجے سے پہلے ملنے کو تیار نہیں ہیں۔“
”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ دوسری جانب سے جھینپی جھینپی سی آواز سنائی دی۔

”تو پھر تیسری بات ہے۔“ وہ اس بار قدرے غصے سے بولی۔ اسے غصہ اس بات پر آ رہا تھا کہ اس کا محبوب اس کی نو سال کی تڑپ کو کسی خاطر میں ہی نہیں لارہا تھا۔

”اچھا بابا غصہ مت کرو۔ میں چند رہیں منٹ میں آتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی۔

اس نے ناٹم دیکھا سوانح رہے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھی اور باہر آ کر گھر لاک کر دیا اور ٹھیک دس منٹ بعد وہ شاہ رکن عالم کے مزار کی ایک بیچ پر بیٹھی اپنے محبوب کا انتظار کر رہی تھی۔

ابھی اسے بیٹھے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ اسے سامنے سے کوئی اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ آنے والے کی عمر چوبیس پچیس کے درمیان ہوگی۔ رنگ سانولا۔ میانہ قد اور عام سا جسم۔

وہ سیدھا بانیہ کی طرف آیا اور بیچ پر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی کیونکہ آنے والا

اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

”سمیر... تم یہاں کیا کر رہے ہو۔“ وہ حیران ہو کر بولی۔ وہ لڑکا کالج میں اس کا کلاس فیلورہ چکا تھا۔

”خود بلا کر کہہ رہی ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔“ سمیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے۔ میں نے تم کو کب بلایا۔“ وہ حیرت سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”یاد کرو۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو تم نے بلایا تھا۔“ سمیر نے کہا۔

”مذاق مت کرو۔ میں بھلا تمہیں کیوں بلاؤں گی۔“ اس بار اس نے تھوڑے تیز لہجے میں کہا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ وہ خط تم کو میں نے ہی بھیجے تھے اور کل کال کر کے مٹنے کا نام بھی میں نے ہی دیا تھا۔“ سمیر کا لہجہ عجیب سا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پریشان ہے یا اکثر جھوٹ بولتے ہوئے ایسا ہوتا ہے۔

”کیا۔ وہ تم ہی ہو۔“ ہانی خوشی سے چلائی اور سمیر سے اپٹ کر رونے لگی۔ سمیر حیران پریشان رہ گیا۔ وہ نہ اسے چپ کر پارہا تھا اور نہ ہی خود سے الگ کر پارہا تھا۔

”ہانی۔ لوگ عجیب نظروں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ پلیز خود کو سنبھالو۔“ سمیر پریشانی سے بولا۔

”دیکھنے دو۔ اب میں تم سے الگ نہیں ہو سکتی۔ تم پھر مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے اور اب میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی۔“ وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے جس محبوب کا اس نے نو سال انتظار کیا تھا وہ اب یہ موقع کیسے گنوائی۔

سمیر نے بڑی مشکوکوں سے اسے چپ کروایا۔ وہ سمیر سے الگ تو ہو گئی تھی مگر سمیر کا ہاتھ ابھی تک اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ سمیر نہیں بھاگ نہ جائے۔

”تم نے مجھے دھوکا کیوں دیا۔“ وہ کچھ دیر بعد نامل ہوئی تو سمیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”دھوکا ارے کیسا دھوکا؟“ سمیر ایسے چونکا جیسے اس

کی چوری پکڑی گئی ہو۔

”ہم چار سال تک کلاس فیلورہ ہے۔ تم پہلے سے مجھے نہیں بتا سکتے تھے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

ہانی کی بات سن کر سمیر نے سکون کی سانس لی اور بولا۔ ”مجھے بتاتا۔ کہاں تم اور کہاں میں۔“

”یہ فلمی ڈائلاگ مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔“ وہ گھورتی ہوئی بولی۔

”میرا مطلب تھا کہاں تم پر یوں سے بھی زیادہ حسین اور کہاں میں کو بے جیسا کالا۔ مجھے تم سے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔“

”آز تم پہلے سے ہمت کر لیتے تو ہم آج ایسے نہ ہوتے۔“

”تو پھر آج ہم کیسے ہوتے۔“ سمیر مسکراتے ہوئے بولا۔

”دو چار بچوں کے ماں باپ ہوتے۔“ وہ شرماتے ہوئے بولی۔

سمیر بھی مسکرانے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔ ”پار تم نے وہ خط بڑے عجیب لکھے تھے۔ تم تو میرا پتہ۔ موبائل نمبر۔ ای میل آئی ڈی سب جانتے تھے۔ پھر ان خطوط میں جھوٹ کیوں لکھا تھا۔“

خط کا نام سنتے ہی سمیر کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔

”کیا سارے سوال آئی ہی کرونی۔ کچھ تو بعد کے لیے بھی بچا کر رکھو۔“

شام کے چار بج رہے تھے۔ ٹو بیہ اپنی اپنی کمرے میں بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے ابو بزنس کے سلسلے میں دو تین دنوں کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔ اس لیے گھر میں اس وقت وہ دونوں ماں بیٹیاں ہی تھیں۔

ٹو بیہ گوری جینی۔ چیکھے نہیں نقشش والی بے حد شوخ حسینہ تھی۔ وہ ہر کسی سے مذاق کر لیتی تھی۔ دوسروں کی نقل اترتا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا

میں بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے ابو بزنس کے سلسلے میں دو تین دنوں کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔ اس لیے گھر میں اس وقت وہ دونوں ماں بیٹیاں ہی تھیں۔

ٹو بیہ گوری جینی۔ چیکھے نہیں نقشش والی بے حد شوخ حسینہ تھی۔ وہ ہر کسی سے مذاق کر لیتی تھی۔ دوسروں کی نقل اترتا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا

میں بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے ابو بزنس کے سلسلے میں دو تین دنوں کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔ اس لیے گھر میں اس وقت وہ دونوں ماں بیٹیاں ہی تھیں۔

شریف تو تھا نہیں کہ خاموشی سے میزبانوں کے رحم و کرم پر گزارتا۔ وہ تو بالکل اپنا گھر سمجھ کر حکم چلا رہا تھا اور یہ ٹوبیہ کے لیے کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ جب بھی ملتا تھا ایسے ہی پیش آتا تھا۔

”مئی کہاں ہیں۔“ اعیان نے پوچھا۔

”مئی۔ کس کی مئی“ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ کیونکہ وہ تو اپنی ماں کو امی کہتی تھی۔

”آپ کی مئی اور کس کی مئی۔ اب میری مئی تو آپ سے اتنی محبت کرتی نہیں جو خدا سے پریشانی لے کر آپ سے ملنے جائیں اور نہ ہی میں کسی فرعون کی مئی کی بات کر رہا ہوں۔ جو تاج گھر کا آرام چھوڑ کر آپ کی خدمت میں پیش ہو۔“ اعیان نے سنجیدہ لہجے میں۔

ٹوبیہ کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی کیونکہ اعیان اتنی زور زور سے بول رہا تھا کہ اس کی آواز سن کر ٹوبیہ کی امی کو اپنے کمرے سے باہر آنا ہی پڑا کہ اتنا شور کون بھارتا ہے۔

ان کو دیکھتے ہی اعیان ان کی طرف لپکا اور ادب سے سلام کیا۔ امی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔ جبکہ ٹوبیہ چن چن میں چلی گئی کیونکہ اسے اعیان کے پیٹ کا کچھ انتظام کرنا تھا اور امی کو ٹوبیہ پہلے اعیان کے آنے کے بارے میں بتا چکی تھی۔

جب اعیان صوفے پر بیٹھ گیا تو امی بولیں۔ ”جیسے ہو بیٹا۔“

”آئی آپ کی دعا سے بالکل ٹھیک ہوں۔“ اعیان نے سر جھکا کر نہایت ہی نرم لہجے میں جواب دیا۔

امی اس سے پوچھتی رہیں اور وہ ہر بات کا سر جھکا کر جواب دے رہا تھا بالکل کسی معصوم بچے کی طرح۔ یہ اس بات کا بھی غماز تھا کہ وہ کتنا ہی شوخ اور شرارتی سہمی لیکن بڑوں کی عزت اور احترام کرنا اس کا فرض ہے۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اپنی بھابھی کے ساتھ اتنی سیدھی بکواس کر رہا تھا۔

کہ کوئی اس سے مذاق مستی میں جیت جائے۔ مگر ایک شخص ایسا تھا جس کے آگے بولنے سے پہلے اسے کئی بار سوچنا پڑتا تھا۔ اور وہ کوئی اور نہیں کریم خان کا دوست اعیان تھا۔ ویسے وہ اعیان کی بہت عزت کرتی تھی اور اعیان بھی اس کا بہت احترام کرتا تھا۔

وہ ادھر ادھر کی باتوں میں لگن نہیں کہ ڈور بیل بجنے لگی۔ وہ اٹھی اور یہ سوچتی ہوئی دروازے کی طرف چل دی کہ اس وقت کون آ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے اعیان کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”آپ۔“ وہ حیرت سے بولی۔ حالانکہ رات کو کریم خان نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اسے لینے کے لیے اعیان کو بھیجے گا مگر وہ آج ہی ٹپک پڑے گا اسے یہ امید نہیں تھی۔

”آپ کے خصم نے بھیجا ہے آپ کو لینے کے لیے اور یہ منہ بند کر لیں ورنہ کھیاں گنگ مار کر دانت توڑ دیں گی۔“ اعیان نے ٹوبیہ کا حیرت سے کھلا منہ دیکھ کر اپنے خاص انداز میں کہا۔

اعیان کی بات سن کر اس نے صحبت سے اپنا منہ بند کر لیا اور پھر بولی۔ ”کیسے ہو۔“

”بہت بھوکا ہوں۔“ اعیان پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

وہ اتنی حیران تھی کہ اس نے اب تک اعیان کو اندمانے کو بھی نہیں کہا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے دروازے کو پکڑے ہوئے تھی اب اعیان بیچارہ اسے دھکیل کر اندر ایسے آتا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ کوئی چارہ نہیں تو وہ آگے بڑھا اور ٹوبیہ کے ایک ہاتھ کو دروازے سے بنا کر اندمانے گیا اور وہ شرمندہ سی دروازہ بند کرنے لگی۔

”سفر کیسار با؟“ اب وہ اپنی حیرت پر قابو پا چکی تھی۔

”بھابھی صاحبہ۔ سفر راستے اور منزلوں کی باتیں بعد میں پہلے کھانے کو کچھ لاؤ۔“ اعیان مسکین سے لہجے میں بولا۔

ظاہر ہے وہ بیچارہ پانچ گھنٹے کا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچا تھا اب بھوک تو لگتی ہی تھی۔ اب اعیان اتنا

نظریوں سے دیکھتا پا کر تو یہ چین کی سانس نہیں لے پا رہی تھی۔

”جینا ابھی تو تم لہا سفر کر کے آئے ہو۔ تھک گئے ہو گے۔ ایک دو دن آرام کر کے پھر اپنی بھابھی کو لے جانا۔“ امی نے کہا۔

”جی ٹھیک ہے آئی۔“ اعیان نے اپنا سر جھکاتے ہوئے کہا۔

اعیان کو امی کی بات ماننا دیکھ کر تو یہ نے سکون کی سانس لی۔

ٹوبیہ نے کریم خان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اعیان کو کم از کم آٹھ دن روکے رکھے گی مگر اعیان تو آج کے دن بھی رکنے کو تیار نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو گھبراہٹ مگر شکر ہے کہ امی نے بات سننا ہی لی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ امی کے ایک بار کہنے پر ہی اعیان نے جانے کا ارادہ منسوخ کر دیا تھا۔

اب ٹوبیہ خوش تھی کہ امی کے کہنے پر وہ دو تین دن تو رک ہی رہا ہے۔ بعد میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر روک ہی لے گی۔ مگر ٹوبیہ کی یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ تھوڑی دیر بعد جب امی کسی کام سے پڑوس میں گئی تو ان کے جاتے ہی اعیان بولا۔ ”چلو بھابھی۔ تیار ہو جاؤ ہم ابھی جا رہے ہیں۔“

”مگر ابھی تو آپ مان گئے تھے کہ دو تین دن بعد جانے کے لیے۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”وہ بات پرانی ہو گئی۔ ہمیں آج اور ابھی گھر چلنا ہے۔“

”مجھے کچھ لینا ہے۔ اس لیے آج نہیں چل سکتی۔ ایسا کرتے ہیں پرسوں چلیں گے۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”کراچی میں دنیا بھر کا سامان مل جاتا ہے اور یہاں سے کہیں زیادہ اچھا۔ آپ کو جو لینا ہے وہیں سے لے لینا۔“ اعیان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جانے کو تیار ہو۔

”وہ..... وہ..... مجھے۔“ اعیان کو اٹھتا دیکھ کر ٹوبیہ

اعیان کی یہی تو خوبی تھی کہ وہ اپنے رویے سے سب کو اپنا بنا لیتا تھا۔ وہ بڑوں سے ملتا تو اچی عزت اور احترام سے پیش آتا کہ وہ اس کے گرویدہ ہو جاتے اور چھوٹے بچوں سے ملتا تو ان کے ساتھ چھوٹا بچہ بن جاتا تھا۔ دوستوں میں بیٹھتا تو اتنا ہی مذاق کرتا تھا کہ ان کا ہنس ہنس کے برا حال ہو جاتا تھا۔

اور جب اسے غصا تا تو وہ تباہی اور فہر کا ایسا دیوتا بن جاتا تھا کہ شیطان کی روح بھی کانپ جائے۔ غرض کہ اس میں انسانوں والی تمام اچھی اور بری خوبیاں موجود تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ٹوبیہ نے ڈانٹنگ نیبل سجادی اور اعیان کے ساتھ امی بھی آ کر ٹیمبل کے گرد بیٹھ گئیں۔ جب ٹوبیہ بیٹھنے لگی تو اعیان نے اسے ٹوک دیا۔

”ارے آپ کہاں بیٹھ رہی ہیں۔ جب تک میں ان چیزوں کے ساتھ انصاف کرتا ہوں آپ اپنا سامان پیک کر لیں۔ بس آدھے گھنٹے کے اندر راند نہیں یہاں سے لکھنا ہے۔“

ٹوبیہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھی وہ گھبرا گئی۔ اسے لگتا تھا کہ کم از کم آج کے دن تو اعیان جانے کی بات نہیں کرے گا۔ وہ کل اسے روکے رکھنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لے گی۔ وہ بوکھلا کر بولی۔ ”اب..... ابھی..... ابھی ہم کیسے جا سکتے ہیں؟“

”میں کار لے کر آیا ہوں۔ اس میں چلیں گے اور کیسے چلیں گے۔ آپ کیا سمجھ رہی ہیں میں آپ کو بیدل لے کر جاؤں گا۔“ اعیان نے ٹوبیہ کے گھبرائے ہوئے چہرے پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”میرا مطلب تھا ابھی ابو باہر گئے ہوئے ہیں۔ دو تین بعد آئیں گے۔ تب چلیں گے۔“ ٹوبیہ کو جلدی میں یہی بہانہ سوچھا۔ وہ اب اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکی تھی۔

”میں انکل کو نہیں آپ کو لینے آیا ہوں۔“ اعیان نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ امی برابر میں بیٹھی ہوئی تھی اس لیے اس نے حتی الامکان اپنا لہجہ ہلکا رکھا تھا۔ مگر اسے گہری

نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا بہانہ کرے۔

”مجھے تو آپ کے ارادے خطرناک لگ رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ مجھے یہاں روک کر مجھے قتل کروانا چاہتی ہیں۔“ اعمیان نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور اس کے چہرے پر بھی سنجیدگی کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

”یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ تو کریم نے کہا تھا کہ آپ کو آٹھ دس دن اپنے پاس روک رکھوں۔ پھر آپ کے ساتھ آ جاؤں۔ اس لیے میں آپ کو روک رہی تھی۔ اور آپ اتنا بڑا الزام۔“ ثوبیہ اپنی بات پوری بھی نہیں کر پائی۔ وہ بالکل رونے جیسی ہوئی تھی۔ اعمیان کا الزام سن کر اس کے پیروں تلے زمین کھسک گئی تھی۔ مگر وہ یہ نہیں سمجھ پائی کہ اعمیان اسے کسے کا رہا ہے۔

”اگر آپ سیدھی طرح بتا دیتیں تو سچ اگلوانے کے لیے مجھے اتنا بڑا الزام لگانے کی کیا ضرورت تھی۔“ اعمیان مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی سنجیدگی غائب ہو چکی تھی۔

اعمیان کا آج ہی واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس نے تو ویسے ہی مذاق میں ثوبیہ سے پیکنگ کے لیے کہہ دیا تھا مگر اس کی بات سن کر جس طرح سے ثوبیہ گھبرا گئی تھی اس سے اعمیان نے اندازہ لگایا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ مگر وہ آنتی کی وجہ سے کچھ زیادہ کہہ نہیں پایا تھا۔ اب آنتی کے جانے کے بعد اس نے ثوبیہ پر الزام کا پہاڑ گرا کر اسے بوکھلا دیا اور اسی بوکھلاہٹ میں وہ سچ بتانی چلی گئی۔ سچ سننے کے بعد اعمیان سات آٹھ دن یہاں آرام سے رہنے کے لیے تیار ہو گیا تھا اور یہ بات اس نے ثوبیہ کو بھی بتادی تھی۔



”مجھے تم مل گئیں۔ سب کچھ مل گیا۔ اب کوئی سوال معنی نہیں رکھتا۔ اب مجھے ایسے سوالوں کے جواب نہیں چاہئیں۔“ ہانیہ نے سمیر کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔ جب سے سمیر یہاں آیا تھا اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کا

ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔

”مجھے بھی تم مل گئی تو سب کچھ مل گیا ہے۔ اب مجھے خدا سے کچھ اور نہیں چاہئے۔“ سمیر نے ہانیہ کے ہاتھ کو ہلکا سا دبا تے ہوئے کہا۔ سمیر کی آنکھوں میں محبت ہی محبت نظر آ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا عام سا چہرہ بھی بہت خاص نظر آ رہا تھا۔

ہانیہ بے خود ہو کر سمیر کو دیکھے جا رہی تھی۔ سمیر تو پہلے سے اپنی پیاسی نظروں کو اس کے دیدار سے سیراب کر رہا تھا۔ دونوں اپنے گرد و پیش سے بے خبر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ بنا پللیں جھپکائے۔ بنا کچھ کہے ہوئے ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبتے رہے ابھرتے رہے۔ وہ پتہ نہیں کتنی دیر تک اسی کیفیت میں کھوئے رہتے کے ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا جوڑا آپس میں کسی بات پر جھگڑنے لگا جن کی تیز آواز سے ان دونوں کی مدہوشی ٹوٹی۔

پہلے ہانیہ ہوش میں آئی اور ہوش میں آتے ہی اس نے سمیر کا ہاتھ چھوڑا اور اپنی پللیں جھپکائیں۔ اس کے چہرے پر شرم کی لالی دوڑنی چلی گئی۔ شرماتے ہوئے وہ کچھ اور خستہ نظر آنے لگی۔ سمیر تو جیسے اس کی اس ادھر پر مڑا تھا۔

”اتنی محبت کرتے ہو مجھ سے۔“ وہ بولی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے بھر آئی تھیں۔ وہ اسے جد سے زیادہ چاہتا ہے اور یہ بات وہ خط پڑھ کر جان چکی تھی مگر وہ اس کی محبت کا اظہار اس کی زبانی سننا چاہتی تھی۔

اب آنسو چاہے خوشی کے ہوں یا غم کے۔ انہیں تو انسانوں کا ساتھ نبھانے کے لیے آتا ہی ہوتا ہے۔

ہانیہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر سمیر تڑپ گیا اور بولا۔ ”اس سے بھی زیادہ۔“ اور کھسک کے ہانیہ کے کچھ اور قریب آ گیا۔ اس نے ہانیہ کی آنکھوں سے ٹونے ہوئے ستارے اپنی پتھلی میں سمیٹے اور انہیں اپنے ہونٹوں سے لگا کر پینے لگا۔

سمیر کی اس حرکت سے ہانیہ کچھ اور شرمائی۔ اس کا جھکا ہوا سر کچھ اور جھکتا چلا گیا۔

حقیقت کی دنیا میں واپس لے آئی۔ اس نے دیکھا۔ کال
سمیر کے نمبر سے آ رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے
موبائل کان سے لگایا۔ ”ہیلو۔“ وہ چمکتی ہوئی بولی۔

”ہیلو۔ کیا آپ ہانیہ بول رہی ہیں۔“ دوسری طرف
سے کسی لڑکی کی آواز آئی۔

”جی ہاں میں ہانیہ بول رہی ہوں۔ مگر آپ کون۔“
اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میں سمیر کی بہن بول رہی ہوں۔ سمیر بھائی کا
ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ہم ان کو نشتر اسپتال لے کر آئے
ہیں۔ سمیر بھائی آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں۔ پلیز آپ
جلدی سے آ جائیں۔“ سمیر کی بہن بہت پریشان اور
گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔



کریم خان ایک بچے سے ڈی ایس پی زاہد علی کا
انتظار کر رہا تھا اور اب پاچ گنج چکے تھے۔ مگر وہ ابھی تک
واپس نہیں آیا تھا۔ گردن منٹ بعد ہی وہ آتا ہوا دکھائی
دیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ تین لوگ اور بھی
تھے۔ زاہد علی نے ان کا کریم خان سے تعارف کروایا وہ
تینوں خفیہ ایجنسی کے آفیسرز تھے۔

”کریم خان! رئیس علی نواز کا کیس اب خفیہ ایجنسی
کے سپرد کر دیا گیا ہے۔“ زاہد علی نے کریم خان کی سوچ پر
ایک اور حملہ کرتے ہوئے کہا۔

”اوکے سر!“ وہ سری ہوئی آواز میں بولا۔ اس کے
لیے یہ ایک بڑا جھٹکا تھا۔

”مگر خفیہ ایجنسی اس کیس پر کام کر رہی ہے۔ یہ بات
تمہارے علاوہ کسی اور کو معلوم نہیں ہونی چاہئے۔“ ڈی
ایس پی نے اسے ایک اور جھٹکا دیا۔

”وہ کیوں سر؟“

”آج کل کے مجرم پولیس سے نہیں ڈرتے مگر ان پر
خفیہ ایجنسی کا رعب ابھی بھی قائم ہے۔ اگر انہیں معلوم
ہو گیا کہ اب یہ کیس خفیہ ایجنسی کے پاس ہے تو وہ چونکا
ہو جائیں گے۔ جبکہ ہم ان کی بے قدری کا فائدہ اٹھانا

”مگر میں شاید تم سے اتنی محبت نہیں کر سکی۔ ورنہ تم
میرے اتنے قریب رہے اور میرے دل کی دھڑکنیں بھی
تمہارے آس پاس ہونے کا احساس ہی نہیں کر سکتیں اور
نہ ہی میری سانسیں بھی تمہارے عشق کی خوشبو کو محسوس کر
سکتیں۔ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں مگر شاید اتنی نہیں
جتنا تم مجھے چاہتے ہو۔“ ہانیہ کہتی رہی۔ اس کی پلکیں شرم
سے بند ہوئے جا رہی تھیں کیونکہ سمیر ایک ٹک اس کے
چہرے کو دیکھے جا رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ سمیر کوئی جواب دیتا اس کے موبائل پر
رنگ بجنے لگی اور وہ موبائل پر بات کرنے لگا۔

”سوری ہانی۔ بہت ضروری کام آ گیا ہے۔ مجھے
ابھی جانا ہوگا۔“ فون سننے کے بعد وہ اٹھ کر جانے کے
لیے کھڑا ہو گیا۔

”ابھی مت جاؤ نا۔“ ہانیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ
پتہ پوچھا دیا۔

”ہانی۔ ابھی مجھے جانے دو۔ اب تو ہم ملتے ہی رہیں
گے۔“ سمیر مسکرا کر بولا۔ آج وہ بہت خوش تھا اور بھلا خوش
کیوں نہ ہوتا چاند سے بھی زیادہ حسین ہانیہ اس سے اتنی
محبت کر رہی تھی۔ وہ اس وقت خود کو دنیا کا خوش قسمت
ترین انسان سمجھ رہا تھا اور بار بار دل ہی دل میں خدا کا شکر
ادا کر رہا تھا۔

”پتھر ملنے کے لیے پتھر نا کیوں پڑتا ہے۔ میں اب
تم سے ایسے لمحے کی ہدائی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔
میں نے کہہ دیا نا کہ تم کہیں نہیں جاؤ گے بس۔“ ہانیہ
ترپ کر بولی۔

کسی نہ کسی طرح سمیر نے بہلا پھسلا کر ہانیہ کو اس
کے گھر روانہ کیا اور خود بھی وہاں سے چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہانیہ اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹی
ہوئی تھی اور آج کی ملاقات کے بارے میں سوچ سوچ
کر مسکراتی تھی۔ آج کا دن اس کی زندگی کا سب سے
خوبصورت دن تھا۔

وہ ابھی خیالوں میں کھوئی رہتی مگر موبائل کی بیل اسے

”نہیں۔“ ہانیہ زور سے چیخی۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اس وقت وہ گھر میں اکیلی تھی ورنہ اس کے امی ابو اس کے چلانے کی وجہ ضرور پوچھتے۔

”بس تھوڑی بہت خراشیں ہی آئی ہیں۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔“ سمیر کی بہن نے ہانیہ کے رونے کی آواز سن کر کہا۔

”نہیں۔ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ آپ کی آواز بتا رہی ہے کہ معاملہ سیریس ہے۔“ ہانیہ روتے روتے بولی۔ ”ارے یقین کریں۔ سمیر بھائی کو بہت معمولی چونٹیں آئی ہیں۔“ اس بار سمیر کی بہن نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ اتنا کہہ کر ہانیہ نے لائن کاٹی اور گھر لاک کر کے پاگلوں کی طرح اپنی کار کی طرف بھاگی اور طوفانی رفتار سے کار دوڑاتے ہوئے اسپتال پہنچ گئی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ کوئی بیچارہ اس کی کار کی زد میں نہیں آیا۔ کیونکہ وہ اس وقت بالکل مدہوشی کے عالم میں ڈرائیونگ کر رہی تھی۔

اپنی کار پارک کر کے اس نے سمیر کا نمبر ڈائل کیا۔ کال سمیر کی بہن نے ریسیو کی اور ہانیہ کو روم نمبر بتا دیا۔ ابھی وہ پانچ چھ قدم ہی چل پائی تھی کہ اس کے موبائل پر کال آ گئی۔ اس نے اسکرین دیکھی اس کی امی کی کال تھی اور وہ اس وقت اس حالت میں نہیں تھی کہ امی کو کچھ بتا پائی اس لیے اس نے موبائل سوچ آف کر دیا۔ ہانیہ اس فلور پر پہنچی جہاں سمیر ایڈمنٹ تھا۔ سمیر کی بہن اسے باہر ہی کھڑی مل گئی۔ وہ جلدی سے اس کے ساتھ روم میں آ گئی جہاں کئی اور لوگ بھی موجود تھے۔

سمیر کے کہنے پر اس کی بہن اور ہانیہ کے علاوہ باقی لوگ باہر چلے گئے۔

”سمیر۔ یہ سب کیسے ہوا۔“ ہانیہ بولی۔ وہ سارے راستے روتی آئی تھی اور ابھی بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

”میں نے تمہیں دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ بس خدا

چاہتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی قیمت پر یہ بات باہر نہیں جانی چاہئے۔“ ڈی ایس پی نے ایک طرح سے اسے جتاتے ہوئے کہا۔

”اوکے سر! یہ بات باہر بالکل نہیں جائے گی۔“ کریم خان نے کہا۔ اس کے علاوہ وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

”اور ہاں۔ جس طرح سے تم اس میں پرکام کر رہے تھے۔ اب نہیں کرو گے۔ لیکن تم اس کیس پر کام کرنے کا صرف دکھاوا کرتے رہو گے۔ باقی کا سارا کام خفیہ ایجنسی خود کر لے گی۔“ ڈی ایس پی سانس لینے کے لیے رکا پھر بولا۔ ”اب انہیں اپنے کیبن میں لے جاؤ اور اب تک کی ساری تفصیل اور پیش رفت انہیں بتا دو۔“

کریم خان کے پاس ڈی ایس پی کی بات ماننے کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ وہ ابھی تک ڈی ایس پی کے دیئے ہوئے جھٹکوں سے ہتھیار نہیں پایا تھا۔

ڈی ایس پی کی کلانی دیکھنے والی بات تو اس کے دماغ سے پوری طرح سے نکل ہی گئی تھی۔

کریم خان ان آفیسرز کو اپنے کیبن میں لے آیا جہاں وہ چار گھنٹے تک اس کا دماغ کھاتے رہے۔

رات کے تقریباً نو بج کر بیس منٹ پر وہ اپنے گھر کے لیے روانہ ہوا اور ابھی وہ گھر کے دروازے کا لاک کھولنے کے لیے چابی نکال ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل پر کال آ گئی۔ اس نے دیکھا کال سرفراز کی تھی۔

”ہیلو سر! سرفراز کی آواز میں پریشانی کی جھلک تھی۔“

”ہاں سرفراز! بولو۔“ کریم خان نے بھی اس کی پریشانی کو محسوس کر لیا۔

”سر! ابھی ابھی مانی کلاچی روڈ پر ڈی ایس پی

صاحب کا ایکسڈینٹ ہو گیا ہے اور انہوں نے موقع پر ہی دم توڑ دیا ہے۔“ سرفراز اور بھی کچھ کہہ رہا تھا مگر اپنے کانوں میں ہونے والی سائیس سائیس کی وجہ سے وہ کچھ سن نہیں پا رہا تھا۔ ڈی ایس پی زاہد علی کی موت کا سن کر اس کا دماغ جیسے کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔



نے اسی کی سزا دی ہے۔“ سیر اپنے ہونٹوں پر ایک درد بھری مسکراہٹ جاتے ہوئے بولا۔

”دھوکا..... کیسا دھوکا کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو تم۔“ سیر کی بات سن کے وہ تڑپ کے بولی۔

”وہ خط جو میں نے تمہیں لکھے تھے۔ وہ دراصل میں نے نہیں لکھے تھے۔ وہ خط مجھے ریلوے اسٹیشن سے ملے تھے۔“ سیر نے سر جھکا کر شرمندگی سے کہا۔

”سیر یہ کون سا موقع سے مذاق کرنے کا۔“ ہانیہ اس کی بات سمجھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں سب سچ سچ بتاتا ہوں۔“ سیر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

سیر کی بات سن کر ہانیہ بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری کرسی پر سیر کی بہن بھی بیٹھ گئی۔ سیر کچھ دیر تک ہانیہ کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر نظر بنا کر کمرے کی چھت کو

گھورتے ہوئے بولا۔ ”یہ لگ بھگ ایک مہینے پہلے کی بات ہے۔ ایک دن میں آفس کے کام سے کوئری جا رہا تھا۔ جب میں پینٹ فارم پر پہنچا تو ایک شخص تیزی سے

بھاگتا ہوا میرے پاس سے لڑا۔ اس کے پیچھے چوبیس پچیس سال کا ایک لڑکا بھاگا آ رہا تھا۔ اس جیسا حسین لڑکا

میں نے زندگی میں پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس لڑکے کا بیگ نیچے گر گیا۔ مگر وہ اس بات سے

بے خبر آگے والے آدمی کے پیچھے بھاگتا چلا گیا۔ وہ بیگ بالکل میرے پاس ہی گرا تھا۔

میں نے وہ بیگ اٹھا اور اس لڑکے کے پیچھے گیا مگر وہ بھیڑ میں نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ میں مایوس ہو کر

وہیں کھڑا اس لڑکے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر جب بہت دیر بعد بھی وہ لڑکا واپس نہیں آیا تو میں نے یہ سوچ کر وہ بیگ

اپنے پاس رکھ لیا کہ اس میں اس کا پتہ ہوا تو کوئری سے واپس آ کر اس تک پہنچا دوں گا۔ مگر جب گھر آ کر میں

نے اس بیگ کو کھولا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اتنا کہہ کر سیر کچھ دیر کے لیے چپ ہوا اور چھت سے نظر بنا کر

ہانیہ کو دیکھا اور پھر اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے دوبارہ

بولنا شروع کیا۔ ”اس بیگ میں وہ دو خط تھے جو میں نے تمہیں بھیجے تھے اور تمہارے اسکول کے زمانے کی بہت

ساری تصویریں تھیں۔ ان خطوط کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ تمہارا ایڈریس بدل جانے کی وجہ سے وہ لڑکا اپنے

خط تم تک نہیں پہنچا سکا تھا۔ ان خطوط کے ذریعے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم اس لڑکے کے بارے میں کچھ بھی نہیں

جانتی۔ میں تمہیں کالج کے زمانے سے بہت چاہتا تھا۔ مگر کبھی اظہار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کیونکہ کالج میں

جس طرح تم گم صم رہتی تھیں اور کسی کولفٹ نہیں کرواتی تھیں مجھے لگتا تھا کہ تم کسی کو چاہتی ہو اور میرا انداز بالکل

درست نکلا۔ ان خطوط کو پڑھ کے مجھے معلوم ہوا کہ تم کے چاہتی ہو۔ ایک بار تو میں نے سوچا کہ وہ بیگ تم تک پہنچا

دوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ سیر بن کر تو میں تمہیں نہیں پا سکتا۔ کیوں نہ وہ انہیں بن کر ہی قسمت آزمائی

جائے۔ میں نے وہ خط جو اس لڑکے نے نو سال پہلے لکھے تھے۔ نئے لفافے میں رکھ کر تمہیں بھیج دیے۔ اور

ایسا میں نے اس لیے کیا کیونکہ نو سال پہلے اس نے تمہیں ایک خط بھیجا تھا اس لیے تم اس کی رائٹنگ کو پہچانتی

ہو گی۔ پھر میں نے اجنبی بن کر تمہیں کالج کی اور میری امید کے مطابق تم میرے جال میں پھنس گئیں۔ مگر کوئی

طاقت تھی جو مجھے ایسا کرنے سے باز رکھ رہی تھی۔ پہلے میں نے اس بات پر دھیان نہیں دیا۔ مگر اس

ایکسڈنٹ کے بعد مجھے ماننا پڑا کہ تم اور وہ لڑکا ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہو۔

جس دن میں نے تمہیں دھوکا دینے کا پکا ارادہ کیا تھا اسی دن میرا سب سے پیارا کتا پی مر گیا۔ جب میں نے

تمہیں پہلا خط بھیجا تو بغیر کسی وجہ کے مجھے جا ب سے نکال دیا گیا۔ کل میں نے تمہیں ایک خط بھیجا اور کالج کی تو

میری کار چوری ہو گئی۔ مگر کل تک میں کچھ نہیں سمجھا تھا کہ میرے ساتھ سب اتنا برا کیوں ہو رہا ہے۔ مگر آج جب

میں تم سے ملا تو آج میرا ایکسڈنٹ ہو گیا اور میں نے اپنی دونوں ناکیں ہمیشہ کے گھوڑی ہیں..... تب مجھے احساس

جانتا۔ اس لیے جیسے ہی اسے دوسرا خط ملا اس نے آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا کہ اسے خط بھیجنے والا اس کا وہی محبوب ہے جس کے لیے وہ تڑپ رہی ہے۔

اور ویسے نجی اگر کوئی شخص پورے نو سال تک پانی کی ایک ایک بوند کے لیے تڑپ رہا ہو اور پھر کوئی اسے ڈھیر سا راپانی دے تو وہ اس بات پر بالکل غور نہیں کرے گا کہ پانی دینے والا اس کا دوست ہے یا دشمن۔ وہ تو سیدھا پانی سے منہ لگائے گا اور پیتا جائے گا۔ اس لیے اگر ہانیہ نے کوئی غلطی کی تھی تو یہ ماننا بھی غلط ہوگا۔ شاید اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ بھی یہی غلطی کرتی۔

حالانکہ وہ سیر کی زبانی یہ جان کر بہت خوش ہوئی تھی کہ اس کا محبوب اسی شہر میں ہے اور جس طرح قدرت اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اسے پوری امید ہونے لگی تھی کہ اس کا محبوب بہت جلد اس سے ملے گا اور ضرور ملے گا۔ اس نے سب کچھ قدرت پر چھوڑ دیا تھا۔ اپنے آپ کو قسمت کے حوالے کر دیا تھا۔ اب قسمت اسے جس طرف لے جا رہی تھی وہ جانے کو تیار تھی۔

ہانیہ گھر پہنچی تو اس کے امی ابو بھی گھر پہنچ چکے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ابو کے پاس ڈیٹیلٹ چایاں تھیں اس لیے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ورنہ وہ اب تک گھر کے باہر کھڑے ہانیہ کا انتظار کر رہے ہوتے۔

گھر میں تھتے ہی اس کی امی نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ایک سہیلی کا ایک سیڈنٹ ہو گیا تھا اس لیے وہ اسپتال گئی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ لگ بھگ ایک گھنٹے تک شاور کے نیچے بیٹھی رہی۔ اب وہ کچھ بہتر محسوس کر رہی تھی۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی تو لیے سے اپنے بال سکھا رہی تھی کہ اس کا موبائل گنگنا نے لگا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو اس کی سب سے پیاری سہیلی ٹوبیہ کی کال تھی۔ ہانیہ نے مسکراتے ہوئے موبائل اپنے کان سے اگالیا۔ ”ٹوبیہ۔ ٹوبیہ۔ کیسی ہو تم۔“

”تمہیں کیا میں جیوں یا مروں۔ میں تمہارے شہر میں

ہوا کہ قدرت بھی تم دونوں کے ساتھ ہے۔ تم دونوں ایک نہ ایک دن ضرور ملو گے۔ میں نے تمہیں بہت بڑا دھوکا دیا ہے۔ ہو سکے تو پلیز مجھے معاف کر دینا۔“ اتنا کہہ کر سیر نے اپنی آنکھیں کھولیں اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگا۔

سیر کی باتیں سن کر ہانیہ کا خون ابل رہا تھا وہ کرسی سے اٹھی اور پوری طاقت سے سیر کے گال پر پھینچ کر دیا۔ پھر اتنی زور کا تھا کہ اس کی آواز کمرے سے باہر بھی سنی گئی۔ اس کے بعد ہانیہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

کچھ ہوش نہیں رہتا۔ کچھ دھیان نہیں رہتا

انسان محبت میں۔ انسان نہیں رہتا

کم از کم ہانیہ کی لکھ لکھ بدلتی حالت کو دیکھ کر یہی کہا جاسکتا ہے۔ شاید وہ ہوش سے کام لیتی تو دھوکا نہ کھاتی۔ مگر وہ عشق ہی کیا جس میں انسان ہوش میں رہے۔ عشق تو کہتے ہی اسے ہیں جو انسان کو بے خود اور بے بس بنائے رکھے۔ عشق انسان کو احساس ہی نہیں ہونے دیتا کہ وہ کیوں کر رہا ہے اور کیا کر رہا ہے۔

اپنی کار میں بیٹھ کر اس نے سیٹ سے پشت نکالی اور گہری گہری سانسیں لے کر اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

ہانیہ کو اس وقت سیر پر نہیں بلکہ اپنے آپ پر غصا رہا تھا۔ سیر نے تو ایک ماہر شکاری کی طرح دوسروں کے دانے پر ایک جال بچھایا تھا۔ بے وقوف تو وہ خود بھی کہ بغیر کسی چھان پھنک کے اس نے مان لیا کہ اسے بلانے والا اس کا محبوب ہے کوئی شکاری نہیں۔ وہ خود ہی دانہ چھٹنے چلی گئی تھی اب اسے پھنسا تو تھا ہی۔

وہ تو قدرت نے اس کا ساتھ دیا کہ سیر کا ایک سیڈنٹ ہو گیا اور اسے پوری سچائی معلوم ہوئی۔ ورنہ جانے کتنے دنوں تک اس کے جھوٹے عاشق کے خول میں چھپا ہوا سانپ سیرا سے ڈستار ہوتا۔

ہانیہ یہی سمجھتی تھی کہ اس خط اور اس کی محبت کے بارے میں اس کے اور اس کے محبوب کے علاوہ کوئی نہیں

ڈی ایس پی زاہد علی کی زندگی کا چراغ ایک سیڈنٹ کی صورت میں ہوا کے تیز جھونکے نے بجھا دیا تھا۔

کریم خان اپنے باس کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ مگر آج صبح جب سے جنگل والے کا بیج کے سامنے کھڑی کار سے ڈی ایس پی کی تصویریں ملی تھیں وہ اس سے ایک عجیب طرح کی نفرت سی محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ ڈی ایس پی یا تو وہ انصار مر ہے جو بڑی بے رحمی سے لوگوں کو مارتا پھر رہا ہے یا پھر وہ سیون اسٹار گینگ کا کوئی ممبر ہے۔ مگر سرفراز کی زبانی ڈی ایس پی زاہد کی مدت کی خبر سن کر اسے بہت دکھ ہوا تھا۔ وہ ہنسنے ہنسنے قدموں سے دوبارہ اپنی گاڑی میں آیا اور اسٹارٹ کر کے مانی کلاچی روڈ کی طرف بڑھا دی۔

وہ جب مانی کلاچی روڈ پر پہنچا تو ٹریفک دور تک جام نظر آ رہا تھا اس لیے اسے اپنی گاڑی کافی پیچھے روکنا پڑی۔ وہ اتر کر گاڑیوں کے بیچ میں پیدل نکلتا ہوا وہاں پہنچا جہاں لوگوں کا جم غفیر جمع تھا۔ کسی طرح لوگوں کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے وہ سب سے آگے آیا تو سامنے دل دہلا دینے والے منظر پر اس کی نظر پڑی۔

روڈ پر کافی دور تک خون کے دھبے جمے ہوئے تھے اور بہت دور تک ڈی ایس پی زاہد کا پسا ہوا جسم روڈ سے چپکا ہوا تھا۔ اس کی چوچالست ہوئی تھی اسے لاش بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ لاش تھی ہی کہاں۔ بس بہت دور تک روڈ پر گوشت لٹھیرے بکھرے ہوئے تھے۔ شاید روڈ پر ملنے والی اس کی ذائقہ اسپورٹس بائیک پھٹے ہوئے کپڑوں اور ایسی ہی چیزوں سے اندازہ لگایا گیا تھا کہ مرنے والا ڈی ایس پی زاہد علی سے ورنہ تو کچھ معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ مرنے والا کون تھا۔ کیونکہ وہاں جسم کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں تھا جو پسنے سے بچ گیا ہو۔

یعنی شہدوں نے بتایا کہ ڈی ایس پی بی بی جیٹی کی جانب سے بہت تیزی سے اسپورٹس بائیک چلاتا ہوا آ رہا تھا اور یہ تو ڈی پارٹمنٹ کے سارے ہی لوگ جانتے تھے کہ زاہد علی کو اسپورٹس بائیک کا کتنا جنون تھا۔ بتانے والوں

آئی ہوئی ہوں اور تم اپنا حسین و جمیل چہرہ دکھانے کے لیے تیار ہی نہیں ہو رہی ہو۔ میں تو ہمت کر کے ایک بار جیسے تیسے تمہارے گھر آ بھی گئی تھی مگر تم نے تو دوستی کو ایک دم ردی سمجھ رکھا ہے۔" ٹوہیہ بولی تو غصے میں بولتی ہی چلی گئی۔

ٹوہیہ واقعی میں ہانیہ سے بہت ناراض تھی۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے اپنے میکے یعنی ہانیہ کے شہر ملتان آئی ہوئی تھی۔ مگر ہانیہ ایک بار بھی اس سے ملنے نہیں آئی تھی۔ جبکہ ٹوہیہ پانچ دن پہلے اس کے گھر اس سے ملنے آئی تھی۔

"ارے میری ماں۔ تم ناراض مت ہو۔ کل میں تمہارے گھر آ رہی ہوں نا۔" ہانیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں آئی نا تو دیکھنا تمہاری نائلیں تو زردوں گی۔ پتہ ہے میں کتنا بور ہو رہی ہوں۔ مگر تمہیں میری کیا فکر ہوگی۔ تم تو اپنی ہی زندگی جی رہی ہو۔" ٹوہیہ بھی غصے میں تھی۔

"اے یار۔ تیری فکر کرنے کے لیے کریم بھائی ہیں نا۔" ہانیہ نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"انہیں بھی اپنی جاب سے فرصت ہو تو میری خبر لیں۔ میرے ماں باپ نے بھی نہ جانے میرے ساتھ کون سے جنم کی دشمنی نکالی ہے جو میری شادی ایک پولیس انسپکٹر سے کروا دی ہے۔"

"تو بھی یار۔ کیا چیز ہے۔ کسی بھی طرح خوش نہیں ہوتی۔"

"اگر تم کل آ گئیں تو میں بھی خوش میرا دل بھی خوش اور شہ میں تو پہلے ہی بتائے دیتی ہوں اپنے دل کو تو خوش ہی رکھوں گی مگر اسنے ہاتھ پیروں کو کھلا چھوڑ دوں گی۔" ٹوہیہ نے بیابانگری و جھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"یار وعدہ کرنی ہوں کل ضرور آؤں گی۔" ہانیہ بولی۔

"اوکے تو پھر باقی باتیں کل ہی کریں گے۔ کال پر زیادہ پیسے خرچ کرنے کا کیا فائدہ۔" اور ہانیہ کا جواب سننے بغیر ہی ٹوہیہ نے لائن کاٹ دی۔



انسان بیچارہ بھی ہواؤں میں جلتے اس چراغ کی مانند ہوتا ہے جسے ہوا کا ایک جھونکا بھی بھی بجھا سکتا ہے۔ آج

”اعیان کی پیدائش بھی وقت سے پہلے ہو گئی تھی
کیا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ ثوبیہ کے اس بے تکے سوال سے
جھلا کر بولا۔

”کیونکہ اعیان صاحب جو آپ کے مطابق کل آنے
والے تھے۔ آج ہی یہاں وارد ہو چکے ہیں۔“ ثوبیہ نے
بنتے ہوئے کہا۔

”کیا واقعی۔ پھر تو یہ پیدائش والا سوال تم اسی سے
پوچھ لو۔“ اعیان کے چہنچہ کی خبر سن کر جیسے ایک اطمینان سا
ہو گیا تھا۔

”کیا آپ نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے جو میں اعیان
سے پوچھوں۔ وہ تو مجھے کچا ہی چبا جائے گا۔“ ثوبیہ
کھٹکھٹاتی ہوئی بولی۔

کافی دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے اور پھر فون بند
کر کے وہ سو گیا۔



کراچی کے علاقے وینفس فیز ۱۷ کے ایک
خوابسورت بنگلے میں ایک تیس پینتیس سال کا آدمی۔ جس
کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ اور جسم پتھری طرح مضبوط لگ رہا
تھا۔ اپنے چہرے کو نقاب میں چھپا رہتا تھا۔

اپنے چہرے کو نقاب میں چھپا کر وہ اس کمرے سے
نکل کر دوسرے کمرے میں داخل ہوا اور سوچ بورڈ کی
طرف بڑھا۔ مگر اس نے کوئی بہن آن کرنے کی بجائے
بورڈ کی ایک خالی جگہ پر اپنی انگلی میں پسینی ہوئی انگلی
لگائی۔ انگلی لگاتے ہی ایک ملکی سی آواز ہوئی اور کمرے
کے ایک کونے کا فرش اپنی جگہ چھوڑنے لگا اور نیچے جاتی
ہوئی سیرھیاں نظر آنے لگیں۔

وہ نقاب پوش سیرھیاں اترنے لگا اور جیسے ہی اس
نے ساتویں زمین پر قدم رکھا اوپر کا فرش آٹو میٹک طریقے
سے بند ہو گیا اور وہ سیرھیاں جو اب تک اندھیرے میں
تھیں روشنی میں چمکنے لگیں۔ نیچے ایک طویل کوریڈور تھا
جس میں کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔

کے مطابق مائی کلاچی اور ایم فی خان روڈ کے سنگم پر موز
کانتے ہوئے بھی اس نے اپنی رفتار کم نہیں کی اور دوسری
جانب سے آنے والی کارنی زد میں آ گیا۔ اس کی ہائیک
ایک طرف جا گری وہ خود بیچ سڑک پر گر گیا اور پیچھے سے
آنے والے ٹرالر کے پہیوں کے نیچے آ گیا اور ٹرالر اسے
بہت دور تک کھینچتا چلا گیا اور صحیح معنوں میں ڈی ایس پی
صاحب اسٹیکر کی طرح سڑک پر چپک کر رہ گئے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر کریم خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
اس سے وہ منظر دیکھا نہیں گیا وہ واپس مڑا اور اپنی گاڑی
میں بیٹھ کر گھر روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر اس نے غسل کیا اور ثوبیہ کو یہ بتانے
کے لیے موبائل پر نمبر ڈائل کیا کہ کل اعیان اسے لینے
آ رہا ہے۔

”ہیلو بے بی۔ کیسے ہو تم۔“ دوسری طرف سے کال
پک کرتے ہی ثوبیہ کی چہنچہ کی آواز آئی۔

”ایک دم مست اور میری جان کیسی ہے۔“ اس نے
زبردستی اپنی آواز کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔ اُس ثوبیہ اس
کی آواز میں پریشانی محسوس کر لیتی تو پھر پوچھ پوچھ کر اس
کا دماغ کھا جاتی۔

”اوه میرے خدا۔ میرے بے بی کو جانے کیا ہو گیا
ہے۔ آج کل مجھ سے جھوٹ ہی بولتا ہے۔ چلو زیادہ
ناگت مت کرو اور یہ بتاؤ کہ اتنے پریشان کیوں ہو۔“
ثوبیہ آخراں کی بیوی تھی۔ نہ بتانے کے باوجود وہ جانے
کس طرح اس کی طبیعت کو پہچان جاتی تھی۔

”یار پولیس کی تو جواب ہی ایسی ہے کہ ہر وقت کچھ نہ
کچھ عجیب ہوتا ہی رہتا ہے۔ خیر چھوڑو۔ میں نے تمہیں
یہ بتانے کے لیے کال کی ہے کہ تمہیں لینے کے لیے کل
اعیان پہنچ جائے گا۔“ اس بار اس کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔
اس بار اس نے اپنے لہجے کو خوشگوار بنانے کی ناکام کوشش
نہیں کی تھی۔

”آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔“

”پوچھو۔“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

اس کی بات سن کر زاہد علی چونک کر بولنے کی خطا کر بیٹھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا۔“

اس کے اتنا کہتے ہی نقاب پوش کی ایک اور زوردار لالت اسے پیٹ پر کھائی پڑی۔ ”سائلے جب تجھے کچھ بولنے کو کہتا ہوں تو چپ رہتا ہے اور چپ رہنے کو کہتا ہوں تو بولنے لگتا ہے۔ تجھے پاگل سمجھا ہوا ہے کیا۔“

اتنا کہنے کے بعد نقاب پوش نے جیب سے ریسمون کنٹرول نکالا اور سامنے دیوار پر لگی ہوئی ایل سی ڈی آن کر دی جس پر ڈی ایس بی زاہد علی کے ایکسیڈنٹ کی نیوز چل رہی تھی۔ یہ دیکھ کر زاہد علی نے چلا کر کہا۔ ”یہ کیا بکواس ہے۔“

”کتے کہنے۔ مجھ پر چلاتا ہے۔“ یہ کہہ کر نقاب پوش نے زاہد علی پر لالتوں اور کھڑوسوں کی برسات کر دی اور تب تک مارتا رہا جب تک وہ چیخ مچ کر بے ہوش نہ ہو گیا۔

زاہد علی تقریباً آدھے گھنٹے تک بے ہوش رہا۔ پھر اسے دھیرے دھیرے ہوش آنے لگا اور تھوڑی دیر میں وہ پوری طرح ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آ چکا تھا۔ ہوش میں آتے ہی اسے اپنے بدن میں ناقابل برداشت تکلیف محسوس ہوئی۔ اس کے منہ سے آہ نکھننے والی تھی جسے اس نے بڑی مشکل سے اپنے دونوں ہونٹ مضبوطی سے بچھو کر اندر ہی روک لیا اور اپنی بند آنکھیں ذرا سی کھول کر دیکھا۔ سامنے ہی وہ نقاب پوش ہاتھ میں ایک ڈنڈا لیے اس کے ہوش میں آنے کا منظر کھڑا نظر آیا۔ نقاب پوش کو دیکھ کر ایک اسی پولیس آفیسر ہوتے ہوئے بھی اس کے پورے بدن میں خوف کی ایک کچھکی سی دوڑ گئی۔ عہدہ اپنی جگہ۔ انسان تو پھر انسان ہوتا ہے اور اتنا تشدد کون برداشت کر سکتا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں دوبارہ بند کر لیں اور بے ہوشی ظاہر کرنے لگا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس پاگل نقاب پوش کو معلوم ہو گیا کہ میں ہوش میں آ گیا ہوں تو مار مار کر میری ہڈیاں تو زڈالے گا۔ مگر اس کی یہ غلط فہمی بھی جلد ہی دور ہو گئی کہ نقاب پوش کو اس کے ہوش میں آنے کا علم نہیں ہے۔

”ابے او تا جائز اولاد۔ یہ تو سکی بند کرور نہ یا آنکھیں جو

کئی راہداریوں سے گزرنے کے بعد وہ نقاب پوش ایک ایسے کمرے میں آیا جہاں ایک شخص لوہے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا بے بس کھڑا تھا۔ یہ بندھا ہوا شخص کوئی اور نہیں بلکہ ڈی ایس بی زاہد علی تھا۔

نقاب پوش اس کے پاس آتا ہوا بولا۔ ”کیا حال ہیں ڈی ایس بی زاہد علی صاحب۔“

”کون ہو تم۔“ زاہد علی نے اس سے پوچھا۔

زاہد علی کا اتنا بولنا بھی جیسے جرم بن گیا۔ نقاب پوش کا ہاتھ اٹھا اور ایک زمانے سے اس کے گال پر پڑا۔ جس سے زاہد علی کون میں بھی تارے نظر آنے لگے۔

”تمہاری یہ ہمت کہ میری بات کا جواب دینے کی بجائے اپنا سوال کر رہا ہے۔“ نقاب پوش نے غصے سے کہا۔

”تم چاہتے کیا ہو۔“ زاہد علی نے پھر پوچھا۔

یہ سنتے ہی نقاب پوش نے ایک زوردار لالت زاہد علی کے پیٹ پر ماری اور تکلیف کے مارے زاہد علی کی چٹخیں نکل گئیں۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کی آستیں اور دوسرے اعضا نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہو۔

”پھر سوال کرتے ہو۔ ایک باری بات سمجھ میں نہیں آتی کیا۔“ وہ غصے سے چلا رہا تھا۔

زاہد علی اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ اگر وہ مزید بولا تو نقاب پوش پھر اس پر تشدد کرے گا۔ مگر اس کا یہ سمجھنا بھی غلط تھا۔ نقاب پوش کچھ دیر تک تو اسے دیکھتا رہا۔ جب زاہد علی کچھ نہیں بولا تو اس نے ایک مکہ اس کی کنبھی پر مارتے ہوئے کہا۔ ”اب خاموش کیوں ہو گئے۔ کچھ بھوکتے کیوں نہیں۔“

نقاب پوش کی بات سن کر زاہد علی کا دماغ پکرا گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ نقاب پوش پاگل اور سکی ہے۔ کیونکہ اگر وہ کچھ بولتا ہے تب بھی مار کھاتا ہے اور خاموش رہتا ہے تب بھی بخشا نہیں جاتا۔

وہ چپ ہی رہا اور کچھ بولنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے چپ دیکھ کر نقاب پوش بولا۔ ”چلو چپ ہی رہو۔ ویسے بھی مردے بولا نہیں کرتے۔“

ٹو بند کر کے کھڑا ہے۔ نکال کر تیرے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔“
 نقاب پوش کی دھمکی سن کر اس نے ایک دم گھبرا کر اپنی
 آنکھیں کھول دیں۔
 ”ٹریڈر تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔ اب میں یہ تم پر چھوڑتا
 ہوں کہ اپنے بدن کی کتنی ہڈیاں تڑوا کر تم سچ بتاتے ہو۔“
 نقاب پوش نے غرا کر کہا۔
 زاہد علی کچھ نہ بول اور نہ ہی اپنے جسم میں پھسل کپڑوں پر
 قابو پا سکا۔

اسے جانتے ہو۔“
 ”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ
 کون ہے۔ اور ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ پولیس کے زیادہ
 تر لوگ تمہارے لیے کام کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تمہیں
 ان سے معلوم ہو چکا ہوتا۔“ زاہد علی نے غصے سے چلا کر
 کہا۔ مگر جب وہ اپنی بات کہہ چکا تو اسے احساس ہوا کہ وہ
 کیا غلطی کر چکا ہے۔ اس نے گھبرا کر نقاب پوش کو دیکھا۔
 اس کا ہاتھ حرکت میں آ رہا تھا۔ جسے دیکھ کر زاہد علی کو اتنا ڈر لگا
 کہ اس جیسے اعلیٰ عہدیدار کا پیشاب خطا ہو گیا۔

”یہ بتاؤ۔ وہ انفارم کون ہے۔“
 ”کک۔۔۔۔۔ کون سا۔۔۔۔۔ ان۔ انفار۔ انفار مر۔“
 زاہد علی ہکلاتے ہوئے بولا۔ خوف کی وجہ سے وہ ٹھیک
 سے بول بھی نہیں پار رہا تھا۔
 ”وہی انفارم جس کی کاہیں آج کل انسپکٹر کریم
 خان کے پاس زیادہ ہی آ رہی ہیں۔“ نقاب پوش کھا
 جانے والے لہجے میں بولا۔

اس کی حالت دیکھ کر نقاب پوش کی ہنسی چھوٹ گئی۔
 اور اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ کافی دیر تک ہنستے رہنے کے
 بعد نقاب پوش بولا۔ ”میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ کچھ
 لوگ وطن کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔ اور کریم خان اور
 اس کی ٹیم کا شمار بھی انہیں وطن پرستوں میں ہوتا ہے۔ اس
 لیے کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔“

”مم۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ آپ کو کک کیسے معلوم
 معلوم ہوا۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ سب۔“ زاہد علی کی حالت نازک ہو
 رہی تھی۔

اتنا کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا اور پھر کہنے لگا۔
 ”اس لیے تمہیں دنیا کی نظروں میں مردہ بنا کر زندہ یہاں
 منگوایا۔ تاکہ تمہاری مدد سے اس انفارم تک پہنچ جاؤں
 گا۔ مگر میرا خیال غلط نکلا۔ تم بھی انفارم کے بارے میں
 کچھ نہیں جانتے۔ خیر اب اپنی دنیا تو تم واپس جا ہی نہیں
 سکتے۔ کیونکہ ان کے لیے تو تم مر چکے ہو۔ اب اگر تم زندہ
 رہنا چاہتے ہو تو میرے لیے کام کرو گے۔ ورنہ۔“ نقاب
 پوش نے اپنی بات اٹھوری چھوڑ دی اور وہاں سے واپس
 چلا گیا۔

زاہد علی یہ سوچ رہا تھا کہ کریم خان نے طارق محمود کے
 قتل کے علاوہ کوئی بات باہر جانے نہیں دی تھی۔ پھر
 انفارم کے بارے میں اس نقاب پوش کو کیسے معلوم ہوا۔
 ”پولیس میں صرف چند لوگ وطن کے لیے کام
 کرتے ہیں۔ باقی سب ہمارے لیے۔“ نقاب پوش نے
 تہہ بہہ لگا کر کہا۔

اس ورنہ کا مطلب زاہد علی اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ وہ
 ورنہ نہیں تھی جو اکثر شہر کی دیواروں پر لکھی ہوتی ہے کہ
 ہمارے لیڈر کو ربا کرو۔ ورنہ۔ ورنہ ہم دوسرا لیڈر ڈھونڈ
 لیں گے۔

”ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ وہ انفارم کون
 ہے۔“ اس بار زاہد علی نے ہکلائے بغیر جواب دیا۔ اب
 تک نقاب پوش نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا اس لیے
 شاید اس کا ذہن کچھ کم ہورہا تھا۔



صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے جب ہانیہ کے ابو
 اسے ٹوبہ کے گھر کے آگے اتار کر آفس چلے گئے تھے۔
 ہانیہ گیٹ کے پاس آئی اور ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔ اتفاق

زاہد علی کی بات سنتے ہی نقاب پوش حرکت میں آیا اور
 اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا پوری طاقت سے زاہد کی
 پنڈلیوں سے ٹکرایا۔ اور پھر وہ غصے سے چلا کر بولا۔ ”مگر
 مجھے کیوں لگتا ہے کہ وہ پولیس کا ہی کوئی آدمی ہے اور تم

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں ثوبیہ کی فرینڈ ہوں۔“ ہانیہ اس نوٹ پر ایک نظر ڈال کر اعیان کی نیلی نیلی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا اور یہ اس کی غلطی تھی۔ جیسے ہی اس کی نظریں اعیان کی نظروں سے ملیں۔ اس کا دل کچھ اتنی زور سے دھڑکا کہ ایک لمحے کو تو اسے ایسا لگا جیسے وہ پسلیوں کو توڑتا ہوا باہر آ جائے گا۔ ہانیہ نے گھبرا کر دوبارہ نظریں جھکا لیں۔

”ثوبیہ کی دوست ہو تو کیا میں اس خوشی میں ڈانس کروں۔“ اعیان باقاعدہ اپنے کو لہے منکا تا ہوا بولا۔ یہ دیکھ کر ہانیہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر وہ اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔ میں ثوبیہ سے ملنے آئی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگی۔

ہانیہ کو کھٹکھٹا کر ہنستا دیکھ کر اعیان کے چہرے پر ایک سکون سا پھیل گیا۔

”میں بھابھی سے پوچھتا ہوں۔ تم باہری رہنا۔ اندر آنے کی کوشش مت کرنا۔ سنا ہے آج کل بھکاری لوگ دن میں گھر کی لوکیشن دیکھ کر جاتے ہیں اور رات کو چوری کرنے آ جاتے ہیں۔ اعیان بولا۔

اعیان کی بات سن کر ہانیہ کی ہنسی کو بریک لگ گئے اور وہ نہ چلا کر اعیان کو دیکھنے لگی۔

”یہ نہیں بھابھی کو بھی کیا ہو گیا ہے کہ اب بھکاریوں سے دوستی کرنے لگی ہیں۔ یہ کہتا ہوا اعیان اندر چلا گیا۔ وہ سپیدھا چکن کی طرف بڑھا کیونکہ اس وقت ثوبیہ چکن میں ہی تھی اور اب تک اعیان کا چہرہ جو نال لگ رہا تھا اس پر ایک دلکش مسکراہٹ آ کر بیٹھ گئی۔ شاید برسوں بعد اعیان کے لبوں پر اتنی شاندار مسکراہٹ پھیلی تھی۔

دوسری طرف ہانیہ کو اب سمجھ میں آیا کہ اعیان اس کی طرف پیسے کیوں بڑھا رہا تھا۔ اس نے اپنے سر پا پر نظر ڈالی۔ بلیک جینز اور بلیو ناپ میں وہ کسی بھی زاویے سے بھکارن نظر نہیں آ رہی تھی۔

”بھابی! آپ سے ملنے آپ کی کوئی فرینڈ ہانیہ آئی ہیں۔“ اعیان چکن کے پاس پہنچتے ہی چلا آیا۔

سے گیت اعیان نے کھولا اور سامنے ہانیہ کو دیکھ کر چونک گیا۔ دوسری طرف ہانیہ کی نظر اعیان پر پڑی تو وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

ہانیہ دل ہی دل میں ہر رہی تھی۔ ”کیا کوئی مرد بھی اتنا حسین ہو سکتا ہے۔“ ہانیہ کو جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے اعیان کو پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔ ایک بار نہیں۔ بار بار دیکھا ہے۔ مگر کہاں دیکھا ہے۔ اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

اعیان بھی پلکیں جھپکائے بنا ہانیہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ ہانیہ کے علاوہ اسے نہ تو کچھ دکھائی دے رہا تھا اور نہ کچھ سنائی دے رہا تھا۔ یہی حالت ہانیہ کی بھی تھی۔ جانے کتنے پل ایسے ہی گزر گئے۔

سب سے پہلے اعیان ہی ہوش میں آیا اور ہانیہ کی کیفیت دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اور اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ہانیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ارے تو اس طرح لائن کیوں مار رہی ہو۔ یہ دس روپے اور یہاں سے نکل لو۔“

اعیان کی آواز سن کر ہانیہ خواب کی سی کیفیت سے باہر نکل گئی۔ وہ اپنی اس کیفیت پر شرمیلی اور گردن جھپکائی۔ اعیان کی بات تو وہ ٹھیک طرح سے ہی نہیں پائی تھی۔ اس لیے چپ کھڑی رہی اور کچھ نہیں بولی۔

”اے لڑکی۔ کیا تم بہری ہو۔“ اعیان ذرا تیز آواز میں بولا۔ اس کے چہرے پر بھی بکا غصہ نظر آنے لگا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں شرارت صاف دیکھی جاسکتی تھی۔

”جی..... جی..... میں ہانیہ ہوں۔“ وہ اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ اس کا دل بار بار اعیان کو دیکھنے کی ضد کر رہا تھا۔ جیسے رو کرتے ہوئے وہ اپنی نظریں زمین پر نکالے ہوئے تھی۔ وہ عجیب سی الجھنوں کا شکار ہو رہی تھی۔

”ہانیہ ہو تو کیا نام کے الگ سے پیسے لوگی۔“ اعیان بولا اور پرس سے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر ہانیہ کی طرف بڑھا دیا۔

”کہاں ہے وہ۔“ تو یہ بچن سے باہر آ کر ادھر ادھر
نظریں دوڑانے لگی۔

”باہر کھڑی ہے۔“ اعیان مسکراتے ہوئے بولا۔

اعیان کی بات سن کر ثوبیہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ
کھولا پھر کچھ سوچ کر بنا کچھ کہے باہر کی طرف لپکی اور
ہانیہ کو لے کر اندر آ گئی اور دونوں ڈرائنگ میں آ گئیں۔
اعیان بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

”ہانیہ! ان سے ملو یہ ہے کریم کا جان سے بھی پیارا
دوست اعیان۔ اور اعیان بھائی یہ میری بیسٹ فرینڈ
ہانیہ۔“ ثوبیہ نے دونوں کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

”ہانیہ تم تو بھابی سے ملنے آئی تھیں نا اور کمال ہے ابھی
تک نہیں ملیں۔ اوہ! شاید تم کو ملنا نہیں آتا۔ چلو کوئی بات
نہیں۔ میں سکھاتا ہوں۔“ اعیان نے کہا اور ہانیہ کی
طرف بڑھنے لگا۔

ثوبیہ اور ہانیہ دونوں ہی اعیان کی بات کا مطلب
سمجھنے سے قاصر تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں کچھ سمجھ
پاتیں۔ اعیان نے قریب پہنچ کر ہانیہ کو اپنی ہانہوں میں
لے لیا۔

اعیان کی ہانہوں میں آتے ہی ہانیہ کو اپنے اندر ایک
سکون سا اثر تا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اپنا سر اعیان کے
چوڑے اور مضبوط سینے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور
خود بخود ہی اس کے ہاتھ اعیان کی کمر کے نزدیک اور
نزدیک آتے گئے۔ اس سے پہلے کہ ہانیہ اسے خود سے
چپکا لیتی اعیان نے اسے خود سے الگ کیا اور صوفے پر
جا کر بیٹھ گیا۔

ہانیہ جو اعیان کی ہانہوں میں بے انتہا خوشی محسوس کر
رہی تھی اور خدا سے دعا کر رہی تھی کہ اعیان اب پوری
زندگی اسی طرح اسے اپنی ہانہوں میں بھر کر رکھ رہے اور
وہ اسی طرح اپنا سر اس کے سینے سے نکالے اور اپنی
آنکھیں بند کیے پوری ایسی ہی گزار دے۔ اسے اعیان کا
اپنی ہانہوں سے آزا کرنا بہت برا لگا۔ اسے بہت تیز غصہ
آنے لگا اور ذرا ہی دیر میں غصے کی لالی اس کے چہرے پر

پھیل گئی۔

اعیان کی اس حرکت پر ثوبیہ بھی بوکھلا گئی تھی اور ہانیہ
کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھ جلدی سے بات کو سنبھالتے
ہوئے بولی۔ ”ارے اعیان بھائی کی تو عادت ہے مذاق
کرنے کی۔ تم برامت ماننا۔“

ثوبیہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اعیان کی اس حرکت پر ہانیہ کو
بہت غصا رہا تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ ہانیہ کو غصہ پکڑنے پر
نہیں بلکہ چھوڑنے پر آ رہا تھا۔ ثوبیہ آگے بڑھی اور ہانیہ کا
ہاتھ پکڑ کر سامنے والے صوفے پر بٹھاتے ہوئے بولی۔
”تم دونوں باتیں کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ یہ بولتے
ہوئے ثوبیہ بچن میں چلی گئی۔

”ایک بات تو ہے۔ غصے میں تم اور زیادہ خوبصورت
لگتی ہو۔ بالکل کشمیری سی۔ جیسی۔ دل کرتا ہے کھا
جاؤں۔“ اعیان نے ہانیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال
کر بڑے رومانوی لہجے میں کہا۔

ابھی وہ اعیان کی بات کا جواب دینے کے پارے
میں سوچ ہی رہی تھی کہ اسے سامنے سے آنٹی آتی ہوئی
نظر آئی۔ اور اس نے کوئی جواب دینے کا ارادہ ترک کر
دیا اور آنٹی سے بولی۔ ”سلام آنٹی۔ کیسی ہیں آپ۔“

پھر بہت دیر تک ہانیہ اور آنٹی آپس میں باتیں کرتی
رہیں۔ اس دوران اعیان صوفے سے سر نکالے یوں
آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوا تھا جیسے ان دونوں کی بور باتوں
سے اسے فیندا آنے لگی ہو۔

ہانیہ آنٹی سے باتیں کرتے ہوئے بار بار ان سے
نظریں بچا کر اعیان کو دیکھے جا رہی تھی۔ ایک بار آنٹی کی
کسی بات کا جواب دیتے ہوئے اس نے اعیان پر نظر
ڈالی۔ اتفاق سے اعیان نے بھی اسی لمحے اپنی آنکھیں
کھول دیں۔ دونوں کی نظریں ایک پل کے لیے آپس
میں ملیں۔ ہانیہ اپنی چوری پکڑے جانے پر گھبرائی اور
جلدی سے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ہانیہ کی اس حرکت پر اعیان مسکراتا رہا پھر بولا۔ ”ہانیہ
آپ کیا کرتی ہیں۔“

”پاپا“ کہہ کر اعیان سے لپٹ گیا۔ اعیان نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں تھاما اور بڑی محبت سے اس کے ماتھے اور گالوں کو چومنے لگا۔

اس بچے کے منہ سے پاپا سن کر ہانیہ کو اپنے دل کی دھڑکنیں رکتی ہوئی سی محسوس ہونے لگیں اور سانس بھی بہت ہلکے ہلکے چل رہی تھی۔ ایک ہی پل میں اسے ایسا لگنے لگا جیسے وہ صدیوں کا سفر طے کر کے آئی ہو اور بہت تھک چکی ہو۔ اس کی آنکھیں رونے کے لیے بے تاب ہو رہی تھیں جسے اس نے بڑی مشکل سے روکا۔

اب وہ کس کی شکایت کر سکتی تھی اور کرتی بھی تو کیا کرتی۔ شکایت تو اسے اپنی قسمت سے تھی۔ جس میں قدرت نے صرف غم ہی غم لکھے تھے۔ کوئی خوشی ملتی بھی تو پل بھر کے لیے اور پھر اسے رورور کران خوشیوں کا قرض اتارنا پڑتا تھا۔

ہانیہ نے آج پہلی بار اعیان کو دیکھا تھا۔ وہ ٹوبیہ کی شادی میں نہیں جا سکی تھی۔ کیونکہ شادی سے ٹھیک ایک دن پہلے اس کی نالی کا انتقال ہو گیا تھا۔ ورنہ شاید چھ مہینے پہلے ہی وہ شادی میں اعیان سے مل چکی ہوتی۔

اعیان کو دیکھتے ہی اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ اسے صدیوں سے جانتی ہے۔ اسے اعیان کا مذاق اس کا چھیڑ چھاڑ کرنے کا انداز بہت اچھا لگا تھا۔ اگر کوئی اور اس سے ایسی باتیں کرتا تو وہ اس کا سر پھوڑ دیتی۔ صبح جب سے اس نے اعیان کو دیکھا تھا وہ اپنے اس محبوب کو بھی بھول گئی تھی جس کے انتظار میں اس نے نو سال تڑپ تڑپ کر گزارے تھے۔

شاید اعیان کی خوبصورتی اسے اعیان کا دیوانہ بنا رہی تھی۔ مگر اب اسے معلوم ہوا کہ اعیان نہ صرف شادی شدہ بلکہ ایک بچے کا باپ بھی ہے۔ وہ بچہ بالکل اعیان کی کاپی تھا۔ اعیان کی جیسی ہی نیلی نیلی آنکھیں۔ ہو بہو اعیان جیسا چہرہ۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کمرے میں ایک نہیں دو اعیان موجود ہوں۔ ایک چھوٹا اعیان اور ایک بڑا۔ مگر وہ بچہ خوبصورتی میں اعیان سے کہیں کم تھا۔ اعیان ابھی تک

”میں ایک سو فٹ ویئر انجینئر ہوں۔ مگر پچھلے مہینے اپنی جاب چھوڑ چکی ہوں اور آپ کیا کرتے ہیں۔“ ہانیہ نے اعیان کی بات کا جواب دے کر اپنا سوال کر دیا۔

ہانیہ حیران تھی کہ کبھی وہ اس سے ٹو تزاک سے بات کر رہا ہے تو کبھی آپ جناب ہے۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ کرگٹ کی طرح پل پل رنگ بدلتا ہے بے انتہا خوبصورت شخص ہانیہ کو قدم قدم پر حیرت میں ڈال رہا تھا۔

”میں بھی فی الحال آپ کی طرح جاب لیس ہی ہوں۔“ اعیان نے بڑے ہی شائستہ لہجے میں کہا۔

ٹوبیہ اپنے ہاتھوں میں ناشتے کی نرے لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ پھر سب نے ساتھ مل کر ناشتہ کیا اور کافی دیر تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد ہانیہ اور ٹوبیہ کچن میں چلی گئیں اور اعیان وہیں بیٹھا آئی سے باتیں کرتا رہا۔

باتوں ہی باتوں میں کب لہج کا وقت ہو گیا یہ ہی نہیں چلا۔ آج کا لہج ہانیہ اور ٹوبیہ نے مل کر بنایا تھا۔ شام کے وقت ٹوبیہ کے کہنے پر اعیان نے کار نکالی اور ہانیہ کو اس کے گھر چھوڑنے کے لیے راضی ہو گیا۔ وہ چپ چاپ ڈرائیونگ کر رہا تھا جبکہ ہانیہ بے چینی سے بار بار اعیان کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر اعیان کو خاموش دیکھ کر اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

اچانک اعیان نے اپنی کار ایک اسکول کے آگے روکی اور کار سے اتر کر اسکول میں جانے لگا۔ ہانیہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہوئی۔ اندر آ کر اعیان اسکول کی پرنسپل کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ہانیہ باہر ہی کھڑی ہوئی۔ اعیان نے پرنسپل سے کچھ باتیں کیں اور پرنسپل نے ان دونوں کو وینٹ روم میں بھیج دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ایک بہت پیارا سا بچہ بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر اعیان کرسی سے اٹھا اور گھٹنے زمین پر ٹکا کر ہانسیں پھیلا دیں۔ وہ بچہ

بچے کے گالوں کو چوم رہا تھا۔
 ”پاپا۔ مئی نہیں آئیں۔“ بچے نے اعیان سے کہا۔
 ”بیٹا مئی ابھی بڑی ہیں۔ اگلی بار آئیں گی۔“ اعیان نے
 پیار سے بچے کے چھوٹے چھوٹے باموں میں ہاتھ
 پھیرتے ہوئے کہا۔

”پاپا مجھے مئی کی بہت یاد آتی ہے۔“
 ”اور پاپا کی یاد نہیں آتی آپ کو۔“ اعیان اس معصوم
 کے معصوم سے گالوں کو چومتا ہوا بولا۔
 ”پاپا آپ کی یاد تو مئی سے بھی زیادہ آتی ہے۔“ بچہ

معصومیت سے بولا۔
 ”آؤ آپ کوئی آئی سے ملواتا ہوں۔“ اعیان بچے کا
 ہاتھ پکڑ کر ہانیہ کی طرف بڑھا۔

”بیٹا یہ سچا آپ کی نئی ہانیہ اور ہانیہ یہ ہے میرا بیٹا
 فیضان۔ پیار سے ہم اسے فیضی کہہ کر بلاتے ہیں۔“
 ”سلام آئی۔“ فیضی نے ہانیہ کو سلام کرتے ہوئے

کہا۔
 ہانیہ نے فیضی کو گود میں اٹھایا اور اس کا ہاتھ چوم کر نیچے
 اتار دیا۔

”اوکے فیضی۔ اب ہم چلتے ہیں۔“ اعیان نے کہا اور
 تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہانیہ نے
 اعیان کی آنکھوں میں آنے والے آنسو دیکھ لیے تھے۔
 مگر وہ سمجھ نہیں سکی کہ وہ رو کیوں رہا تھا۔ وہ بھی اعیان کے
 پیچھے کمرے سے باہر نکل گئی۔

دونوں چپ چاپ آ کر کار میں بیٹھ گئے۔ اعیان
 نے ہانیہ سے سنا کے کار راستہ معلوم کیا اور کار اسٹارٹ کر دی۔
 اس وقت اعیان کے چہرے پر ایک درد سا پھیلا ہوا تھا۔
 ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش
 میں لگا ہوا ہے۔

ہانیہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔ کچھ دیر بعد اعیان
 نے کار ہانیہ کے گھر کے باہر روک دی۔ کار کے رکتے ہی
 ہانیہ بنا کچھ کہا تری اور اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔
 ”گھر لا کر مہمان کو اندر آنے کا نہیں کہو گی۔“ اعیان

نے کہا۔

جوا پنی انگلی میں کارکی چابی گھماتا ہوا باہر جا رہا تھا۔
 ”ہانیہ نے ذہن پر بلایا ہے۔“ اعیان یہ کہتا ہوا باہر
 نکل گیا اور ٹوہیہ یہ سن کر حیرت میں رہ گئی۔

کچھ ہی دیر میں وہ اپنی کار ہانیہ کے گھر کے سامنے
 روک کر نیچے اتر رہا تھا۔ گیٹ پر پہنچ کر اس نے پہلے نیل
 بجانے کے بارے میں سوچا مگر پھر سٹوئم و اوکھ کر بغیر
 کسی میل و وجہت کے اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت ہانیہ کی
 امی کچن سے نکل کر دوسرے کمرے میں جا رہی تھی۔

اعیان کو یوں بلا اجازت گھر میں آتا دیکھ کر چونک کے
 رک گئی اور سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

”السلام علیکم امی جی۔ کیسی ہیں آپ۔“ اعیان نے
 ان کے قریب پہنچ کر ادب سے سلام کیا۔

”میں تو ٹھیک ہوں۔ مگر تم کون ہو۔“ امی حیران ہو کر
 بولی۔ اسے سب سے زیادہ حیرت اعیان کے امی جی
 بولنے پر ہو رہی تھی۔

”امی جی میں ہانیہ کی دوست ٹوہیہ کا دیور ہوں۔“ وہ
 نرمی سے بولا۔

وہ تو بیٹا کھڑے کیوں ہوا۔ آؤ اندر آ جاؤ۔“ امی اسے
 ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔

”جی شکر یہ امی جی۔ بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔ بھی بھی
 نے ہانیہ کو لینے کے لیے بھیجا ہے۔ ان کا روم کہاں ہے۔“

میں انہیں تیار ہونے کا کہہ دیتا ہوں۔“
 ”اس کا کمرہ اوپر والے پورشن میں ہے۔“ امی نے

اپنے ہاتھ سے اوپر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 اعیان بے دھڑک اوپر جانے لگا اور امی اس کے لیے

پچھ بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔
 اعیان جب ہانیہ کے کمرے میں پہنچا تو وہ سو رہی

تھی۔ وہ کچھ دیر تک اس کے معصوم چہرے کو دیکھتا رہا پھر
 آگے بڑھ کے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک جھٹکے سے اسے اٹھا

کر بٹھا دیا۔
 ”آ۔۔۔ آپ۔۔۔ یہاں۔۔۔“ ہر بڑا کراٹھتے ہی ہانیہ کی

نظر اعیان پر پڑی تو وہ گھبرا کر بولی۔
 ”ہانیہ نے بھیجا ہے۔ تمہیں لینے کے لیے۔ تم پانچ
 منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ ورنہ اسی حالت میں اٹھا کر لے
 جاؤں گا۔“ اعیان نے ہانیہ کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔
 ”ٹھیک ہے۔ آپ نیچے انتظار کریں میں ابھی آتی
 ہوں۔“ ہانیہ بیڈ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

اعیان نیچے یا اور کچن کے دروازے سے لگ کر ہانیہ کی
 امی کو دیکھنے لگا جو کچھ بنا رہی تھیں۔ امی کی نظر اس پر پڑی تو
 جلدی سے بولی۔ ”ارے بیٹا آپ یہاں کیا کر رہے ہو۔
 ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔“
 ”امی جی۔ صرف پانچ منٹ ہی تو رکنا ہے یہاں۔
 اس لیے میں نے سوچا اکیلا بیٹھنے کی بجائے آپ سے ہی
 باتیں کر لوں۔“
 ”بیٹا ایک بات پوچھوں۔“
 ”جی پوچھیے۔“
 ”آپ مجھے امی جی کیوں کہہ رہے ہو؟“
 ”میرنی امی کا انتقال ہو چکا ہے۔ آپ کو دیکھ کر مجھے
 اپنی امی یاد آ گئیں۔ بس بے دھڑک آپ کو امی کہہ دیا۔
 آپ کو اچھا نہیں لگا کیا۔“
 ”کسی بات نہیں ہے بیٹا۔ میں تو یونہی پوچھ رہی تھی۔
 تم مجھے امی کہہ سکتے ہو۔“ اعیان کی بات سن کر امی کے دل
 میں متاثر آئی۔ ہانیہ ان کی اگلی اولاد تھی اور انہیں ایک
 بیٹے کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی تھی۔ اعیان کی اس بات سے
 وہ تڑپ اٹھیں اور آگے بڑھ کر اعیان کے گلے میں ہاتھ
 ڈال کر اس کے سر کو نیچے جھکایا اور اس کے ماتھے کو چومنے
 لگی۔
 ہانیہ جو اس وقت اوپر سے اتر کر رہی تھی یہ منظر دیکھ کر
 حیرت زدہ رہ گئی۔ اعیان کی پیٹھ ہانیہ کی طرف تھی اور امی
 جس والہانہ پن سے چوم رہی تھی اس نے اسے شدید غلط
 فہمی میں مبتلا کر دیا۔ وہ جہاں گھڑی تھی وہاں سے دیکھنے
 والا اسی قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا
 تھا جیسے اس کی امی اعیان کے ہونٹ چوم رہی ہے۔ شاید
 اسی لیے بزرگوں نے کیا خوب کہا ہے کہ کبھی کبھی آنکھوں

جس کے سینے میں چاقو لگا تھا وہ اپنے ہاتھ میں ریو اور لیے کھڑا تھا۔ ”اب تم نہیں بچو گے۔“ اور اتنا کہتے ہی اس نے ٹریائیکر دبا دیا۔ جتنی تیزی سے گولی اعیان کی طرف بڑھی تھی اتنی ہی تیزی سے وہ ایک طرف کو جھک گیا اور گولی دوسرے ساٹھی کے سینے میں جا گئی اور وہ آدمی ایک دل خراش چیخ کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوتی تو اس کی جگہ اعیان زمین پر پڑا ہوتا۔ مگر انہیں کیا پتہ تھا کہ اعیان خود حفاظتی کا اتنا ماہر ہے کہ وہ چاہے چھ کی چھ گولیاں اس پر فائر کر دیتا تب بھی شاید ہی کوئی گولی اسے چھو پائی۔

اگر پانچ چھ آدمی ایک ساتھ بھی اس پر حملہ کرتے تو مجال ہے کہ وہ اسے بچ کر پاتے۔ پچھلے پانچ سالوں میں اس نے گولی سے بچنے، دشمن کے حملے کو ناکام بنانے، نشانہ بازی، جوڑو اور دیگر مارشل آرٹ میں بھرپور مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ اتنا ماہر نشانے باز تھا کہ آنکھیں بند کر کے اڑتی چڑیا کو نشانہ بنا سکتا تھا۔

اور رہی بات دماغ کی تو اس کا دماغ ایسے حالات میں اتنی تیزی سے کام کرتا تھا کہ جب تک مخالف کسی پیستریے کے بارے میں سوچ ہی رہا ہوتا تھا اور اعیان ایکشن بھی لے چکا ہوتا تھا۔

جس کے ہاتھوں اسی کے ساتھی کو گولی لگی تھی وہ پھٹی آنکھوں سے اپنے ساتھی کو دیکھ رہا تھا۔ اعیان کا ایک ہیر ہوا میں لہرایا اور دوسرے ہی پہ اس آدمی کے ہاتھ سے ریو اور نکلتا چلا گیا وہ ریو اور اٹھانے کے لیے جھکا اور اعیان نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ ریو اور تک پہنچتا اعیان کا سر اس سے ٹکرایا اور وہ پیچھے جا گرا۔ اعیان بھی نیچے گرا اور نیچے گرتے ہی اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس ریو اور کو رومال میں لپیٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

ابھی اعیان اٹھا ہی تھا کہ وہ آدمی چاقو لے کر خونئی انداز میں اس کی طرف لپکا۔ اعیان نے جھکائی دے کر اس کا دار خالی جانے دیا۔ اس نے دوسرا وار کیا مگر اس بار

دیکھا بھی غلط ہوتا ہے۔ جیسے اس وقت ایک پاکیزہ جذبے کو بانیہ ہوں بھر ایک لمحہ سمجھ رہی تھی۔ بانیہ نے عجیب سی نظروں سے اپنی امی اور اعیان کو دیکھا اور اندر چلی گئی تاکہ اس کی امی کو بھی کے سامنے شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

تھوڑی دیر بعد اعیان کی کار تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی اور بانیہ اس کے برابر میں خاموش بیٹھی۔ اس کے دماغ میں رہ رہ کر بچکن والا منظر گھوم رہا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی امی اتنی گری ہوئی عورت ہو سکتی ہے کہ ایک حسین مرد کو دیکھ کر اس کے لب چوسنے لگ جائے گی۔ وہ اس بات کو کیسے جھٹلا سکتی تھی۔ اس نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسے اپنی ماں سے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔

سڑک تقریباً سنسان تھی۔ اکا دکا کاریں ہی ادھر ادھر جاتے نظر آ رہی تھیں۔ اچانک اعیان نے تیزی سے بریک لگایا اور کار سے اتر کر دوسری طرف کو بھاگا جہاں دو آدمی سگریٹ پیتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے پاس پہنچتے ہی اعیان نے ان میں سے ایک آدمی کی کپٹنی پر زور دار ٹھونسا دے مارا۔

”اوائے“ وہ آدمی زور سے چلایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات پوری کرتا۔ اعیان کی ذات اس کی پیٹھ پر پڑی اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اعیان کا ایک اور مکا اس کے چہرے پر پڑا جس سے اس کے دو دانت نوٹ کر نیچے گر گئے۔

اتنے میں دوسرے والے آدمی نے پیچھے سے اعیان کے کندھے پر چاقو سے حملہ کیا۔ اعیان بجلی کی سی تیزی سے نیچے جھک گیا اور اس کا چاقو اسی کے ساتھی کے سینے میں دائیں طرف دھنستا چلا گیا۔ اور چاقو مارنے والا حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اعیان نے اس کی حیرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے پیٹ میں لگا تار کئی کے جھزدیے اور ہر کے پروہ نیل کی طرح ڈکرار ہاتھا۔

تب ہی اعیان کو اپنے پیچھے غراہٹ سنائی دی۔ وہ آدمی

بھی تاکا سر ہاں۔ پھر وہ ایک جنونی انداز میں لگا ہارا عیامان پر حملے کرتا رہا اور عیامان ہر بار بڑی خوبصورتی سے ادھر ادھر ہو کر بچتا رہا۔ ایسا لگتا رہا تھا جیسے عیامان اس آدمی کو حملہ کرنے کی پریکٹس کروا رہا ہو۔ اس کے ہر حملے سے بچنے کے بعد عیامان کے چہرے پر مسکراہٹ بڑھتی جا رہی تھی اور ہر ناکام حملے کے بعد اس آدمی کا فہم بھی بڑھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ غصے کے مارے اس کے منہ سے جھانگ نکلنے لگا۔ ہر لڑائی کا پہلا سبق ہی یہ ہوتا ہے کہ ہر حال میں اپنے غصے پر قابو رکھو اور مخالف کی اگلی چال کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ غصہ بھرتل کو کھاجاتا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو مخالف تم کو کھاجائے گا۔

وہ اب کھڑا ہو رہا نہ رہا تھا۔ چانک عیامان اس کی طرف بڑھنے لگا۔ حیرت سے عیامان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اس آدمی نے حملہ کرنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھایا اور عیامان کے سینے پر حملہ کیا۔ مگر اس سے پہلے کہ چاقو عیامان کے سینے پر کوئی زخم پہنچاتا عیامان پیچھے کی جانب ایسے مڑا جیسے کوئی لاش گری ہو۔ مگر اس سے پہلے کہ عیامان کی سر زمین سے گنتی اس نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا دیئے اور ایک زوردار لات اس آدمی کی دونوں ہاتھوں کے بیچ میں پڑی۔ وہ چیخ کر دروازے دوہرا ہو گیا اور زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

عیامان کی دوسری لات اس جگہ پڑی جہاں اس کے اپنے ساتھی نے غلطی سے چاقو مارا تھا۔ وہ گرا کر پیچھے گر گیا۔ عیامان آگے بڑھا اور اس کے پیٹ میں لات مارتے ہوئے بولا۔ ”بولو۔ تم۔“

مگر اس سے پہلے کہ عیامان اپنی بات پوری کرتا دور سے پولیس سائرن کی آواز اس کی کانوں میں پڑی۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کی جگہ جھنجھلاہٹ نے لے لی۔ اس نے جلدی سے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور اس آدمی کو سیدھا کر کے اس کی فونوٹی۔ پھر وہ لاش کی طرف بھاگا اور جلدی سے اس کی بھی فونوٹے لے کر اپنی کار کی طرف دوڑا۔

بانیہ کار کے باہر کھڑی پریشان نظروں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے یا عیامان کیوں ان انجان لوگوں سے جھگڑا کر رہا ہے۔ بانیہ کو کار کے باہر دیکھ کر عیامان دور ہی سے چیخا۔ ”کار میں بیٹھو۔ جلدی۔“

عیامان کی آواز اور اس کے چہرے پر اتنا غصہ دیکھ کر بانیہ سہم گئی اور ایک دم سے کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ عیامان نے کار میں بیٹھتے ہی کار آگے بڑھا دی۔ اس بار وہ کار کو نارمل اسپید سے دوڑا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے چہرے پر چھائے غصے کے بادل چھٹنے لگے اور اس کی جگہ اسی پہلے وہی والی دل کش مسکراہٹ نے لے لی۔

یہ سب کچھ صرف دو منٹ کے اندر اندر ہو گیا تھا۔ بانیہ پاگل سی عیامان کو دیکھ رہی تھی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ عیامان ان دونوں آدمیوں کو مارنے کیوں گیا تھا۔ پھر وہ پولیس سائرن کی آواز سن کر وہاں سے بھاگا تھا تو اب نارمل انداز سے کار کیوں چلا رہا ہے۔

جب عیامان کے چہرے پر مسکراہٹ پوری طرح پھیلی گئی تو بانیہ نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ ”آپ ان دونوں کو مارنے کیوں گئے تھے؟“

”کیونکہ وہ چیک پلیس پر اسموگنگ کر رہے تھے اور آپ کو شاپ پر پتہ نہیں ہے کہ عوامی مقامات پر سگریٹ نوشی جرم ہے اور انہیں اس جرم کی سزا تو منی ہی چاہئے نا۔“ عیامان نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی جواب دیا۔

”کیا۔“ وہ زور سے چلائی۔ ”صرف اتنی سی بات پر آپ سچ میں پاگل ہیں۔“



کریم خان کا کل کا دن نارمل انداز سے گزارا تھا۔ کل ڈی ایس پی زاہد علی کی تدفین میں جانے کے علاوہ اس نے اور کوئی خاص کام نہیں کیا تھا۔

کل رات ہی اسے سرفراز سے معلوم ہو گیا تھا کہ نئی ڈی ایس پی انیتا اعوان نام کی کوئی لڑکی ہے۔ وہ اپنے کیبن

انیتا کو اتنا بھڑکتا دیکھ کر کریم خان بھی گھبرا گیا تھا۔ اس کے ساتھ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ زاہد علی تو اس کے ساتھ نہایت ہی دوستانہ ماحول میں گفتگو کیا کرتا تھا۔ ”کچھ دنوں سے رئیس علی نواز والا کیس خفیہ ایجنسی کے پاس ہے۔“

”ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ مگر فیصلی تمہیں بھی اس کیس سے الگ نہیں کیا گیا ہے۔“

”آ فیصلی یہ کیس ابھی بھی میرے پاس ہے۔ مگر مجھے آرزو دینے گئے ہیں کہ میں اپنے طور پر اس کیس پر کوئی کام نہیں کر سکتا۔ بس نام کے طور پر ہی یہ کیس میرے پاس ہے۔“ کریم خان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اور تم نے مان لیا۔ تمہارے اندر عقل نام کی کوئی چیز بھی ہے یا نہیں۔“ انیتا غراتے ہوئے بولی۔

”زاہد علی صاحب نے مجھے ایسا آرزو دیا تھا تو میں ماننے کے علاوہ اور کون بھی کیا سکتا تھا۔“

”تم اور تمہارا پاس زاہد علی ایک نمبر کے بے ڈوف ہو۔ اب اگر خفیہ ایجنسی والے اس کیس کو سلجھالیتے ہیں تو ان کا نام ہو جائے گا اور اگر ایسا نہ ہو تو بے عزت ہونے کے لیے پولیس ڈپارٹمنٹ تو ہے ہی۔“ انیتا دانت پیس کر بہت غصے میں کہہ رہی تھی۔

کریم خان اس صورت حال میں خود کو بالکل بے بس تصور کر رہا تھا۔ انیتا بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی اس پر تو اس نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس لیے وہ سر جھکائے شرمندہ سا کھڑا رہا۔

”اب سب سے پہلے تم مجھے اس کیس کی وہ باتیں بتاؤ جو تمہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اس کے بعد ہم ان باتوں پر دسترس کریں گے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔“

”میم اس کیس میں مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ مری مری سی آواز میں بولا۔

”تم بالکل تالائق ہو۔ اپنی کام چوری کی وجہ سے ہی تم نے خوش خوشی زاہد کی بات مان لی تھی۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ پولیس کو تراس کھانے کی عادت پڑ گئی ہے اور یہ بھی

میں بیٹھانی ڈی ایس پی صاحبہ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ انہوں نے اسے اپنے کیمین میں طلب کر لیا۔

ڈی ایس پی کے کمرے کے باہر پہنچ کر کریم خان نے دستک دی۔ ”ایس کم ان۔“ اندر سے ایک میٹھی سی آواز آئی۔

کریم خان اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ کرسی پر دودھ جیسی گوری اور بہت ہی خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔

اب چونکہ کریم خان اور سابقہ ڈی ایس پی زاہد علی آپس میں بہت فری تھے۔ اس لیے وہ جب بھی زاہد علی کے کمرے میں آتا تھا تو نہ سیلوٹ کرتا تھا اور نہ ہی بیٹھنے کے لیے زاہد علی کی اجازت کا انتظار کرتا تھا۔ اپنی اسی عادت سے مجبور کریم خان نے آج بھی یہی کیا اور نہ تو اس نے نئی ڈی ایس پی کو سیلوٹ کیا اور ان کی اجازت کے بغیر ہی سیدھا جا کر کرسی پر براجمان ہو گیا۔

نئی ڈی ایس پی ڈسپلن کی بہت پابند تھی۔ وہ خود بھی ڈسپلن میں رہتی تھی اور ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر اسے بہت غصسا جاتا تھا۔ اور غصے میں وہ کیا کچھ کہہ دیتی تھی وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

جب انیتا نے اس طرح کریم خان کو آ کر کرسی پر بیٹھتے دیکھا تو اسے بہت غصسا آیا۔ ”تمہیں انسپیکٹر کس نے بنا دیا۔ تمہیں تو اپنے سینئر آفیسرز کی رسپیکٹ کرنی بھی نہیں آتی۔“

جب کریم خان کے کانوں میں انیتا کی آواز پہنچی تو اسے احساس ہوا کہ وہ کیا غلطی کر چکا ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ شرمندہ سا کرسی سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ”سوری میم۔“

کریم خان کے سوری کہنے سے انیتا کے غصے میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے کریم خان کو دیکھ رہی تھی۔ ”انسپیکٹر کریم خان۔ کیا تم ہی رئیس علی نواز والے کیس کو ہینڈل کر رہے ہو۔“

”نومیم۔“

”یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ کیا اوپر سے مجھے خط انڈر مشن دینا ہی ہے۔“ اس بار انیتا نے چلاتے ہوئے کہا۔

سچ کہتے ہیں کہ بڑی کھانے اور کتوں کی طرح بھونکنے کے علاوہ ہماری پولیس کچھ نہیں کرتی۔“ کریم خان کی بات نے انیتا کا غصہ مزید فروں کر دیا تھا۔ اور وہ غصے میں جانے کیا کیا بولتی چلی گئی۔ آج تک کریم خان کی ایسی بے عزتی کسی نے نہیں کی تھی۔ شرمندگی کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ سر جھکائے چپ چاپ انیتا کی ڈانٹ سنتا رہا۔

”اب چپ کیوں ہو۔ جلدی بکنا شروع کرو۔ ویسے تو میں سب کچھ فائل میں پڑھ چکی ہوں مگر میں وہ سب کچھ تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔“ انیتا ایک بار پھر غصے سے چلا کر بولی۔

”میم۔“ رئیس علی نواز کی پارٹی میں جتنے بھی لوگ شریک ہوئے تھے۔ ان سب کی موت ہارٹ ایک سے ہوئی تھی۔ سب کی لاشیں مل چکی تھیں سوائے ایک آدمی کے۔ اس کا نام طارق محمود تھا۔ پھر سمندر کی طرف جانے والی سڑک پر حادثے کا شکار ہونے والی ایک کار سے اس کی لاش ملی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی موت ہارٹ ایک سے نہیں بلکہ سر میں گولی مارنے سے ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ہمیں پتہ چلا کہ اس کی موت شام چھ اور سات بجے کے درمیان ہوئی تھی۔ یعنی کہ رئیس علی نواز کی پارٹی شروع ہونے سے پہلے اور اس بات کی تصدیق یوں بھی ہوئی ہے کہ پارٹی میں اس کے کوئی فنگر پرنٹس نہیں پائے گئے۔ وہاں سے ملنے والے فنگر پرنٹس میں تین ایسے تھے جنہیں اس پارٹی میں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔

پہلے فنگر پرنٹ خود رئیس علی نواز کے جو ایک دن پہلے سزا خان اسپتال میں ایڈمٹ ہو چکے تھے۔ جس کے گواہ اس کے گھر کے ملازمین ہیں۔ اور میں نے خود اسپتال کی ویڈیو فوٹیج دیکھی تو پتہ چلا کہ وہ تو اپنے بیڈ سے بلا تک نہیں۔ مگر اس سے پہلے کہ ہم اس سے کچھ پوچھنا چھو کر پاتے برین میجرج کی وجہ سے ان کی بھی موت واقع ہوئی۔ یہ سب پہلے دن کی بات ہے۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ جو دوسرے فنگر پرنٹ پائے گئے تھے وہ کمال نامی کسی شخص کے تھے جو سات سال پہلے چھ ماہ کی سزا کاٹ چکا تھا۔ مگر تیسرے فنگر پرنٹ کس کے ہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ پھر اسی صبح ٹی سی او سے کسی کی کال آئی جس میں بتایا گیا کہ کھنڈر میں ایک لاش ملے گی۔ اور وہاں سے واقعی ایک لاش ملی جو کمال کی تھی جس کی کلائی پر سات کا ہندسہ گدا ہوا تھا۔ پھر اسی رات تقریباً ساڑھے دس بجے کمال کے نمبر سے کسی نے مجھے کال کر کے بتایا کہ ڈیٹیکٹس فیرفائیو کے ایک جگھے میں کمال کے چار ساتھی جمع ہو رہے ہیں۔

اس رات ہم نے کارروائی کر کے چاروں کو گرفتار کر لیا۔ مگر جب ان سے تفتیش کی گئی تو کہانی بالکل الٹ نکلی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ چاروں الگ الگ گینگ کے ممبر ہیں۔ مگر کمال کی طرح ان چاروں کی کلائی پر بھی سات کا ہندسہ گدا ہوا تھا۔ تھرڈ ڈگری استعمال کرنے پر بھی انہوں نے کوئی یقینی جواب نہیں دیا۔

اور پھر اگلی صبح کسی انجان نمبر سے اس انفارم نے مجھے دوبارہ کالی کر کے بتایا کہ فیڈل ہائی دے پرواقع ایک کانسٹیبل میں کمال کے پاس شفقت چینا عرف ریڈ 001 کی لاش ملے گی جس کا تعلق سیون اسٹار گینگ سے ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نمبر جس سے انفارم نے کال کی تھی وہ اسی شفقت چینا کا تھا۔ اور وہ موہاٹل اسی پولیس اسٹیشن کے میدان سے برآمد کیا گیا۔ اور وہاں کانسٹیبل میں شفقت چینا کی جیب سے کمال کا موہاٹل ملا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)



دیپکے تار

شہناز نسیم

نشے میں انسان کو کچھ نظر نہیں آتا، لیکن اکثر کچھ باتیں نشے کو توڑ دیتی ہیں۔

ایک ایسے ہی شخص کا واقعہ، جو نشے میں گناہ کی طرف بڑھ رہا تھا، لیکن اس کی بیوی کی آواز اسے حال میں واپس لے آئی۔

مارجوری اپنے فلیٹ کے لاؤنج میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ٹی وی سیٹ کی آواز بند کر رکھی تھی اس لیے خبریں پڑھنے والے اناؤنسر کے ہونٹوں کی حرکات بڑی دلچسپ بلکہ مستحکم خیر لگ رہی تھیں۔

مارجوری ہمیشہ سے کم سو واقع ہوئی تھی۔ گپ شپ کرنا اس کی طبع کے خلاف تھا اس لیے وہ پارٹیز وغیرہ میں شرکت کرنے سے عموماً گریز بھی کرتی تھی۔ جارج نے درست ہی کہا تھا کہ اس رات جو آفیس پارٹی ہو رہی ہے وہاں جا کر وہ آتا بہت محسوس کرے گی۔

”دیکھو نا ڈارلنگ تم کسی کو جانتی ہی نہیں ہو وہاں سب اجنبی چہرے ہوں گے۔“ مارجوری نے بھی اس کی تردید نہیں کی اور راضی ہو کر ہنسی۔

جب جارج، پارٹی میں جانے کے لیے لباس بدل رہا تھا تو مارجوری اسے دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ بعد شباب گزر جانے کے باوجود جارج کی جسمانی کشش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس کے جسم پر اویسز عمری اپنا وار کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس کی خوش لبہائی بھی ویسی کی ویسی ہی تھی۔ اس نے شوخ رنگ کی شرت پہنی، پھولدار نائی لگائی، کوٹ کی بریسٹ پائمنٹ میں رومال سجایا اور پھر اپنے لمبے لمبے گھونٹھریالے بالوں میں تنگی پھیرنے لگا۔

”پارٹی میں تمہیں اپنی آواز کا فن دکھانے کے لیے تو ضرور کہا جائے گا۔“ مارجوری نے کہا۔

جارج نے آئینے کے قریب تر ہو کر اکا دکا سفید بالوں کو سیاہ بالوں کے نیچے چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

”ہمیشہ مجھ سے یہی فرمائش کی جاتی ہے کہ آج فلاں کی آواز نکال کر دکھاؤ نا آج فلاں کی نقل اتار کر دکھاؤ۔“

مارجوری کی جارج سے پہلی ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی

تھی اور وہ جارج کی اس انوکھی خوبی سے بے حد متاثر ہو گئی تھی۔ وہ حیرت انگیز طور پر مشہور لوگوں کی آواز اور لہجے کی ہو، ہونے لگیں اتار سکتا تھا۔ اس کی یہ صفت اپنے ارد گرد اچھا خاصا مجمع لگانے کے کام آتی تھی اور کئی سیاست دانوں، اداکاروں اور اس طرح کے نامور لہجے میں ہو، بہو بات کر کے سامعین کو حیرت میں ڈال دیتا تھا۔

جارج نے اپنی تیاری آٹا خری بیچ دیتے ہوئے کوٹ پر ہنس پھیرا آئینے میں اپنے سر یا پر ایک آخری نظر ڈالی اور پھر اپنی کار کی چابیاں اٹھاتے ہوئے بولا۔

”ڈارلنگ میری واپسی تو شاید بارہ بجے کے بعد ہی ہوگی اس لیے میرے انتظار میں جاگتی نہ رہنا، بے فکر ہو کر سو جانا۔“

پھر اس نے مارجوری کے گال پر پیار بھری چپت لگائی اور کہا۔

”ڈارلنگ کوئی ایسا کام نہ کرنا جو تمہارے شوہر تا مدار کو نا پسند ہو۔“

پھر وہ منگھرا تا ہوا باہر چلا گیا۔

مارجوری کے چہرے پر پھینکی مسکراہٹ تھی وہ سوچ رہی تھی کہ آج جارج اتنے با اعتماد لہجے میں اسے کوئی ایسا ویسا کام نہ کرنے کی ہدایات کیوں دیتا رہتا ہے؟ اسے یہ یقین کیوں ہوتا ہے کہ میں واقعی کوئی ایسا کام نہیں کروں گی؟

وہ صوفے کی پشت پر سر تیک کر سوچتی رہی۔ چشم تصور سے وہ اس پارٹی کا منظر دیکھ رہی تھی۔ جس میں شریک ہونے کے لیے جارج اسے تنہا چھوڑ گیا تھا۔ جارج تو محفل کی جان بنا ہوگا۔

چھیل چھیل، اسارت، خوش رو، خوش گفتار، کوش پوش اور پھر وہ اضافی کشش، وہی ہر شخصیت کے لب و لہجے کی کامیاب نقل، لڑکیاں تو اس پر ٹوٹ ہی پڑتی ہوں گی۔ یکے ہوئے پھل کی مانند۔ وہ اس وقت ضرور کسی نہ کسی حسین لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے لے کر رہا ہوگا بلکہ شاید بوسے بازی بھی، لیکن مارجوری کو یہ بھی یقین تھا کہ اس کا شوہر اس حد سے تجاہذ نہیں کرے گا وہ

شوہروں کو قتل ڈال کر رکھتی ہیں۔“

مس ولسن نے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خواب ناک لہجے میں کہا۔

”ڈارلنگ، تمہارے پاس تو اپنی بیوی کو مطمئن کرنے کا بہترین ذریعہ موجود ہے۔ تم مسٹر بلیک برن کے لہجے کی انتہائی کامیاب نقل ادا کر سکتے ہو ان کی آواز میں تم اپنی بیوی کو فون کر کے کہو کہ پارٹی ابھی دیر تک جاری رہے گی اور چونکہ پارٹی کی کامیابی کے لیے جارح جیسے دلچسپ شخص کی یہاں موجودگی ضروری ہے اس لیے اسے گھر لوٹنے میں زیادہ دیر ہو جائے تو اس کی بیوی مانڈ نہ کرے۔ مجھے یقین ہے تمہاری بیوی مسٹر بلیک برن کی سفارش کے بعد بے فکر ہو کر سو جائے گی اور ہم مزے سے...؟“ اس نے آنکھ مار کر بات مکمل کر دی۔

جارح کو تسلیم کرنا پڑا کہ مس ولسن کی ترکیب بہت عمدہ ہے واپسی آ کر مار جوڑی کو معلوم ہو جائے کہ اس کا شوہر ہاس کے اصرار پر مجبور ہو گیا ہے تو وہ ہمیشہ کی طرح راضی بہ رضا ہو جائے گی اور اس کی واپسی پر خفگی کا اظہار نہیں کرے گی۔ آخر ہاس کو خوش رکھنا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔

مس ولسن جارح کو اسی طرح اپنے ساتھ چمٹائے ایک نیونیون کی طرف لے گئی اور جب جارح نے اپنی بیوی کو فون کیا تو مار جوڑی نے فوراً ہی ریسیور اٹھا لیا جارح کا اندازہ ٹھیک نکلا تھا مار جوڑی ابھی تک سوئی نہیں تھی اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

جارح نے اپنے ہاس مسٹر جوزف بلیک برن کے لب و لہجے میں انتہائی کامیاب نقل ادا کرتے ہوئے مار جوڑی سے وہی کچھ کہا جو مس ولسن نے بتایا تھا۔

پھر جارح نے مار جوڑی کی آواز سنی جس نے تیز لہجے میں کہا تھا۔

”جوزف ڈارلنگ، میں نے تمہیں کتنی بار منع کیا ہے کہ مجھے میرے فلیٹ کے نمبر پر فون نہ کیا کرو، تم سمجھتے کیوں نہیں کیا تم چاہتے ہو کہ جارح سب کچھ جان جائے۔“

۱۱

اس سے بے وفائی کا مرتکب تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ پارٹی میں خوش گپیاں اور خوش فعلیاں کرنا تو خیر کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن کسی لڑکی کو لے کر پارٹی سے غائب ہو جانا یہ ممکن نہیں، جارح ایسا ہرگز نہیں کر سکتا مار جوڑی نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔

جارح اس وقت واقعی رقص کر رہا تھا اس نے نئی لڑکیوں کے ساتھ رقص کیا تھا اس سے قبل حسب معمول اس سے مختلف شخصیات کی آوازیں بھی سنی تھیں اور بڑی واہ واہ ہوتی تھی۔ پھر جب رقص کا آغاز ہوا تو اسے اپنا پارٹنر تلاش کرنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑی۔ وہ دفتر کی تین چار ٹیپسٹ لڑکیوں کے ساتھ رقص کر چکا تھا اور اب اس کے بازوؤں کے حوالے میں مس ولسن تھی و پینچ کے شیعے کی نگاہیں مس ولسن کا جسم بے حد گداز اور گرم تھا اس ولسن کی جنسی کشش تو ناقابل برداشت تھی اور اس وقت وہ ذرا مدہوش بھی تھی اس لیے جارح کے ساتھ چمٹی ہی جارہی تھی۔ اب پارٹی میں پہلے کی ہی گھما گھمی تھی نہیں رہی تھی۔ زیادہ تر شادی شدہ جوڑے، شاید رگ و پے کی سنسنہ بہت دور کرنے کے لیے گھروں کا رخ کر چکے تھے۔ ہاس جوزف بلیک برن بھی کب کا جا چکا تھا اور دوسرے بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جا رہے تھے لیکن مس ولسن جارح کو چھوڑنے پر تیار نظر نہیں آتی تھی۔

شاید جارح بھی اس سے جان چھڑانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ شراب کے نشے میں جسم کی مہک نے اس پر بے خودی سی طاری کر دی تھی۔ مس ولسن سوچ پاتے ہی اسے چھینچ کر نسبتاً ایک ویران گوشے میں لے گئیں جہاں روشنیوں کی پہنچ نہیں تھی۔ وہاں تو بیچتے ہی واپس آئی بے کلمتی سے جارح کے گلے کا ہارن بنی۔ اس کی شدت نے جارح کو بالکل ہی بے قابو کر دیا تھا۔

مس ولسن نے ٹھوڑا آواز میں کہا۔

”سنو، ڈارلنگ کیوں نہ اس پارٹی کا اختتام میرے فلیٹ پر چل کر ہو وہاں صرف تم ہوں گے اور میں۔“ جارح نے اشارت میں سر ہلانے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قیام پایا اور اپنی رست و راج پر نظر ڈالی۔ بارونج کرچکیس منٹ ہو چکے تھے اور جارح جانتا تھا کہ اس کی تاکید کے باوجود مار جوڑی سوئی نہیں ہوگی اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ اس نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔

”میں خود یہی چاہتا تھا لیکن اگر میں اور زیادہ ڈیسٹ ہو گیا تو میری بیوی اسے پسند نہیں کرے گی تم جانتی ہی ہو وہاں اپنے

ضرب پلس

فیاض الرحمان قادری

فطرت کے ساتھ ایک طویل عرصے سے انسان کی جنگ جاری ہے۔ انسان مستقبل کی تسخیر چاہتا ہے۔ بلکہ مستقبل تک پہنچنے کا آرزو مند ہے
ایک سائنس دان کی جدوجہد کا حیرت انگیز احوال

ہیں۔ اس کے لہجے میں غور و فکر کا پہلو نمایاں تھا۔
”پلیز مسٹر وائٹی، آپ یہ تمام کہانی ایک مرتبہ پھر سنا دیں۔ لیکن اس مرتبہ ذرا آہستہ آہستہ میں۔“ وائٹی نے جو کہانی سنانا کر پہلے ہی تنگ آ چکا تھا۔ احتجاجی انداز میں ہاتھ بلند کیے مگر پلیز ٹریوس نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔
”ہاں ہاں مجھے معلوم ہے تم مجھے یہ کہانی پہلے بھی سنا چکے ہو لیکن تمہیں خیال کرنا چاہیے کہ پروفیسر برونسکی ہمارے ملک کے ایکٹرا انس کے ماہر سائنسدان تھے۔ تم ان کے پرسنل اسٹنٹ تھے۔ اس حیثیت سے تمہیں اس بات کا مجھ سے بہتر علم ہوگا کہ آیا وہ کسی نہایت اہم منصوبے پر کام کر رہے تھے یا نہیں۔ وفاق وزی نے اس حادثے کی مفصل رپورٹ طلب کی ہے۔“
وائٹی کھسکا۔ اس نے ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لے کر کہا شروع کیا۔
”پروفیسر برونسکی ان دنوں ایک نام مشین پر کام کر رہے تھے۔ اس کا آخری ایڈجسٹمنٹ آج صبح ہی ہم نے کیا تھا۔“
”کس قسم کی مشین تھی یہ؟“ ٹریوس نے پوچھا۔
”اس مشین کا مقصد کراہی کی زندہ مخلوق کو وقت کی قید سے آزاد کرنا تھا۔“

وائٹی نے تشریح کی۔ ”آپ صرف ان باتوں کا تصور کر سکتے ہیں جو اس مشین کی بنا پر ممکن ہو سکتی ہیں اس مشین کے ذریعے یہ پتا چلایا جا سکتا ہے کہ آئندہ چند ہفتوں یا چند سالوں میں دوسری حکومتیں کس قسم کے اقدام

اپیش برانچ کے انسپکٹر ٹریوس نے اپنے منہ سے سر کو پھینکانے کے عالم میں تیزی سے بھجایا۔ اس نے چادر سے ڈھکی ہوئی لاش پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈالی۔ یہ لاش لیبارٹری کے وسط میں بہنے ہوئے پتیل کے کیبنٹ کے قریب پڑی ہوئی تھی۔ لیبارٹری کی دیواروں پر گئے ہوئے برقی آلات سے نکلنے والی تیز بجھکتی ہوئی پوری لیبارٹری میں پھیلی ہوئی تھی۔

انسپکٹر ٹریوس پاس ہی کھڑے ہوئے سفید روت میں ملبوس شخص کی طرف مڑا۔

”وائٹی! یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے۔“ اس نے کہا۔

”اور تم مجھ سے یہ توقع بھی نہ کرنا کہ میں اس بات پر یقین کروں گا کہ بے ضرر سے دو پانچ ذروں کی وجہ سے پروفیسر برونسکی کی موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی ہے۔“
بجھرتے کے اندر بند دو خروش باہر آنے کو بے تاب تھے اور ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔

وائٹی غصے کے عالم میں لیبارٹری میں ادھر ادھر ٹھل رہا تھا۔

”یہ خودکشی ہے سر! خودکشی۔“ وہ تقریباً چیختے ہوئے بولا۔

”یقین کرو اس کی موت خودکشی کا ہی نتیجہ ہے۔ وہ محض غلط اندازوں کی وجہ سے مرے۔“

”خودکشی۔“ انسپکٹر نے حیرت سے کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہیں۔“

کرنے والی ہیں۔“

”ٹھیک، یہ بات کچھ سمجھ میں آتی ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”اب مجھے اس بات کا شبہ ہونے لگا ہے کہ کہیں پروفیسر کو دشمن کے ایجنٹوں نے موت کے گھاٹ نہ اتارا ہو۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ وانٹی نے اپنی بات جاری رکھی۔

”پروفیسر کا اصرار تھا کہ مشین کو ذرا ٹیسٹ کر لیا جائے میں نے انہیں اس عجلت کی بنا پر پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے میری باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا ان کی بے تابی کا عالم تو یہ تھا کہ وہ اس پہلے ٹیسٹ کے لیے خود ہی اس کیبنٹ میں داخل ہونے لگے لیکن میں نے انہیں ایسا کرنے سے بڑی مشکل سے باز رکھا اور انہیں مجبور کیا کہ وہ پہلے ٹیسٹ کے لیے خرگوش کے جوزے کو استعمال کریں۔“

”ایک منٹ وانٹی۔“ انسپکٹر ٹریوس نے چمچ سوچتے ہوئے اور بابا یاں گال کھجاتے ہوئے کہا۔

اگر تم دونوں ہی اس وقت کیبنٹ سے باہر تھے تو پھر تم کیسے بچ گئے؟“

وانٹی نے دیوار پر لگے ہوئے کنٹرول پینل کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ وہ مقام ہے جہاں میں کھڑا ہوا تھا اور آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ جگہ شیشے کے ایک پارٹیشن کے پیچھے ہے۔“

”ٹھیک، ٹھیک اپنی بات جاری رکھو۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”پروفیسر نے کیبنٹ کا دروازہ بند کر کے مجھ سے کہا کہ میں 1983ء کے لیے کنٹرول سیٹ کر دوں۔ میں نے تجویز پیش کی کہ یہ پہلا تجربہ ہے لہذا کم مدت کے لیے کنٹرول سیٹ کیا جائے لیکن پروفیسر اس تجربے کے سلسلے میں اتنے پر جوش تھے کہ میری بات نہیں مانی۔ مجبوراً میں نے سوچا آج کر دیے لوڈ کے نتیجے میں روشنی مدھم ہوئی اور پھر..... اور پھر.....!“

انسپکٹر نے اس کا بازو دچکڑا لیا۔

”مجھے یہ بات معلوم ہوئی چاہیے وانٹی۔“ انسپکٹر نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”اپنی بات جاری رکھو۔“

”ٹھیک ہے انسپکٹر میں بتاتا ہوں۔“ وانٹی نے کہا۔

”تھوڑی دیر میں اچانک ایک دھماکہ ہوا اس کے ساتھ ہی کیبنٹ کا دروازہ کھل گیا خرگوش اچھل کر باہر آ گئے جنہوں نے پروفیسر کو نیچے گرا دیا جو نبی مجھے محسوس ہوا کہ اصل واقعہ کیا ہے میں نے مشین رپورس میں چلا دی لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی بے چارہ پروفیسر اپنے انجام تک پہنچ چکا تھا۔“

انسپکٹر ٹریوس نے سخارنا انداز میں کھنکھارا۔

”میری بات سنو وانٹی۔“ وہ تیز لہجے میں بولا۔

”تمہیں ذرا ڈھنگ کی بات کرنی چاہیے۔“ اس نے دونوں خرگوشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا تم اب بھی اس بات پر مصر ہو کہ ان دو معصوم ننھے جانوروں کی وجہ سے ایک جواب اور طویل القامت شخص دم گھٹ کر ہلاک ہو گیا۔“

”بے وقوفی کی بات تو آپ کر رہے ہیں انسپکٹر، میں صرف ان دونوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔“ وانٹی نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

”کیا آپ اب بھی نہیں سمجھ سکتے؟ ناٹم مشین کو چار سال آگے کی طرف سیٹ کیا گیا تھا۔ جب انہوں نے دروازہ کھولا تو ان کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ فرش سے لے کر چھت تک صرف خرگوش ہی خرگوش نظر آ رہے تھے اور اسی سلسلے میں ہم نے غلط اندازہ لگایا تھا۔“



غلط فہمی

راحیلہ ناز

بعض اوقات نامساعد حالات انسان کو ایسے مقام لاکھڑا کرنے
پس کہ وہ بوکھلاہٹ کے عالم میں ہونے والے اپنے ہر فعل کو وقت کی
ضرورت اور بالکل صحیح گردانتا ہے۔
فرانس کے نور افتاد پہاڑی سلسلے میں ایک سیاح کو پیش آنے
والے ایک دلچسپ حادثے کی روداد جس کا انجام ہڑہ کر آپ
مسکرائے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

فرانس کے جنوبی حصے میں واقع ایک پہاڑی
سلسلہ ہے جو ناٹردان کہلاتا ہے۔ ناٹردان کی
پہاڑیاں، سیاحوں میں اس اعتبار سے بہت مشہور
ہیں کہ وہاں بڑے بڑے پتھر، تلے اوپر جمع ہو کر
عجیب و غریب شکلیں اختیار کر لیتے ہیں اور آدمی
ان کے درمیان کھڑا ہو کر یوں محسوس کرتا ہے جیسے
ان گنت خوفناک اور مہیب جانوروں کے غول میں
گھر گیا ہو اور وہ خوفناک جانور بتدریج اس کے
گرد اپنا گھیرا تک کر رہے ہوں۔
ان پہاڑیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ
اگر کوئی بوڑھی عورت چھتری سمیت ان پر چڑھ
جائے تو ان بھاری چٹانوں کو چھتری سے با آسانی
لڑھکا سکتی ہے۔ یوں جیسے بچے بلے سے گیند لڑھکا
دیں۔ ان پہاڑیوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے
کہ ان میں لا تعداد غار اور بے حساب کھائیاں بھی
ہیں۔ فرانس جانے والا کوئی بھی سیاح ان پہاڑیوں
کو دیکھے بغیر، واپس نہیں لوٹتا۔ سیاحوں میں یہ بات
مشہور ہے کہ جس نے ناٹردان کی پہاڑیوں کو نہیں
دیکھا اس نے دراصل فرانس ہی نہیں دیکھا۔
مجھے بھی سیاحوں میں پھیلا یہ مقولہ ان
پہاڑیوں کی طرف بھیج لایا تھا۔ اس روز وہاں

چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چمکیلی،
جلمگانی دھوپ اور خود رو جھاڑیوں میں سے نکلنے
والے پھولوں پر تتلیاں منڈلا رہی تھیں۔ میں اپنے
گرد و پیش میں گھومنے سے مناظر سے لطف اندوز ہوتا
وہاں گھوم رہا تھا۔ دھوپ نے میرا پورا جسم پسینے میں
بھگو دیا تھا۔
ایک جگہ میں پسینہ پونچھنے کے لیے رکا تو
اچانک میرا پاؤں رپٹ گیا۔ میں نے گرنے سے
بچنے کے لیے اپنا توازن برقرار رکھنا چاہا مگر ناکام
رہا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں سمجھتا۔ توازن بگڑنے
کی وجہ سے میں ایک گہرے گڑھے میں جا گیا۔ یہ
سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ میں اپنے حواس
بحال نہ رکھ سکا اور بے ہوش ہو گیا میرے گرد و پیش
میں کیا تھا؟ اس کا مجھے احساس بھی نہ ہو پایا۔
پتا نہیں کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا حواس بحال
ہونے پر میں نے اٹھنا چاہا تو دائیں پاؤں میں
شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ میرے پیر میں موج
آگئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گہرے
گڑھے میں سے آسمان نظر آ رہا تھا مگر بہت کم جس
سوراخ سے میں گرا تھا اس کے دہانے سے بہت
بلکی سی روشنی آ رہی تھی گڑھا کسی بھی طور پندرہ سولہ

فٹ سے کم گہرا نہ تھا۔

بروقت دوسری جانب چھلانگ لگا کر میں نے خود کو اس پتھر تلے آنے سے بچایا۔ بڑے پتھر کے بہتے ہی دوسرے چھوٹے چھوٹے پتھر، کنکریاں اور بہت سی مٹی بھی نیچے آ گئی جس سے میں کسی طرف نہ بچ پایا جب لمبے کی بارش تھی تو میں نے سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ اب پتھروں کا سہارا لے کر اوپر چڑھنا خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر خود نے کے مترادف تھا۔

یہ انکشاف میرے لیے خاصا پر ہول تھا۔ میرا سر چکرا گیا یہ پندرہ سولہ فٹ گہرے گڑھے میں سے نکلنا آسان نہیں تھا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ میرے ایک پاؤں میں موج بھی آ گئی تھی۔ میرے جسم پر پتھروں کی رگڑ سے پڑنے والی خراشیں تھیں اور اس اچانک حادثے پر میرا پورا جسم لرز رہا تھا۔

میں دیوانہ وار گڑھے میں چکر لگانے لگا اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں باہر گھوم رہا تھا تو مجھے دور دور تک اس علاقے میں کوئی دوسرا شخص دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر میں نے جین پکار کی تب بھی بیرونی امداد ملنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔

میرے کاروبار سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ میں جیسے تیسے کر کے وہاں پہنچ سکتا تھا۔ بشرطیکہ اس گڑھے سے نکل جاتا گڑھا نیچے سے چوڑا مگر اوپر سے تنگ تھا اور اس میں سے نکلنا آسان نہیں تھا۔

میرے چشم تصور میں اخبارات میں چھپنے والی خبروں کی سرخیاں ابھر آئیں جن کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک انڈین انجینئر جو گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے فرانس آیا تھا۔ اچانک ہی لاپتا ہو گیا تلاش بسیار کے باوجود اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔

میں نے ایک ملکی سی کراہ بھری اور اپنے دائیں پاؤں کی دونوں ہاتھوں سے خوب اچھی طرح مالش کر ڈالی۔ مالش سے خاصا فائدہ محسوس ہوا اب میں اپنا پاؤں زمین پر ٹیک سکتا تھا اور اس پر اپنے جسم کا وزن بھی ڈال سکتا تھا۔ میں نے اس گڑھے سے نکلنے کا ہر صورت میں تہیہ کر لیا میں باہر نکلنے کی کوئی تدبیر سوچ رہا تھا کہ میری نظر غار میں ابھرے ہوئے ایک بڑے پتھر پر جم گئی جو غار کی دیوار میں خاصا آگے کی جانب نکلا ہوا تھا۔

اس دہشت انگیز خیال نے مجھے اور پریشان کر دیا۔ میرے حواس دھیرے دھیرے میرا ساتھ چھوڑنے لگے۔ میں حیران پریشان اور گم صم اپنی جگہ کھڑا تھا کہ میری سماعت سے ٹھیکوں کی جھنجھنات نکرائی، میں چونکا ہوا گیا۔ میں نے سر اٹھایا تو وہ کھیاں خلا سے نیچے آ کر بائیں جانب چلی گئیں ان کھیبوں کے پیچھے ایک غول کی صورت میں لا تعداد کھیاں تھیں۔ پہلی دو شاید ان کی رہنمائی کر رہی تھیں۔

میں نے چھلانگ لگا کر اس بڑے پتھر کو پکڑا اور اس پر پاؤں جما کر اس پتھر کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا جو میرے ہاتھوں کی پہنچ سے صرف چند انچ دور تھا۔ میں نے وہ پتھر پکڑنے کے لیے اپنی جگہ کھڑے کھڑے اوپر کی جانب چھلانگ لگا لی تھی کہ وہ پتھر اپنی جگہ سے کھسک گیا جس پر میں کھڑا ہوا تھا اور تیزی سے نیچے گرتے ہوئے گڑھے کے فرش پر جا کر ٹک گیا۔

میں نے اس جانب قدم بڑھائے، جدھر کھیاں جارہی تھیں میں چند ہی قدم چلا تھا کہ ٹھنک گیا۔ مجھے

سب ٹھیک ہو جائے گا
 لڑکی کے باپ نے شادی کے ایک امیدوار سے
 کہا۔
 ”میری بیٹی میرے گھر میں جس طرح پٹی بڑھی
 ہے کیا تم اسے اس طرح رکھ سکو گے؟“
 ”جی نہیں۔“ امیدوار بولا۔ ”لیکن میں آپ کو یقین
 دلاتا ہوں کہ تھوڑے دنوں میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے
 گا۔“
 ”یعنی تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ باپ نے حیرت
 سے پوچھا۔
 ”یہی کہ میں جس طرح اس کو رکھنا چاہوں گا اسے
 اس کی عادت ڈلوادوں گا۔“

کر دیکھا تو تھوڑی سی فراسیسی کر لی، چند ٹریولرز
 چیک اور کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرچہ ملا جس پر ٹائپ
 میں چند سطر ہی عبارت درج تھی۔ اب سورج ڈھل
 رہا تھا۔ اس لیے گڑھے میں روشنی برائے نام ہی رہ
 گئی تھی۔ میں بہ مشکل اس تحریر کو پڑھنے میں
 کامیاب ہو سکا پرچے پر لکھا تھا۔

”ڈی میگا رڈ، تم نے ہماری تنظیم سے غداری
 کی ہے لہذا تمہارے لیے موت کی سزا تجویز کر دی
 گئی ہے تم جاوے دنیا کے کسی بھی گوشے میں پہنچ جاؤ
 میرے آدمی تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے اور تمہیں مجوزہ
 سزا دیں گے پھر تمہاری زبان کاٹ کر“ کالی
 دیوٹی کے حضور پیش کر دی جائے گی۔“

تنظیم پرچے کے اختتام پر نام کی جگہ بین الاقوامی
 تنظیم ”ساحران“ کے سربراہ اعلیٰ کے دستخط تھے جو
 کسی انسانی کھوپڑی سے مشابہہ تھے۔ اس پرچے
 کو بڑھ کر میرے جسم پر ایک بار پھر لڑزہ طاری
 ہو گیا جو لوگ اس تنظیم کے بارے میں کچھ نہیں
 جانتے۔ ان کے لیے یہ پرچے بے معنی اور قطعی غیر

بلکی روشنی میں ایک انسانی لاش دکھائی دی میں سر تاپا
 کانپ اٹھا، پتا نہیں وہ کون بد نصیب تھا جو اس طرح
 دیار غیر میں مارا گیا تھا۔ پھر مجھے اپنا خیال آ گیا کیا
 میرا بھی یہی حشر ہوگا؟ اس خیال کے ساتھ ہی
 میرے جسم میں تھر تھری چھوٹ گئی اور پسینہ بدن کے
 مساموں سے پھوٹ نکلا۔ شاید میں بھی کسی ایسی ہی
 صورت حال سے دوچار ہونے والا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اپنا دل مضبوط کیا اور
 لاش کے قریب چلا گیا۔ یہ خیال میرے لیے
 تقویت کا باعث تھا کہ جب مرنا ہی ٹھہرا تو اس
 سے ڈرنا کیا۔ لاش کے جسم پر براؤن پتلون اور
 سیاہ چمڑے کا جیکٹ تھا جبکہ سر پر ایک گہرا زخم تھا
 جس میں سے خاصی مقدار میں خون نکل کر اس
 کے چہرے پر جم گیا تھا اس طرح کہ اس کی صورت
 میں پہچانی نہ جاتی تھی۔

میں نے بغور زخم کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ اس کے
 سر پر کسی نوکدار وزنی چیز سے وار کیا گیا تھا لاش
 کے معائنے کے دوران میں نے یہ بھی محسوس کیا
 کہ لاش سے بدبو نہیں اٹھ رہی تھی۔ اس کا مطلب
 یہ تھا کہ اسے میرے گڑھے میں گرنے سے تھوڑی
 دیر پہلے ہی وہاں لاکر پھینکا گیا تھا۔

آہستہ آہستہ مکھیوں کی تعداد اور ان کی
 جھنجھنہٹ میں اضافہ ہونے لگا تو مجھ پر الجھن
 سوار ہو گئی۔ موت کا خوف اب میرے اعصاب پر
 پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ میں نے گھٹنوں کے
 بل جھک کر لاش کی جیبوں کی تلاشی لی تو ایک چرمی
 بو اور شناختی کارڈ ملا۔ شناختی کارڈ کے مندرجات
 کے مطابق وہ ڈی میگا رڈ تھا۔ میری ہی طرح
 ایک انگریز جو ایک بینک آفیسر تھا جبکہ میں ایک
 دندان ساز تھا۔ میں نے بوے کو مزید الٹ پلٹ

اہم تھا مگر میں جانتا تھا کہ ”بین الاقوامی تنظیم
ساحران“ کیا بلا تھی اس تنظیم کا چرچا برطانوی
اخبارات میں بہت عرصے سے ہو رہا تھا۔

یہ ایسے افراد کا ٹولہ تھا جو کالے علم پر دسترس
رکھتے تھے۔ ان کی سرگرمیاں غیر قانونی اور زیر
زمین تھیں۔ اس لیے پولیس کو ہمیشہ ان کی تلاش
رہتی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ ڈی میگارڈو یقیناً پولیس
کا منجر ہوگا اور اس نے تنظیم کے بارے میں کوئی
خفیہ بات پولیس کو بتادی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی
مجھے یاد آیا کہ کچھ ماہ پہلے برطانیہ میں اس تنظیم کے
بیشتر افراد کی گرفتاری اس کی خبریں بھی اخبارات
میں شائع ہوئی تھیں جو یقیناً ڈی میگارڈو کی جانب
سے ملنے والی اطلاعات ہی کی مرہون منت تھیں۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہ آئی کہ
ڈی میگارڈو تنظیم کے ہر کاروں کے خوف سے فرانس
بھاگ آیا ہوگا مگر ایسے یہاں بھی پناہ نہیں ملی موت
اس کا مقصوم بن گئی تھی۔ تنظیم کے ارکان نے اسے
ذھونڈ نکالا اور بالآخر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔
میں لاش کے قریب سے ہٹ گیا اور گڑھے کی
ایک دیوار کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں
موت کا انتظار کرنے لگا۔ جو بتدریج میری جانب
بڑھ رہی تھی اور جس سے فرار ممکن نہیں رہا تھا۔ رفتہ
رفتہ غار میں ٹھن بڑھنے لگی اور لاش سے تعفن اٹھنے
لگا۔ مکھیوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ہی
میرے وحشت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں پھر لاش کے قریب گیا۔ یہ
دیکھنے کے لیے کہ تنظیم کے افراد نے اس کی زبان
کاٹی تھی یا نہیں، ایک دندان سازی کی حیثیت سے میں
ان گنت افراد کے جڑ سے اور منہ ان کی مرضی کے
خلاف کھلوا چکا تھا مگر وہ ایک لاش تھی۔ اس کا جڑا

کھولنے میں مجھے پسینہ آ گیا۔ بالآخر میں اپنی
کوشش میں کامیاب ہو ہی گیا۔ منہ کھلنے پر میں
حیران رہ گیا۔ مجھے ڈی میگارڈو کے حلق میں موجود
اس کی زبان صاف دکھائی دے رہی تھی جو اپنی جگہ
موجود تھی۔

میں ابھرن اور حیرت کا شکار ہو گیا میں سوچ رہا
تھا کہ آخر تنظیم کے لوگوں نے اپنا عمل پورا کیوں
نہیں کیا انہیں یقیناً اپنے سربراہ اعلیٰ کا حکم پورا کرنا
چاہیے تھا۔ ورنہ خود ان کی خیر نہ ہوتی وہ بھی کسی
نادیدہ نذاب کا شکار ہو سکتے تھے۔ اسی لمحے ایک
اور خیال میرے ذہن میں در آیا۔ یہ عین ممکن تھا
کہ کسی وجہ سے انہیں ڈی میگارڈو کی زبان کاٹنے
کا وقت ہی نہ ملا ہو۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ڈی
میگارڈو کی زبان کاٹ کر اپنے ہاس کے سامنے
لے جا کر پیش کر دے گا تا کہ وہ اسے ”کالی
دیوی“ کے حضور پیش کر سکے۔

یہ خیال میرے لیے خاصا دہشت ناک اور
لرزہ خیز تھا۔ میں نے غار میں چاروں طرف
دیکھا۔ غار کی دائیں جانب ایک بڑا سا پتھر پڑا
تھا۔ میں فوراً ہی اس کے عقب میں چھپ کر بیٹھ گیا
تا کہ آنے والے کی نگاہ مجھ پر نہ پڑ سکے۔ مجھے
جب تنظیم کے ہر کاروں کا خیال آتا میں کانپ اٹھتا
میں نے دل ہی دل میں اس وقت کو کو سا جب میں
نے فرانس آنے اور ناٹردان کی پہاڑیاں دیکھنے کا
منصوبہ بنایا تھا اور اس پر عمل بھی کر بیٹھا تھا۔

مجھے پتھر کے چھپے چھپے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ
ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے غار میں جھانک کر دیکھا
ہو بلکہ ہی آہٹ بھی ہوئی تھی میں آنے والوں کے
خوف سے مزید دبک گیا۔ چند ثانیے بعد ہی غار
کے دبانے پر قدموں کی چاپ سنائی دی اور دو

میں مر جاؤں گی

ٹرین کے ایک ڈبے میں دو عورتیں کھڑکی کے پاس بیٹھیں آپس میں جھگڑ رہی تھیں۔ گارڈ کے آنے پر ایک عورت نے شکایت کی۔

”یہ خاتون کھڑکی کھلی رکھنا چاہتی ہیں جس کی وجہ سے مجھے سخت سردی لگتی ہے۔ ڈر لگتا ہے کہ کہیں بخار میں مر نہ جاؤں۔“

دوسری عورت نے کہا ”لیکن اگر کھڑکی بند رکھتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میرا دم گھٹ جائے گا اور میں مر جاؤں گی۔“

دونوں عورتوں کی فریاد سن کر گارڈ گھبرا گیا۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے ڈبے میں بیٹھے مسافروں میں سے ایک مسافر سے درخواست کی کہ وہ ایک خاتون کی سیٹ سے اپنی سیٹ بدل لے۔ یہ سن کر اس مسافر نے کہا۔

”جناب! سیٹ بدلنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اس کا آسان حل یہ ہے کہ پہلے آپ کھڑکی بند کر دیں اس سے پہلی خاتون دم گھٹ کر مر جائے گی پھر آپ کھڑکی کھول دیں تاکہ دوسری خاتون سردی سے مر جائے گی اور اس طرح ہم سب آرام اور سکون سے سفر کر سکیں گے۔“

میرے لبوں سے بے ساختہ ایک طمانیت بھری سانس نکل گئی اب میں آزاد تھا اور آسانی سے اوپر جا سکتا تھا اور پر پہنچتے ہی مجھے مقامی پولیس کو اس واقعہ کی تفصیلی رپورٹ دینی تھی۔ لیکن غار سے نکلنے کا عمل اتنا آسان ثابت نہیں ہوا۔ جتنا کہ میں نے سمجھا تھا کیونکہ میری ٹانگ کی تکلیف دوبارہ شروع ہو گئی تھی اور کمزوری کا احساس مجھ پر غالب آچکا تھا۔ تاہم میں نے ہمت نہ ہاری اور اسی رسی کے سہارے غار سے نکل آیا۔ اس وقت میں خود کو دندان ساز کی بجائے ایک بہرہ و تصور کر رہا تھا جس نے ایک غیر قانونی تنظیم کے دو افراد کو جہنم رسید کر دیا تھا اور

آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا گویا تنظیم کے ہر کارے ڈی میگارڈو کی زبان کا نسنے کے لیے آپہنچے تھے اور اب نیچے اترنے کی تیاری کر رہے تھے۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ سر اٹھا کر غار کا روشن حصہ دیکھتا رہا ان میں سے ایک نے غار میں رسی لٹکا کی جو بل کھاتے ہوئے نیچے آ کر غار کے فرش سے ٹک گئی پھر ان میں سے کسی ایک نے رسی کو جھٹک کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا اور اس کے سہارے پھسلتا ہوا نیچے اترنے لگا۔

میں نے اپنا سانس روک لیا جو نبی اس کے پاؤں زمین سے ٹکرانے وہ گہرے سانس لیتا ہوا لاش کی طرف بڑھا اور جھٹک کر اس کا جائزہ لینے لگا اسی اثنا میں دوسرا آدمی بھی نیچے اتر آیا میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی تھی ورنہ وہ ڈی میگارڈو کی زبان بعد میں کانتے پہلے میری خبر لیتے اور مجھے بھی ڈی میگارڈو کے پیچھے ایک لمبے سفر پر روانہ کر دیتے تھے۔

وہ دونوں لاش پر جھٹکے بغور اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کی پشت میری جانب تھی میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے قریب پڑا ہوا ایک وزنی پتھر اس شخص کی کھوپڑی پر دے مارا جو مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پتھر لگتے ہی اس کے حلق سے ایک کریہہ چیخ نکلی اور وہ زمین پر گر کر ترپنے لگا دوسرے آدمی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا مگر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے ایک اور وزنی پتھر اٹھایا اور اس کی کھوپڑی کی طرف اچھال دیا اس بار بھی میرا نشانہ خطا نہیں گیا اس آدمی کی بھی کھوپڑی کھل گئی اور وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح فرش پر گر کر ترپنے لگا۔

معاشرے کے دوسروں کو کاٹ پھینکا تھا۔

سازی کا پیشہ اختیار کر کے غلطی کی مجھے پولیس کے
ٹکٹے میں ہونا چاہیے تھا۔“

”ضرور۔“ اس نے سرد مہری سے کہا اس کا لہجہ
کچھ اس انداز کا تھا میں چونک کر اس کی طرف
دیکھے بغیر نہ رہ سکا شاید کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔

”تمہیں یہ جان کر دکھ ہوگا کہ موسیو میگاردو کا
قاتل پہلے ہی گرفتار ہو چکا ہے۔“ اس نے سانپ
کی طرح پھنکار تے ہوئے کہا۔

”میں نے لاش حاصل کرنے کے لیے دو آدمی
روانہ کیے تھے وہی دونوں جنہیں تم نے پتھر مار کر
شدید زخمی کر دیا۔ ان دونوں کا شمار فرانس کی پولیس
کے بہترین آدمیوں میں ہوتا ہے، لیکن اب وہ
ہسپتال میں بڑے ہیں۔“

”مگر..... مگر..... وہ..... تو.....!“ میں ہلکا کر
رہ گیا اور اس سے آگے کچھ نہ کہہ پایا۔ ساری بات
غلط فہمی کی تھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ فرانس کی
پولیس کے آدمی ہیں میں تو انہیں بین الاقوامی تنظیم
ساحرائی کے ایجنٹ سمجھا تھا جو اپنے پاس کے حکم
کے مطابق ڈی میگاردو کی زبان کاٹنے کے لیے
گڑھے میں اترے تھے۔

پولیس چیف نے مجھے درستی سے گھورا اور پھر
چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔
میں دل ہی دل میں ان دونوں کی جلد صحت
یابی کی دعا کرنے لگا۔ اگر وہ مر جاتے تو مجھ پر
فرانس کی پولیس کے دو بہترین آدمیوں کو نکل
کر دینے کے الزام میں مقدمہ بھی چل سکتا تھا۔
پہلے میں نیل جاتا پھر سوئے دار۔

غار سے باہر آنے کے بعد میں نے اس سمت
چلنا شروع کر دیا جہاں میری کار کھڑی تھی لیکن میں
بہ مشکل چند ہی قدم طے کر پایا تھا کہ مجھے چکرا گیا
اور میں بے ہوش ہو گیا بے ہوشی سے قبل مجھے
صرف اتنا یاد ہے کہ میں پتھروں پر گر پڑا تھا۔ اس
کے بعد مجھے گرد و پیش کا ہوش نہیں رہا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک
ہسپتال کے بستر پر پایا میری تیمارداری پر متعین
نرس نے مجھے بتایا کہ چند سیاح اتفاق سے اس
پہاڑی سلسلے پر جانکے تھے۔ انہوں نے مجھے بے
ہوش پڑے پایا تو اٹھا کر شہر لے آئے۔ میری کار
ان لوگوں کو کہیں نظر نہ آئی تھی۔ میں نے اثبات
میں گردن ہلا دی کار کے بارے میں مجھے فکر مند
ہونے کی ضرورت نہیں تھی وہ بعد میں بھی آ سکتی تھی
اسی دن مجھے ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا میں
پورے دو دن بے ہوش رہا تھا۔

دوسرے روز جب کہ میں اپنے ہوٹل کے بستر
پر بیٹھا سو پنی رہا تھا اور اپنے اس پیر کو دیکھ رہا تھا
جس پر پلستر چڑھا دیا گیا فرانس کی پولیس کا چیف
مجھ سے ملاقات کرنے آیا اس کا چہرے گھوڑے کی
طرح سخت اور آنکھیں سانپ جیسی چمکیلی تھیں۔

اس نے مجھ سے استفسار کیا کہ مجھے کیا واقعہ
پیش آیا تو میں نے جواب میں اسے پوری تفصیل
سے آگاہ کر دیا وہ خاموشی سے سنتا رہا میں خاموش
ہوا تو اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میرا خیال ہے موسیو، اپنے اس کارنامے پر تم
خود کو بہرے سمجھ رہے ہو گے۔“

”ہاں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”اب میں سوچتا ہوں کہ میں نے دندان

۴۵

قلندر و منارت

امجد جاوید

قلندر نو طرح کے ہوتے ہیں لہک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہی حاصل کرنے میں کلیباب ہو جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو نات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر ریچہ اور کتے نجانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے درد آہن کی ہے جو نات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا تسخیر کرنے کی نھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل ننگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران اس داستان کی انفرانیت کی گواہی آپ خود دین گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین ہی کرتی ہے۔

طرح انٹ ہو گیا۔ قدموں کی چاپ نہیں آ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جی تربیت یافتہ ہیں۔ میں نے سامنے دیکھا، بانیتا اور میرنی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے بتا دیا کہ وہ آ رہے ہیں۔ اس نے دروازے کی آڑ لے لی۔ اس نے ہاسٹل کا سیٹھی کیج پٹایا اور وہ فائرنگ کے لیے پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔

ایک دو منٹ کے اندر ہی وہ اوپر آ گئے۔ وہ چار تھے۔ ایک کے آتے ہی کسی سے کہا۔

”یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ نہ جمال اور.....“

”نہیں ہوں گے، دیکھو۔“ دوسرے نے حکمانہ انداز میں کہا۔ اسی لمحے وہ آگے آ کر پھیلنے لگے۔ اس طرح وہ مجھے دیکھ لیتے، میں جب تک ایک دو کو فز مارتا، تب تک وہ مجھے نشانہ بنا لیتے۔ اسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے بانیتا کور نے فائر کر دیا۔ اس لمحے انہیں سمجھ نہیں آئی کہ یہ فائر کس طرف سے ہوا ہے۔ میں نے اسی لمحے کا فائدہ اٹھایا اور تجمی میں نے ایک کے ہاتھ کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔

ہاسٹل سمیت اس کا ہاتھ اڑ گیا تو اس کے منہ سے بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ اس کے بعد موقع نہیں تھا۔ ان کی طرف سے کوئی چلی اور بانیتا کور بھی اگلا فائر کر چکی تھی۔ اس کے ساتھ میں نے فائر کر دیا۔ وہ واپس مڑنا چاہتے تھے یا نہیں، ابھی میں سامنے نکل کر ان پر فائر کرتا چلا گیا۔ وہ چاروں

میں نے بچتے ہوئے سیل فون کو جیب سے نکال کر دیکھا۔ اسکرین پر اسٹیشن نمبر جھلکا رہے تھے۔ پھر باہر کی جانب نظر دوڑائی۔ وہ لوگ اندر آ رہے تھے۔ میں نے بانیتا کور کی طرف دیکھ کر فون رسیو کر لیا۔ میرے ہیلو کے جواب میں کسی اجنبی نے کہا۔

”اسمارٹ مین، میرے بندے تمہارے پاس پہنچ چکے ہیں۔ امید ہے تم زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہیں کرو گے اور چپ چاپ ان کے ساتھ آ جاؤ گے۔“

”کون ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تفصیل میں تمہیں اس وقت بتاؤں گا، جب تم میرے سامنے اپنی موت کے لیے بھیک مانگ رہے ہو گے۔ میں.....“ وہ کہہ رہا تھا اور میں سمجھ گیا کہ وہ جو کوئی بھی تھا، کیا چاہ رہا ہے۔ میں نے سیل فون بند کر کے جیب میں رکھا اور تیزی سے اٹھا۔ بانیتا کور مجھے دیکھ رہی تھی، اس لیے مجھ سے پہلے ہی وہ اٹھ گئی۔

”یہ لوگ ہمارے لیے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سامنے کے واش روم میں حسمی۔ یہ چند قدم چلتے رہنے کے دوران اس نے اپنا ہاسٹل نکال لیا تھا۔ میں دوسری طرف بنے ہوئے ستون کے ساتھ لگ گیا۔ وہاں سے سیز جیوں کا سرا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے وہ سیزھیماں چڑھتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں پوری

چہروں پر کافی حد تک تشویش دیکھی تھی۔
میں نے بانیتا کو کو یہ سمجھایا تھا کہ وہ ایک دم سے
سیڑھیوں پر سے لڑھکتے ہوئے ایسے نیچے گرنی چلی جائے
جیسے کہ وہ بے ہوش ہے یا مر چکی ہے۔ ایک آدھ ٹائمنے کو
ان حملہ آوروں کی توجہ ہٹائی تھی لیکن اس سے پہلے
میں نے اسے کہا تھا کہ وہ اپنا ہاسٹل میری طرف پھینک
دے۔ وہ وہاں پر ان چاروں میں سے کسی کا بھی اسلحہ
استعمال کر سکتی تھی۔ چند لمحوں ہی میں اس نے پردے کے
ایک کپڑے میں ہاسٹل باندھ کر بالکل میرے اوپر تک
پہنچا دیا۔ میں نے لمبے لمبے وہ کھولا، اس کا میگزین دیکھا
اور مطمئن ہو کر اسے ایمیشن کے لیے کہہ دیا۔

میں غور سے شست باندھے ان پر نگاہیں گاڑے
ہوئے تھا۔ جو نبی ان کی توجہ ہٹی، انہوں نے گھوم کر
دیکھا، جی میں نے دونوں ہاتھوں سے پوری توجہ کے
ساتھ دو فائر کیے۔ ان کے ہاتھوں سے ہاسٹل نجانے
کہہ گئے، اس کے ساتھ ہی ان کے حلق سے چیخیں بلند
ہوئیں۔ میں نے اگلا لمحہ ضائع نہیں ہونے دیا۔ جس
وقت تک ان کی چیخیں کم ہوتیں، میں میز سے کود گیا تھا۔
بلاشبہ بانیتا کو بھی اٹھ گئی ہوگی۔ میرے قدم جو نبی زمین
پر گئے۔ وہ دونوں باہر کی جانب بھاگ کر آئے ہوئے
دکھائی دیئے۔

میں اسپرنگ کی مانند اچھلا اور ان دونوں کے درمیان آ
گیا۔ انہوں نے یہی سمجھا کہ میں ان پر وار کروں گا، لیکن
میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں ایک دم سے جھک گیا وہ
میرے اوپر سے الٹ کر باہر فرش پر جا گرے۔ اس سے
پہلے کہ وہ اٹھتے میں ان کے سر پر پتھر پھینچ گیا۔ اس وقت تک
بانیتا کو بھی آگئی۔ اس نے آتے ہی ایک بندے کے منہ
پر زور دار ٹھوک ماری۔ اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اس
کے منہ پر ٹھوک کر سید کی۔ وہ اونٹ کی کر یہ آواز نکال کر
وہیں ڈھیر ہو گئے۔

خطرہ ٹل جانے کا احساس کر کے لوگوں کی باتیں
شروع ہو گئیں۔ یہ ایسی صورت حال تھی، جس میں

فرش پر پڑے چیخ رہے تھے۔ بلاشبہ نیچے والوں نے اوپر آنا
تھایا پھر بھاگ جانا تھا۔ میں انہیں بھاگنے کا موقع نہیں دینا
چاہتا تھا۔ میں نے ہاسٹل کا میگزین بدلا اور سیڑھیوں کے
سرے پر دیکھنے لگا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے بانیتا کو کو
دیکھا۔ وہ پاؤں کی ٹھوک سے ان کا اسلحہ ان سے الگ کر رہی
تھی۔ وہ ایسا کر چکی تو میں نے اسے سیڑھیوں کے سرے
پر نظر رکھنے کو کہا۔ وہ میری جگہ آگئی تو میں تیزی سے شستے
کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ایک الماری کی کنڈی نہیں
تھی۔ میں نے اسے کھولا اور نیچے قدم رکھا اور ایک ہاتھ
سے جھول گیا۔ اسی لمحے مجھے اندر کا منظر دکھائی دیا۔ وہ منظر
دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا۔ مجھے ایک دم سے شاک لگا۔ ان
دونوں حملہ آوروں نے دو عورتوں اور چند بچوں کو برہمال بنایا
ہوا تھا۔ بچوں کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اگر ایک ہوتا تو
میں چشم زدن میں اس کا صفایا کر چکا ہوتا۔ وہ دو تھے۔ اگر
ایک مرتا تو دوسرا نقصان پہنچا سکتا تھا۔

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ میں نیچے بڑی آسانی
کے ساتھ جا سکتا تھا لیکن اوپر جانا بہت مشکل تھا۔ مجھے
اچھی طرح احساس تھا کہ بانیتا کو دوسری طرف نگاہ رکھے
ہوئے تھی۔ میں وہیں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر بہت مشکل
سے کھڑا ہونا چاہا لیکن میری حرکت سے آواز پیدا ہوئی۔
میں کوئی ایسی آواز بھی نہیں نکالنا چاہتا تھا، جس سے نیچے
کھڑے حملہ آور متوجہ ہو جاتے۔ میں نے جیب سے
سیل فون نکالا اور بانیتا کو کو فون کر دیا۔ اس نے بجائے
فون سننے کے چند ٹائمنے کے بعد کھڑکی میں آ کر دیکھا۔
وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ
دی ہوئی تھی۔ اس نے اشارے سے پوچھا، تو میں نے
سیل فون کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دوبارہ کال کر کے
نیچے کی صورت حال کے بارے میں بتایا۔ پھر اسے سمجھایا
کہ کیا کرتا ہے۔ اس وقت دو عورتوں اور بچوں کی زندگی کا
سوال تھا۔ بانیتا کو پچھتے ہٹ گئی تو میں نے بڑی احتیاط
سے خود کو اس طرح میز پر لٹایا کہ آواز تک پیدا نہیں
ہونے دی۔ اس بار جب میں نے ان حملہ آوروں کے

تنگ تخیلی سے کہا تو وہ میری لوکیشن پوچھنے لگا۔ میں نے بتایا تو وہ بولا۔

”آپ سیدھے اسی روڈ پر آتے چلے جائیں۔ پھر دائیں جانب آئیں گے تو نہر آجائے گی۔ تب تک میں پہنچ جاتا ہوں، میں کار میں سوار ہو گیا ہوں، میں قریب ہی ہوں۔“ اس نے روانی سے کہا۔ میں اگلے چوک کو دیکھنے لگا جہاں سے مڑنا تھا۔ ہم نہر پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے طارق کھڑا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ہم کون سی کار میں ہیں۔ میں نے کال کر کے اسے بتایا تو وہ اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ ہم اس کا تعاقب کرتے ہوئے ایک بنگلہ نما گھر میں آ گئے۔

”وہ منجھری اوھر ہی ہے۔ آپ خود اس سے پوچھ لیں۔“ طارق نے بتایا۔

”ان دونوں کو اتار دو، یہ ذرا خاص مہمان ہیں، ان کی خاطر داری کرو، ان کے ہاتھوں پر زخم ہیں، انہیں فرسٹ ایڈ دو پھر ان سے بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔

ننگے فرش پر ایک ادھیڑ عمر فریبہ ماٹل شخص اُدھ مو پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔

”کیں ہے وہ منجھری۔“ طارق نے بتایا تو میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ آواز سن کر اس نے پہ مشکل پونے کھولے، میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ وہ میری جانب خوف زدہ لگا ہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر یوں سرگرا دیا جیسے وہ مایوس ہو کر ہر طرح کی صورت حال کو قبول کرنے کا فیصلہ کر چکا ہو۔ میں نے اس کے بال پکڑے اور اس کا سر اٹھا کر پوچھا۔

”کیسے ہوا سب؟“

”جس وقت فیضان بٹ کی گاڑی پولیس ہیڈ کوارٹر کے سامنے پھنسی تھی، اس وقت تمہارے دو بندے ٹیکسٹری میں موجود تھے اور الطاف گجر بھی وہیں تھا۔ یاد ہے آپ کو؟“ اس نے یوں کہہ کر یاد دلانے کی کوشش کی جیسے یہ

ہمارے لیے خطرہ بڑھ جاتا۔ پولیس کو جواب دینا، وقت ضائع ہونا اور خواہ مخواہ تفتیش سے گزرنا، کئی ایسے مرحلے تھے۔ اس سے بہتر یہی تھا کہ ان دونوں کے لیے کریہاں سے نکل جائیں۔ میں نے فوری طور پر ان کی تلاشی لیتے ہوئے وہاں کے لوگوں کو کہا کہ فوراً رسی لائیں۔ جب تک ہم نے ان دونوں نے تلاشی کی تب تک ہمیں رسی دستیاب ہوگئی۔ میں نے دونوں کو باندھتے ہوئے بانیتا کور کو سمجھا دیا کہ اب کیا کرنا ہے۔ وہ تیار ہوگئی۔ جیسے ہی میں نے دوسرے کو باندھا، وہ کار کی جانب بڑھ گئی۔ وہ تیزی سے کار قریب لائی۔ اس کا دروازہ کھولا۔ ابھی ایک آدمی تیزی سے بولا۔

”ارے کیا کر رہے ہو بھائی، پولیس آتی ہی ہوگی۔“

ہم نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ ان دونوں کو اٹھا کر، کار کی پچھلی سیٹ کے درمیان رکھا۔ بانیتا کور نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ہم وہاں سے چل دیئے۔

”کدھر جاتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”فی الحال چلتے چلو۔ بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا اور سیل فون نکال لیا۔ میں نے طارق نذیر کے نمبر پر کال کی۔ میرے خیال میں اس نے سیل بھی نہیں سنبھنے دی تھی کہ فون پک کر لیا۔

”سر میں آپ ہی کو فون کر رہا تھا۔“ اس نے تیزی سے پر جوش لہجے میں کہا۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس بندے کا پتہ چل گیا ہے، جس کی وجہ سے آپ کے گھر پر حملہ ہوا تھا۔ وہی منجھری تھا، وہ ہمارے پاس ہے اسی نے بتایا۔“ وہ بولا۔

”اچھا میں یہ تفصیل تمہارے پاس آ کر سنتا ہوں۔ مجھے کوئی سیف ہاؤس بتاؤ، یا پھر ایسی جگہ جہاں دو غلط قسم کے بندوں کے ساتھ ہم بھی کچھ وقت گزار سکیں۔“ میں نے کہا تو وہ تشویش سے بولا۔

”اوہ! ایسا کیا ہو گیا سر؟“

”یار، آ کر بتاتا ہوں، نا، جلدی بولو۔“ میں نے کافی حد

بہت پرانی بات ہو۔ میں سمجھ گیا تھا۔

”آگے کہو۔“ میں بولا۔

”اس وقت مجھے فون کال ملی کہ میرے بیٹے کو اغوا کر لیا گیا ہے، انہوں نے میرے بیٹے کی آواز تک مجھے سنائی۔ میری بات کروائی اس سے۔“

”تمہارے بیٹے کا اغوا؟“ میں نے یوں پوچھا جیسے مجھے بہت حیرت ہوئی ہو۔ حالانکہ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ایک نئی کہانی گھڑے گا۔

”جی، میں یہی سمجھ رہا تھا کہ کوئی مجھ سے تاوان مانگے گا، جیسے آج کل اغوا برائے تاوان کی دبا چھلی ہوئی ہے۔“ اس نے کراسپتے ہوئے کہا۔

”تو پھر.....؟“ میں نے پوچھا۔

”انہوں نے مجھ سے کوئی رقم نہیں مانگی، بلکہ انہوں نے مجھ سے کام لینے کے بارے میں کہا اور جب انہوں نے مجھے کام بتایا تو میں نے سوچ لیا کہ اب نوکری تو چھوڑنا پڑے گی۔ اپنے بیٹے کی خاطر میں نے نوکری

چھوڑنے کا سوچ لیا تھا۔ دوسرا انہوں نے میرے بیٹے کو نقصان نہ پہنچانے کا وعدہ کیا تھا۔ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ یہاں رات سے کس طرح کے بندے کو رکھا ہوا تھا۔

انہوں نے مجھ سے تصدیق کی تو میں نے بتا دیا کہ بندہ ابھی تک ادھر ہی ہے۔ انہوں نے مجھے ان سب پر نگاہ رکھنے کو کہا۔ یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے

پائیں۔ جب تک وہ آئے آپ لوگوں کے بندے الطاف گجر کو نکال کر لے جائے تھے۔ پھر مجھے کہا گیا کہ میں اپنے مالک کو یہاں بلواؤں، میں نے اسے بلالیا۔

اس کے بعد مجھے نہیں پتہ۔ میرا بیٹا ابھی تک ان کے پاس ہے۔ وہ یوں بولا جیسے ابھی مر جائے گا۔

”انہوں نے تم سے کام کیا لیا؟“ میں نے تحمل سے پوچھا تو وہ بولا۔

”جب تک وہ پہنچے آپ کے بندے تو جا چکے تھے۔ انہوں نے یہی کہا کہ میں وہ بندے پہچان کر اسے دوں کہ وہ کون ہیں۔ میں نے اپنے ایک بندے کو ان کے

پیچھے لگا دیا تھا۔ مجھے یہ احساس تھا کہ اگر میں نے وہ بندے نہ پکڑوائے تو میرا بیٹا بازیاب نہیں ہوگا۔ میرا آدمی ان دو بندوں کا گھر دیکھ آیا۔ بعد میں انہیں گھر کا بھی پتہ چل گیا۔“

”کیا ملا تجھے، نہ بیٹا اور نہ نوکری، اب کہو گے کہ ان کے بارے میں بھی نہیں معلوم کہ وہ کون ہیں، کہاں کے ہیں، تم انہیں نہیں جانتے۔“ میں نے طنز یہ انداز میں کہا۔

”جی بالکل، میں نہیں جانتا۔ مگر میرے بیٹے کو انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ میری اس سے بات ہوتی ہے، اب شاید وہ اپنی ماں سے بات کرتا ہوگا۔“

”مطلب تم نے اپنے بندوں کے ذریعے ہمارے گھر کی نشاندہی کروائی اور انہوں نے ہمارے گھر پر حملہ کر دیا۔ اگر ہماری قسمت اچھی نہ ہوتی تو اب تک ہم منوں مٹی کے نیچے پڑے ہوتے۔ خیر۔ اب تم ہمارے مہمان

ہو۔ دیکھتے ہیں، وہ کون لوگ ہیں، جو ہم تک پہنچے۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اب کیا کرنا ہے اس کا؟“ طارق نے پوچھا۔

”یہ مہمان ہے۔ اسے کھانا دو، اب کچھ نہیں کہنا اسے۔ میں بعد میں بات کروں گا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور چل دیا۔ جیسے ہی کمرے میں آئے تب میں نے طارق سے کہا۔

”اس کا بیٹا واقعی ہی اغوا ہوا ہے تو، الگ بات ہے اور اگر نہیں، تب پھر معاملہ دوسرا ہوگا۔ اب پتہ یہی کرنا ہے کہ اس کا بیٹا اغوا ہوا تھا؟ اس کے بیٹے کا پتہ کرو۔ اس کے گھر کی اور گھر والوں کی خفیہ

گھرائی ہو۔“

”جی ہو جائے گا۔“ طارق نے کہا تو ہانپتا کور نے میرے کانہ سے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

”اوائے۔ بھوکا ہی مار دینا سے تو نے، کوئی روٹی کا بھی بندوبست ہے یا زری تفتیش ہی چلنی ہے۔“

”ہاں۔ یہ تو ہے۔“ میں نے یوں کہا جیسے اس کی بات سمجھ میں آئی گئی ہے تو اس نے بیڈ کے سرے پر رکھا تکیہ اٹھایا اور میرے دو سے مارا۔

تھی۔ میں سمجھ گیا کہ انہیں دو اور غیرہ بھی دے دی گئی ہوگی۔ میں ان کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور نری سے پوچھا۔

”کون ہو تم لوگ؟“

”ہم کوئی بھی ہیں، تم اپنا کام کرو، ہمیں مارو، ہماری بوٹی بوٹی کرو، دکھاؤ اپنی درندگی۔ مارو.....“ اس نے انتہائی نفرت سے مجھے گالی دی۔ ایک دم سے میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اندر سے ایک لہر اٹھی لیکن جس طرح یہ لہر اٹھی تھی۔ اسی طرح میں نے اس پر خود قاپو پایا۔

”میں یہ جانتا ہوں کہ تم دونوں مجرم نہیں ہو اور نہ وہ تھے، جو تم لوگوں کے ساتھ تھے۔ تمہا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ چونکہ اب وہ مر چکے ہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں ان کی آخری رسومات ان کے مذہب کے مطابق ادا کر دی جائیں۔ باقی تم لوگوں سے باتیں تو میں بعد میں بھی کر لوں گا۔“ میں نے انتہائی تحمل سے کہا تو میرے یوں کہنے پر ایک نے سر اٹھا کر اسی نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

”وہ نہیں رہا تو کوئی بات نہیں، اب اس کا جسم ہے، چاہے جلا دو یا دفنادو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”یہ تو کی بات ہے کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ وہ جس مذہب سے بھی تعلق رکھتے ہیں، میں..... میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ دوسرا کتائے ہوئے انداز میں بولا۔

”جو مرضی کرو۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔“

”لیکن ہمیں تو ہے۔“ میری پشت سے بانیتا کور کی آواز آئی۔ انہوں نے سامنے کھڑی بانیتا کور کو دیکھا پھر استہزا یہ انداز میں مسکرا دیے۔ میرے لیے یہ کافی حیرت والی بات تھی کہ یہ لوگ اتنے نڈر ہیں۔ لیکن دل نہیں مان رہا تھا کہ یہ نڈر ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی غیرت مند آدمی بچوں اور عورتوں کو برغمال نہیں بیٹاتا۔ میں نے دیکھا وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے یوں کھڑی تھی، جیسے ابھی ان پر برس پڑے گی۔

”تو کرتے رہو، ہم سے کیا پوچھ رہے ہو۔“ پہلے نے

”بس دس منٹ دے دیں مجھے۔“ طارق نے کہا اور جلدی سے سڑ گیا۔

تقریباً بیس منٹ بعد ان کے لیے نہایت پر تکلف کھانا تازہ دیا گیا۔ بانیتا کور نے سیر ہو کر کھایا۔ پھر چائے کا گم لے کر بیڈ پر جا بیٹھی۔

”اب تو کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ سکون سے سو جانے کو من کر رہا ہے۔ آؤ، کچھ دیر سکون سے سو جائیں۔“ اس نے خمار آلود آواز میں کہا تو میں ہنس دیا

”وہ جو ساتھ لائے ہیں ان.....“

”انہیں بھی دیکھ لیں گے۔ صبح تک وہ باتیں کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔“

”اگر سونا ہی ہے تو ناؤں چلتے ہیں۔“ میں نے رائے دی

”اب تو بٹنے کو بھی جی نہیں کر رہا اور تم ظالم ہو پھر سفر کرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔“ وہ تیشلی آواز میں بولی تو میں ہنس دیا

”ویسے تمہیں ادا کار ہونا چاہئے تھا۔ اسکرین پر دھمال ڈال دو، سچی۔“

”میرا تو ابھی دھمال ڈالنے کو بڑا دل کر رہا ہے، آؤ تا۔“ اس نے باقاعدہ بانیتا کور پھیلا کر کہا تو میں اپنا قبضہ نہ روک سکا تو وہ بھی کھل کر ہنس دی۔

ہم چائے پی چکے تو میں اٹھا اور نیچے والے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں ان دونوں کو رکھا ہوا تھا۔ وہ فرش پر پڑے تھے اور ان کی آنکھوں میں نفرت اٹل رہی تھی۔ مجرم چاہے کتنا بڑا ہو، اس کی آنکھ میں خوف ڈر آتا ہے۔ لیکن وہ جو کسی مقصد کے لیے نکلا ہو، اس کی آنکھ کچھ اور ہی بول رہی ہوتی ہے۔ یہ آنکھیں ویسی ہی تھیں جو کسی مقصد کے لیے لڑ رہے ہوتے ہیں۔ یہ تو انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ مقصد انسانیت کے لیے قابل قبول بھی ہے یا وہ حیوانیت اور شیطانت کے نرغے میں پھنس کر اسی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ میں ان کی آنکھوں میں جھانک کر کافی دیر دیکھتا رہا۔ ان کے ہاتھوں ہر سفید پٹی بانڈھی ہوئی

بھی اسی طرح اکتائے ہوئے انداز میں کہا جیسے ہم ان کے آرام میں خلل ڈال رہے ہوں۔

”تم لوگوں سے تو بہت کچھ پوچھنا ہے، دیکھو، ہم کتنے اچھے ہیں کہ تم دونوں سے یہ پوچھ رہے کہ کیسے بتاؤ گے، آرام سے یا ذلیل ہو کر۔“ بانیتا کور نے دانت پیٹتے ہوئے کہا تو دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا

”بندھے ہوئے.....“ دوسرے نے کہنا چاہا تو وہ آگے بڑھی اور اس نے قریب کھڑے ایک بندے کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”اسے کھول دو۔“

وہ بندہ آگے بڑھا اور اس نے دوسرے کو کھول دیا۔ وہ آزاد ہوتے ہی کھڑا ہوا گیا۔ مجھے لگا کہ وہ بانیتا کور سے زیادہ بھاری ہے۔ مگر میں بھی اس کا اعتماد دیکھنا چاہتا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ اس نے سامنے کھڑے اس بندے کو وار کرنے کی دعوت دی۔ وہ سرعت سے آگے بڑھا۔ اور اس نے جھکائی دے کر پوری قوت سے مکا اس کے منہ پر مارا مگر اس کی کوشش رائیگاں گئی۔

بانیتا کور نے اس کی کھائی پر ہاتھ مارا اور وہ بے ساختہ آگے جھک گیا، بانیتا نے اس کی گردن پر زور دار کھائی رسید کی، جس سے وہ اپنی ہی جوتک میں لڑکھڑاتا ہوا آگے دیوار کی جڑ میں جا گرا۔ بانیتا کور نے اسے اٹھنے نہیں دیا، پوری قوت سے پاؤں کی ٹھوکرا اس کے سر پر دے ماری اس کا سر دیوار سے لگا۔ وہ چکرا گیا۔ وہ رُک نہیں، اس نے اس کا سر پکڑا اور دو پارہ اسے دیوار پر دے مارا۔ خون کا فوارا اس کے سر سے نکل پڑا۔ بانیتا کور نے اسے کالر سے پکڑا اور تھپتھپ کر کمرے کے درمیان میں لے آئی۔ پھر اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ چند ثانیے میں وہ ادھ موا ہو گیا تو وہ ایک طرف ہو کر بولی۔

”اب اسے کھول دو، اور اس پر ٹھنڈا پانی ڈال دو۔“
”ٹھنڈی“ میں نے کہا اور پھر بندھے ہوئے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا خیال ہے؟“
وہ چند ثانیے سوچتا رہا پھر اس نے جیسی آواز میں

جواب دیا

”پوچھو، کیا پوچھنا ہے۔“

بانیتا کور ایک طرف پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔
”کون لوگ ہو تم؟“

میرے یوں پوچھنے پر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

”ہم بھارتی ہیں اور اپنے مشن پر ہیں۔“

”ہمارے پیچھے کیوں تھے؟“

”تم دونوں کو اغوا کر کے لے جانا تھا؟“ وہ بولا۔

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہیں، جہاں ہمارا پاس کہتا۔ اس سے زیادہ ہمیں کچھ پتہ نہیں۔“ وہ بولا۔

”کب سے یہاں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”دو سال ہو گئے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”میرے پیچھے ہی کیوں؟“

”کہنا پاس نے قسم دیا ہے کیونکہ ہمیں پتہ ہے کہ تم ہی الطاف گجر کو پکڑ کر لائے ہو۔ تم ہمارا نیٹ ورک تباہ کر دینا چاہتے ہو۔“ وہ نفرت سے بولا تو میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا

”جو کچھ تم کہہ رہے ہو، کیا اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ یقین جانو، ہمیں جانے دوں گا۔ کیونکہ تم ایک مقصد کے لیے لڑ رہے ہو۔ تم کوئی مجرم نہیں ہو۔“ میں نے کہا تو اس نے پہلی بار نرم انداز میں میری طرف دیکھا، پھر مایوسی سے بولا۔

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے پتہ نہیں، میرا پاس کہاں ہے، مجھے بس میرے ساتھی سے قسم ملا اور میں اس کے ساتھ چل دیا۔“

”ٹھیک ہے پڑے رہو، جب تجھے اپنے پاس سے رابطہ کرنے کا طریقہ معلوم ہو جائے بتا دینا۔“ میں نے کہا اور باہر چل دیا۔ دوسرا بے ہوش ہو چکا تھا۔ قریب کھڑے بندے نے اسے دوبارہ باندھ دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

کیا بچوں کی طرح کر رہی ہو۔“ وہ اکتاتے ہوئے بولا۔
 ”میں نے کہا تا کہ تمہاری باتوں پر میرا دل نہیں مان
 رہا ہے۔ اور اب اس کی وجہ مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کیوں
 ہے۔“ اس نے تنگ کر کہا۔

”اچھا، میرا مغز نہ کھاؤ، صبح وہ نوتن کو آ جائے گی ادھر،
 اس سے پوچھ لینا تفصیل کہ میں کہاں تھا۔ اگر چاہو تو ابھی
 پوچھ لو کہ میں کہاں تھا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سیل
 فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

”اچھا، غصے کیوں ہوتے ہو، بس تم نے کہا اور
 میں نے مان لیا۔“ اس نے عام سے انداز میں کہا۔
 ”تو پھر، یوں اجنبی کیوں لگ رہی ہو؟“ جسپال نے
 پوچھا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں تمہارے لیے چائے لانا بھول گئی، وہ لے
 آؤں۔ یا پھر کوئی کونجج دوں؟“

”ہر پریت۔! ادھر بیٹھو، میرے پاس اور بتاؤ بات کیا
 ہے؟“ جسپال نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ
 چند لمحوں کی طرف دیکھتی رہی، پھر بیڈ کے کنارے
 بیٹھ گئی تو اس نے پوچھا۔ ”بولو کیا بات ہے؟“

”میں بہت ڈسٹرب ہوں جسی، میری سوچیں مجھے
 پاگل کر رہی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔“ اس
 نے بے چینی کے سے انداز میں کہا۔

”کیسی سوچیں ہیں؟“ اس نے نرمی سے پوچھا۔

”یہی کہ یہ جو ہم ایکشن لڑنے جا رہے ہیں، کیا ہوگا

اس سے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ہم اسمبلی کی سیٹ
 جیت جائیں گے اور مجھے سو فیصد امید ہے کہ ہم جیت بھی
 جائیں گے لیکن اس کے بعد ہوگا کیا؟ پورے علاقے

میں جہاں صرف چند لوگ ہمارے دوست ہوں گے،

وہاں اس سے کہیں زیادہ دشمن پیدا ہو جائیں گے۔ ایک

خوشامدی ٹولہ بن جائے گا جو ہمیں گھیرے میں لے لے

گا۔ اگر ان کے کام ہوتے رہے تو وہ دوست دکھائی

دیں گے اور اگر کام نہ ہوئے تو یہی لوگ سازش کریں

گے۔ منافقت کریں گے اور دشمنوں کا ساتھ دیں گے، مان

رات کا پہلا پہرا بھی ختم نہیں ہوا تھا جب جسپال اوٹی
 بند پہنچ گیا۔ پھر پھوگجیت کو رکھانے کی میز پر بیٹھی ہوئی
 تھی۔ اس نے ڈرائیونگ روم داخل ہوتے ہی فتح بلائی تو
 پھو پھو نے جواب دے کہا۔

”تو پتر جلدی سے کھانے پر آ جا، میں تیرا انتظار کر رہی
 ہوں اور باقی سب کو بھی بلائی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ آواز دینے لگی۔ جسپال وہیں بیٹھ گیا۔ چند
 منٹوں میں سارے وہاں آ گئے۔ خوشگوار ماحول بن گیا۔

وہ وہاں بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ جسپال نے
 جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ رتن دیپ سنگھ نے ایکشن ہی کے
 لیے بلایا تھا۔ پارٹی میں ہر پل اوپر نیچے تو ہو رہی ہے۔
 ایسی ہی کچھ باتیں کر کے اس نے سب کو مطمئن کر دیا کہ
 وہ بہت اہم کام سے گیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں تھا اور ایسا ہونا ناممکن تھا کہ وہ

اپنے کمرے میں ہو اور ہر پریت اس کے پاس نہ ہو

۔ وہ ایزی ہو کر بیڈ پر لیٹا ہی تھا کہ ہر پریت آ گئی۔ وہ

حسب معمول اس کے پاس بیڈ پر نہیں بیٹھی، بلکہ قریب

بڑی ایزی چیئر پر سٹ کر بیٹھ گئی۔ جسپال نے پہلے تو

مخسوس نہ کیا، پھر چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے

حیرت سے پوچھا۔

”خیر تو ہے پریتو، یوں اجنبی ہو رہی ہو؟“

”کہاں تھے تم، اتنی رات کو اچانک نکلے؟“ اس نے

جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔

”بتایا تا کہ میں رتن دیپ سنگھ کے پاس گیا تھا۔ کیوں

تم شک کیوں کر رہی ہو؟“ اس نے ہر پریت کی آنکھوں

میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے شک نہیں یقین ہے۔“ اس نے اعتماد سے

کہا۔

”مطلب میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ اس نے

ناراضگی سے کہا۔

”مجھے نہیں پتہ۔“ وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی

”کوئی وجہ تو ہو، میرے جھوٹ بولنے، نہ بولنے کی،

پر اعتماد کیا ہی نہیں جاسکتا، ہم ہر طرح کے لوگوں کی نگاہوں میں آجائیں گے۔ وہ سکون وہ اطمینان، جو تھوڑا بہت ہمیں میسر ہے، وہ بھی نہیں رہے گا۔“ وہ یوں کہتی چلی گئی، جیسے وہ پھٹ پڑی ہو۔

”کیا چاہتی ہو تم؟“ ہسپال نے نرمی سے پوچھا۔
 ”یہ سب چھوڑو، میں انوجیت کو تو یہ نہیں کہہ سکتی، تمہیں تو کہہ سکتی ہوں۔“ وہ پھر یوں بولی جیسے اسے سمجھ نہ آ رہی ہو کہ وہ آخر کہنا کیا چاہتی ہے۔ ہسپال نے اس کا ہاتھ نرمی سے پکڑا اور پھر اسے قریب کر لیا۔ وہ ساری کی ساری اس کی طرف ہو گئی۔ ہسپال نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”پریتو! سچ بتانا، بات کیا ہے؟“
 وہ اس کے چہرے پر دیکھتی رہی، جیسے بہت کچھ کہنا چاہ رہی ہو پھر کچھ کھوں بعد بولی۔
 ”ہسپال! ہم کب تک بھاگتے دوڑتے رہیں گے، کالج لائف میں اک جوش تھا، عقل نہیں تھی، بہت کچھ کیا کیونکہ ہمیں لگتا تھا کہ اب کچھ دن ہی ہیں، جب ہم اپنی قوم کو آزاد کرالیں گے، لیکن اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ یہ اب ناممکن ہے، آزادی ہم سے بہت دور ہو گئی ہے، ہم لڑتے ہوئے مر جائیں گے اور شاید اگلی نسل ایسا کچھ نہ کر پائے۔“
 اس کے لہجے میں مایوسی تیر رہی تھی۔

”پھر کیا کرنا چاہتے ہو تم؟“ اس نے پوچھا۔
 ”میں کہ زندگی کو زندگی سمجھ لیں اور جو ہو رہا ہے اسے قبول کر لیں۔ خود سے ایسا کچھ نہ کریں جو زندگی کو ختم کرنے والا ہو، سکون بھی تو چاہئے نازندگی میں۔“ اس نے اپنی آنکھوں میں اُمید کے نجانے کتنے دینے جلائے کہا تو ہسپال آہستہ سے بولا۔

”پریتو! جیسا تو چاہے گی نا، ویسا ہی ہوگا۔ ہم ابھی اور اسی وقت ایکشن نہ لڑنے کا اعلان کر سکتے ہیں لیکن اس سے ہوگا کیا؟ ہم پر کوئی اعتبار نہیں کرے گا۔ ہم بہت آگے نکل آئے ہیں، بہت ساری جگہوں پر یہ طے کر لیا گیا ہے، اب واپسی ناممکن ہے۔“ ہسپال نے اسے

سمجھاتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن ابھی تو اتنی مشکل نہیں ہے، بعد میں تو.....“
 اس نے کہنا چاہا تو ہسپال اس کے ہاتھ کو دبا کر بولا۔

”زندگی یہ نہیں ہے جو تم چاہ رہی ہو۔ زندگی کا مقصد کچھ دوسرا ہے۔ میں ابھی تمہیں بتانے والا نہیں بلکہ تمہیں دکھاؤں گا زندگی ہوتی کیا ہے اور آزادی ایک دن میں نہیں مل جاتی۔ ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ ہم نے آزادی کی اس وقت قدر نہیں کی جب وہ ہمارے سامنے دھری ہوئی تھی۔ اگر ایک بار آزادی چھین جائے تو پھر بہت دیر بعد ملتی ہے۔ اب یہ آزادی بہت وقت بعد ملے گی اور بڑا خون بہانا پڑے گا۔ ہم جس سے آزادی مانگ رہے ہیں وہ کینہ دہن ہے۔ اور آخری بات، تم اتنی مایوس کیوں ہو گئی ہو، کب سے تم نے عقل کی باتیں سوچنا شروع کر دی ہیں؟“ اس نے بڑے پیار سے کہا۔
 ”مجھے ڈر لگتا ہے ہسپال، ہماری قربانی ہمارا لہو کہیں رائیگاں نہ چلا جائے۔“ وہ دکھ سے بولی۔

”ہمیشہ وہ لہو رائیگاں جاتا ہے، جس میں انسانیت سے محبت نہ ہو۔ ہم کسی کو نیچا دکھانے یا اپنی انا کے لیے نہیں لڑ رہے ہیں، ہمیں طاقت سے بھی غرض نہیں لیکن۔ اگر کوئی ہماری حرمت کو نقصان پہنچائے گا تو اس کے لیے معافی نہیں ہے۔ تناؤ کیا ہونی چاہئے معافی؟“ اس بار ہسپال بات کرتے ہوئے کافی حد تک جذباتی ہو گیا۔ اس پر وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“
 ”پریتو، میں سمجھتا ہوں کہ تم اس کی ہوتی ہو اور اوٹ پناہگ سوچتی رہتی ہو۔ خیر، اب تم مجھے ایک اچھی سی چائے پلاؤ، پھر میں تمہیں ایک مزیدار بات بتاتا ہوں۔“
 ہسپال نے یونہی کہہ دیا تو وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ ٹرے لیے واپس آ گئی۔

”وہ بھوتی لے کر آ رہی تھی۔ اب سناؤ مزیدار بات۔“
 اس نے ٹرے اپنے سامنے بیڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔
 ”مزیدار بات یہ ہے کہ بائیکاٹ کو اس وقت جمال کے

پاس لاہور میں ہے۔“ اس نے ایک دم سے کہا۔

”ارے واہ، وہ کیسے؟“ وہ کافی حد تک حیرت لے
جوش سے بولی۔

”بس چلی گئی اس کے پاس۔“ جسپال نے کہا۔

”کاش ہم بھی وہاں جاتے۔“ ہر پریت نے آہ

بھرتے ہوئے کہا تو جسپال بولا۔

”بس یہ ایکشن سے فارغ ہو جائیں، پھر شری ننگانہ

صاحب چلیں گے درشن کے لیے۔“ اس نے کہا اور

چاپے بنائی ہر پریت کے چہرے پر پھلتے رنگوں کو دیکھنے

لگا۔ سچی اس نے موضوع بدل دیا۔ وہ ایکشن کے بارے

میں بتانے لگی۔ یونہی ارد گرد کے گاؤں جانے کی باتیں۔

رات گئے وہ دونوں باتوں میں اٹھے رہے۔ یہاں

تک کہ انوجیت بھی ان کے پاس آ گیا۔ وہ ایکشن ہی کی

باتیں کرنے لگا۔ رات کے دوسرے پہر تک باتیں

کرنے کے بعد وہ سونے کے لیے چلے گئے۔

صبح کی روشنی بہت حد تک پھیل گئی تھی جب جسپال کی

آنکھ کھلی۔ اس کے پاس سوائے نوتن کور کا انتظار کرنے

کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ وہ دھیرے دھیرے تیار ہوا۔ اور

پھر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ کجیت کورہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔

وہیں اسے پتہ چلا کہ رات پنڈ کے ایک گھر سے لڑکی اغوا

ہوئی ہے۔ بھائی کی آنکھ کھلی تو اس نے مزاحمت کی، جس

پر انہوں نے بھائی کو فائر مار دیا۔ وہ بے چارہ وہیں مر گیا۔

اب نہ لڑکی کا پتہ ہے اور نہ لڑکی لے جانے والوں کا۔

انوجیت انہی کے گھر گیا ہوا ہے۔

”پھوپھو، یہ تو بہت برا ہوا، میں دیکھتا ہوں۔“ اس

نے اپنا سیل فون نکال کر کہا اور انوجیت کے نمبر ملانے

لگا۔ جلد ہی اس نے فون ریسیو کر لیا۔

”کچھ پتہ چلا؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، کوئی سراغ نہیں ملا، پولیس آئی تھی اور قانونی

کارروائی کر کے چلی گئی ہے۔ لاش بھی پوسٹ مارٹم کے

لیے لے گئے ہیں۔ اب دیکھیں۔“ وہ جواب میں بولا۔

”اچھا، میں آ رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر

دیا۔ وہ اٹھنے لگا تو کجیت کور بولی۔

”ناشتہ نہ کر کے جانا، وہاں پتہ نہیں کتنا وقت لگ

جائے۔“

”جی پھوپھو، جیسا آپ کہیں، اس نے کہا تو کجیت

کو راتھ کر چنن کی طرف چل دی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ بلیر سنگھ سٹیج کے پاس جا

پہنچا۔ وہ اپنے گھر ہی تھا اور پنچائت گھر جانے کے لیے

تیار ہو گیا تھا۔ جسپال کے جاتے ہی وہ اس کے ساتھ کار

میں بیٹھا اور ادھر چل دیا۔

”سٹیج جی، آپ کو کوئی اندازہ ہے یہ جو اغوا ہوئی ہے

لڑکی، یہ کون کر سکتا ہے؟“ جسپال نے اپنا کام شروع کر دیا

”ابھی دیکھتے ہیں، کیا نکلتا ہے۔ اصل میں یہ جو

لڑکیوں کے اغوا والے معاملات ہیں نا، ان میں آدھے

سے زیادہ وہ ہوتے ہیں جن میں لڑکیاں خود شامل ہوتی

ہیں۔ بس لوگوں میں یہ بات مشہور نہ ہو کہ لڑکی گھر سے

بھاگ گئی ہے۔ کچھ لوگوں کی آپس کی دشمنی کی بھینٹ

چڑھ جاتی ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی جرم ہو، مجھے

نہیں لگتا کہ کسی کی اتنی جرات ہوگئی ہے کہ وہ ایسا جرم

کرے، وہ اب پہلے والا ماحول نہیں رہا۔“ بلیر سنگھ نے

اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آپ کیسے یہ معلوم کر پائیں گے؟“ جسپال نے

پوچھا تو وہ بولا۔

”دیکھو بیٹا! سیانوں کی ایک کہاوت ہے کہ جہاں جرم

ہوتا ہے، سراغ بھی وہیں سے ملتا ہے۔ سب سے پہلے تو

ان کے دشمن کو شک کی زد میں لایا جاتا ہے۔ اور یہ کوئی نئی یا

انوکھی بات نہیں ہے یہاں۔ سبھی ایسا کرتے ہیں۔ وہ یا

اپنی صفائی دیتے ہیں یا پھر ایسا کوئی سراغ پامست دے

دیتے ہیں، جس سے بات آگے چلائی جاتی ہے۔ اگر

انہوں نے اپنی صفائی دے دی، تو بہت حد تک یہ معاملہ

صاف ہو گیا۔ اگر لڑکی کہیں دوسرے لڑکے کے ساتھ

بھاگی ہے تو بھی وہیں بات کھل جاتی ہے۔ کیونکہ خود کو

انزام سے بری کرنا ہوتا ہے نا مظلوموں نے۔“ سٹیج نے

بات چل رہی تھی لیکن ابھی کچھ بھی طے نہیں ہوا تھا۔ وہ لوگ ساتھ والے گاؤں کمونڈی بھارو میں رہتے تھے اور لڑکا اپنے کام کی غرض سے ٹوڈر شہر میں رہتا تھا اور وہیں کسی کے پاس ملازم تھا۔ ابھی تک ان دو خاندانوں میں بات اس لیے طے نہیں ہو پائی تھی کہ لڑکے والے جہیز کا کچھ زیادہ ہی مطالبہ کر رہے تھے۔ جبکہ لڑکی اس لیے نہیں مان رہی تھی کہ اسٹن لاپچی لوگوں کے ہاں وہ شادی نہیں کرے گی۔ والدین کا خیال تھا کہ وہ لوگ اگر کچھ کم جہیز پر راضی ہوئے تو یہیں ہاں کر دیں گے۔ وہ کچھ دیر ان کے گھر رہے اور پھر وہاں سے واپس آ گئے۔

جسپال نے پلیئر سنگھ پنچ کو اس کے گھر چھوڑا ہی تھا کہ ایسے میں نوتن کور کی کال آ گئی کہ وہ گھر پہنچ چکی تھی۔ جسپال کا من بہت بھاری ہو رہا تھا۔ وہ اسی دھی من کے ساتھ گھر آ گیا۔

نوتن کور ڈرائنگ روم میں ہی تھی اس کے پاس ہر پریت بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ ان کے سامنے کھانے کے لیے کو کافی کچھ رکھا ہوا تھا۔ جسپال ان کے پاس جا بیٹھا۔ نوتن کور نے ہی غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”خیر تو ہے نا جسپال، ایسے من کیوں بنا رکھا ہے؟“
 ”یار، بات ہی ایسی ہے، بہت دکھ ہو رہا ہے۔“ وہ آزرہ لکھے میں بولا۔

”اسکی کیا بات ہو گئی، وہی تو پوچھ رہی ہوں؟“ اس نے اچھتے ہوئے پوچھا تو جسپال نے سارا احوال کہہ دیا۔ تو وہ بھی افسردہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”بہت برا ہوا۔“

”وہ غریب لوگ ہیں، اگر قاتل مل بھی گئے نا، تو وہ ان کا کچھ نہیں کر پائیں گے۔“ ہر پریت نے کہا تو جسپال نے اس کی طرف دیکھ کر لبخ لہجے میں پوچھا۔

”ہر پریت۔! ان قاتلوں کا پتہ تو طے تم تو ایسے کہہ رہی ہو، جیسے تمہیں پتہ ہے کہ اس کے قاتل کون ہیں، اور کوئی بھی ان کا کچھ نہیں بچا زبایا۔“

”میں مانتی ہوں کہ مجھے نہیں پتہ لیکن تم جانتے ہو کہ

”اور اگر جرم ہو تو۔۔۔“ جسپال سے پوچھا۔

”تو پھر لوگ پولیس کی مدد لیتے ہیں اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو انصاف ملتا ہے۔ ایسا جرم کرنے والا اکثر ہمیشہ طاقتور بندہ ہی نکلتا ہے اور طاقت ور ہاتھ نہیں آتا۔“ وہ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

اسی خاموشی میں وہ پنچاٹ گھر جا پہنچے۔ وہاں بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر صرف کوئی قتل ہو گیا ہوتا تو شاید ایسے وقت میں یہ پنچاٹ نہ ہوتی بلکہ آخری رسومات کے بعد یہ سب ہوتا، لیکن چونکہ ایک لڑکی کا اغوا ہوا تھا، اس لیے پنچاٹ بلانا لازمی تھا۔ وہاں کیا فیصلہ ہوتا، یہی سننے کے لیے جسپال بھی وہیں بیٹھ گیا۔

تقریباً ایک گھنٹہ باتیں سنتے رہنے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ یہ کسی باہرہ کی بندے کا کام ہے۔ گاؤں میں ان کے رشتے داروں ہی سے ان کی پتلاش تھی۔ انہوں نے نہ صرف سفائی دے دی تھی، بلکہ آئندہ بھی ان کا کوئی جرم ثابت ہو جائے تو وہ ہر طرح کی سزا کے لیے تیار تھے۔ سبھی لوگوں کا اس پر اتفاق تھا کہ لڑکی بہت اچھی تھی، کسی نے اس میں ایسا کچھ نہیں دیکھا تھا کہ کوئی شک بھی کیا جا سکے۔ طے یہی پایا کہ پولیس سے مدد لی جائے اور خود بھی کوشش کی جائے۔

جسپال وہاں سے اٹھ گیا۔ اس نے پلیئر سنگھ پنچ سے بڑے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

”یہ تو کچھ بھی نہ ہوا پنچ جی، جب تک پولیس اس لڑکی تک پہنچے گی، اس کا پتہ نہیں کیا حشر ہو جائے گا۔ وہاں ان کی دسترس ہی میں نہ رہے۔“

”اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ کوئی سراغ تو ملے جہاں کوشش کی جائے، اب جیسے ہی ملے گا، کچھ کرتے ہیں۔“ وہ دونوں اس گھر میں گئے جہاں کی لڑکی اغوا ہوئی تھی۔

اوچھڑ عمر ماں باپ کے ساتھ ایک چھوٹا بھائی تھا۔ بہن اغوا ہوئی اور بھائی بہن کو پچاتا ہوا مارا گیا تھا۔ ان پر تو قیامت گذر رہی تھی۔ وہیں سے پتہ چلا کہ لڑکی کی ایک جگہ

سوال

ایک سفید پوش آدمی ایک مالدار کے پاس پہنچا اور بولا ”جناب بے روزگار ہوں، روزگار دلوادیتے ہیں۔“

مالدار آدمی بگڑ کر بولا۔ ”ابے میں نے لوگوں کو روزگار دلانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا؟“ اس شخص نے نہایت عجز و انکساری سے کہا۔

”جناب میں تین روز سے بھوکا ہوں روزگار نہیں دلواسکتے تو روٹی کے لیے ہی کچھ پیسے دیتے ہیں۔“

مالدار آدمی اور بھی غصہ اور طیش میں آ کر کہنے لگا۔

”کیا بک بک لگا رکھی ہے؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے، ہر روز تم جیسے کئی فراڈیے آتے رہتے ہیں یہاں۔“ یہ سن کر سائل نے جیب سے پستول نکالا اور کہنے لگا

”اب تو غالباً میری مالی مدد کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا.....؟“

جاوید احمد صدیقی..... راو پینڈی

ایسے جرم کون لوگ کرتے ہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر پولیس کی بجائے ہم ان قاتلوں کی تلاش کریں تو جلدی ان تک پہنچ جائیں گے۔ وہ مایوسانہ لہجے میں بولی۔

”ہر پریت یہی ہے وہ ضرورت، جس کی وجہ سے ہمیں طاقت اپنے ہاتھ میں لینی ہے۔ بے شک دشمن پیدا ہوتے ہیں، لیکن طاقت کے آگے، بہت کم لوگ سر مارتے ہیں، سو دفعہ سوچتے ہیں۔ یوں بے بس نہیں ہونا پڑتا۔ بتاؤ، یہی معاملہ اگر ہمارے ساتھ ہوتا تو ہم کیا کرتے۔ یہ جنگل ہے ہر پریت، اس میں کیسے رہنا ہے یہ اب ہمیں جانوروں ہی سے سیکھنا ہوگا۔ انسان اب مہذب نہیں رہا۔ درندہ بھی بھوک لگنے پر شکار کو نکھتا ہے، جبکہ انسانوں کی ان بستیوں میں ہر وقت صیادگات لگائے بیٹھا ہے، شاید ان کی بھوک متی ہی نہیں۔“ جہپال جیسے ایک دم ہی سے پھٹ پڑا تھا۔

”جہپال! تم پر سکون رہو، رت مہراں کرے گا، تم پریشانی مت لو۔“ یہ کہہ کر وہ لہجہ بھر کو خاموش ہوئی پھر اس سے پوچھا۔ ”کیا پولیس سے تم ذاتی طور پر ملے ہو؟“

”نہیں، ابھی تو نہیں ملا۔“ اس نے جواب دیا۔
”دیکھتے ہیں، وہ کیا کرتے ہیں۔“ نوتن نے کچھ ایسے کہا کہ جہپال کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ کس طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ ایک دم سے پر سکون ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

میں نے بانیتا کور کے ساتھ بڑے سکون سے ناشتہ کر کے فہیم کو فون کیا۔ میں نے یہاں آتے ہی اس اجنبی ”باس“ کا نمبر اسے دے دیا تھا کہ جس نے مجھے دھمکی لگائی تھی۔ یہ سب اسی کے لوگ تھے۔ وہ چاروں تو مر گئے۔ پولیس انہیں اٹھا کر لے گئی تھی۔ باقی دو ادھر پڑے ہوئے تھے۔ میڈیا پر بہت کچھ ہوتا رہا تھا۔ جسے میں نے تھوڑا بہت سنا، پھر دھیان ہی نہیں دیا۔ فہیم سے کہا تھا کہ وہ پتہ کرے یہ کس کا نمبر ہے؟ لیکن باوجود رات گزر جانے کے وہ ابھی تک بتا نہیں پایا تھا۔ دوسری نیتل پر کال

رہی کرتے ہوئے اس نے مایوسی سے کہا۔
”ابھی تک اس کے بارے میں پتہ نہیں چلا، میں نے اروندا اور رونیت سے بھی مدد لی، مگر پتہ نہیں چلا۔“
”کہیں ان کے پاس تو وہی کچھ نہیں ہے جو ہمارے پاس ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”دنیا بہت آگے چلی گئی ہوئی ہے۔ اگر یہ نیکینا لوجی ہمارے پاس ہے تو کسی دوسرے کے پاس بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو ہے اس کا تو زنجی مل سکتا ہے، میں نے سلمان سے بات کی ہے، وہ بھی مصروف ہے، اس نے رابطہ نہیں کیا۔ اروندا بھی اسی تلاش میں ہے۔“ اس

نے مجھے پوری تفصیل بتادی۔

”فون پر، وہ بھی ہمارے لیڈر کو مانتا تھا، وہ ہمیں ساری تفصیل بتاتا تھا۔“ اس نے اسی لہجے میں جواب دیا

”کون تھا لیڈر؟“ میں نے سوال کیا

”وہ شاید مر گیا ہے۔ وہ ان چاروں میں سے ایک تھا جو اوپر تم دونوں کے پاس گئے تھے۔“ دوسرے نے کہا یہی تھا اور میں مزید کہنے لگا تھا کہ میرا سیل فون بج گیا۔ میں اسکرین پر دیکھا تو ایک دم سے مسکرا دیا، پھر کال ریسیو کرتے ہوئے اسپیکر آن کر دیا، اس کی ہیلو کمرے میں گونج گئی تو میں نے قبقبہ لگاتے ہوئے کہا۔

”بھئی واہ، ابھی تمہارے بندوں کے ساتھ تمہارا ہی ذکر کر رہا تھا۔ میں ان سے پوچھ رہا تھا کہاں گیا وہ چوہا، کس بل میں ہے، کس دے کر غائب ہو گیا ہے۔“

میرے کہنے پر وہ مجھ سے بھی اونچا قبقبہ لگاتے ہوئے بولا۔

”میں کہیں بھی نہیں ہوں اور تمہارے بالکل قریب ہوں، یہ جانتے ہوئے بھی تمہیں ابھی کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ بہت لمبا کھیل کھیلنا چاہتا ہوں جمال، تو ابھی سے مجھے تلاش کرنے لگ گئے ہو۔ ابھی تو میں نے تمہیں کچھ بھی نہیں کہا۔“

”جھوٹ بولتے ہو تم، اگر تم اتنے ہی طاقتور ہو تو میرے سامنے آؤ، پھر چاہے جتنی مرضی لمبی انگلیز چلے، میں کھیلوں گا۔ ورنہ میں نے تمہیں تلاش کر لیا تو تمہارا کھیل ختم کر دوں گا۔“ میں نے بڑے تحمل سے کہا۔

”نہیں ایسے نہیں جمال۔۔۔۔۔۔ جب میں کھیلنے کا کہہ رہا ہوں تو آؤ۔۔۔۔۔۔ کھیلو۔ جیت ہار کے بغیر کھیل کیسے ختم ہو سکتا ہے اور ہاں۔۔۔۔۔۔ اگر میں ہار گیا تو خود اپنا آپ تیرے حوالے کر دوں گا اور۔۔۔۔۔۔ اگر جیت گیا تو تجھے مرنا ہوگا۔“

اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”تم کھیلنا چاہتے ہو تو کھیلو، میں تجھ تک پہنچ جاؤں گا، پھر فیصلہ میں کروں گا اور ہاں جھوٹے سے اور چھپ کر وار مرد نہیں کرتا۔“ میں نے اس سے تضحیک آمیز لہجے میں کہا

تو وہ قبقبہ لگاتے ہوئے بولا۔

”اب اسے تلاش تو کرتا ہے، کیسے ہوگا، یہ تو وہی جانتے ہیں نا جو اس کے ماہر ہیں۔“ میں نے کہا۔

”مجھے امید ہے، ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔“ وہ اعتماد سے بولا تو میں نے اس سے کہا۔

”اوکے، میں انتظار کر رہا ہوں۔“

میں نے سیل فون بند کر کے جیب میں رکھا اور اٹھ گیا۔ پھر مختصر انداز میں باغیتا کو کو بتایا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس کمرے کی طرف چل پڑے جہاں ان دونوں کو رکھا ہوا تھا۔ اس وقت نیچر سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں اسے بعد میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ مجھے ان دو بندوں سے دلچسپی تھی۔

وہ دونوں فرش پر بندھے ہوئے چت پڑے تھے۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ویسی ہی نفرت تھی جو میں نے رات کے وقت دیکھی تھی۔ جس نے باغیتا کو رے مار کھانی تھی، وہ ذرا بھی نام نہ نہیں تھا۔ جبکہ دوسرا میری جانب یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں اسی سے بات کروں گا۔ میں نے باری باری دونوں کو دیکھا اور کہا۔

”دیکھو بھئی، تمہارے پاس نے مجھ سے تو رابطہ نہیں کیا اب تک، اگر تم لوگوں کو کوئی طریقہ آتا ہو تو بتاؤ؟“ میرے اس سوال پر ان میں سے کوئی بھی نہیں بولا

تو میں نے پھر سے اپنا سوال دہرا دیا۔

”اوئے بولو۔“ باغیتا کو نے ان کے پاس آ کر پوچھا۔

”چلو یہ بتا دو، کہ وہ کون ہے کہاں ہے، میں خود مل لیتا ہوں جا کر؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمیں اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ وہ یہاں اس ملک میں ہے یا کہیں دوسرے ملک میں موجود ہے۔ ہمیں تو حکم ملتا ہے اور ہم اسی پر عمل کرتے ہیں۔“

دوسرے نے دھمے لہجے میں جواب دیا

”کیسے ملتا ہے حکم؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ فلسفے چھوڑو اور آج کی حقیقت والی بات کرو۔“

وہ تیزی سے بولا۔
”میں نے پتہ کیا تھا۔ وہ انوا تو ہوا تھا، اور اب بھی
.....“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رکا، پھر بولا۔ ”نہیں،
میں پھر سے دیکھتا ہوں۔“

”گڈ بوائے، اچھی طرح دیکھنا، مجھے کچھ اور ہی دکھائی
دے رہا ہے فی الحال۔“ میں نے کہا اور بانیتا کور کے
ساتھ باہر کی جانب چل پڑا۔

میں ناؤن والے نئے گھر میں جب پہنچا تو وہاں
سکوت تھا۔ وہ باس میرے ذہن پر سوار ہو گیا تھا۔ وہ مجھے
جانتا بھی تھا، میرے قریب بھی تھا، میری انتہائی احتیاط
کے باوجود مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ یہ تجسس ہی بہت زیادہ تھا
کہ وہ کون تھا؟ اس پر وہ میرے اتنے قریب تھا کہ میرے
بارے میں جان لیتا تھا۔ یہ کیسے؟

اس وقت بانیتا کور نیچے نیم اور مہوش کے پاس چلی گئی
تھی۔ باقی سب بھی یہیں موجود تھے۔ میں کمرے میں تنہا
تھا۔ میں اس باس کے بارے میں جتنا بھی سوچتا، میرا
ذہن اسی قدر بکھر جاتا۔ میں اس بارے میں سب سے
بات کرنا چاہتا تھا، مگر اس وقت وہ سارے ہی باس کا نمبر
اور اس کی لوکیشن تلاش کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ پھر
اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ جس طرح مجھے
کارخانے کے مالک زوہیب کے بارے میں پتہ چلا تھا،
وہی ہی تو جہانگاہ کر دیکھوں۔

میں نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور بیڈ سے نیچے قالین پر
آ بیٹھا۔ میں نے پوری توجہ یہ سوچنے پر لگا دی کہ وہ کون
ہے اور میرے بارے میں کیسے جان لیتا ہے۔ چند لمحوں
ہی میں میرے دماغ سے ساری سوچیں ہٹ گئیں۔
میں نے خود کو خلا میں محسوس کیا۔ میری بند آنکھوں کے
سامنے بننے والے دائرے ختم ہو گئے اور وہاں پر اس طرح
رنگ پھیلنے لگے، جیسے کئی لوگ ان رنگوں کو اڑا رہے
ہوں۔ وہ لوگ تو دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن مختلف
رنگ اڑتے اور فضا میں جا کر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو
جاتے۔ وہ رنگ مختلف بادلوں کی صورت اختیار کر

ہے تو اپنے دو بندے لے جاؤ، میرے پاس بندھے
ہوئے پڑے ہیں۔ بے چاروں نے بہت مار کھائی ہے۔
وہی بندے جنہیں تو نے میرے لیے بھیجا تھا تاکہ وہ مجھے
پکڑ کر تیرے پاس لے آئیں، بے چارے۔“ میں نے
انسوس ناک انداز میں کہا۔

”او چھوڑو جمال، ایسے کیڑے مکوڑے پتہ نہیں کتنے
روزانہ کا کروچ کی طرح مرتے ہیں، دو بلٹ ان کے
دماغ میں اتارو، وہ بھی میری طرف سے، کیونکہ ایسے
لوگوں کی مجھے کوئی ضرورت نہیں، وعدہ رہا کہ ان کے
مرنے کے عوض میں تمہارے چار بندوں کی جان بخش
دوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے ہتھ ہلکا دیا۔

”چلو انتظار کرو میرا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر
دیا۔ میں نے فون واپس جیب میں رکھتے ہوئے ان کی
طرف دیکھا۔ فطری طور پر ان کے چہرے مایوسانہ حد
تک مسخ ہو گئے تھے۔

”تمہارا باس بہت چالاک ہے، کہہ رہا تھا کہ تم لوگوں
کو مار دوں۔ اس کی بات مانوں گا تو بھی اسی کا فائدہ اور
زندہ چھوڑوں گا تو بھی وہی فائدہ میں رہے گا، کیسا؟“
میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”جو تمہارا دل چاہے۔“ دوسرا مردہ لہجے میں بولا اور
اس نے اپنا سر زمین سے لگا دیا۔ وہ مایوس ہو چکا تھا۔ میں
اٹھا اور بانیتا کو باہر جانے کا اشارہ کر کے چل دیا۔ سامنے
ہی طارق نذیر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے کچھ
چھپاتے اور تھوڑا بتاتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے انہیں کسی جیل میں رکھوا دیا جائے۔
بعد میں دیکھیں گے۔“

”اور وہ نیچر باس کا کیا کرتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”وہ اگر آج کوئی بات بتاتا ہے تو ٹھیک، ورنہ اسے
بھی ان کی طرح جیل میں رکھوا دو اور یہ پتہ کرو کہ اس کا بیٹا
واقعی ہی انوا ہوا تھا یا یہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ میں نے کہا تو

”ظاہر ہے، مجھے ان کو اپنے ساتھ لے کر جانا ہے۔ ان کے بغیر تو کام نہیں چلے گا، لیکن سارے تو نہیں جائیں گے۔ ہاں جنید اور علی نواز تو تم اپنے پاس رکھ لو۔“ اس نے مشورہ دیا

”نہیں، تم انہیں بھی لے جاؤ۔ اپنا سیٹ اپ بنا لو۔ پھر اس کے بعد دیکھیں گے کیا ہوتا ہے، اس وقت پتہ نہیں کیا صورت حال ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”میں نے اپنا سیٹ اپ دوہی میں بنانا ہے۔ یہ سب تو نہیں جاسکیں گے نا وہاں پر۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”لیکن تم دوہی میں تو نہیں رہو گی نا، کراچی تو آنا ہوگا، ان لوگوں کی تمہیں وہاں ضرورت ہوگی اور پھر تم سب سے میرا رابطہ رہے گا۔ جب بھی اور جس کی مجھے ضرورت ہوگی، میں بلا لوں گا۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھ لیں، یہاں پر آپ کا کام چل جائے گا؟“ اس نے پوچھا۔ تو مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیوں نہیں، بلکہ میں اب کہوں گا کہ تم سب لوگ جاؤ، ممکن ہے میں بھی وہیں کراچی آ جاؤں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں تیرے پیچھے پیچھے دوہی چلا آؤں۔“

میری اس بات وہ مسکرا دی۔ پھر خوشگوار لہجے میں بولی۔

”چلیں، یہ تو اچھا ہوگا کہ تم وہاں آ جاؤ، کچھ دن سکون سے کٹ جائیں گے۔ پھر پوری پوری پلاننگ کے ساتھ نیا کام شروع کریں گے۔“

”اوکے، جیسا تم چاہو۔“ میں نے اطمینان سے کہہ دیا۔ میں اس سے مزید بحث نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے تھوڑی دیر گپ شپ کے بعد وہ جانے کو تیار ہوئی۔

دوپہر تک وہ لوگ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہیں ایک نئی پٹنی کی فلائٹ سے سینیں مل گئیں۔ وہ سبھی تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ دار سے نے ان سب کے لیے کھانا تیار کیا ہوا تھا۔ وہ سب نے مل کر کھایا اور پھر وہ سب نکل گئے۔

اس وقت دوپہر ڈھل چکی تھی۔ میں اور بانیتا کورلان

جاتے۔ جب تبھی وہ بادل بیٹے تو ان میں سے مجھے ایک شہر کا منظر نظر آتا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں فضا میں ہوں یا ہوائی جہاز میں بیٹھا نیچے کسی شہر کا منظر دیکھ رہا ہوں۔ پھر میں فضا میں فلا بازیاں کھاتا ہوا نیچے آنے لگا۔ یہاں تک کہ میں ایک سڑک پر جاؤں۔ میرے ارد گرد بہت سارے لوگ آ جا رہے تھے۔ ہر بندے کا اپنا رنگ تھا۔ میں نے اپنے رنگ پر غور کیا تو میرا رنگ بھی مختلف تھا۔ مجھے وہ نیلا اور ارغوانی کالا جلا لگا۔ وہ مجھے دھواں کی صورت دکھائی دے رہا تھا۔ جو اوپر کی جانب اٹھ جاتا تھا۔ میں جس بندے کو بھی دیکھتا، وہ بھی دھواں کی مانند تھا۔ وہ دھواں بھی اوپر کی جانب اٹھ رہا تھا۔ اچانک وہ منظر ہٹ گیا۔ ایک معمول کی زندگی میرے سامنے تھی اور پھر وہ منظر بھی ہٹ گیا۔ میں اپنے آپ میں آ گیا۔ دروازے میں گیت کھڑی حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ بولی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے تم ایسے قالین پر کیا کر رہے ہو؟“

”میں بہت تھک گیا تھا، یہ جسم کو سکون دینے کی ایک مشق ہے، وہ کر رہا تھا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر سکون سے کہا تو کچھ نہ سمجھتے ہوئے اندر آ گئی۔ میں اٹھ کر

بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے ان سب کی کوششوں کے بارے میں بتاتی رہی اور میرا ذہن ان مناظر کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا، جو میں کچھ لمحے پہلے دیکھ چکا تھا۔ وہ سب کیا

تھا، مجھے اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ان مناظر کو سمجھنا کچھ دیر کے لیے موقوف کیا اور گیت کی بات سمجھنے لگا

”میں نہیں سمجھتی کہ اب میں اس جگہ پر اپنا پردہ کشن

باؤس چلا پاؤں گی۔ وہ جگہ اب غیر محفوظ ہو گئی ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو کیا خیال ہے تمہارا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں واپس کراچی چلی جاتی ہوں۔ وہیں پر کام کرنی ہوں۔“ اس نے اپنا خیال بتایا

”تو اس کا مطلب ہے، باقی کچھ لوگ بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔“ میں نے پوچھا۔

میں کرسیوں پر بیٹھے ہاتھیں کر رہے تھے۔ مجھے ان سب کے جانے پر بلکا سا جدائی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں انہی کی باتیں یاد کرتے ہوئے اس بتا رہا تھا کہ کتنا اچھا وقت ان سب کے ساتھ گزارا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم اداں ہو رہے ہو۔“ بانیتا کور نے پر شوق نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”ساتھ چاہے چند دن کا ہو، احساس تو ہوتا ہے نا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی، بتانا، مجھے اسی طرح یاد کیا تھا۔ جب تم پہلی بار امرتسر سے آئے تھے؟“ اس نے اسی طرح پر شوق نگاہوں سے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔ ایمانداری سے بتاؤں گا۔ تم مجھے بہت عرصہ تک یاد آتی رہی ہو۔ تب تک ہم دو بارہ نہیں مل گئے۔“ میں نے پوری سچائی سے بتایا تو اس کی آنکھیں تک مسکرا دیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ میرے سیل فون پر چوہدری اشفاق کے نمبر جگمگانے لگے۔ میں نے کال ریسیو کی تو وہ سکون سے بولا۔

”یار۔! کوئی نورنگر آنے کا ارادہ ہے؟“

”کیا ہوا، کوئی خاص کام؟“ میں نے پوچھا۔

”خاص ہے بھی اور نہیں بھی۔ وہ جو ملنگ اور جوئی رام لعل تم یہاں چھوڑ گئے تھے، وہ اب بھی یہیں ہیں۔ میں نے ان میں تو کوئی خاص بات نہیں دیکھی، لیکن چند دنوں سے ان کے پاس کچھ لوگوں کا آنا جانا بڑھ گیا ہے۔ وہ بندے مجھے مشکوک لگتے ہیں۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور دوسری پلچل تو نہیں ہے علاقے میں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، ابھی تک تو نہیں ہے۔ لیکن میرا دماغ کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں میں کوئی گڑ بڑ ہے۔“ اس نے الجھتے ہوئے کہا تو میں نے ایک دم سے فیصلہ کر لیا۔

”ٹھیک ہے، میں چکر لگاتا ہوں۔ تم ان لوگوں کا ٹیچکانہ معلوم کر کے رکھو۔ دیکھ لیتے ہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ پھر کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فون بند

کر دیا۔ فون رکھ کر میں نے بانیتا کور کو اس جوگی اور ملنگ کا قصہ سنانے لگا۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔ پھر ایک دم سے بولی۔

”چل یار۔! ادھر تیرے نورنگر ہی چلتے ہیں۔ ایک دو دن ادھر گزار کے آتے ہیں۔ تب تک کوئی بات سمجھ میں آ جائے گی، اس باس کے حوالے سے۔“ بانیتا کور نے یاد دلایا تو مجھے کچھ گھٹنے پہلے کا منظر یاد آ گیا جو میں نے مراقبہ کی سی کیفیت میں دیکھا تھا۔ ایک بار تو میرا دل کیا کہ میں وہ منظر بانیتا کور کے ساتھ شیئر کروں، پھر ایک دم سے ارادہ بدل دیا۔ جب مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تو پھر اس کے ساتھ دماغ ہی کھپا نا ہے۔ سبھی میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”چل اٹھ پھر تیار ہو جا، چلیں۔“

میرے یوں کہنے پر وہ اٹھ گئی۔

میں نے اپنے ساتھ دارے کو بھی تیار کر لیا۔ نجانے کب کا وہ نورنگر نہیں گیا تھا۔ میں نے دارے کو چلنے کا کہہ دیا تو وہ دوسرے ملازم بھی چل گئے، وہ میاں بیوی، کب کے یہاں آئے ہوئے تھے۔

”اچھا، پھر تم لوگ ایسا کرو۔ ان دنوں بزرگوں کو بھی ساتھ لے لو، انہیں بھی اپنے ساتھ نورنگر لے جاؤ۔ جتنے دن رہنا ہوگا، رہو۔ ان بزرگوں کو چاہے جوہلی میں چھوڑ دینا۔ ایک ہفتہ تک تم لوگ خوب گھوم پھر لو۔ ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو سبھی خوش ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ ایک دو دن نورنگر رہ آؤں گا پھر یہاں کے ساتھ وقت گزاروں گا۔ بانیتا کور بھی ساتھ آ جائے گی۔

”ٹھیک ہے، ہم پھر وہ فور ورنل گاڑی لے جاتے ہیں۔“ دارے نے تیزی سے اجازت چاہی۔

”چل لے جا۔ ہم آ جائیں گے۔“ میں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

جب میں تیار ہو کر واپس آیا تو بانیتا کور بالکل بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اور بالکل کوئی پنجاب کی منیارد دکھائی دے رہی تھی

”یہ کپڑے کہاں سے لیے؟“

دروازہ کھولا۔ بانیتا کور نے وہ سارا سامان جلدی سے پھینکی
سیٹ پر رکھا، جو رکھتے ہی بکھر گیا۔ سب سے اوپر کچھ
پرفیوم کی بوتلیں تھیں۔ وہ جو گری تو ان میں سے دو نوٹ
گئیں۔ کار میں تیز مہک پھیل گئی۔

”اوہ۔! یہ کیا ہوا یار۔“ وہ جھنجھلاتے ہوئے بولی۔
”کچھ نہیں ہوا، پرفیوم ضائع ہو گیا۔“ میں نے ہنستے
ہوئے کہا تو وہ ملتتے ہوئے بولی۔

”میں نے ٹیکر آتی ہوں، بس ایک منٹ ٹھہرو۔“
”چلو آ جاؤ، کچھ اور بھی ہیں۔“ میں نے کہا تو میری
بات سنی ان سنی کرتی ہوئی دوکان میں گھس گئی۔ میں نے
وہ دونوں بوتلیں اٹھائیں تاکہ انہیں باہر پھینک دوں اور
ان کی تیز مہک سے نجات ملے۔ میں نے جیسے ہی وہ نوٹوں
ہوئی بوتلیں اٹھائیں، ان میں پڑا ہوا پرفیوم میری کپڑوں
پر گر گیا۔ میں نے وہ بوتلیں باہر پھینک دیں اور ڈرائیونگ
سیٹ پر آن بیٹھا۔ میں نے دروازے کھول دیئے تاکہ وہ
مہک ختم ہو جائے۔ پانچ منٹ کے دوران بانیتا کور پلٹ
آئی۔ اس نے دو کی بجائے چار بوتلیں خرید لی تھیں، وہ
اس نے ڈیش بورڈ پر رکھ دیں اور ہم چل پڑے۔

”ہم جدھر سے گزرتے جا میں، ادھر سے خوشبو
بکھرتی چلی جائے گی۔“ بانیتا کور نے کہا اور بچوں کی طرح
ہنس دی۔ جبکہ مجھے وہ مہک اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

اس وقت ہم شہر ہی میں تھے۔ سورج غروب ہو گیا
تھا۔ تبھی مجھے خیال آیا تو میں نے کہا۔

”یار کھانا نہ کھائیں۔ یہاں سے نورنگر کا فاصلہ چار اور
پانچ گھنٹوں کا ہے۔“

”کچھ نہیں ہوتا، رستے میں کچھ دیکھ لیں گے یا
وہیں چل کر کھائیں گے۔“

اس نے کہا تو میں نے پوری توجہ ڈرائیونگ پر لگا
دی۔ تقریباً دو گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد میں پینڈول
لینے کے لیے ایک فلنگ اسٹیشن پر رکا۔ وہیں ایک ہوٹل
بھی تھا۔ اسے دیکھتے ہی بانیتا کور نے کہا۔

”ارے یہاں تو ڈھابہ بھی ہے، ہمیں سے کچھ کھا پانی

”میں نے اور گیت نے خریدے تھے۔ باقی میں نے
کافی کپڑے رکھ لیے ہیں۔ کیسی لگ رہی ہوں؟“ اس
نے میری طرف دیکھ کر مصنوعی شرمابٹ سے کہا تو میری
ہنسی نکل گئی۔

”اچھا چلو، نکلو، مجھے چوہدری اشفاق کے لیے کچھ
چیزیں بھی خریدنی ہیں۔“ میں نے کہا تو اس نے قریب
پڑے بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ دیکھو! میں تیار ہوں، چلو۔“ اس نے کہا تو میں
نکل پڑا۔ میرا رخ مارکیٹ کی طرف تھا۔

”کیا خریدنا ہے اس کے لیے؟“ بانیتا کور نے یونہی
پوچھا تو میں نے ہنستے ہوئے بتایا

”پچھلی بار جب میں نورنگر گیا تھا تو چوہدری اشفاق
نے بڑے مان سے ایک بات کہی۔“

”کیا؟“ اس نے پوچھا۔
”کہنے لگا کہ چھاکے سے مجھے چوہدری اشفاق تو بنا
دیا ہے۔ اب میرا کھرا کھاؤ بھی ایسا ہونا چاہئے۔ اب آؤ تو
شہر سے کپڑے، پرفیوم، اور وہ ساری چیزیں لے کر آنا
جس سے بندے کی شہور شہور بنے۔ بس اس کی شہور شہور کا
سامان لینا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں ہنس دیا۔ تو وہ بھی
کھلکھلا کر ہنس دی۔

”یار یہ تعلق، یہ رشتے یہ ناتے، جن پر مان ہوتا ہے،
جنہیں ہم اپنا کہہ سکتے ہیں، ان کے لیے کچھ کرتے وقت
کتنا اچھا لگتا ہے۔“ وہ بڑی ادا سے بولی۔

”ہاں ایسا ہی ہے۔“ میں نے کہا تو ہم ایسے ہی باتیں
کرتے ہوئے مارکیٹ جا پہنچے۔

تقریباً دو گھنٹے تک یونہی جو کچھ میں آیا اس کے لیے
خریدتے رہے۔ ہمیں شاپنگ کرتے ہوئے کوئی دیکھتا تو
بلاشبہ ہمیں اتاڑی کہتا۔ اسی دوران گیت کا فون آ گیا کہ وہ

لوگ کراچی پہنچ چکے ہیں۔ ابھی ایئر پورٹ سے نکل رہے
ہیں۔ ہم شاپنگ بیگز سے لدے واپس گاڑی تک آئے

۔ میں نے اپنا سامان بانیتا کور کے دوڑوں ہاتھوں میں
پکڑے ہوئے سامان کے اوپر رکھ دیا اور چابی نکال کر

تائیں؟“

اس کے لہجے میں بے بسی صاف سمجھ میں آ رہی تھی۔

”میں اپنے گھر میں ہوں۔ اترم میں ہمت ہے تو میرے سامنے آ جاؤ اور پھر تمہارا دعویٰ کدھر گیا کہ تم ہر وقت مجھ تک پہنچ سکتے ہو، میرے قریب ہو اور“ میں نے اسے مزید غصہ دلاتے ہوئے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔ بانیتا کو میری باتوں سے اندازہ لگا چکی تھی کہ فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ میں نے انتہائی اختصار سے اسے بتایا تو وہ بولی۔

”پہلے پتہ تو کرو، گھر کا؟“

ارد گرد کے کسی بندے کا فون میرے پاس نہیں تھا۔ میرے پاس اس سیکورٹی گارڈ کا نمبر بھی نہیں تھا۔ وہ دارے کے پاس تھا۔ میں نے دارے کو فون کرنے کا سوچا ہی تھا کہ اس کا فون آ گیا۔

”او جمال، جس گھر سے ہم آئے ہیں، کسی نے وہاں راکٹ لانچر اور بم مار کر پورے گھر کو اڑا دیا ہے۔“ تمہیں کس نے بتایا؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنے پولیس والوں نے۔“ اس نے تیزی سے بتایا۔ ”سیکورٹی گارڈ کہاں تھا؟ وہ وہاں پر اس لیے کھڑا رہا کہ لوگ آئیں اور بم مار کر چلے جائیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے بھی پوچھا تھا پولیس والوں سے، انہوں نے بتایا کہ وہ شدید زخمی ہے اور اسپتال میں پہنچا دیا گیا ہے، انہوں نے آتے ہی اسے گولیاں ماری تھیں۔“ اس نے تیزی سے بتایا۔

”تم کہاں پر ہو؟ اور پولیس والوں کو اپنے بارے میں کیا بتایا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں ابھی نور گھر پہنچا ہی ہوں اور انہیں بھی یہی بتایا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”ٹھیک ہے میں آتا ہوں کچھ۔“ میں نے کہا اور چند لمحے سوچ کر طارق نذیر کو فون کر دیا۔ اسے ساری صورت حال بتا کر کہا۔

”اسے دیکھ لینا، اب ہم نے وہاں واپس نہیں جاتا،

”یہاں سے کھالیتے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ اتر گئی۔ میں نے پیٹرول لیا اور ایک جانب کار پارک کر کے اس کے پاس جا بیٹھا۔ وہاں دش خاصا کم تھا۔ شاید رات کا پہلا پہر تھا۔ اس لیے ٹرک اور دوسری گاڑیاں نہیں رک رہی تھیں۔ ہم نے بڑے سکون سے کھانا کھایا۔ اس وقت چائے پیتے ہوئے بانیتا کو خاموش تھی کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ میں نے اسکرین پر نگاہ کی۔ اسی پاس کا فون تھا۔ میں کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو۔“ میں نے بڑے سکون سے کہا۔

”کہاں ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا تو مجھے اچانک اس کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی کہ اس کا تو یہ دعویٰ تھا کہ وہ ہر وقت میرے قریب ہے، یہ اب کیوں پوچھ رہا ہے۔ میں نے ایک لمحہ میں سوچا اور جواب دیا۔

”اپنے گھر میں ہوں۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اس نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے پوری طرح یہ احساس کر لیا کہ اس کے لہجے میں وہ پہلے والی خوشگواریت نہیں تھی۔

”تم یقین نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

”میں اس لیے یقین نہیں کر سکتا کہ ابھی چند منٹ پہلے میرے لوگوں نے تمہارے ہاؤس والے گھر کو لاپتروں سے اڑا لیا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ تم وہاں ہو اور فوج گئے ہو۔“ وہ تیزی سے بولا تو میں نے مزید اسے تپاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے تم نے بموں سے گھر کو اڑا دیا ہوگا لیکن میں تو گھر میں ہوں۔ اور تم سے بات کر رہا ہوں اور پھر میرے مرنے کی خبر مجھے سنار ہے ہو، حیرت ہے۔ ابھی تو ہم نے کافی لمبی آنکڑھیلی تھی۔ اپنے وعدے سے بھی مکر گئے ہو۔ مجھے مار کر۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں طنز اتر آیا تھا۔

”تم اپنے گھر میں نہیں ہو۔“ اس نے غصے میں کہا تو

تجھی میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی، اب یہاں نہ ماں تھی اور نہ سوہنی۔ مجھے یوں لگا جیسے ساری حویلی ہی ویران ہو۔ میں چلتے ہوئے ڈرلینگ روم میں جا بیٹھا پیچھے ہی وہ دونوں آگئے۔ حویلی کے ملازمین کو پتہ چل گیا تھا کہ میں آ گیا ہوں۔ وہ آنے لگے۔ چوہدری اشفاق نے کھانا لگانے کا کہا تو بانیتا کور نے بتایا کہ ہم ایک ڈھاپہ ہوٹل سے کھا آئے ہیں، چائے وغیرہ پی جاسکتی ہے۔ وہ انہی باتوں میں مصروف تھے کہ باس کی کال آگئی۔

”تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تم بچ گئے ہو، ورنہ آج تمہارا کام ختم ہو جانے والا تھا۔“ اس نے غصے اور مایوسی سے لے لے میں یوں کہا جیسے اسے بری شکست ہو چکی ہو۔
 ”دیکھو، تم جو کوئی بھی ہو، اپنی بات پر قائم رہنے والے نہیں ہو۔ ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جو کافی بے غیرت قسم کے ہوں۔ چھپ کر وار کرنے والا بے غیرت ہی تو ہوتا ہے، جس کے باپ کا کوئی پتہ نہیں ہوتا، لہذا، اگر مجھ سے دشمنی لینی ہی ہے تو مردانگی دکھاؤ، بیجڑوں سے میں نہیں لڑتا۔“ میں نے انتہائی طنز یہ لہجے میں کہا۔

”تم مجھے ایسے اشتعال نہیں دلا سکتے ہو، میں چاہوں تو ابھی تمہیں ختم کر سکتا ہوں، لیکن میں تم سے کھیل.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔

”بکواس بند کرو، اور اگر ہمت ہے تو میں لاہور کے مال روڈ پر، ایک ریسٹوران میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میں دیکھ لوں گا تمہیں۔ ایک گھنٹے کی تمہیں مہلت دیتا ہوں۔ مجھے تلاش کرو، میرا وعدہ ہے میں خود کو تیرے حوالے کر دوں گا اور نہ تلاش کر سکے، تو تم اپنی شکست مانتے ہوئے خود اپنے آپ کو میرے حوالے کر دینا، کیسا ہے یہ کھیل؟ آؤ، اب میں تمہارے ساتھ کھیلتا ہوں۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو، تم زیادہ دیر تک میری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتے ہو۔“ اس نے انتہائی غصے میں کہا تو میں چونک گیا۔ کیا اس وقت میں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوں؟ جیسے ہی مجھے یہ

سیکورٹی گارڈ کا ہر ممکن خیال کرنا۔“
 ”آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔“ اس نے کہا تو مجھے خیال آیا۔
 ”اور ہاں۔ وہ میجر کے بیٹے کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟“

”آپ نے درست ٹریک دیا تھا۔ مجھے تھوڑا پتہ چلا ہے، تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔“ اس نے تیزی سے کہا۔
 ”اوکے۔“ میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ ہم نے کپڑے نہیں رکھے۔ بل دیا اور کار میں آ بیٹھے۔

میرے سامنے سوالیہ نشان تھا۔ اس باس کا دعویٰ بالکل غلط تھا کہ وہ میرے قریب ہے۔ اصل میں وہ مجھ تک نہیں پہنچ پاتا تھا صرف اپنی ذہانت سے مجھے چکر دینے کی کوشش کرتا تھا۔ اور اگر وہ درست تھا تو اس بار وہ دھوکا کیسے کھا گیا؟ میں اور بانیتا اسی بارے میں باتیں کرتے ہوئے سفر کرتے چلے گئے۔ یہ سفر حل نہ ہوا۔ یہاں تک کہ نورنگر آ گیا۔

ہم نورنگر پہنچ گئے۔ تمام راستے میرا طارق سے رابطہ رہا۔ وہ مجھے وہاں کے بارے میں بتاتا رہا۔ بانیتا کور پہلی بار یہاں آئی تھی۔ جیسے ہی ہم حویلی کے گیٹ پر آئے، چوہدری اشفاق سامنے آ گیا۔ گیٹ کھل گیا۔ میں نے جب تک کار پورچ میں روکی تب تک چوہدری اشفاق ہمارے قریب آ گیا۔

”جی آیاں لوں بانیتا۔“ اس نے پورے خلوص سے کہا۔

”بہت مہربانی چوہدری اشفاق، لو میں تمہارے لیے چھیلانی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کار سے شاؤنک بیگ نکالنے لگی۔ تجھی چوہدری اشفاق نے پوچھا۔
 ”یار اتنا تیز پرفیوم، تو نے پہلے کبھی نہیں لگایا تھا، یہ کیوں؟“

”یہ تیرے لیے لائی ہوئی ایک پرفیوم کی شیشی نوٹ گئی تھی۔ وہ مجھ پر گرئی۔ ابھی کپڑے بدلتا ہوں۔ یہ مہک چلی جائے گی۔“ میں نے کہا اور اندر کی جانب بڑھا۔

خیال آیا تو میں چونک گیا۔
 ”اب بھاگومت، آؤ، مجھے پکڑو، تمہیں تو معلوم ہونا چاہئے کہ میں کس جگہ پر ہوں؟“ میں نے کہا تو وہ خاموش رہا تب میں بولا۔ ”حملہ کر کے بھاگ جانے والوں کے باپ کا پتہ نہیں ہوتا، دنیا میں دو طرفہ کے لوگ ہیں، بے غیرت اور منافق اور یہ اپنے باپ کے نہیں ہوتے، بار جانے کا اعلان کرو اور خود کو میرے حوالے کرو، یا پھر مجھے آ کر پکڑ لو، مزاحمت نہیں کروں گا۔“

بہت چھوٹا ہوا گیا۔ وہ اصل میں قتل کو چھپائیں گے۔ ممکن ہے کہ وہ لڑکی کو بھی.....“ یہ کہتے کہتے وہ رک گئی۔ پھر دھی لہجے میں بولی۔ ”سوان و جوہات پر نگاہ رکھی جائے، جن کی وجہ سے وہ لڑکی اغوا ہو سکتی ہے یا ہوئی ہے، قاتل خود بخود واضح ہو جائیں گے۔“ اس نے اپنی بات کہہ دی۔
 ”تو یہ بتا کہیں سے کریں؟“ جسپال نے پوچھا
 ”دو جگہ ہیں، ایک تھانہ اور دوسرا اسی لڑکی کی کوئی کنبلی، ان سے بات آگے بڑھے گی۔“
 ”جہاں تک تھانے کا معاملہ ہے اگر انسپکٹر نے بات چھپانا چاہی تو وہ کبھی بھی ہمیں اصل بات نہیں بتائے گا اور اگر.....“ جسپال نے کہنا چاہا تو نون بولی۔
 ”پریشان مت ہو، ابھی کچھ دیر میں پتہ چل جائے گا۔ میں نے گرین کور سے کہا ہے۔ وہ اسی انسپکٹر کے سیل فون کو ٹریس کر رہی ہے۔ ان دونوں میں اس کا جس سے سب سے زیادہ رابطہ ہوا ہے، وہ سامنے آ جائے گا، اسے دیکھ لیتے ہیں۔“
 ”اور وہ کنبلی والا معاملہ؟“ جسپال نے پوچھا۔
 ”وہ دوسرا آپشن ہے، وہ میں اور ہر بریت دیکھ لیں گے۔“ اس نے سکون سے کہا اور دور کہیں دیکھنے لگی۔
 ”میں کروں اس سے بات؟“ جسپال نے بے تابی سے کہا۔
 ”کر لو، مگر وہ ذمہ دار لڑکی ہے، اپنا کام کر رہی ہوگی، مطمئن ہو کر ہی فون کرے گی۔“ نون نے کہا۔
 ”ویسے یہ سلمان نے ہمیں جو سیل فون دے دیئے ہیں، یہ بھی کمال کی چیز ہے، کہیں ٹریس نہیں ہوتا۔ ورنہ ہم ابھی تک پکڑے گئے ہوتے۔“ جسپال نے ہنستے ہوئے کہا۔
 ”جی تو سہی، لیکن کب تک، میں سوچ رہی تھی جس دن اس سے بھی بڑھ کر کوئی ٹیکنالوجی آئی، یا سوفٹ ویئر مارکیٹ میں آ گیا، تب کیا ہوگا، ہمیں شاید پتہ بھی نہ چلے۔“ نون کور نے بھی ہنستے ہوئے کہا اور تھوڑے سے فاصلے پر موجود نیوب ویل کی جانب بڑھ گئی۔ جسپال بھی

اس نے جواب نہیں دیا اور فون بند کر دیا۔ مجھے تھوڑا بہت سمجھ آنے لگی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے ایک خاص دوست کو فون کیا اور اسے سمجھاتے ہوئے اس ریستوران کے بارے میں بتایا اور اسے سمجھا دیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ میں بعد رابطہ کروں گا۔
 ہن..... ہن..... ہن.....
 دوپہر کے بعد ہی کا وقت تھا جب نون کور اور جسپال کھیتوں کی طرف نکل گئے تھے۔ سامنے سرسبز و شاداب فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ ملکی ملکی ہوا چل رہی تھی۔ صاف اور شفاف ہوا، جسے سینے میں اتارتے ہوئے بھی سکون ملتا تھا۔ اصل میں وہ اسی لڑکی کے بارے میں بات کرنا چاہتے تھے۔
 ”نون کور مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ جرم کس نے کیا ہے؟“ اس نے بات بڑھائی
 ”جہاں تک میں نے اب تک سنی ہوئی بات پر تجزیہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ وہ فقط لڑکی ہی اغوا کرنے آئے تھے۔ درمیان میں بھائی آیا تو وہ قتل ہو گیا۔ اگر ہم دونوں جرائم کو ساتھ ملا کر سوچیں گے تو کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ صرف لڑکی کے اغوا کو سامنے رکھیں گے تو کوئی سراغ ہاتھ لگنے کا امکان ہو سکتا ہے۔“ نون نے انتہائی سنجیدگی سے اپنی رائے دی تو اس نے پوچھا۔
 ”تمہاری اس رائے دینے کی وجہ یا بنیاد کیا ہے؟“
 ”کیونکہ اغوا ایک سنگین جرم تو ہے ہی، اس پر قتل ہو جانا سنگین تر ہو گیا۔ اب مجرموں کے لیے اغوا کا معاملہ

۲۰۱۵ مارچ

نوتن کور نے مایوسی سے کہا اور اٹھ کر دوسرے صوفے پر
سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”کیا مشکل ہوئی؟“ جسپال نے پوچھا۔

”اب اس میں پارٹیاں آجائیں گی، جھوٹ اور سچ کی
تمیز نہیں رہے گی، میں کہتی ہوں کہ یہ نہ ہو۔“ وہ پھر مایو
سانہ لہجے میں بولی۔

”اچھا دیکھتے ہیں۔“ جسپال نے کہا اور انوجیت کا
فون ملانے لگا، کچھ ہی دیر بعد مل گیا تو اس نے اسپیکر آن
کرتے ہوئے پوچھا۔

”کہاں ہو؟“

”میں ادھر ہوں میلان پور میں، ادھر ایک جلسہ ہے
اور پچھ لوگوں سے ملنا بھی ہے۔“ اس نے تفصیل بتادی
”مجھے یہ بتاؤ، ٹیڈر میں جگندر سنگھ کون ہے؟“ جسپال
نے پوچھا۔

”وہی، جو ہمارے مخالف ایکشن لڑنے کی تیاری کر رہا
ہے، وہ ہماری تیسری بڑی مخالف پارٹی ہے۔ اگر ہم نہ
ہوں تو وہ ایکشن جیت سکتا ہے۔“

”کیسا بندہ ہے وہ؟“ اس نے پوچھا۔

”اچھا نہیں ہے، جرائم پیشہ ہے، لوگ اس کے شر سے
اس کی عزت کرتے ہیں، کیوں کیا ہوا؟“ انوجیت نے
پوچھا تو اس نے کہا۔

”مجھے شک ہے کہ وہ انخواہونے والی لڑکی، اس ہی کی
کارستانی ہے۔“

”ممکن ہے، لیکن اسے ثابت کرنا اور ثابت ہو جانے
پر لڑکی کا برآمد کرنا بہت ہی مشکل ہے، یوں کہہ لیں شیر
کے منہ سے نوالا کھینچنا، کیونکہ وہ ایک قتل بھی اس کے ساتھ
کروا چکا ہے۔ اگر یہ سب ہو بھی جائے تو وہ کون سا اس
نے کیا ہوگا۔ ایسے۔۔۔ اس نے مزید کہنا چاہا تو جسپال
نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”میں دیکھ لوں گا تم اپنا کام جاری رکھو۔“ یہ کہہ کر اس
نے فون بند کر دیا۔ پھر ہر پریت کی طرف دیکھ کر بولا۔
”جوئی سے ہو، چائے پی پلاوے۔“

اس کے ساتھ چل دیا۔

انہیں وہاں کھڑے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ گرلین
کور کا فون آ گیا۔ اس نے بات کی تو اس نے فون جسپال
کی جانب بڑھا دیا۔ جسپال نے فون پکڑا اور کان سے
لگاتے ہوئے کہا۔

”ہاں گرلین کور۔! کیا بنا پھر؟“

”جسپال ویرے ایک ہی نمبر ہے، وہ بھی ٹیڈر سے
ہے۔ ان پر باتیں ہوتی ہیں۔ اس بارے میں جتنی بھی
تفصیلات مجھے ملی ہے، وہ میں نے میل کر دی ہے۔ وہ
دیکھ لیں، اگر وہ آپ کے کام کی ہوئی تو۔“ وہ چپکی۔

”ہم دیکھ لیتے ہیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔“ جسپال
نے کہا اور چند اودھائی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ بات
کرنے کے بعد وہ کھیتوں میں نہ ٹھہر سکے فوراً ہی واپس گھر
پلٹ آئے۔ اس نے راستے ہی میں ہر پریت سے کہہ دیا
تھا کہ لیپ ٹاپ کھول لے۔ دن منٹ میں جب وہ
ڈرائنگ روم میں آئے تو وہ لیپ ٹاپ کھولنے لگی تھی۔
جسپال نے اپنا ای میل بکس کھولا اور گرلین کی میل دیکھی۔
اس میں ویسے گئے نمبر کے آگے جگندر سنگھ لکھا ہوا تھا۔ اس
وقت کتنی دیر کی کال ہوئی، یہ بھی دیرن تھا۔

”وہ لڑکی کتنے بچے انخواہونے لگی؟“ نوتن نے پوچھا تو
ہر پریت تیزی سے بولی۔ ”بہن کوئی رات کے دو بجے
ہوں گے، یہی وقت بتایا تھا انہوں نے۔“

اور یہ دیکھو جسپال۔“ نوتن نے ایک وقت کے دوران
پرانگی رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک گھنٹے بعد کال ہوئی ہے
اور پھر مسلسل صبح تک وقفے وقفے سے کال ہوتی رہی
ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ جگندر سنگھ کون ہے؟ یہ ساتھ
میں اس کا پتہ بھی ہے۔“

”نام تو سنا سنا سا لگ رہا ہے۔“ ہر پریت نے کہا پھر
ایک دم چونک کر بولی۔ ”ارے یہ وہی تو نہیں ہماری
مخالف پارٹی کا سیاست دان۔ میرا خیال ہے یہ ایکشن بھی
لڑ رہا ہے؟“

”اگر وہی ہے تو، بہت مشکل درپیش ہو سکتی ہے۔“

”میں کہتی ہوں۔“ ہر پریت نے کہا اور اٹھ گئی۔

وہ چند قدم دور گئی ہوگی کہ نوتن نے ہسپتال کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کیا ہر پریت کو روکنا اپنے نئے گروپ کے بارے میں نہیں پتہ یا.....؟“

”نہیں اور اس کے بارے میں ابھی اسے بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے، راز جس قدر اپنے درمیان میں رہے اتنا ہی اچھا ہے۔ میں اسی لیے محتاط تھا۔“ ہسپتال نے اسے سمجھایا۔

”تو پھر تمہیں کسی طور بھی بات کرنے کی ضرورت نہیں، میں دیکھ لیتی ہوں سب، شام تک اس بارے پتہ چل جائے گا کہ وہ لڑکی اس گنڈر کے پاس ہے کہ نہیں۔“ نوتن نے حوصلہ افزاء لہجے میں کہا۔

”کیا کروگی، انہیں بتاؤ گی۔ کیا وہ سب اتنی جلدی آ جائیں گے؟“ ہسپتال نے پوچھا۔

”اوئے میں نے اسی وقت ان سب کو بتا دیا تھا، جب یہاں میں نے یہ بات سنی تھی۔ دراصل رات میری بلدیوں سگھ سے بات ہوئی تھی۔ بچن کو تو بہت زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔“

”بچن کو، وہ کیوں..... مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو ان کے پاس جا کر پتہ چلے گا۔“ یہ کہہ کر وہ لہجہ بھر کر رکی، پھر کہتی چلی گئی، ”میں نے انوجیت کے ایکشن

کے بارے میں بلدیوں سگھ بتایا تو وہ بہت زیادہ پر جوش ہو گیا تھا۔ اس نے کہا کہ اچھا ہے، ہمارا کوئی بندہ تو ہوگا

پارلیمنٹ میں۔ وہ یہی پلان کر رہا تھا کہ اسے جتوانا ایسے ہے۔ اسی لیے وہ آج دوپہر سے پہلے ہی کمودر میں آ گئے

ہوئے ہیں۔ ابھی میں انہی کے پاس چلی جاؤں گی۔ میرے خیال میں اب تک وہ کوئی نہ کوئی کام تو کر رہی تھیں

ہوں گے۔“ نوتن نے بتایا تو ہسپتال نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”وہ کیا کریں گے یہاں؟“

”تجھے یہاں بھارت میں ایکشن اور سیاست دانوں کا

نہیں پتہ۔ یہاں جمہوریت کم اور ڈرامے بازی زیادہ ہے۔ ساری پارلیمنٹ کو دیکھ لو، اس میں کتنے لوگ ہیں جو صاف ستھرے ہوں گے، ان میں زیادہ تر لوگ اپنے اپنے علاقے کے غنڈے اور بد معاش ہیں۔ جرائم پیشہ ہیں، اپنے کالے دھندوں کو تحفظ دینے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے الیکشن جیتنا اور ہر حال میں جیتنا زندگی اور موت سے بڑھ کر کھیل ہوتا ہے۔ جس طرح انوجیت نے بتایا ہے کہ گنڈر کون ہے؟ اس سے لگتا نہیں کہ وہ کیسا بندہ ہوگا۔ اور تمہارا دوسرا مخالف بندہ، ان سیاست دانوں میں کتنے ایسے ہیں، جو صاف ستھرے ہیں۔ سو یہاں الیکشن جیتنا تو ووٹوں سے جاتا ہے لیکن وہ ووٹ حاصل کیسے کیسے جاتے ہیں، یہ ایک آرٹ ہے، ہنر ہے میری جان، جسے ابھی تم نہیں سمجھ سکتے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ آخری لفظ ہر پریت نے سن لیے تھے۔ اس لیے بیٹھے ہوئے بولی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہے نوتن، یہاں الیکشن جیتنا ایک آرٹ ہی ہے۔ بہت ظلم ہوتا ہے لوگوں کے ساتھ۔ ان کی امیدوں کے ساتھ کھیلتے ہیں یہ لوگ۔“

”اچھا چلو یہ ختم کرو، اب یہ سوچو، کیا کرتا ہے۔ نوتن تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ ہسپتال نے جان بوجھ کر پوچھا۔

”میں تو ابھی واپس جا لندھ جاؤں گی وہاں کچھ کام ہیں، کل اگر وقت ملا تو آؤں گی، آخر ہم بھی تو ملازم ہیں

رتن دیپ سنگھ جی کے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”یار نوتن، ابھی تو اتنا کام نہیں، لیکن الیکشن کے دنوں میں تو کام بہت بڑھ جائے گا۔ تم وہ چند دن ہمارے

ساتھ آ جاؤ۔“ ہر پریت نے اس سے کہا۔

”میں رتن دیپ سنگھ سے اجازت لے کر آ جاؤں گی۔ مجھے امید ہے کہ.....“ اس نے کہنا چاہا تو ہر پریت تیزی سے بولی۔

”تم نوکری چھوڑ دینا، انوجیت اگر ممبر بن گیا تو بہت

کام ہوگا، وہ تمہیں سنبھال لینا۔“

”دیکھیں گے۔ فی الحال تو میں چائے پی کر نفل رہی

واپس لے آئے۔ وہ چھت پر کھڑا ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا تھا کہ بلدیو سنگھ کا فون آ گیا۔

”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہسپال، ابھی نوتن کو رنے مجھے بتایا ہے۔ تم جاؤ، لوگوں میں گھلوملو، دس بجے تک تم نے وہیں رہنا ہے، باقی میں دیکھ لیتا ہوں۔ مجھے سمجھا آگئی سے میں نے کیا کرتا ہے۔“

”کوئی کسی قسم کی مدد؟“ ہسپال نے پوچھا۔

”ہوگی تو بتا دوں گا۔ یہ کنفرم ہو گیا ہے کہ وہ لڑکی انہی کے پاس ہے۔ اسے وہیں نہیں رکھا ہوا ہے۔ مل جائے گی۔ میں پھر فون کرتا ہوں۔“ بلدیو سنگھ نے کہا تو وہ بہت حد تک پرسکون ہو گیا۔ وہ تیزی سے نیچے آیا۔ ہر پریت ابھی نکلی نہیں تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ اب وہ مختلف لوگوں کے گھروں میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ بات اس نے ہر پریت کو سمجھا دی۔ لیکن اس معاملے کی ہوا بھی نہیں تگنے دی کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اس وقت کی آوارہ گردی کیوں ضروری ہے؟

وہ دونوں ہی مختلف گھروں میں جاتے رہے۔ ان کے پاس انوجیت کے لیے دوٹ مائٹنے کا، ایک معقول بہانہ تھا۔ ہر جگہ سے یہی کہا گیا کہ وہ لوگ ووٹ انہی کو دیں گے۔ ہسپال اور ہر پریت دونوں ہی سمجھ رہے تھے کہ ووٹر بڑا سیانا ہو گیا ہے۔ کوئی ایک فیصد لوگ ہی انکار کرتے ہیں اور وہ لوگ نظر پائی قسم کے ہوتے ہیں جو بہت کم قسم کے ہوں۔ ورنہ کوئی بھی نہیں کہتا۔ ہسپال نے وقت گزارنا تھا۔ وہ گزار لیا۔ دس بج گئے تھے۔ اسے بلدیو سنگھ کے فون کا انتظار تھا۔

اس وقت وہ ایک گھر میں بیٹھے ہوئے تھے، جب بلدیو کا فون آ گیا۔ وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ اس دوران وہ اس سے عام سی باتیں کرتا رہا۔ جیسے ہی وہ اکیلا ہوا تو بولا۔

”اب بتاؤ، کیا بنا؟“

”تم نے کبھی کہانی سنی ہے کہ کسی جن کی کسی طوطے میں جان ہوتی ہے۔“

”ہاں سنی ہے؟“ اس نے سمجھتے ہوئے جواب دیا

ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس دی۔

جائے پینے کے بعد نوتن کو اپنی کار میں نکل گئی اور ہر پریت کچن کی جانب بڑھ گئی۔ ایسے میں ہسپال نے صوفے پر بیٹھ کر بلدیو سنگھ کو فون ملا یا۔ حال احوال کے بعد اس نے کہا۔

”نوتن نے مجھے ساری بات بتا دی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ کام اسی جگہ رستگہ ہی کا ہے۔ اسی کی ایک کڑی مجھے ملی ہے۔“

”وہ کیا؟“ ہسپال نے تیزی سے پوچھا۔

”میرے ایک بندے نے بتایا ہے کہ وہ لڑکا، جس کے ساتھ لڑکی کی بات طے ہو رہی تھی، وہ جگہ رستگہ کے پاس کام کر رہا ہے۔ اس کا ذاتی ملازم ہے۔“ بلدیو نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”کہیں یہ کام.....“ ہسپال نے یہ کہنا چاہا تھا کہ بلدیو نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

”وجہ کچھ بھی رہی ہو، یہ ایک کڑی بنتی ہے، رستہ ہے، ممکن ہے، اسی لڑکے نے جگہ رستگہ سے کہہ کر پولیس آفیسر سے سفارش کروائی ہو لیکن ایک بات طے ہے، اتنی رات کو، اتنی جلدی یہ ہوتا نہیں۔ خیر، تم پتہ کراؤ کہ لڑکے اور لڑکی والوں کے درمیان کوئی اختلافی بات تو نہیں چل رہی تھی۔“

”تھا۔ یہی جہیز کم زیادہ کا چکر تھا۔ تم ایسے کرو، سیدھا اسی لڑکے کو.....“ ہسپال نے غصے میں کہا۔

”نہیں پھر بھی تم پتہ کرو، کوئی بڑا معاملہ تو نہیں چل رہا تھا۔“ بلدیو نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

”اوکے۔“ ہسپال نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ ہر پریت کے ذمے لگائے گا۔ وہ یہی کسی بات کا پتہ لگا پائے گی اگر کوئی ہوئی تو۔ اس نے کچن میں جا کر ہر پریت کو سمجھایا اور اوپر چھت پر جا پہنچا۔

اس نے وہاں جاتے ہی خود کو پرسکون کرنا چاہا۔ وہ بہت حد تک سمجھ گیا تھا کہ یہ کیا ہو سکتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خود نمودر جائے اور صبح ہونے سے پہلے لڑکی کو

نہیں اٹھنے دے۔

نہیں اٹھنے دے۔

نہیں اٹھنے دے۔

نہیں اٹھنے دے۔

نہیں اٹھنے دے۔

نہیں اٹھنے دے۔

نہیں اٹھنے دے۔

نہیں اٹھنے دے۔

نہیں اٹھنے دے۔

نہیں اٹھنے دے۔

نہیں اٹھنے دے۔

کٹھ مینٹھ ٹوٹکے

”اگر آپ کا وزن زیادہ ہے اور لوگ آپ پر ہنستے ہیں نیز آپ پتلا ہونا چاہتی ہیں تو نیوز چینل باقاعدگی سے دیکھیں امید سے وزن کم ہوگا۔“

”اگر آپ کو خوش گوار خواب نظر نہیں آتے اور ڈر لگتا ہے تو سونے سے پہلے آئینہ ضرور دیکھیں، کبھی ڈر نہیں لگے گا۔“

امجد علی..... میرپور خاص

کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟ کوئی تفتیش میں پیش رفت، کوئی شائبہ میں پکڑا؟“

”او کہاں کی تفتیش جی، آج کل تو آپ سیاست دانوں کے معاملات ہی نہیں سانس لینے دیتے، کبھی کسی کی سیکورٹی، کبھی کسی وی آئی پی کا استقبال، پروٹوکول، یہ ایکشن بھی تو بھٹانے ہیں۔“ اس نے اکتائے ہوئے انداز میں جواب دیا

”اور اگر وہ لڑکی قتل ہوئی تو کیا ہوگا؟ وہ کس کے ذمے ہوگی؟“ چسپال نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”یہ تو جی، قتل کرنے والے جانیں، یا پھر آپ مجھے کے کسی بڑے سے کہیں، اب مجھے جو حکم ملتا ہے، میں تو وہی کروں گا نا۔“ اس نے پھر اسی انداز میں کہا۔

”یہ حکم آتے کہاں سے ہیں، جن کی وجہ سے بے چارے عوام کو انصاف نہیں ملتا؟“ وہ طنز یہ لہجے میں پوچھا۔

”میں نے بحث نہیں کرنی، مجھ سے تو جو ہو سکتا ہے کر رہا ہوں، دن رات عوام کی خدمت کر رہے ہیں۔“ اس نے ملکا سا قبضہ لگاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، لیکن ان لوگوں کا قصور، انہیں کچھ نہ سمجھ تو.....“ چسپال نے کہنا چاہا مگر وہ تیزی سے بات کاٹتا ہوا بولا۔

”اوجی، اب میں کیا کروں، اندھی تفتیش ہے، کوئی سرا پتہ وہ دیں تو میں اسے ابھی اٹھوا لیتا ہوں۔ پھر بعد میں

”تو بس پھر، وہ طوطا ہمارے پاس سے۔ صبح تک سارے معاملات حل ہو جائیں گے۔“ اس نے کہا۔

”اوکے، پھر صبح ہی دیکھیں گے۔“ چسپال نے جواب دیا تو بلدیو سنگھ نے فون بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہر پریت کے ساتھ واپس گھر آ گیا۔

انہیں گھر آئے کچھ ہی وقت گزرا ہوگا۔ کہ اوگی پنڈ سے کچھ لوگ ان کے باپ آ گئے۔ وہ لوگ ان کے ساتھ تھے، جن کی لڑکی اغوا ہوئی تھی اور ان کا بیٹا قتل ہو گیا تھا۔ وہ کبھی باہر لان میں بٹھا دیئے گئے۔ وہ ابھی بیٹھ ہی رہے تھے کہ چسپال کے ساتھ ہر پریت بھی ان کے پاس آ بیٹھے۔ کبھی ان میں سے ایک بزرگ نے بات کی۔

”چسپال پتر! ہم سب تیرے پاس آئے ہیں تاکہ تو ہماری مدد کرے۔ ہماری تو کوئی بھی بات نہیں سنتا۔“

”بزرگو بتائیں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔“

اس نے بڑے سکون اور خمیرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہمیں اب تک یہ پتہ ہی نہیں چل سکا کہ وہ لوگ کون تھے۔ کس نے کیا ہے سب۔ لیکن یہ کیسا ظلم ہے کہ

تھانیدار بھی ہماری کوئی بات نہیں سنتا۔ اس نے ایک درخواست لکھ لی ہے اور ایف آئی آر کاٹ کر ہمارے ہاتھ میں تھما دی ہے۔ دو دن ہو گئے، وہ ہمیں ملتا ہی نہیں ہے، چند بار فون کیا ہے، اب تو وہ گالیاں دینے لگا ہے کہ فون کیوں کرتے ہو۔ کہاں جائیں، کس کے پاس فریاد کریں۔“ لڑکی کا باپ یہ کہتے ہوئے رو دیا

”چلیں بات کرتے ہیں اس سے،“ چسپال نے کہا۔

”رب تمہارا بھلا کرے، اگر تمہاری وجہ سے ہمیں اپنی جینی مل جائے۔“ لڑکی کا باپ بولا۔

”اس کا فون نمبر دو، میں ابھی بات کرتا ہوں اس سے۔“ چسپال نے کہا تو ایک نوجوان نے تھانیدار کا نمبر دے دیا۔ چسپال نے کال ملانی تو کچھ دیر بعد اس نے فون ریسیو کر لیا۔ چسپال نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بولا۔

”جی، حکم،“ اس کے لہجے میں طنز آ گیا تھا۔

”وہ لڑکی، جو اغوا ہوئی اور اس کے بھائی کے قاتل

”لڑکی اسی گنجد رستگھ کی شہدہ پر اغوا ہوئی ہے، یہ معلوم ہو گیا ہے۔ اس کے قریبی دو بندے پکڑ لیے ہیں اور اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی اٹھالی ہے۔“

”کیا، اس کی بیٹی۔ مطلب.....؟“ جسپال نے حیرت سے کہا تو نون کور بولی۔

”بلد یوستگھ اس معاملے میں بڑا سخت ہے۔ وہ لڑکی بھی تو کسی کی بیٹی ہے، کیا کسی امیر اور طاقت ور کی بیٹی میں سرخاب کے پڑ لگے ہیں کہ وہ اغوا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ بلد یوستگھ نے تو اس لڑکی کو بتا دیا کہ تمہارے باپ کے گناہ کے بدلے اسے اغوا کیا گیا ہے۔“

”تو کیا بنا، گنجد رکوپتہ چلا؟“ اس نے پوچھا۔

”بتا دیا اسے اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر ایک گھنٹے کے اندر اندر لڑکی واپس گاؤں نہ پہنچی تو وہ اس لڑکی کو کہیں دور لے جائیں گے۔“ نون نے بتایا

”اغوا کرنے کی وجہ کیا تھی؟“

”وہی لڑکا، جن سے لڑکی والوں کی بات چل رہی تھی۔ اسے پکڑ لیا ہے، اسی نے بتایا۔ اب اصل بات کیا ہے، یہ بھی پوری طرح پتہ نہیں چلی۔“ تفصیل معلوم ہو جائے گی۔“ نون نے بتایا تو جسپال اندر سے کھول اٹھا۔

”یار میں آتا ہوں وہاں، دیکھی جائے گی، اسے تو میں سبق.....“

”سارا کھیل گمز جائے گا۔ صبح تک انتظار کرو، پھر تم ہی اس سے سیدھے ہو جاؤ۔ یہ لوگ درمیان سے نکل جائیں گے۔“ نون نے کہا۔

”چلو دیکھتے ہیں۔ مجھے نیند نہیں آئے گی۔“ جسپال نے کہا۔

”تم آرام کرو، یہ دیکھ لیں گے سب۔“ نون نے کور نے اعتماد سے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔

جسپال کا دوران خون تیز ہو گیا تھا۔

جسپال.....

میں، ہانپتا کور اور اشفاق چوہدری، بہت دیر تک اسی موضوع پر سوچتے رہے کہ ہاں یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ میں

آپ لوگوں نے ہی ان کی سفارش کرنی ہے کہ یہ بے گناہ ہیں، انہیں چھوڑ دیں۔“

”چلو، ٹھیک ہے، ہم بھی کوشش کرتے ہیں، آپ بھی کرو، جیسے ہی کوئی سراپتہ ملا، بتاتے ہیں۔“ جسپال نے کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

کبھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے فون جیب میں رکھا اور تھانیدار سے ہونے والی بات انہیں بتا دی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ ساری بات سن کے وہی بزرگ بولا۔

”سر دار جی، یہ تو اس کی کچھ بھی نہ کرنے والی باتیں ہیں نا۔“

”مجھے بھی یہی لگتا ہے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”اب یہ تو بات پکی ہو گئی ہے کہ اس واردات میں کوئی ایسا بندہ ملوث ہے، جو اس تھانیدار پر بھی اپنا حکم چلا سکتا ہے۔“ اس بزرگ نے کہا۔ تو جسپال نے اس لڑکی کے باپ سے پوچھا۔

”وہ جو لڑکا ہے، جس سے لڑکی کی بات چل رہی تھی، ان سے کوئی اختلاف ہوا، یا کوئی بات؟“

”ہماری تو ان سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی، یہی جہیز کی بات تھی، اس پر بھی کوئی اختلاف نہیں تھا۔ بس طے ہو رہی تھی بات۔“ باپ نے جیسی سی آواز میں جواب دیا۔

وہ لوگ کچھ دیر بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ نکو در شہر میں جا کر بڑے آفسر سے ملا جائے۔ کل صبح جانے کا فیصلہ ہوا۔ جسپال نے ان کے ساتھ جانے کی باقی بھرتی اور انہیں یہ حوصلہ دیا کہ اب یہ ان کا مسئلہ نہیں اس کا اپنا مسئلہ ہے۔ وہ لڑکی بازیاپ مروانے میں پوری طرح ساتھ دے گا اور جو انہوں نے نقل کیا ہے، اس کا حساب بھی لیں گے۔ وہ کافی حد تک مطمئن ہو کر چلے گئے۔ انہیں گئے ہوئے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ نون کور کا فون آ گیا۔ وہ اسی فون سے کال کر رہی تھی، جو لڑکی نہیں ہوتا تھا۔ اس نے بتایا۔

باہر کے لوگ تھے۔" اشفاق چوہدری نے تفصیل سے بتایا
"اس کے بعد انہوں نے کچھ کیا، کوئی مشکوک....."
میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"نہیں، انہوں نے کچھ نہیں کیا، ان کا ایک اپنا معمول
ہے اور وہ اس طرح اپنے دن گزار رہے ہیں۔ تانی جب
تھی، وہ سیکورٹی کی لگا میں کھینچے رکھتی تھی، علاقے میں کوئی
پرندہ بھی سر مارتا تھا تو اس کے بارے میں بھی پوچھنا چھوڑ
گرتی تھی۔ وہ باخبر رہتی تھی۔ مجھے علاقے میں پھرنا پڑتا
ہے۔ اس طرف زیادہ دھیان نہیں رکھ پاتا۔"

"تم چاہتے کیا ہو۔ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا؟" میں
نے اس کی بات سننا چاہی۔

"میں چاہتا ہوں کہ یہ خطرناک لوگ ہیں، دشمن پھر
دشمن ہوتا ہے، اس کا بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ انہیں چلتا
سرویا ان کے بارے میں جو فیصلہ کرنا ہے وہ کرو کیونکہ
دو دن سے ان کے پاس ایک شخص آیا ہوا ہے۔ پوچھنے
پر پتہ چلا ہے کہ وہ اس کا بیٹا ہے۔ وہ کب آیا، کہاں سے
آیا، اس بارے میں وہ مطمئن نہیں کر سکا۔ میں نے جب
اسے اسے دیکھا ہے، وہ میرے دماغ کو کھٹک رہا ہے۔"
اس نے اپنا خیال واضح کر دیا۔

"تو ابھی چلو، ان کے پاس چلتے ہیں۔" میں نے
اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے یہی خیال آیا تھا کہ اس کا ایک ہی
بیٹا اس سے دور تھا جو میں میں رہتا تھا۔ اُروہی ہے تو اسے
ممبئی میں تلاش نہیں کرنا پڑا، وہ یہیں آ گیا ہے۔ میں اسے
فوری طور پر ملنا چاہتا تھا۔ ابھی میں نے پلان کیا تھا کہ
اسے ممبئی میں تلاش کیا جائے۔ اب وہ ویسے ہی یہیں آ
گیا تھا۔

"چلو۔" اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا
اور اٹھ گیا۔

"بانیٹا! اُتر تم چاہو تو آرام کرو۔" میں نے کہا تو وہ بنا
کوئی بات کیے اٹھ کر باہر چل دی۔ اسے میرا یوں کہنا اچھا
نہیں لگا تھا۔ وہ پورچ میں کھڑی کار کی بجھلی نشست پر جا
بیٹھی تھی۔ اسے مزید کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ سو میں

اس کی نگاہوں کے سامنے ہوں اور یہ دعویٰ کسی حد تک
تسلیم بھی کیا جاسکتا تھا کہ اس نے دو بار مجھ پر حملہ کیا اور
دونوں بار شخص خوش قسمتی کے ساتھ رب کی رضا کے باعث
بچ گیا تھا۔ پہلی بار ریسٹوران میں اس نے حملہ کروایا،
اسے کیسے پتہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ وہاں مجھے ایک شک
تھا کہ جو لوگ حملہ کرنے والے تھے، انہیں میرے بارے
میں معلوم نہیں تھا۔ مطلب انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوا
تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی ٹریک پر چلتے ہوئے
سیدھے ہمارے سر پر آن پہنچے۔

دوسری بار بھی ایسا ہوا تھا۔ میں نے ناؤن میں جو گھر
لیا تھا، اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اس کے
لیے میں بہت رازداری برتی تھی لیکن اس نے وہاں بھی
حملہ کروایا۔

یہ حملہ ایسے وقت میں ہوا، جب وہاں کوئی بھی نہیں تھا،
کیا اس نے اسی تاک میں وہاں حملہ کیا کہ وہاں کوئی نہیں تھا
بصرف ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے، یا پھر ایسے پتہ ہی
نہیں چلا کہ وہاں پر کوئی نہیں ہے، اور سب خوش قسمتی سے
بچ گئے؟ ہاں میرے لیے ایک معذرت چلا جا رہا تھا۔ ایسا
کیوں تھا؟ وہ خود مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا تھا یا قسمت
مجھ پر مہربان تھی؟ میں یہی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔

یہ ساری باتیں ہمارے درمیان زیر بحث آ چکی تھیں،
لیکن کوئی سراپتہ ہمیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اچانک اشفاق
چوہدری نے کہا۔

"یہ سمجھنے سمجھانے کی باتیں تو چلتی رہیں گی، ان
دونوں کا کیا کرنا ہے، میری بہت زیادہ توجہ ان کی طرف
رہتی ہے۔"

"کیا تم نے ان کی کوئی ایسی سرگرمی دیکھی ہے یا
معمول سے ہٹ کچھ ہوا ہے، جس کی وجہ سے تمہیں کوئی
شک محسوس ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ان دونوں کو پانچ اجنبیوں کے ساتھ ملتے ہوئے
دیکھا گیا ہے۔ وہ ایسے لوگ تھے، جو نہ تو اس علاقے کے
ہیں اور نہ ہی دوبارہ دیکھے گئے ہیں۔ صاف ظاہر ہے وہ

خاموشی سے پنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اشفاق چوہدری نے اسیرنگ سہارا اور چل ویا۔

ہم مسافر شاہ کے تھڑے کے پاس پہنچے تو اس کے ساتھ بنے ہوئے کمروں میں گھب اندھیرا تھا۔ کسی کمرے میں کوئی ذرا سی بھی روشنی نہیں تھی۔ اماؤں کی اس رات میں بس تارے چمک رہے تھے۔ تھڑے کے ارد گرد صرف وہی منظر دکھائی دے رہا تھا، جہاں ہینڈ لائٹس کی روشنی پڑ رہی تھی۔ ان کمروں کے پاس کار جا رکی۔ کار رکھتے ہی ایک نوجوان جوگی کمرے سے باہر آیا۔ اسے شاید ہم دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس لیے پوری طرح سامنے آ گیا۔ میں دروازہ کھول کر باہر آیا اور اوچی آواز میں کہا:

”رام لعل کو بلاؤ۔“

وہ میری آواز سن کر چونکا اور پھر مجھے پہچان کر ٹھنک گیا۔ پھر فوراً اندر کمرے کی طرف چلا گیا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا، جوگی رام لعل باہر آ گیا اور سیدھا میری جانب بڑھا۔ اس نے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھائے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے قریب آتا، میرے اور جوگی رال لعل کے درمیان باغیتا کور آگئی۔

”ہو گیا۔“ باغیتا کور نے ہاتھ کے اشارے سے اسے دور رکھتے ہوئے تیزی سے کہا تو وہ رک گیا۔ اس نے اپنی چندھیائی آنکھوں سے ہماری جانب دیکھا اور بولا۔

”مہاراج۔! اس سے، کہیں ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی؟“

”اوپس رام لعل، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تو وہ جلدی سے بولا۔

”آئیں آجائیں اندر۔“ وہ اندر کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تو باغیتا کور اندر کی جانب بڑھ گئی۔ اشفاق چوہدری اس کے پیچھے بڑھا، پھر رام لعل اور میں اندر کمرے میں چلے گئے۔

اندر فرش پر درمی پتھی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر دیواروں کے ساتھ تین بستر لگے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ

لگے بستر پر ایک سنجیدہ سا جوان بیٹھا ہوا تھا۔ جو مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ باقی دو بستر خالی تھے۔ میں ایک بستر پر بیٹھ گیا تو وہ جوان میری جانب بڑھا آیا۔ اس نے ہاتھ ملایا۔

”یہ میرا بیٹا ہے، جی سندر لعل۔ تمہی میں رہتا ہے، مجھے ملنے کے لیے آیا ہوا ہے۔“

”یہی ہے وہ، جو زہر کے بارے میں اتھارنی رکھتا ہے؟“ میں نے پوچھا تو وہ ذرا سا مسکرا دیا

”جی، یہی ہے۔“ رام لعل نے کہا۔

”یہاں کیسے آیا، قانونی طریقے سے یا غیر قانونی؟“

”قانونی لوگوں نے غیر قانونی طور پر بھیجا ہے۔“ رام لعل کی بجائے وہ بولا۔

”کیسے؟“ میں نے سکون سے پوچھا۔

”انہی لوگوں نے، جنہوں نے میرے باپ کو یہاں بھیجا ہوا ہے۔“

”تمہیں ہی کیوں بھیجا؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”کچھ عرصہ سے یہاں کے بارے میں انہیں کوئی معلومات نہیں ملی۔ وہ مجھ تک پہنچے، انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں یہاں آؤں اور پتہ کروں کہ بات کیا ہے۔ کیونکہ انہیں یہ تو معلوم ہے کہ باپ زہر دیا اور آزاد زندگی گزار رہے ہیں، لیکن وجہ نہیں کہ وہ جو معلومات درکار تھیں وہ نہیں مل رہی ہیں۔“ سندر لعل نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”اب تم رام لعل کو لینے آئے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو باپ کی مرضی ہے، یہ کیا چاہتے ہیں۔“ اس نے جوگی کی طرف دیکھ کر کہا تو میں نے اس سے پوچھا۔

”ہاں بولو رام لعل، کیا چاہتے ہو؟“

”میں سچی اور دل کی بات بتاؤں تو وہ یہ ہے کہ میں یہیں رہنا چاہتا ہوں، اسی جگہ، میں کہیں نہیں جانا چاہتا۔ نہ واپس اپنے گاؤں مناسکر اور نہ کہیں دوسری جگہ۔ میرا پر یوار جاتا ہے تو جائے۔ میں آپ کی سیوا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی پورے دل سے۔“ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے بڑی لجلالت سے کہا۔

”جن لوگوں نے تمہیں یہاں بھیجا ہے، کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ تم یہاں پکڑے جا سکتے ہو؟“

”مجھے یہ کہانی سنانے کو کہی گئی ہے کہ میں اندرون سندھ سے یہاں آیا ہوں۔ وہی جو کہانی باپو سناتے ہیں۔ یہ تو باپو جی نے مجھے یہاں کے بارے میں بتا دیا ورنہ تو میں یہی کہانی سنانے والا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ صبح آپ سے بات کروں کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔“

”ظاہر ہے اب اگر تم رام لعل کو نہ لے کر گئے تو تم بھی ممبئی میں پھین سے نہیں رہ پاؤ گے۔ ٹھیک ہے لے جاؤ۔ اپنے باپ کو اور اس ملنگ کو بھی اور انہیں یہ باور کرا دینا کہ اب کوئی بندہ ادھر کا رخ نہ کرے۔“ میں نے ایک دم سے فیصلہ سنا دیا تو وہ ایک دم سے خوش ہو گیا۔

”بہت دھننے واہ مہاراج۔“ سندھ لعل نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو رام لعل کا چہرہ مرجھا گیا تب میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کوئی بات نہیں، میں تمہیں مناسک سے واپس منگوا لوں گا، یہ میرا تم سے وعدہ رہا۔“

”جی مہاراج۔“ وہ ایک دم سے کھل گیا۔

”ابھی جاؤ گے یا.....“ میں نے جان بوجھ کر اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”جی اجی، آج رات ہی، یہاں بھی بندے ہیں، جن کی نگاہ مجھ پر ہے، آپ یہاں ہوئے اور.....“ اس نے بھی اپنی بات روک کر کہا تو میں ساری بات سمجھ گیا۔

”یہاں کا مطلب ہے یہاں پر کام ہو رہا ہے؟“

میں نے جی سے کہا۔

”جاتے سے سب کے بارے میں بتا جاؤں گا اور ایک تھنہ بھی دے جاؤں گا۔“ وہ خوشی سے بولا۔

”تھنہ، وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں بنیادی طور پر ایک کیسٹ ہوں، میں نے زہر پر بہت تجربہ کیا ہے۔ جس طرح قدرتی شہد کے اپنے اثرات ہوتے ہیں اور ان جیسے اثرات انسانی کوشش پیدا نہیں کر سکتی، اسی طرح سانپ کے منہ میں بنا ہوا زہر

”اور وہ ملنگ، کیا بنا اس کا نشہ چھوڑا کہ نہیں اس نے؟“ میں نے جان بوجھ اس کے بارے میں پوچھا۔

”بس ایک بستہ لگا اسے خود پر قابو پانے میں۔ اب ٹھیک ہے، روزانہ صبح تھڑے پر چھوڑا لگاتا ہے۔ اور اسی طرح شام کو بھی وہ اپنی ڈیولی دینا ہے جو آپ اس کے ذمے لگا گئے ہیں۔“ وہ اسی لہجے میں بولا، ہاتھ اس کے جڑ سے رہے۔

”دیکھو بھئی رام لعل، مجھے یا میرے کسی بندے کو تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اور اس دوران میرا سلوک بھی تم نے دیکھ لیا، تمہیں تنگ نہیں کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ تم یہاں رہنا چاہتے ہو، اب پتہ نہیں تم رہ پاتے ہو یا نہیں۔ یہ الگ بحث ہے، لیکن اگر تم واپس جاتے ہو تو وہ لوگ ساری زندگی تمہیں مشکوک سمجھتے رہیں گے۔ وہ تم پر یقین نہیں کریں گے، کیا کہتے ہو؟“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو ہے، وہ مجھے مشکوک ہی سمجھیں گے۔“ جوگی نے جواب دیا تو سندھ لعل نے تیزی سے بولا۔

”نہیں باپو جی، میں ان سے بات کر کے آیا ہوں، وہ بھی جانتے ہیں کہ آپ مجبوری میں نہیں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ تو کوئی بھی کہانی انہیں سنائی جا سکتی ہے۔ میں تب سے یہی پوچھ رہا ہوں، اور ابھی یہ مہاراج آج بھی گئے ہیں، ان کے سامنے بھی پوچھتا ہوں کہ یہاں کیوں رہنا چاہتے ہیں؟“

”دیکھ بیٹا۔! میں ساری زندگی اس دشت کی سیاحی میں رہا ہوں، صحرا کی خاک چھائی ہے، ہر طرح کے بندے سے ملا ہوں، لیکن جو شائق یہاں ہے، مجھے نہیں سے نہیں ملی۔ یہاں کہیں زیادہ گیان ہے، جو میں نے نہیں دیکھا، پر نہیں عمر متی ہے۔ تم آگے ہو، اپنے سارے پر پوار کو لے جاؤ۔ میں شائق سے یہاں مرنا چاہتا ہوں۔“

رام لعل نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اس بار تو چلو نا، پھر چاہے ادھر آجانا۔ میں نے وہاں وعدہ کیا ہے۔“ اس کے بیٹے نے کہا تب میں نے پوچھا۔

بھی اپنی خاصیت رکھتا ہے۔ اس طرح کے خواص کیمیکل سے نہیں بنائے جاسکتے۔ اگر کسی شے میں مہلک اثرات ہیں تو اسی میں زندگی بخش اثرات بھی ہیں۔ ضرورت صرف تلاش کرنے کی ہے۔ مہانپ کے زہر کے انسانی بدن پر جو اثرات ہو سکتے ہیں، میں نے ان پر بہت کام کیا ہے۔ اب تک میرے دو تجربے بہت کامیاب ہوئے ہیں۔“ اس نے بتایا

”کون سے؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔
”میں نے ایک دو ایسی تیاری کی ہے، جو کسی انسان کو ایک خاص مقدار میں دی جائے تو اس کی سوچوں پر تو پوپایا جاسکتا ہے۔ کسی دور میں فٹیش سے کام لیا جاتا تھا، وہ سب وقتی نشے ہیں، لیکن یہ ایسا ہے کہ چند دن تک ایک خاص مقدار بدن میں اتار دی جائے تو انسان کی سوچوں کو تہیل کر دیا جائے۔ تب اس سے جو چاہے نتیجہ لے سکتے ہیں اور یہ وقتی نہیں ہوتا۔“ اس نے تفصیل سے کہا۔

”اس کے اثر کو ختم کرنے کے لیے۔“ میں نے پوچھا۔

”اس کا توڑ سے، لیکن میں یہی بتاتا ہوں کہ اس دوا کا اثر ختم نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ انہی لوگوں کو دی جاتی ہے، جنہیں صرف مرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اسی لیے یہ دوا نام استعمال میں نہیں لائی جاتی اور ایک خاص اہمیت اختیار کرتی ہے۔ میں اگر توڑ دے دوں، تب میری اہمیت تو ختم ہو گئی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

مجھے وہ بہت ہی تیز اور سمجھار کا تھا۔ اپنا بچاؤ پہلے سوچ کر رکھنے والا اکثر کامیاب ٹھہرتا ہے۔
”اور دوسرا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو عام سا ہے، وہ میں آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ چونکہ بہت تیز خوشبو لگانے کے عادی ہیں، اس لیے میں وہ آپ کو بتا رہا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں چونک گیا، کیا اسے بھی یہ بہت بری لگ رہی ہے؟ لیکن میں خاموش رہا تا کہ اس کی بات سن سکوں، وہ کہہ رہا تھا، ہاتھ لگ نب میں فقط ایک قطرہ ڈال دیا جائے، اس میں

نہا نہیں، آپ کے بدن سے ایسی بھینی بھینی خوشبو پھوننے لگے گی کہ دوسری صنف مدہوش ہو جائے گی۔ یہ چھوٹا سا چمکدار میں نے پیسے بنانے کے لیے کیا ہوا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیا یہ چیزیں تم ساتھ میں اٹھائے پھر رہے ہو؟“ بائیتا کو رنے پہلی بار بات کی

”بھیس جو بدل کر آتا تھا یہاں اور بھی بہت کچھ ہے جوئی کی بوتلی میں۔“ یہ کہہ کر وہ بلکے سے ہنس دیا۔

”پہلی والی کا تو ٹھیک ہے، دوسری والی کا کوئی سائڈ لہفائیٹ؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی نہیں، یہ میرے امیر ترین کلائنٹس کے لیے ہے، لوگ ان سے پوچھتے ہیں یہ پرفیوم دنیا کے کس مقام سے ملتا ہے، مگر وہ نہیں جانتے۔“ اس نے یہ بات سنجیدگی سے کہی

”اس کا تجربہ کروانے کے لیے تمہیں ایک دن راتنا پڑے گا۔“ میں نے اسے کہا تو وہ بولا۔

”جیسے آپ کی مرضی، میں ایک ہفتہ بھی رک جاؤں گا، سب سے دوا کا تجربہ کر لیں۔“

”ٹھیک ہے، تم ابھی رہو یہاں پر، بلکہ پورا پورا رہو۔“ اس نے تجربات کریں گے اور دوسری اگر کوئی چیز ہوئی تو اس پر کچھ بات ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔

”اور اگر تمہاری باتیں غلط اور تمہارا دعویٰ جھوٹے ہیں تو ابھی راتوں رات نکل جانا، یہ نہ ہو کہ صبح میرا ارادہ بدل جائے۔“ بائیتا کو رنے نے کہا تو اس پر سند لعل کیست نے حوم کر است دیکھا، کچھ نہ جانے کیا سوچ کر خاموش رہا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے سر کو بلانے لگا تھا۔ میں نے مزید کوئی بات نہیں کی اور اٹھ گیا۔ میں منگ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو وہ سامنے کھڑا تھا۔ مجھ سے ہاتھ ملایا تو میں نے پوچھا۔

”اب کیسے ہو؟“

”آپ نے ڈیوٹی لگا دی، جو مزہ اس ڈیوٹی میں ہے شاید ہی کسی اور شے میں ہو۔“ وہ تشکر بھرے لہجے

میں نے اسے دیکھا۔

”اب کیسے ہو؟“

”آپ نے ڈیوٹی لگا دی، جو مزہ اس ڈیوٹی میں ہے شاید ہی کسی اور شے میں ہو۔“ وہ تشکر بھرے لہجے

میں بولا۔

”کہاں ہے وہ؟“

”میں نے لان میں بٹھایا ہے۔“ اس نے جواب دیا
”اچھا، میں آتا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ پلٹ گیا۔
میں تھوڑی دیر کا ریڈور میں ٹہلتا رہا پھر نیچے چلا گیا۔ وہ لان
میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

”کیسے آئے صبح صبح، خیریت؟ میں نے پوچھا۔
”جی، رات وہ آپ کی سیکورٹی گارڈ نے جو بات کہی
وہ مجھے بہت کھلی ہے۔ میں صرف اس لیے آیا ہوں کہ خود
اپنے سامنے تجربہ کروا سکوں۔ اگر کچھ ہو تو مجھے وہ فوراً
شوٹ کر دے۔“ اس کے لہجے میں دکھ سے زیادہ اٹکا بول
رہی تھی۔

”وہ میری دوست سے یار۔ تم اس کی بات کا براندہ
مناؤ۔ اس نے جو کہا...“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے
میری بات کانتے ہوئے

”آپ نے جو میرے باپ پر دیا کی ہے، میں اس کا
احسان بھی نہیں دے سکتا۔ آپ چاہتے تو انہیں قتل کر سکتے
تھے، کوئی پوچھنے والا نہیں تھا، وہ آپ کے دشمن تھے۔ میں
یہ ثابت کر کے جانا چاہتا ہوں کہ میں دشمنی نہیں کر رہا، میں
یہاں سے جاؤں گا تو آپ کا احسان مند ہو کر۔ اور جب
یہاں سے چلا جاؤں گا تو آپ میرے احسان مند ہوں
گے۔ میں آئندہ بھی دوست ہی ثابت ہوں گا۔ آپ
نہا نہیں اس سے، میں ہوں ادھر۔“ اس نے ضدی سے
لہجے میں کہا تو میں اس کی ذہنی حالت کو سمجھنے لگا تھا۔ وہ
وہاں کا مانا ہوا کیسٹ اپنے باپ کو پچانے اور راز کے کہنے
پر یہاں آیا تھا۔ اپنی انا پر ہلکی سی شرب بھی برداشت
نہیں کر پایا تھا۔

”اچھا، ٹھیک ہے، آؤ اندر بیٹھتے ہیں اور چائے پیئیں
ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ اٹھ کر میرے ساتھ اندر آ گیا۔
بانیتا کو مجھ سے پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ میں نے
اس سے کوئی بات نہیں کہی۔ میں اسے اپنے کمرے میں
لے گیا۔ میں نے اس کے سامنے ایک قطرہ مہ میں ڈالا
تو خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ وہ باہر انتظار کرنے لگا۔

”چلو باقی باتیں صبح ہوں گی۔“ میں نے کہا اور کار
میں جا بیٹھا۔ اسٹن میں وہی سنڈر لعل تیزی سے میری
طرف آیا۔ اس نے ایک کانڈ میری جانب بڑھا کر کہا۔

”یہ میں نے وہ دوسری دوا کا پورا فارمولا لکھ دیا ہے۔
یہ کسی بھی ماہر کیسٹ کو دیکھا دیں، وہ یہ دوا تیار کر دے گا۔
اس سے یہ بھی پوچھ لیں کہ انسانی بدن پر اس کے کیا
اثرات ہوں گے اور یہ دوا، اس کا تجربہ یہ کروالیں۔“
میں نے کانڈ کا وہ پرچہ اور دوا پکڑ لی۔ مجھے لگا کہ بانیتا
کوئی بات اسے کھا گئی تھی۔ یہ ایک فطری ہی بات ہے،
کسی کی ذات اور کام کو جب نظر انداز کر دیا جائے تو اس کا
رد عمل ضرور ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سنڈر لعل ٹھیک
کہہ رہا ہے۔ ورنہ اس کی موت اس کے سامنے تھی۔ اور
پھر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود کو ختم کر کے ہمیں مار دینا چاہتا
ہو۔ کچھ بھی ممکن ہو سکتا تھا۔

حویلی واپس ہوئے آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ راستے میں
اشفاق چوہدری یہی کہتا رہا کہ انہیں جس قدر جلدی ہو
سکے یہاں سے روانہ کر دینا چاہئے۔ کیونکہ ہم بھی اس کی
وجہ سے لپیٹ میں آسکتے ہیں۔ میں نے ان کے بارے
میں صبح فیصلہ کرنے کا کہا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ میں بیڈ
پر آن لینا۔ بھی مجھے خیال آیا، میں نے اپنے دوست کو فون
کیا اور حالات پوچھے۔ اس نے کہا۔

”وہاں کوئی بندہ نہیں آیا، جسے مشکوک کہا جاسکے۔“
”چلو ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور سونے کے لیے
لیٹ گیا۔ بانیتا کو میرے ساتھ بیڈ پر بھی وہ بھی لیٹتے ہی سو
گئی۔ رات کافی ہوئی تھی۔

صبح میں بیدار ہوا تو سورج مشرقی افق سے
نہیں نکلا تھا۔ میں گہری گہری سانس لیتا ہوا حویلی کی
چھت پر جانے لگا تو حویلی ہی کے ایک ملازم نے مجھے
کہا۔

”باہر ایک جوئی آیا کھڑا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا
ہے، سنڈر لعل نام بتایا ہے۔“

لوگ تھے۔ ہم وہاں جا کر رکے تو دیکھا، جوگی رام لعل، سندھ لعل اور ملنگ باہری زمین پر گدڑی بچھا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے پاس جا بیٹھا اور کچھ دیر باتوں کے بعد انہیں وہاں سے چلے جانے کو کہا۔

”دیکھیں۔ میں یہاں نہیں رہا اور نہ ہی مجھے رہنا ہے لیکن آپ لوگوں کے باعث ہمارے دوست کو پریشانی ہو رہی ہے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ آپ کی حفاظت نہیں کر سکتے۔“

”ٹھیک ہے، جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔ ہم آج ہی یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ آپ سے رابطہ رہے گا۔“

جوگی رام لعل نے کہا تو میں نے اسے سمجھایا

”ہمیں آپ لوگوں کے بارے میں بالکل پتہ نہیں ہے کہ آپ کون ہو، کہاں سے آئے ہو، یہاں کس لیے تھے۔ ہم نے آپ لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک صرف اس لیے کیا کہ آپ فقیر لوگ ہیں۔ یہی بیان ہر جگہ دینا، ہم آپ کو یہاں سے اب بھی نہیں جانے دینا چاہتے تھے کہ آپ لوگ خود یہاں سے چلے گئے۔“

”جی میں سمجھ گیا مجھے کیا کرنا ہے۔“ اس نے کہا تو میں وہاں سے اٹھ گیا۔ پھر ہم وہاں سے چل پڑے۔ اشفاق چوہدری ہمیں ڈرنگ سے بہت دور تک چھوڑنے آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

دو گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ جہاں اپنے کمرے میں بیڈ پر پڑا، یہی سوچے چلا جا رہا تھا کہ اب تک بدیوشکھ کا فون نہیں آیا اور نہ ہی نوٹن کو رنے نے اطلاع دی۔ وہ یہی سوچے چلا جا رہا تھا کہ انہوں نے مجھے باندھ کر رکھ دیا ہے۔ آٹرمیں وہاں ہوتا تو اب تک بہت کچھ کر چکا ہوتا۔ اسے خود پر قابو پانا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ ابھی اس نے نوٹن کو رکھ کال کر دی۔ اس کی آواز سنتے ہی بولا۔

”اب تک کیا؟“

”گنڈہ رشتہ سے بات چل رہی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی دے دی جائے اور وہ لڑکی لے لی جائے۔“

”اور جو اس کا بھائی قتل ہو گیا، وہ کس کھاتے

میں خوب نمایاں یہاں تک کہ میں پرسکون ہو گیا۔ وہ جوتیز خوشبو، میرے ساتھ چھٹی ہوئی تھی وہ دور ہو گئی۔ ایک بھینسی بھینسی خوشبو نے مجھے دھماکہ میں لے لیا۔ جو بہر حال مجھے اچھی لگ رہی تھی۔

”واقعی مست کر دینے والی خوشبو ہے۔“ بانیتا کو رنے خمار آلود آواز میں کہا تو سندھ لعل ایک دم سے خوش ہو گیا۔ میں نے ناشتہ لگوانے کا کہہ دیا۔

ناشتے کے دوران وہ بہت ساری باتیں کرتا رہا۔ جن میں سے کچھ کی مجھے سمجھ آئی اور کچھ کی نہیں۔ جس وقت وہ جانے لگا تو اس نے دو چھوٹی چھوٹی بوتلیں میری جانب بڑھائیں۔ وہ دو مختلف رنگ کی تھیں۔

”یہ کیا ہے؟“

”یہ آپ بعد میں سکون سے پی کر سمجھیں۔ میں نے اس کے ساتھ سب کچھ لکھ کر اس لفافے میں ڈال دیا ہے۔ اب مجھے آگیا دیں۔“ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ چلا گیا۔

دو پہر ہو چکی تھی۔ جب میں بانیتا کو ر حویلی سے نکل پڑے۔ اشفاق چوہدری نے وہاں کے ایک ایک معائنے کے بارے میں مجھے بتایا۔ ایکشن کے لیے ماحول تیار ہو رہا تھا۔ علاقے میں سیاسی پارٹیوں کے کارندے اپنے اپنے طور پر سرگرم تھے۔ ہم نے ہر موضوع پر بہت دیر تک بات کرتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ اشفاق چوہدری کے پاس ساری باتیں ختم ہو گئیں۔ اس کی تان یہیں پر آ کر ٹوٹی کہ انہیں یہاں سے بھیج دیا جائے۔ کیونکہ اگر کسی بھی ادارے کو معلوم ہو گیا کہ وہ کون ہیں اور انہیں یہاں ہم نے رکھا ہے تو خواہ مخواہ کی مصیبت آ جائے گی۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ اور کچھ دیر بعد مسافر شاہ کے تھڑے کی طرف چل دینے تھے۔ تاکہ ان کے پاس جا کر انہیں وہاں سے چلے جانے کا کہہ دیا جائے۔ ابھی تک میرے بدن سے جو بھینسی بھینسی مہک اٹھ رہی تھی، اس نے مجھے مدہوش سا کر دیا تھا۔

اشفاق چوہدری دوسری کار میں تھا۔ اس کے ساتھ دو

”ابھی تک پہنچی کیوں نہیں ہو؟“
 ”بس یہاں معاملہ قریب ترین پہنچنے والا ہے۔“ اس
 نے تیزی سے بتایا

”مگر مجھے تو یہاں کے لوگوں کے ساتھ اسے سی پی
 کے پاس آنا ہے اور میں آ رہا ہوں۔“ وہ بولا۔

”لوگوں کے ساتھ ہی آ رہے ہونا تو آ جاؤ، یہ تو بہت
 اچھا ہے۔ یہی تو انتظار ہے۔ باقی باتیں یہاں آؤ گے تو ہو
 جائیں گی۔“ نوتن نے کہا۔

”اوکے۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا اور ڈرائیونگ
 سیٹ پر جا بیٹھا۔ اگلے آدھے گھنٹے کے اندر اس نے سردار
 بلہیر سنگھ کو اپنے ساتھ لیا اور پہنچاؤ گھر آ گیا۔ وہاں
 نمودر کے لیے جانے والے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ
 انہیں لیتے ہوئے نمودر کے لیے چل پڑے۔

پنجاب کا یہ الیہ ایک ثقافت کی صورت اختیار کر گیا
 ہے۔ انصاف کے لیے بھی ان لوگوں کو ”بڑے لوگوں“ کا
 محتاج ہونا پڑتا ہے۔ عوام ان بیورو کریٹس کے آگے جھکنے
 پر مجبور ہو جاتے ہیں، جو کہنے کو عوام کے خادم ہیں۔ اور یہی
 عوام کے خادم خواص کی خدمت میں دن رات صرف
 کر کے عوام ہی کو محکوم بنائے ہوئے ہیں۔ یہ صرف اور
 صرف تعلیم کی کمی کے باعث ہے۔ جو انہیں یہ شعور ہی
 نہیں دیتی کہ وہ ایک ہو جائیں اور ان خواص اور بیورو
 کریٹس کو اپنا خادم بنائیں۔ اس طرح قافلے بنا بنا انصاف
 کی بھیک مانگنے نہ جانا پڑے۔

وہ نمودر شہر میں اسے سی پی آفس کے سامنے جا کے۔
 ہسپتال کا دماغ اس وقت بہت ٹھنڈا تھا۔ وہ پرسکون تھا۔
 اسے ان مراحل سے بھی ابھن نہیں ہوئی، جو اس عوام
 کے خادم تک پہنچنے کے رکاوٹوں کو عبور کرنا ہوتا ہے۔ تین
 لوگوں کا فون باریابی ملا کہ وہ اندر آ کر بات کریں۔ ہسپتال
 بلہیر سنگھ اور لڑکی کا باپ اندر چلے گئے۔ اسے سی پی اپنی
 کرسی پر براجمان تھا۔ اس نے تینوں کو دیکھا اور بیٹھنے کا
 اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے تو بلہیر سنگھ نے اپنا مدعا بیان کیا۔ اور
 اوگی کے تھا نیدار کے بارے میں بتا دیا کہ وہ تعاون کرنے

میں جائے گا، ان کی جو گاؤں میں بے عزتی ہوئی، وہ کدھر
 جائے گی۔ نہیں کوئی ایسا.....“ ہسپتال نے انتہائی جذباتی
 انداز میں کہا تو نوتن نے اس کی بات کا متے ہوئے کہا۔

”تم سنو گے۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کور کی اور پھر کبھی چلی
 گئی۔ ”بلد یو سنگھ بالکل نہیں مان رہا ہے۔ وہ اسی بات پر اڑا
 ہوا ہے کہ لڑکی کو لو اور سیدھے تھانے چلے جاؤ، وہاں جا کر
 اپنے جرائم کا اعتراف کرو، جیسے ہی تم یہ کرو گے، لڑکی گھر
 بھیج دی جائے گی۔“ اگر پھر بھی نہیں مانے تو وہ لڑکی لینے خود
 اس کے پاس آ رہے ہیں۔ جتنی سیکورٹی لگانی ہے لگالے۔
 ”تو پھر میری ضرورت ہوگی، میں آ رہا ہوں۔“ ہسپتال
 نے تیزی سے کہا۔

”لڑکی، ہم نے بازیاب کر لی ہے۔ وہ بھی ہمارے
 پاس ہے۔“ اس نے بتایا تو ہسپتال بولا۔

”پھر وہ لڑکی کیسے لائے گا۔ یہ سب بات کی؟“
 ”دراصل اس نے لڑکی جہاں رکھی ہوئی تھی، وہیں پر
 ان کے بندے قابو کیے ہوئے ہیں۔ اسے یہی پتہ ہے کہ
 لڑکی اس کے قبضے میں ہے۔ گنڈ راب تک اپنے گھر سے
 نہیں نکلا۔ معاملہ کچھ دوسرا ہے، وہ میں صبح آ کر بتاتی
 ہوں۔ وہ لڑکی نہ لائے تو اچھا ہے، اس کی بیٹی بھی تو
 ہمارے پاس ہے۔ بلد یو سنگھ صرف اس سے قتل کا
 اعتراف کرانا چاہتا ہے۔“ نوتن کور نے کہا۔

”اوکے لڑکی مل گئی۔ یہی بڑی بات ہے۔ اب مجھے
 کچھ سکون ہوا ہے۔ اب میں سونے لگا ہوں، صبح ہی
 ملاقات ہوگی۔“ اس نے کہا اور فون بند کر کے بند پر لیٹ
 گیا۔ کچھ دیر وہ یہی معاملہ سوچتا رہا، پھر اس کی آنکھ گئی۔
 صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ وہ جلدی
 سے فریش ہو کر تیار ہوا اور نیچے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔
 اسے ہر پریت تیار ملی۔ دونوں نے ناشتہ کیا اور وہ نمودر
 جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہسپتال لا شعوری طور پر نوتن کور
 کا انتظار کر رہا تھا جو ابھی تک وہاں نہ پہنچ پائی تھی۔
 ہر پریت کو الوداع کہہ کر اس نے پورچ میں جا کر فون کیا۔
 رابطہ ہوتے ہی اس نے نوتن کور سے پوچھا۔

”سردار گنڈر سنگھ جی آئے ہیں۔ انہیں معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ وہاں سے آئے ہو یہاں، تو یہ تم لوگوں کی سہاتا (بھدری) میں آگئے ہیں۔“

اتنی دیر تک وہ ان کے قریب آگئے۔ سردار دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے ان کے قریب آگیا اور آتے ہی زور دار انداز میں فتح بلائی

”ست سری اکال۔“ لوگوں نے اس کی فتح کا جواب دیا۔ تو وہ بولا۔ ”مجھے بہت دکھ ہوا ہے، میں نے ساری جانکاری لے لی ہے۔ اور آؤ کرتے ہیں اسے سی پی سے ذرا بات۔“ اس نے سب کو لے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو لوگوں نے جہپال کی طرف دیکھا۔ تب بلیمر سنگھ بولا۔

”ہم ان کے پاس سے ہو آئے ہیں۔“

”کیا کہتا ہے وہ؟“ اس نے پوچھا۔

”وہی دلاسہ دیا کہ کرتے ہیں کچھ؟“ بلیمر سنگھ نے جواب دیا تو بہت دھول سے بولا۔

”میں کرتا ہوں بات۔“ یہ کہہ کر اس نے قدم بڑھائے ہی تھے کہ جہپال نے سرد سے لہجے میں کہا۔

”گنڈر سنگھ! اس اے سی پی کو یہاں بلاؤ۔“

اس کا بولنا گنڈر ہی کو نہیں وہاں ہر بندے نے محسوس کیا۔ بھی اس نے چونک کر پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

”جو کہتا ہے وہ کرو۔“

جہپال نے اسی لہجے میں کہا تو ایک لہجہ کے لیے اس نے سوچا پھر بولا۔

”ہم اندر جا کر بات کرتے ہیں۔ آؤ تم بھی آؤ؟“ اس نے کہا تو جہپال نے ضدی لہجے کہا۔

”اسے یہاں بلاؤ۔“

”اے تمہیں سمجھ نہیں آتی کہ سردار جی کیا کہہ رہے ہیں۔“ اس کے ایک مصاحب نے تیزی سے کہا تو جہپال نے اسے ہاتھ کے اشارے سے دور جانے کو کہا۔ وہ چند

لہجے کھڑا رہا، پھر پیچھے ہٹ گیا۔ تب وہ گنڈر سنگھ کے

کی بجائے بہانے بنا رہا ہے۔ ساری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔

”میں دیکھتا ہوں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میں بلواتا ہوں اس تھا نیدار کو۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لہجہ کور کا اور پھر بولا۔

”اور کوئی حکم ہے میرے لیے۔“ ان آخری لفظوں کے کہنے کا مطلب اس کے سوا کوئی

دوسرا نہیں تھا کہ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔ بھی جہپال نے سکون سے پوچھا۔

”یہ آپ کا دیکھنا، کتنے دنوں تک چلے گا؟“ اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اے سی پی نے بڑے غور سے اس

کی طرف دیکھا۔ یوں جیسے اس کی بدتمیزی پر اسے غصہ آ گیا ہو۔ پھر بھی اس نے نرم لہجے میں کہا۔

”کیا کہہ سکتے ہیں، ہمارے پاس کوئی ایسا چوٹکار تو ہے نہیں کہ ایک دم سے ڈھونڈ نکالیں۔ کرتے ہیں اس پر کام۔ آپ دھیر ج رہیں۔“

”دیکھیں، یہ ہمارے علاقے کے لوگ ہیں۔ ان کا مسئلہ دنوں میں نہیں گھنٹوں میں ہونا چاہئے۔“ جہپال نے

کافی حد تک سخت لہجے میں کہا۔

”یہ آپ جیسے عوامی نمائندوں کو ہر جگہ اپنے نمبر بنانے کی کیوں پڑنی رہتی ہے۔ کہنا دیکھتے ہیں تو دیکھتے ہیں۔

اب تم لوگ جاؤ۔“ اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تو لڑکی کا باپ پہلے ہی اٹھ گیا۔ بلیمر سنگھ سچ اٹھا اور پھر

جہپال اٹھ گیا۔ اسے سی پی کی سردمہری بہت بری لگی تھی۔ وہ باہر آگئے۔

بھی سامنے کافی ساری کاریں آ کر رہیں۔ اس میں سے کئی سارے لوگ باہر آئے۔ ان کے درمیان ایک

لبے قد کا آدمی نمایاں تھا۔ جہپال کو اس کا چہرہ کافی حد تک

جانا پہچانا لگا تھا۔ وہ ایک جتھے کی صورت میں آئے۔ ان کے آگے ایک بندہ سامنے کھڑے لوگوں کی جانب بڑھا

اور ان سے پوچھا۔

”یہ اوٹی سے کون لوگ یہاں آئے ہیں؟“ ”ہم ہیں۔“ ایک شخص نے جواب دیا تو وہی شخص بولا

پاس آیا اور جھمی ہی آواز میں کہا۔

”تم وہی کرو، جس کے کرنے کے لیے تمہیں بھیجا گیا ہے۔ اب میں آ گیا ہوں یہاں تمہاری بیٹی بھی نچ جائے گی۔ ہسپتال سنگھ سے میرا نام۔“ اس نے کہا ہی تھا کہ گنجد رنگھ نے متوحش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحے اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، پھر اپنے لوگوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”اسے سی پی کو ادھر ہی بلاؤ، سب کے سامنے بات ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے ہسپتال کا ہاتھ تھا، اور ایک جانب لے جا کر بولا۔ ”تم کیا جانتے ہو کہ میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں۔“

”اگر میں تمہاری بیٹی کے بارے میں جان سکتا ہوں تو کیا یہ نہیں جانتا کہ تمہیں یہاں کیا کرنے بھیجا گیا ہے؟“ وہ سب غلط فہمی میں ہو گیا۔ اب میں طریقے سے سب ٹھیک کر رہا ہوں۔ میں نے ایکشن۔“ اس نے کہنا چاہا تو ہسپتال بولا۔

”او نہیں، جو کہا گیا ہے وہی کرو۔“ یہ کہہ کر ہسپتال وہاں سے ہٹ گیا۔ ایک سپاہی اندر گیا ہوا تھا کہ اس دوران پریس کی کئی گاڑیاں وہاں آن رہیں۔ گنجد رنگھ ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ وہ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے یہاں سہتا کرتے کرتے وہ خود پھنس گیا ہے۔ جھمی اسے سی پی باہر آ گیا۔ ان سب کو دیکھ کر بولا۔

”جی سردار جی آپ، یہاں کیسے؟“ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، ہسپتال نے انتہائی غصے میں کہا۔

”اصل میں تم جیسے کرپٹ بیوروکریٹس نے ان عوامی نمائندوں کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ تم لوگ خوشامد کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اتنے لوگ آئے، مگر تم نے ان کی ایک نہیں سنی اور محض دلاسہ دے کر انہیں اس آفس سے نکال باہر کیا، جو اسی عوام کے پیسے سے بنا ہے اور اس کے ٹیکس سے تمہیں تنخواہ ملتی ہے۔ اس گنجد رنگھ نے بھی وہی کہنا ہے جو ہم تمہیں کہہ کر آئے

ہیں۔ اب تم باہر کیا سننے آئے ہو؟“

اسے سی پی نے باہر کھڑے تمام لوگوں کی طرف دیکھا، اس نے اپنی بے عزتی قطعاً محسوس نہ کی اور ہسپتال کو نظر انداز کرتے ہوئے گنجد رنگھ کی طرف دیکھ کر سکون سے بولا۔

”آئیں اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ اس پر گنجد رنگھ نے ہسپتال کی طرف دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سے اپنی بات منوانا چاہتا تھا، جس طرح وہ سوچ کر آیا تھا۔ جب ہسپتال نے ذرا سا بھی ریپانس نہیں دیا تو وہ بڑھ کر ہسپتال کے پاس آیا اور منت بھرے لہجے میں بولا۔

”تم آ کر چاہو تو ہم ابھی سکون سے کوئی معاملہ طے کر لیتے ہیں۔“ ”نڑکی تو واپس کرنی ہے وہ بات تو ہوئی۔ میں صرف اس شرط پر تم سے سارا معاملہ طے کر لیتا ہوں۔“ ہسپتال نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”کہو، کیا کہتے ہو؟“ ”اس کے بیٹے کو تو تم واپس نہیں کر سکتے ہو، ہاں اس کے بدلے اپنی بیٹی دے دو۔“ ہسپتال نے سکون سے کہا تو گنجد رنگھ کا چہرہ دیک باری سرخ ہو گیا جیسے کسی اسے گالی دے دی ہو۔

”ہسپتال۔! میں اگر سکون سے بات کر رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کوئی کمزور ہوں۔ میں معاملے کو حل کرنا چاہتا ہوں، وہ کرو۔“ اس نے غصے میں کہا۔

”تو پھر کیا کرو گے؟“ ہسپتال نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”میں تم سب کو دیکھ لوں ابھی اور اسی وقت؟“ اس نے غصے میں کہا تو اس کی آواز خاصی بلند ہوئی۔ جو وہاں کھڑے لوگوں اور پریس تک جا پہنچی۔

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اب تمہیں ختم ہونا ہے۔“ ہسپتال نے کہا اور اس کی کوئی بات سننے بغیر بلبر سنگھ کے پاس آ گیا۔

”چلیں۔“ بلبر سنگھ نے پوچھا تو ہسپتال نے اسے سی

”ہاں! مجھے پتہ ہے۔ آپ مجھے گرفتار کرو۔ وہ بندہ بھی یہیں ہے، وہ بھی گرفتاری دے گا۔“ اس نے کہا تو پیچھے سے ایک شخص آگے آ گیا۔

اسی وقت ارد گرد کھڑے پولیس والوں نے اسے ہتھ کڑی لگا دی۔ یہ سب کچھ پولیس کے سامنے ہوا۔ تصویریں بن گئیں۔ ایسے میں گنبد رستگھ کا فون بج اٹھا۔ اس کا ایک مصاحب آگے بڑھا اور فون اسے دے دیا۔

ایسے میں ہسپتال کا بھی فون بج اٹھا۔ نوتن کو رنے بتایا کہ اس وقت لڑکی گنبد رکی ہی اک فیکٹری میں موجود ہے۔ پولیس سے کہا جائے کہ وہ اسے وہاں سے بازیاب کرے۔ پورے پولیس کے ساتھ۔ ہسپتال نے یہی بات اسے سی پی سے کہی تو پولیس من رہا تھا۔ وہ سب لوگ اس جانب بھاگے۔ پولیس کو بھی وہاں جانا پڑا۔ ہسپتال بھی وہاں جا پہنچا۔ سبھی ہوئی لڑکی کو وہاں سے بازیاب کرایا گیا۔ وہیں سے جس وقت سب واپس نکودر تھانے آئے تب لڑکی کا بیان لکھا گیا۔ جس وقت وہ ادگی واپس آ رہے تھے، اس وقت نوتن نے بتایا کہ گنبد رستگھ کی بیٹی کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ اپنے گھر جا چکی ہے۔

راتے میں لڑکی نے بتایا کہ جس لڑکے سے اس کی بات چل رہی تھی۔ اس نے ملے کو کہا۔ اس نے انکار کر دیا۔ جس پر اس لڑکے نے ضد بنائی کہ وہ اسے اٹھا لے گا۔ وہ لڑکا گنبد رستگھ کے پاس کام کرتا تھا اور اسی دھندے میں ملوث تھا۔ دراصل وہ لڑکیوں کو آگے اٹھل کرتے تھے۔ یہی اس کا بڑا دھندہ تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے اور اپنے پاس سے بات کی۔ اس نے لڑکی اٹھانے کو کہہ دیا کہ چند دن اسے اپنے پاس رکھنا، پھر اسے آگے بھیج دینا۔ اس دوران لڑکی کا بھائی قتل ہو گیا۔ یہی سر درد ہی تھی۔ وہ اس لڑکی کی آگے بات نہیں کر پائے۔ لڑکا اسے رام کرتا رہا، لیکن جس کا بھائی اس کے لیے قتل ہو چکا ہو، اسے کہاں ہوش تھا۔ وہ تو اپنے بھائی کے قاتلوں کو قہم کر دینا چاہتی تھی۔ گنبد ر اور اس کے لوگ لڑکی کا قتل بھی سوچ ہی رہے تھے کہ اس کی بیٹی اغوا ہوئی۔ گنبد ر کے گمان میں

پی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہاں، اب کچھ اور ہی کرنا ہوگا۔ یہاں کے لوگ بھی کرپٹ نکلے۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ لڑکی کو کس نے اغوا کرایا ہے۔ چلو۔“ یہ کہہ کر ہسپتال جانے لگا تو اسے سی پی نے پولیس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے میں کہا۔

”اُونو جوان۔! رکو، یوں بیان دے کر نہیں جاسکتے ہو، بتاؤ کون ہے وہ؟ رکو۔“

”تم مجھے روک بھی نہیں سکتے ہو۔“ ہسپتال نے کہا۔

”میں تمہیں گرفتار کر سکتا ہوں۔“ اسے سی پی نے کہا۔

”تم مجھے گرفتار بھی نہیں کر سکتے، کیوں گنبد رستگھ بولتے کیوں نہیں ہو؟“ وہ نغوت سے بولا تو سبھی گنبد رستگھ کی طرف دیکھنے لگے۔ ہسپتال آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ ابھی گرفتاری دینے لگا ہو۔ وہاں کھڑا ہر بندہ حیران تھا کہ گنبد رستگھ جیسا شخص اس کے سامنے خاموش کیوں ہے؟ کافی دیر تک جب کوئی نہیں بولا تو گنبد رستگھ آگے بڑھا اور اس نے اسے سی پی سے کہا۔

”ہسپتال ٹھیک کہہ رہا ہے، یہ اغوا اور قتل میرے ایک بندے سے ہوا۔ میں اسے آج ہی پیش کر دیتا ہوں۔“ یہ کہتا ہی تھا کہ وہاں موجود ہر بندہ چونک گیا۔ پولیس نے جلدی سے تصویریں بنانا شروع کر دیں۔ ایک پچھلی سی جٹی تھی۔ اسے سی پی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”لڑکی لاؤ کہاں ہے؟“ اس بار لمبیر رستگھ نے تیزی سے کہا۔

”وہ میرے پاس نہیں ہے۔ میں پیش کر دوں گا۔“ اس نے کہا تو ہسپتال نے اسے سی پی سے کہا۔

”اب اگر تم نے کچھ نہ کیا تو تیرے لیے بہت برا ہوگا۔ میں تمہیں صرف دو گھنٹے دیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور اپنے لوگوں کو چلنے کا اشارہ کر کے کاری جانب بڑھا تو اسے سی پی نے کہا۔

”رکو ہسپتال، یہ کہہ کر وہ گنبد رستگھ کی طرف دیکھ کر بولا۔“ آپ کو پتہ ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

انہیں لے کر چاندھرفارم ہاؤس پر جا رہے ہیں۔ رات تک وہیں آ جاتا۔ میں تمہیں یہی بتانا چاہتی تھی۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جسپال کو کافی حد تک سکون مل گیا تھا، لیکن ایک بے چینی اس کے اندر بڑھ گئی کہ یہ سب کیسے ہوا؟ یہ رات ہی کو پتہ چلنا تھا، جب وہ ان لوگوں کو ملتا۔ اس نے اپنا سر جھٹکا اور گھر کی جانب جانے کے لیے رفتار تیز کر دی۔

اس وقت سورج مغرب میں ڈوب رہا تھا، جب وہ اوگی پنڈ سے نکل کر چاندھر کی جانب رواں تھا۔ اس کے ذہن پر وہی وی رپورٹ چھائی ہوئی تھی، جو اس نے کچھ دیر پہلے دیکھی تھی۔ وہ اسے بہت بڑا سوشل ورکر قرار دے رہے تھے۔ وہ یہ واقعہ تخریب کاری اور سیاسی مخالفت سے بھی سے جوڑ رہے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ اسے سیاسی رنگ دے کر وہ انوجیت یا خود جسپال کی راہ کو روکا جاتا۔

سیاست کے اس کھیل میں اس بندے کا زیادہ فائدہ ہونے والا تھا، جو اس کی جگہ پارٹی ٹکٹ لے کر الیکشن کے میدان میں اترتا۔ اس کا پہلا ہدف انوجیت تھکے ہوتا۔ وہ اس سارے کھیل کو سمجھ رہا تھا اور اس کا توڑ بھی کرنا چاہتا تھا۔ انہی سوچوں میں الجھا وہ فارم ہاؤس جا پہنچا۔ وہاں سب آچکے تھے۔ وہ ان سے بڑے بھر پور انداز میں ملا

”بلدیہ بونے تو اس کا قصہ ہی ختم کر دیا۔ کیوں کیسے ہوا یہ سب جسپال نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اصل میں جس وقت ہمیں پتہ چلا تو کچھ ہی دیر بعد یچن کور نے مجھے بتایا کہ یہ انواہ خیرہ کی واردات جیسے ہو رہی ہے، اس کی تفصیل تمہیں یہ یچن کور ہی بتا سکے گی۔“ یہ کہہ کر وہ لحد بھر کے لیے رکا، پھر کہتا چلا گیا: ”خیر ہم وہاں سب نمودار پہنچے۔ ہمارے وہاں پہلے ہی کافی سارے سورس تھے۔ ایک گھنٹے میں ہمیں پتہ چل گیا کہ یہ کس کا کام ہے اور وہ کیوں کر رہا ہے۔ پھر اس کی تصدیق ہوتی چلی گئی۔ جیسے ہی کنفرم ہوا میں نے سوچ لیا کہ اس کا ملتان کیا ہوتا ہے۔ اور وہ ہو گیا۔“

”وہ تو وہاں بڑا طاقت ور سمجھا جا رہا تھا۔“ جسپال نے

بھی نہیں تھا کہ کوئی اتنا سر پھرا بھی ہوگا جو اس کے گھر تک جا پہنچے گا۔ وہ سمجھ گیا کہ بات بہت بڑھ جائے گی، وہ اس معاملے کو اپنے طریقے ہی سے حل کر لینا چاہتا تھا۔ مگر اسے پولیس کے سامنے اقرار کرنا پڑا۔ حالات ہی ایسے بن گئے۔ اس کے لیے فراری کوئی راہ نہیں تھی۔

جس طرح یہ سب ہو گیا تھا، جسپال کا دماغ نہیں مان رہا تھا کہ بات ابھی ختم ہوئی ہے۔ یہ اتنا سادہ اور سیدھا معاملہ نہیں تھا کہ وہ ختم ہو جاتا، وہ بہت دور تک سوچ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دماغ میں یہ بھی خیال تھا کہ کاش اس کے دوست بھی یہی سوچ رہے ہوں۔

وہ لوگ اوگی پنڈ پہنچ گئے۔ وہ لڑکی اپنے گاؤں پہنچ گئی۔ سہ پہر تک وہ اوگی پنڈ ہی میں رہا۔ وہیں لوگوں کے درمیان اس کا سارا وقت گزار گیا۔ بہت سارے سوال اٹھے، جس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ اس کے والدین ہی لوگوں کو مطمئن کرتے رہے۔ سہ پہر کے بعد جس وقت جسپال اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ رستے میں نوٹن کا فون آ گیا۔

”وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ گنڈر سنگھ نے بیٹی کے گھر پہنچتے ہی اپنا بیان بدل دیا ہے۔ اس نے پریس کو یہی بیان دیا کہ یہ سیاسی مخالفین کی چال تھی۔ اس کے ویسوں نے اس کی ضمانت کروائی ہے اور اب وہ واپس اپنے گھر چلا گیا ہے۔ یہ پریس کانفرنس اس نے اپنے گھر کی سے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ یہی کرے گا۔ اس نے گنڈر سے کہا بھی تھا۔ وہ ... نوٹن کور نے کہنا چاہا تو جسپال نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”بلدیہ اتنا ہی نا سمجھ ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اب اسے میں دیکھوں گا، ان لوگوں سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اب تک اسے شوت ہو جانا چاہئے تھا۔“ جسپال نے غصے اور مایوسی میں کہا۔

”وہ شوت ہو گیا ہے۔“ نوٹن نے کہا۔

”کیا ...؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”اس کے وہ خاص بندے ہم نے پکڑے ہیں۔“

بھی نہیں تھا کہ کوئی اتنا سر پھرا بھی ہوگا جو اس کے گھر تک جا پہنچے گا۔ وہ سمجھ گیا کہ بات بہت بڑھ جائے گی، وہ اس معاملے کو اپنے طریقے ہی سے حل کر لینا چاہتا تھا۔ مگر اسے پولیس کے سامنے اقرار کرنا پڑا۔ حالات ہی ایسے بن گئے۔ اس کے لیے فراری کوئی راہ نہیں تھی۔

جس طرح یہ سب ہو گیا تھا، جسپال کا دماغ نہیں مان رہا تھا کہ بات ابھی ختم ہوئی ہے۔ یہ اتنا سادہ اور سیدھا معاملہ نہیں تھا کہ وہ ختم ہو جاتا، وہ بہت دور تک سوچ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دماغ میں یہ بھی خیال تھا کہ کاش اس کے دوست بھی یہی سوچ رہے ہوں۔

وہ لوگ اوگی پنڈ پہنچ گئے۔ وہ لڑکی اپنے گاؤں پہنچ گئی۔ سہ پہر تک وہ اوگی پنڈ ہی میں رہا۔ وہیں لوگوں کے درمیان اس کا سارا وقت گزار گیا۔ بہت سارے سوال اٹھے، جس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ اس کے والدین ہی لوگوں کو مطمئن کرتے رہے۔ سہ پہر کے بعد جس وقت جسپال اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ رستے میں نوٹن کا فون آ گیا۔

”وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ گنڈر سنگھ نے بیٹی کے گھر پہنچتے ہی اپنا بیان بدل دیا ہے۔ اس نے پریس کو یہی بیان دیا کہ یہ سیاسی مخالفین کی چال تھی۔ اس کے ویسوں نے اس کی ضمانت کروائی ہے اور اب وہ واپس اپنے گھر چلا گیا ہے۔ یہ پریس کانفرنس اس نے اپنے گھر کی سے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ یہی کرے گا۔ اس نے گنڈر سے کہا بھی تھا۔ وہ ... نوٹن کور نے کہنا چاہا تو جسپال نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”بلدیہ اتنا ہی نا سمجھ ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اب اسے میں دیکھوں گا، ان لوگوں سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اب تک اسے شوت ہو جانا چاہئے تھا۔“ جسپال نے غصے اور مایوسی میں کہا۔

”وہ شوت ہو گیا ہے۔“ نوٹن نے کہا۔

”کیا ...؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”اس کے وہ خاص بندے ہم نے پکڑے ہیں۔“

نئے افق

www.pdfbooksfree.pk

115

مارچ ۲۰۱۵

خوش تھی۔ اس کے ساتھ دوسری لڑکیاں بھی تھیں۔ لڑکی نے بچن کو بتایا کہ اس نے فورس جوآن کر لی ہے۔ اور ٹریٹنگ سے گزرنے کے بعد اس کی پوسٹنگ ہونے والی ہے۔ یہ پوسٹنگ کسی بارڈر پر ہوگی۔ بچن کو نے اسی وقت پوچھ لیا کہ وہ کہاں رہتی ہے اور واپس کیوں نہیں گئی وغیرہ۔ لڑکی نے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دیا اور اس کا فون نمبر لے لیا کہ وہ اس کا کال کرے گی۔ چند دن بعد اس لڑکی نے بچن کو کال کی اور اسے اپنے اسٹینڈیوٹ میں بلا لیا۔ جہاں وہ لڑکی ٹریٹنگ لے رہی تھی۔

”تمہاری اس کہانی کا ہمارے گاؤں کی لڑکی سے کیا تعلق؟“ جیپال نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”ہے، بہت گہرا تعلق ہے، تم صبر سے سنو۔“ بچن کو نے سختی سے کہا تو وہ خاموشی سے سننے لگا۔ ”میں ایک ماہ اس کے پاس جاتی رہی۔ اس سے ملتی رہی۔ میری سہیلی وہ نہیں رہی تھی۔ وہ معصومیت ختم ہو چکی تھی اس میں، اس کی جگہ ایک پختہ کارا بھٹ بن گئی تھی۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو شاید اندازہ نہ کر پاتا۔ مگر میں بھانپ گئی۔ وہاں بہت ہی خاص قسم کی ٹریٹنگ وی جاری ہے۔ میں نے اس میں دل چسپی لی اور یہ چلا کہ یہ کوئی معمولی تربیت نہیں ہے۔“

”کیا ہے وہ، کیا اب بھی جاری ہے؟“ جیپال نے پوچھا تو وہ بولی۔

”ہاں اب بھی جاری ہے اور اس کی پہلی کھیپ، جس میں میری سہیلی شامل ہے وہ مختلف ملکوں میں پہنچا دی گئی ہیں۔ اگلی کھیپ تیار ہو رہی ہے۔ یہ کہہ کر وہ سانس لینے کے لیے رکی پھر تیزی سے بولی۔ ”اس تربیت کے لیے لڑکی کا خوبصورت ہونا لازمی ہے، باقی کمی وہ پوری کر لیتے ہیں۔ اب تم جانتے ہو کہ تمہارے گاؤں کی لڑکی کچھ نہیں بہت خوبصورت ہے۔ پنجاب میں بہت سارے ایسے دلال ہیں جو ایسی لڑکیاں اس ادارے کے لیے تلاش کرتے ہیں۔ شادی کا بہانہ بنا کر یا بھگا کر یہاں پہنچا دیتے اور وہ یہاں باہر کے ملکوں کے لیے تیار ہوتی ہیں۔ ان دلالوں میں یہ ایک گنڈر سٹکھ بھی تھا۔ جیسے ہی مجھے پتہ چلا

پوچھا تو کرم سٹکھ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ان کی اولاد اتنی ہی سر پھری ہوتی ہے۔ اس کی بیٹی کو پتہ ہے کہاں سے اٹھایا، ایک کلب سے جہاں وہ تاج گانے میں مصروف تھی۔ ان لڑکیوں کو خواہ کواہ کا وہم ہو جاتا ہے کہ وہ شہر پر راج کر رہے ہیں۔“

”ہمیں پتہ تھا کہ اس نے پھر جانا ہے، اسی لیے اس کے بارے میں پوری طرح جان لیا۔ یہ اپنی کمران کو اور سرچیت بڑے سکون سے گئے، وہ پرنس کا نفرنس کے بعد آرام کرنے اپنے کمرے میں گیا تھا۔ انہوں نے وہیں اس کا کام کیا اور سکون سے باہر آ گئے۔ اس وقت وہاں رش لگا ہوا تھا، کون کس کو جانتا تھا۔ یہ جس وقت وہاں سے آ گئے تو انہیں پتہ چلا، ہم اس وقت تیرے پنڈ کے قریب تھے۔ سو جا ادھر چلیں، پھر جاندر کی طرف نکل گئے۔“ بلدیو نے سکون سے کہا۔

”یہ سب ہوا کیوں، وہ انہوں کیوں کرتا تھا؟“

”اسی بات کا تو تمہیں پتہ نہیں۔ میں بتاتی ہوں۔“

بچن کو اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ وہ کہتی رہی اور وہ سنتا رہا۔

بچن کو کی ایک بچپن کی سہیلی اس کے ساتھ کالج تک پہنچتی رہی۔ دونوں کی آپس میں بہت محبت تھی۔ گہری دوستی ہوئے۔ بائیس ان کا آپس میں کوئی راز راز نہ رہا تھا۔ وہ کالج میں تھی کہ اس کی ایک بے سے کافی گہری دوستی ہوئی تھی۔ یہ تعلق پروان چڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ لڑکے والوں نے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ یہ رشتہ کسی وجہ سے آگے نہ چل پایا۔ پھر ایک دن وہ لڑکی گھر سے غائب ہو گئی۔ کسی کو پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے۔ فطری طور پر پہلا شک اس لڑکے پر گیا۔ وہ دوسرے ہی میں موجود نہیں تھا اور نہ ہی اس کے گھر والے۔ لڑکی کے گھر والوں نے لڑکی کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت تک بچن کو بھی مزید پڑھنے کے لیے امرتسر آ چکی تھی۔

یہ کوئی دو ماہ پہلے کی بات تھی۔ وہیں ایک دن اس کا آتما سامنا اس لڑکی سے ہو گیا۔ وہ بہت با اعتماد تھی اور

تو میں نے جلد یو کو ساری بات بتادی۔ میں نے ایسے ہی دو دلال پہلے ہی پھڑکا دیئے ہوئے ہیں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے یہ بھی اسی ادارے میں جانے والی تھی؟“ جہپال نے پوچھا۔

”بچن، تم اس لڑکی کے بارے میں بتا رہی تھی، میرا مطلب سندھ پ کے بارے میں۔“

”جی، وہ اس کے بارے میں بتانے لگی۔“

☆.....☆.....☆

وہ ایک ننھی سی شام تھی۔ جس وقت ہم لاہور پہنچے۔ اس وقت تک مجھے یہ شدت سے احساس ہوا کہ اب سارے لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ اگر چہ ایسے ہی کسی وقت کے لیے میں نے بہت سارے ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ لیکن جس طرح ایک جھٹکے سے یہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا، اس نے مجھے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں ولید کا خیال آیا۔ وہ کہاں ہوگا؟ میں نے اسے فون ملایا تو اس نے ریسو کر لیا۔

”جی، بہت دنوں بعد آپ نے مجھے یاد کیا۔“

”کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنے آبائی گاؤں آپ فرمائیں، میں حاضر ہو جاتا ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”ہاں یہ وہیں جانے والی تھی۔ اگر اس کا بھائی قتل نہ ہوتا تو یہ اب تک وہاں جا چکی ہوتی۔“ بچن کو نے بتایا۔

”کیا وہ کوئی ذہنی تبدیلی کرتے ہیں جس سے.....“

جہپال نے پوچھا چاہا تو بچن کو نے بولی۔

”وہ کچھ بھی کرتے ہیں، لیکن لڑکی پوری کی پوری بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں یہ تو وہی لڑکی بتا سکتی ہے، جس نے تربیت لی ہو یا پھر وہ تربیت دینے والے۔ مگر یہ ایک بہت بڑا پلان ہے۔ اب وہ ادارہ، جگہ رکے معاملے میں ذرا بھی دل چسپی نہیں لے گا۔ پہلے دو کے بارے میں بھی نہیں لی۔ لیکن جس ادارے کے تحت یہ سب چل رہا ہے، وہ دلچسپی ضرور لے گا۔“

”چلو، وہ جو ہوگا سو ہوگا۔ اب کیا کرتا ہے۔“ جہپال نے پوچھا تو جلد یو نے کہا۔

”کب تک پہنچو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”زیادہ سے زیادہ دو، اڑھائی گھنٹے لگیں گے۔“ اس نے کہا تو میں نے اسے کل آنے کے لیے کہہ دیا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد ہم ماڈل ٹاؤن کے علاقے میں جا پہنچے۔ پھر اگلے چند منٹ میں ہم اسی سیف ہاؤس میں آچکے تھے، جو چار کنال کی کونٹری میں تھا۔ یہاں پر بھی گیت نے اپنا پروڈکشن ہاؤس بنا رکھا تھا۔ وہاں پر چند لوگ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے کار گیراج میں کھڑی نہیں کی بلکہ اسے یوں پورچ میں کھڑی کی کہ اگر ایک دم سے بھی نکلنا پڑے تو نکل جائیں۔ ہم اوپر ایک گھڑی قسم کے کمرے میں چلے گئے۔ جہاں ہر طرح کی سہولت تھی۔ میں یہاں خود کو خاصا محفوظ سمجھ رہا تھا۔

”کوئی نہیں، ادھر ہی ہیں۔ جو بھی سر اٹھائے گا اسے دیکھ لیں گے۔ اور ہاں، تیرے پنڈ والا تھا نیدار، اسے کچھ سبق دیں گے۔ تاکہ وہ تمہیں ہی پر ڈوکول دے۔“

اس پر سب نے قہقہہ لگا دیا۔ پھر باتیں کرنے لگے۔ تب جہپال سٹگھ نے ایسے ہی بچن کو سے پوچھا۔

”تمہاری وہ سہیلی کہاں ہے اس وقت؟“

”پاکستان میں، شاید لاہور میں۔“ بچن کو نے بتایا تو نون کو نے کہا۔

”اس کے بارے میں تفصیل معلوم ہو تو بتاؤ، پتہ کر لیں گے۔“ اس پر بچن کو نے سر ہلاتے ہوئے کہنا چاہا تو جہپال نے پوچھا۔

”اگر چہ بانٹیا کو میرے ساتھ سارے راستے باتیں کرتی ہوئی آئی تھی۔ لیکن وہ ساری باتیں ہمارے اپنے متعلق تھیں۔ وہ اپنے بارے میں بتاتی رہی اور میں اپنے بارے میں کہتا رہا۔ وہ بیڈ پر پھیل کر لیٹ چکی تھی۔ اور میں

”نکو دو رو بندے لائے ہو یا ابھی وہیں ہیں؟“

”ہیں، ادھر سر ونٹ کوارٹر میں، ان سے بہت کچھ اگلوٹا ہے، وہ ذرا ٹھیک ہو جائیں بتانے کے لیے۔“

کرن کو نے بولی تو نون نے پھر یاد دلایا

ٹریس نہیں کر پایا۔ یہ بات مجھے اس وقت سمجھ میں آئی ہے جب سنڈر لعل نے اس مہک کا تھکا دیا۔ یقین جانو، یہ بھی رتب کی طرف سے ہے۔ میں باس کی نگاہوں سے چھپ گیا، اس کا تعلق اس خوشبو سے ضرور ہے۔ اب سمجھنا یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟“ میں نے کہا بانٹتا کور ایک دم سے مسکرا دی پھر بولی۔

”یقین جانو جمال، آج صبح سے میرے دماغ میں یہ خیال کئی بار آیا ہے۔ لیکن میں تم سے اس لیے نہیں کہہ پائی کہ شاید تم میرا مذاق اڑاؤ۔ چل اب کچھ نہیں ہوتا۔ رتب ہمارے ساتھ ہے تو پھر کیا پروا۔ اب یہ دیکھ کہ اس باس کے بچے کو تلاش کیسے کرتا ہے؟“

”وہ بھی ہو جائے گا۔“ میں نے کہا اور نند کوفون ملا یا۔ اس نے چند منٹ بعد فون رسبو کر لیا۔ تو میں نے پوچھا۔ ”ہاں سنا، کچھ پتہ چلا؟“

”ہم نے سوفٹ ویئر بنا لیا ہے۔ اس کا تجربہ جاری ہے۔ یہ نمبر کبھی ایسیسز م میں ملتا ہے اور کبھی ددنی میں۔ اس کی لویشن مختلف جگہوں سے مل رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف ایک دودن میں اسے تلاش کر لوں گا۔“

اروند نے کسی حد تک شرمندہ سے لہجے میں جواب دیا۔ ”چلو کوئی بات نہیں، تم کوشش تو کر رہے ہونا، مسلمان کو کسی بلیک مارکیٹ سے بھی نہیں ملا؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ تو بہت کوشش کر رہا ہے، لیکن نہیں ملا۔ بہر حال اگر ہم خود کوئی سوفٹ ویئر بنا لیں گے تو اس کا توڑ بہت مشکل ہوگا، یہ ہمارے ہی کام آئے گا۔ کسی دوسرے کے پاس نہیں ہوگا۔“ اس نے امید افزا انداز میں کہا تو کچھ دیر یونی گپ شپ لگانے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

میں نے فون بند ہی یا تھا کہ اشفاق چوہدری کا فون آ گیا۔ میں نے کال رسبو کی تو اس نے بتایا۔ ”یار وہ لوگ مسافر شاہ کے تھڑے سے چلے گئے ہیں، سارے کے سارے، وہ ملنگ بھی انہی کے ساتھ چلا گیا ہے۔“

”چلو اچھا ہوا۔ اب ان کی طرف سے کوئی ٹینشن

اس کے پاس ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ تبھی اس نے گہرے سچے میں پوچھا۔

”جمال، یہ اچانک تمہارے ہاتھ سے سب کچھ کیسے نکل رہا ہے، وہ سب لوگ جو تمہارے ارد گرد تھے چلے گئے۔ اب کیا کرو گے؟“

”وہی جو میرا دل چاہے گا۔ جو میں نے سوچ لیا ہے اور اس کی گواہی میرے دل نے دے دی ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ خاموش رہی، تب میں کہتا چلا گیا، ”وہ مجھے چھوڑ کر نہیں گئے، بلکہ میں نے انہیں خود سے الگ کیا ہے۔ کیونکہ میں اب محسوس کر رہا ہوں کہ حالات بدلنے لگے ہیں۔ تمہیر کے لیے ٹوٹ پھوٹ ضرور ہوتی ہے۔ میں شاید اب کسی دوسرے دائرے میں جا رہا ہوں۔“

”مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”دیکھو۔! سب لوگ جو یہاں سے چلے گئے، کیا تم نہیں سمجھتی ہو کہ میرا دائرہ پھیل گیا؟“ میں نے کہا تو وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”ہاں یہ تو ہے۔“

”اور دیکھو۔! وہ باس جو ایک نادر قوت کی طرف سے وہ آیا اور تو یکسر حالات بدل گئے۔ وہ نادر قوت جو ہمیں ختم کرنے کے ورے تھی، وہ نہیں توڑ پائی، بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ رتب کی مرضی یہی ہے کہ وہ ہمیں کچھ نہیں کر پائے۔ ابھی اپنی اپنی جگہ محفوظ ہو گئے۔ ہوتا یوں کہ انسان اپنے سوچنے، فیصلہ کرنے اور عمل میں آزاد ہونے کے باوجود جب رتب تعالیٰ کے نظام میں داخل ہوتا ہے، اس کی منشاء اور مرضی کے خلاف جاتا ہے تو پھر بے بس ہوتا ہے۔“ میں نے اسے سمجھایا تو وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”اس نے اتنے ایک کیسے اور تم بچ گئے۔ اب وہ تم تک نہیں پہنچ پایا اور نہ ہی تم اس تک پہنچ سکے ہو، ایسا کیا ہے، کچھ سمجھ میں آیا؟“

”ہاں، اور کچھ ہونہ ہو، یہ جوکل پر فیوم کی شیشی ٹوٹی ہے، اس خوشبو کا بہت بڑا ہاتھ ہے کہ وہ کل سے مجھے

نہیں ہوگی۔“ میں نے کہا۔

میں تفصیل بھی درج ہے کہ یہ کیسے استعمال کرنا ہوگا۔ اگر ضرورت پڑے تو مزید بنا سکتے ہیں۔ ورنہ میں تو حاضر ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ امن، صرف طاقت کے توازن ہی میں پوشیدہ ہے۔ امید ہے میرے باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا یہ اچھا بدلہ ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ خط اس لیے دیر سے دیا ہے کہ تم مجھے اب روک نہ سکو۔ بنگوان کے لیے روکنا بھی نہیں۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ رابطہ کروں گا۔“

میں خط پڑھ چکا تو کچھ دیر تک اس کے اثر میں رہا۔ پھر بانیتا کور کی آواز پر چونکا

”کافی پراسرار آدمی تھا۔“
”ہوں، یہ دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا اور سوچ میں ڈوب گیا۔ مجھے اب کسی کیسٹ کو تلاش کرنا تھا جو بہت زیادہ بخر بے کار ہو اور وہ اس فارمولے کے مطابق کام کر سکتا ہو۔ اس وقت میرے ذہن میں دور تک کوئی ایسا بندہ نہیں تھا۔ میں نے صبح اس بارے میں معلومات کا سوچا اور سونے کی تیاری کرنے کے لیے اٹھ گیا۔ اسی وقت جہاں کا فون آ گیا۔ حال احوال کے بعد اس نے کہا۔

”یار، تمہارے لاہور میں ایک لڑکی رہتی ہے۔ یہاں تو اس کا نام سندھپ کور تھا، اسے پکڑنا ہے، اس کے پیچھے لوگوں کو پکڑنا ہے، میں اس کا پتہ اور تصویر بھیج رہا ہوں، وہ ہماری ایک بہت اچھی دوست کی سہیلی ہے۔“

”تمہاری دوست کی سہیلی، ویسے کون ہیں وہ لوگ؟“
میں نے پوچھا تو اس نے اختصار کے ساتھ وہ ساری کہانی سنا دی۔ پھر کہا۔

”یہ ٹھیک لوگ نہیں ہیں، اس کی آڑ میں کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔“

”میں دیکھ لیتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون سے تصویر دیکھنے والا آپشن کھولتے ہوئے کہا۔ اس پر بانیتا کور نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”لگتا ہے کوئی کام نکل ہی آیا۔“
”ہاں لگتا تو ایسے ہی ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے

”میں نے ان کے پاس بندے چھوڑے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت تک وہیں رہے جب تک وہ چلے نہیں گئے۔ جس وقت وہ چل دیئے تھے، اس وقت سندر لعل نے ایک خط دیا ہے تمہارے نام، جاتے ہوئے انہی دو بندوں کو تھما گئے تھے۔ وہ ابھی لائے ہیں میرے پاس۔“

”تو پڑھ کے سنا دو۔“ میں نے کہا۔
”کاش میں اتنا پڑھا لکھا ہوتا۔ یہ انگریزی میں ہے۔ میں ایسے کرتا ہوں، اس خط کی تصویریں تمہیں ابھی بھیج دیتا ہوں، تم اسے پڑھ لو۔“ اس نے کہا۔

”چلو سٹیج دو۔“ میں بولا تو اس نے فون بند کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے وہ خط تصویروں میں بھیج دیا۔

”کیا لکھا ہے۔“ بانیتا کور اٹھ کر بیٹھ گئی تو میں پڑھا ”محترم جمال۔! میں نے کہا تھا نہ میرے باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر میں اس احسان کا بدلہ دوں گا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ میرے جانے کے بعد آپ میرے احسان مند ہوں گے تو میں ایک اہم بات بتا رہا ہوں، جس سے انسانیت کا بہت بھلا ہونے والا ہے۔

میں نے جو پہلی دوا تیار کی تھی، اس وقت میرے ذہن میں یہ تھا کہ وہ لوگ جو عادی مجرم ہیں اور انسانیت کے لیے قاتل ثابت ہو رہے ہیں، ان کا ذہن بدلنے کے لیے دوا استعمال کرائی جائے۔ انسانیت کی بھلائی کے لیے

ذہن لوگوں کو اور زیادہ ذہین بنایا جائے۔ لیکن ہوا کیا اس کے الٹ۔ میری اس دوا کے بل بوتے پر ایک ایسی فورس تیار کی جا رہی ہے، جو دوسرے ملکوں میں جا کر تخریب

کاری کریں۔ میرے ملک میں ایسا ہی ہو رہا ہے اور اس فورس کی تیار کردہ کچھ لڑکیاں تمہارے ملک میں بھی آ چکی

ہیں۔ مجھے یہ تو نہیں پتہ کہ مقامی بندہ کون ہے۔ لیکن یہ تو کر سکتا ہوں کہ تمہیں آگاہ کر دوں۔ میں نے جو دو

شیشیوں کے ساتھ خط تمہیں دیا ہے، اس میں ان دواؤں کا فارمولا تمہیں لکھ کر دے دیا ہے۔ یہ فارمولا پہلی دوا کے ساتھ ہی دوسری دوا کا بھی لکھا ہوا ہے۔ ان کے بارے

تاکہ ایک چکر لگا آئیں۔ طارق بار بار بانیتا کور کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس پر وہ محض ہنس کر رہ گئی۔

”میں اصل میں یہاں اس لیے رکا ہوں کہ پلان کے بارے میں بات کر کے کلیئر ہو جائیں۔“ یہ کہہ کر میں ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”اس علاقے میں تم لوگ گھروں کے بارے میں جانتے ہو، سیکورٹی بھی ہوگی اور اندر سے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔“

”اس کا میں نے بندوبست کیا ہے۔ پولیس فورس کی مدد لی ہے، اگر آپ کہیں تو انہیں بلوالیں۔“ طارق نے پوچھا تو میں نے کہا۔

”اگر اندر سے مزاحمت ہوئی تو ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ وہاں کیا ہوگا۔“

”میں کہتا ہوں، آخر اس آپریشن کے بارے میں جواب بھی تو دینا ہوگا۔“ اس نے فون سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے لیکن یہ لڑکی ہر حال میں زندہ چاہئے۔“ میں نے سیل فون پر اس کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ سب نے تصویر دیکھی لی۔ ایسے میں ان دو بندوں کی طرف سے کال آئی، جنہیں گھر دیکھنے کو بھیجا تھا۔ طارق نے وہ

کال سنی، پھر بتایا
”وہاں مکمل خاموشی ہے۔ گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں بلکہن ہے اندر ہو۔ وہ کونٹھی صرف سامنے سے کھلی ہے، باقی تین اطراف میں گھر ہیں۔“
”چلو نکلیں۔“ میں نے کہا تو ہم سب وہاں سے نکلنے چلے گئے۔

وہ سڑک مین روڈ سے دائیں جانب نکلی تھی۔ دور تک جاتی ہوئی اس سڑک پر اسٹریٹ لائٹ کی کجی روشنی تھی۔ وہ کونٹھی آگے جا کر دائیں جانب آٹھواں تھا۔ وہ ایک کنال پر تھی، جس کے وسط میں رہائشی عمارت تھی۔ میں نے اس کونٹھی کے عین سامنے جا کر کاررو کی۔ سب تک ہم دونوں اسلحہ سے لیس ہو چکے تھے۔ ہم نے جو جینٹس پہنی تھیں۔ اس میں سب کچھ تھا۔ ہم دونوں نکلے اور گیٹ پر

اسے وہ سب بتا دیا جو جہاں تک نے مجھے بتایا تھا۔ اس نے بیڈ کی پشت گاہ کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”اسٹریٹ وہاں کہاں؟ میری نگاہ میں تو ایسا کوئی ادارہ نہیں، کہاں ہو سکتا ہے؟“

”یہ تم جانو اور تمہاری یادداشت۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”چلو دیکھ لیتے ہیں۔“ اس نے بے پروائی کے سے انداز میں کہا اور اس لڑکی کی تصویر دیکھنے لگی۔ سندیپ کور اچھی خاصی حسین لڑکی تھی۔ بھرا بھرا جسم، گول چہرہ، موٹی نیلی آنکھیں، تلوار ناک اور پتلے پتلے رسیلے لب۔ چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد میں نے طارق نذیر کو فون کیا۔ وہ شاید میرے ہی انتظار میں تھا۔

”وہ ٹاؤن میں جو حادثہ ہوا، اس کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم نہیں ہوا ہوگا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔
”صرف اتنا کہ چند لوگ آئے اور حملہ کر کے غائب ہو گئے۔“

”چلو، اب تم ایسا کرو، اپنے چند لوگ ساتھ لو، جب تیار ہو جاؤ تو مجھے بتانا، بہت ہی اہم مشن تمہارے ذمے لگا رہا ہوں۔“

”جی میں تیار ہوں جہاں کہیں گے پہنچ جائیں گے۔“ اس نے کہا تو میں نے اسے پتہ بتاتے ہوئے کہا۔

”میں وہیں تمہیں ملوں گا۔ میرے ساتھ میری ایک ساتھی بھی ہوگی، ہوگی کا مطلب ہوگی۔“

”جی میں سمجھ گیا، میں نکل رہا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔ ہمیں وہاں سے نکلنے میں پانچ منٹ سے بھی کم وقت لگا۔

نمبر کا پل پار کرتے ہی میں نے طارق کو فون کیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسی طرف ہی جا رہا تھا۔ میں نے ایک پوائنٹ پر اسے رُک جانے کو کہا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم آپس میں جا ملے۔ اس کے ساتھ چار آدمی تھے۔ وہیں ساتھ میں ایک مارکیٹ تھی۔ وہاں موجود ایک ریسٹوران میں ہم جا بیٹھے۔ دو بندے اس گھر کی جانب بھیج دیئے

اچھا خاصا زیور، بڑی تعداد میں نوٹ، ایک ڈائری، لپ ٹاپ، اسکے علاوہ دوسرا ایسا کوئی سامان نہیں ملا جس سے وہ مشتبہ ثابت ہو سکیں۔ جہاں نوٹ تھے، وہاں سے دو پاسپورٹ بھی ملے، سندھپ کور کا نام اس پاسپورٹ پر ساڑھ تھا، اور اس کے شوہر کا نام خرم اقبال تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ادھر ہی ہے۔

رات کے دو بجے کو آگے لیکن ان کا پتہ نہ تھا۔ تقریباً سو دو بجے کے قریب باہر سے اشارہ مل گیا کہ وہ آگے ہیں۔ سچی الرٹ ہو گئے۔ گھر کے اس ملازم کو بتا دیا تھا کہ امراس نے ہمارے کہنے کا ذرا سا بھی انکار کیا تو موت کے حوالے ہو گا۔ اس کی بیوی ہمارے پاس تھی۔ باہر اس نے کار روکی اور ہارن دینے لگا۔ سچی اسی ملازم نے جلدی سے گیٹ کھول دیا۔ تو وہ اپنی گاڑی سمیت اندر آ گیا۔ اس وقت تک ہم داخلی دروازے کے پیچھے آگے تھے۔ وہ نشے میں تھا۔ اس لیے جلدی سے اندر آنا چاہتا تھا۔

سندھپ کور تصویر سے زیادہ حسین تھی۔ اس نے جو لباس پہنا ہوا تھا، اس میں وہ آدھی سے زیادہ برہنہ تھی۔ بلاشبہ اس نے بھی پی رکھی تھی۔ وہ جیسے ہی جھوٹی ہوئی اپنے شوہر کے ساتھ اندر آئی، ان کی کپٹی پر ہاسٹل رکھ دیا گیا۔ ان کے لیے یہ اچانک تھا، خرم تو کوئی مزاحمت نہ کر رہا لیکن سندھپ نے اصرار ہی طور پر اپنا بچہ ڈالنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے وہ تربیت یافتہ تھی۔ تین بائیت اور نے اسے مردن سے پلڑا اور زور سے قالین پر پھینک دیا، پھر ہاسٹل اس کے ماتھے پر رکھتے ہوئے سرد سٹجے میں کہا۔ ”اب کوئی حرکت مت کرنا سندھپ کور۔ ورنہ تیرا بدن چھلنی رروں گی۔“

اس کے یوں کہنے پر وہ حیران نکاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ تب تک دوسرے لوگ بھی آگئے۔ انہوں نے تیزی سے دونوں کو باندھا اور خرم کو باہر کھڑی ہائی ایس ڈین میں ڈال دیا۔ جبکہ سندھپ کور کو ہم لے گئے۔ بعد والوں نے ان دونوں ملازمین کو جی اٹھایا۔ وہ اسی کاروائی میں تھے کہ ہم وہاں سے نکل پڑے۔

چلے گئے۔ اس دوران ایک لڑکا ہانڈری وال پر چڑھ گیا۔ اس نے اندر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ باخیتا کور نے اسے اشارہ کیا کہ اندر سے جائز گیٹ کھول دے۔ وہ اندر کود گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے گیٹ کھول دیا۔ میں اندر چلا گیا۔ باقی میرے پیچھے آگئے، دو بندے گیٹ کے پاس رک گئے۔

میں داخلی دروازے پر پہنچا اور اسے حوالا دے کھل گیا۔ سامنے صوفے پر دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک عورت تھی، دوسرا مرد تھا جو سامنے دیوار پر لگنی وی میں کھوئے ہوئے تھے۔ جہاں کوئی ڈرامہ چل رہا تھا۔ میں اور بائیتا کور دبے قدموں ان کے سر پر جا پہنچے اور ہاسٹل کی مال ان کے سروں پر رکھ دی۔ وہ ایک دم ہی سے ہم گئے۔ عورت کی تو کھلی بندھنی۔ وہ دونوں گھر کے مالک نہیں لگ رہے تھے

”جی جی، خدا کے لیے ہمیں کچھ نہ کہیں۔“ مرد ہمت کر کے بولا۔

”گھر میں اور کون کون ہیں؟“ بائیتا کور نے پوچھا۔
”گنگ۔ گنگ۔ کوئی نہیں، صاحب اور بیگم پارٹی میں گئے ہوئے ہیں۔“ مرد نے کہا۔

”کب آئیں گے؟“ میں نے پوچھا۔
”پتہ نہیں جی، کب آتے ہیں۔“ اس نے جلدی سے کہا تو میرے ساتھ گھر سے ایک بندے نے میرا اشارہ پا کر انہیں باندھنا شروع کر دیا۔ پھر انہیں کمرے میں لے گئے۔ طارق سمیت اب سب انصار ہو گئے کہ اندر کیا ہوا۔ میں جلدی سے بیڈروم میں گیا۔ وہاں سامنے دیوار پر شادی کی تصویر تھی۔ سندھپ کور عروسی جوڑے میں غضب ڈھارتی تھی۔ بائیتا کور کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ وہی ہو سکتی ہے۔ میں نے فوراً طارق کو بتایا اور نئی ہدایت دے دیں۔ جس سے ان کی آمد کو بالکل فطری کر دیا گیا تھا۔ جیسے انہیں احساس ہی نہ ہو کہ اندر کوئی ہے۔ یہ سب کرنے کے بعد گھر کی تلاشی لی جانے لگی۔ تقریباً ایک گھنٹے کی بھرپور تلاشی کے بعد ایک کمرے سے چھوٹا سا ملا

آدھے گھنٹے میں ہم اسی سیف باؤس میں آچھے تھے۔ سندھپ کو کو ایک کمرے میں لے جا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ ہمارے سامنے تھی۔ اس کی آنکھوں میں رتی بھر خوف نہیں تھا۔ یوں جیسے وہ مجھے انتہائی نفرت سے دیکھ رہی ہو۔ مجھے اس کی آنکھیں دیکھ کر وہ لوگ یاد آنے لگے، جنہوں نے ریستوران میں مجھ پر حملہ کیا تھا اور وہ میری طرف یوں دیکھ رہے تھے۔

”کیا چاہتے ہو مجھ سے؟“

”کچھ نہیں، ہم نے تو تجھے بچایا ہے۔“ بانیتا کور نے کہا تو وہ نفرت سے بولی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ سہماتے ہوئے بولی۔

”کیوں، ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟“ بانیتا کور نے کہا۔

”پھر مجھے اس طرح باندھا کیوں ہوا ہے، اگر تم لوگ میرے ہمدرہ ہو تو مجھے کھول دو۔“ وہ طنز سے لہجے میں بولی۔

”کھول دو۔“ میں نے کہا تو بانیتا کور نے ایک نگاہ میری طرف دیکھا اور پھر برا سا منہ بنا کر اسے کھولنے لگی۔

اسے کھولنے کی دیر تھی۔ وہ انتہائی تیزی سے یوں نکلی جیسے بجلی کو نڈ گئی ہو۔ اس نے ایک ہاتھ بانیتا کور کی ٹھوڑی کے نیچے گروان پر رکھا اور اسے پرے دھکیل دیا۔ بانیتا لڑکھڑا

گئی، اس نے اتنی لڑکھڑاہٹ کا فائدہ اٹھایا اور اپنا چھٹا اس کے پیٹ میں مارا، وہ وہ جبری ہو گئی، سندھپ نے اپنی کہنی اس کے سر پر ماری اور اسے مرادیا۔ بانیتا کور کو امید نہیں تھی

کہ وہ ایسا کرے گی یا کر سکتی ہے۔ اتنی لمحے سندھپ نے چھلانگ لگائی اور دروازے کی جانب بڑھنا چاہا۔ تب تک بانیتا کور اٹھ گئی تھی اور وہ تیر کی سی تیزی کے ساتھ اس پر

چھتی، میں حیرت زدہ رہ گیا۔ سندھپ یوں اس کی پیٹھ سے نکلی کہ وہ اس چھوٹی نہ تھی۔ بانیتا کور غصے میں آئی تھی

اور بہی غصہ ایک فائبر کے لیے جان لیوا ہوتا ہے۔

سندھپ گھومی اور اس نے بانیتا کو بڑھا ہوا بازو پکڑ لیا۔ پھر ایک جھکاؤ دیا، وہ پھر لڑکھڑا گئی۔ اس بار سندھپ نے حملہ

نہیں کیا بلکہ مجھے نگاہ میں رکھتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھی۔ اس نے میرے اور دروازے کے فاصلے کا تعین کر

لیا تھا۔ اسی مناسبت سے وہ آگے بڑھی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ باہر نکل جائے گی، میں اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھا

۔ اس نے مجھے دور رکھنے کے لیے اپنے ہاتھوں کو یوں بڑھایا کہ جیسے وہ مجھ پر حملہ کرے گی۔ میں جیسے ہی اس

کے قریب گیا اس نے پوری قوت سے کھڑی پھیلی میرے منہ پر مارنا چاہی، میں اسے چھکائی دے گیا۔ لیکن

اس کی انگلیاں میرے چہرے کو چھو گئیں۔ تبھی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑ لی

۔ وہ چیخنے کی طرف زور لگانے لگی تو میں نے اسے چھوڑ دیا وہ بڑھک کر فرش پر گر گئی، پھر جیسے ہی جھپ لگا کر اٹھی اور

باہر کی طرف کودتے ہوئے پوری قوت سے پیٹھ میرے منہ پر مارا۔ تبھی میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر

گرفت میں لے لیا۔ یہ سب کچھ انتہائی تیزی سے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہوا۔ میں نے محسوس کیا جیسے

سندھپ کی جان ہی نکل گئی ہو۔ اس کا جسم ایک دم سے ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ یوں میرے ساتھ لگ گئی جیسے میرے

بدن میں محسوس جانا چاہتی ہو۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھا، اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ یوں خمار آلود انداز

میں میرے ساتھ چمٹ گئی جیسے وہ بھر پور نشے میں ہو۔ میں چونک گیا کہ اسے کیا ہوا۔ اس وقت تک بانیتا کور اٹھ

گئی تھی اور تیزی سے سندھپ کی طرف آئی، اس نے آتے ہی اسے گردن سے پکڑا اور پھینچ کر پیچھے کی طرف

لے گئی، سندھپ نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی، بانیتا کور بھی اس کے ڈھیلے اور بے جان جسم کو محسوس کر کے حیران

ہو گئی۔ اس نے سندھپ کو مارا نہیں بلکہ اسے چھوڑ دیا۔ وہ ایک لمحہ کو یونہی بیٹھی رہی، پھر یوں اٹھی جیسے نشے میں ہو۔

اس نے میری جانب دیکھا اور میری طرف آئی۔ میں کھڑا رہا۔ وہ میرے ساتھ لگ گئی۔ پھر اپنا چہرہ آہستہ آہستہ

میرے سینے سے رٹڑنے لگی۔ چھوٹی ہاتھوں بعد اس کے منہ سے سسکاریاں نکلتے لگیں جیسے وہ بے تحاشا لذت

محسوس کر رہی ہو۔ میں اس کی یہ حرکت قطعاً نہیں سمجھ سکا۔ میں نے اس کو دونوں کانڈھوں سے پکڑا اور اسے

بدن میں رچ چکی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی مہک لگا ہے۔ جس نے مجھے ایک نئے جہان سے آشنا کیا۔ یہی مہک میرا بدن مہکا دیتی ہے، آگ لگ جاتی ہے مجھے، آؤ اب دیر مت کرو، مجھے بچھوڑو الو۔۔۔۔۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بدن پر ہنسی ہوئی مختصری شرٹ زور سے پکڑ کر بھاڑ دی۔ وہ پورے سینے سے برہنہ ہوئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور نرمی سے کہا۔

”ابھی وقت نہیں،“ پھر باہر کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ ”میں اسے بھیج دوں، اتنے میں تم فریش ہو جاؤ۔ پھر بیڈروم میں چلتے ہیں۔“

میرے یوں کہنے پر وہ ایک دم سے مان گئی۔ وہ اٹھی اور کسی رپورٹ کی طرح ہاتھ روم کی جانب چل دی۔ اس نے دروازہ کھلا رہنے دیا۔ اتنے میں ہانپتا کور نے جھانک کر دیکھا تو میں نے اشارے سے اسے بلا یا اور اس کی جانب اشارہ کر کے چپ چاپ نکل گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ پورا لباس پہنے آئی۔ وہ کافی حد تک ہوش میں تھی۔ میں نے اسے خود سے پرے رکھا۔ میں نے وہاں موجود لوگوں کو کچھ کھانے کے لیے کہا۔ تھا، وہ کافی کچھ پھل، بسکٹ اور کیک کے ساتھ چائے دے گئے۔ ہم ڈائننگ ٹیبل کے اطراف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے میری جانب دیکھا اور شرمندہ سے انداز میں کہا۔

”سوری، میں پاگل ہو گئی تھی۔“
 ”دیکھو! ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں، بلکہ تمہارے دوست ہیں۔ ہم تمہیں قطعاً نقصان نہیں پہنچانے والے بلکہ ہم تو بچپن کور کے۔۔۔۔۔“

”بچپن کور، تم جانتے ہو اسے؟“ اس نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، میں جانتا ہوں اور اسی کے کہنے پر یہاں آئے ہیں، اور اب تمہیں واپس لے کر جانا ہے، تم غلط باتھوں میں پھنس چکی ہو، یہی تمہیں بتانا تھا، ٹھہرو، میں تمہاری

لے جا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ یوں میری جانب دیکھنے لگی، جیسے کسی پیاسے کے منہ سے پانی کا پیالہ بنا لیا جائے۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی بجائے ایسی قربان ہونے والی جاہت جھانک رہی تھی کہ میں ایک لمحے کے لیے پکڑا گیا۔ اسے ہوا کیا ہے؟ یہی سوال میرے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ بھی ہانپتا کور نے اس کے منہ پر زبانی دار پھڑ مارتے ہوئے پوچھا۔

”کیا ہوا تجھے؟“
 ”کچھ نہیں، اب جو چاہو کرو، میرا بدن حاضر ہے۔“

سندھپ نے میری طرف یوں دیکھ کر کہا جیسے اس نے اپنا آپ مجھے سوپ دیا ہو۔ ہانپتا کور نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس سے پھر پوچھا لیکن میری سمجھ میں سندھپ کی بات گونج گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہ مہک صنف نازک کو پاگل کر دینے والی ہے۔ کیا سندھپ اس قدر پاگل ہو گئی ہے؟ ہانپتا کور بھی تو صنف نازک سے تعلق رکھتی ہے، اس کچھ کیوں نہیں ہوا؟ میں نے ہانپتا کور کو اشارہ کیا، وہ باہر نکل گئی۔ میں اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے محبت پاش نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔

”کوئی اتنی جلدی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا، میرا اپنا ہی کوئی مجھے پہچان سکتا ہے۔“

”میں تو تمہارا اپنا نہیں ہوں، تم نے کیسے جان لیا کہ میں تمہارا اپنا ہوں۔“ میں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”یہ مہک دنیا میں کوئی دوسرا نہیں لگا سکتا۔ یہ صرف ہمارے ہی لوگ لگاتے ہیں۔“ اس نے کہا تو میں سندھپ اور جہاں سنگھ کی باتیں میرے دماغ میں گھوم گئیں۔ میں نے اسی لمحے پینتھر ابد لیتے ہوئے کہا۔

”تو پھر یہ بہت بڑی کمزوری ہوئی۔ کیا اتنا اثر لیتے ہو تم لوگ؟ کیا باقی لڑکیاں بھی اسی طرح مدہوش ہو جاتی ہیں؟“

”نہیں، ایسا نہیں ہے، شاید دوسری ایسی مدہوش نہ ہوتی ہوں لیکن میں ہو جاتی ہوں۔ یہ مہک میرے تن

بچن کور سے بات کراتا ہوں۔“ میں نے کہا اور سیل فون پر بچن کور کے نمبر لائے۔ کچھ ہی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ وہ ہمارے ہی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”ہیلو۔“

کیا ہوا، وہ ٹھیک تو ہے۔“

”اب قدرے نارمل ہے۔ بچن کور سے بات کرنا چاہتی ہے۔“ میں نے کہا تو وہ بولی۔

”یہ ساتھ ہی بیٹھی ہے۔“ اس نے کہا تو بلاشبہ اس نے فون بٹن کی جانب بڑھا دیا۔ ابھی اس نے ہیلو کہا تو میں نے فون سنڈیپ کور کی جانب بڑھا دیا۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ سنڈیپ کور رونے لگی۔ آخر میں اس نے یہی کہا۔

”ٹھیک ہے جیسے تم کہو، میں وہی کروں گی۔“ یہ بہرہ کر اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس سے بات کر کے فون بند کر دیا۔ اس نے مجھے یہی بتایا کہ ان دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں ہیں۔ میں نے فون جیب میں رکھا اور اسے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کھانے لگی اور اس دوران روتی رہی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ پھر یقیناً بولی۔

”پوچھیں، کیا پوچھنا ہے آپ لوگوں نے؟“

”ہاں نہیں۔ تم جتنا کھاؤ۔“

وہ سون سے کھانے لگی۔ پھر خود ہی بتانے لگی۔

”میں امرتسر سے ہوں۔ اور وہیں سے آئی ہوں۔“

مجھے بتاؤ تمہارا وہ اسٹینڈیٹ کہاں ہے امرتسر میں؟“ بانیتا کور نے پوچھا تو وہ بتانے لگی۔ سنڈیپ کور ہر وہ بات بتانی چلی گئی جو بھی اس سے پوچھا گیا۔ میں نے پہلی بار کسی کو ایسے دیکھا تھا، جس نے اتنی نفرت دکھائی اور پھر اس قدر تا بعد امداد سے سب کچھ بتائے چلی جا رہی تھی۔ اس وقت صبح کے آثار واضح ہونے لگے تھے۔ جب بانیتا کور سے ایک کمرے میں چھوڑ آئی۔

میں اس وقت سوچ رہا تھا کہ اس پر اعتبار کروں یا نہ کروں اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ خوشبو نے مجھے پھر کے

رکھ دیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ان کا آپس میں ضرور کوئی تعلق ہے۔ اور وہ باس بھی اس سے کہیں الگ نہیں تھا۔ یہ راز کب کھلے گا، مجھ اسی کا انتظار تھا۔ میں جلد از جلد باس تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں سویا نہیں، بلکہ میں نے سب سے پہلے اروند سے رابطہ کیا۔ اسے ایسے ہی ادارے کے بارے میں بتایا۔ اروند نے اسی وقت کراچی سے نسیم کو آن لائن لے لیا۔ وہ ابھی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے تھوڑی سی غیند لینے کے بارے میں کہا اور اپنے کمرے میں آ کر سونے کی کوشش کرنے لگا، لیکن مجھے غیند نہیں آئی۔ میں بیڈ پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ مجھے سنڈر فعل کے خط کا خیال آیا۔ میں اٹھا اور اپنے سامان کی طرف گیا۔ وہاں سے وہ پیکٹ لیا جس میں دو انیاں اور لفافہ تھا۔ میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں دو پرچے تھے۔ ایک پر فارمولے کی زبان تھی اور دوسرے میں ان دونوں دوانیوں کے بارے میں درج تھا۔ وہ دو جو پہلی دوانی کا اثر توڑنے والی تھی۔ سنڈیپ کور کے بالکل ٹھیک تھی۔ میں نے درج ہدایات کے مطابق وہ دوانی اور سنڈیپ کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ایک گلاس پانی میں ایک قطرہ دینا تھا۔ وہ میں پانی کے گلاس میں ڈالا اور اس کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ سونے کی کوشش میں تھی۔ میں وہ پانی اسے دے کر پینے کو کہا۔ وہ پانی پی گئی۔ میں وہاں سے آ گیا۔ سونے سے پہلے میں اس سیف ہاؤس کے بیڈ کو امرتسر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر غیند لے لوں۔

جسٹ... ہنڈ... ہنڈ...

جسپال اس وقت واپس آؤں گی جانب چل پڑا تھا، باقی سب میں سے آدھے جائنڈھر کی جانب چلے گئے اور آدھے واپس نمودر چلے گئے۔ نون کور کو فارم ہاؤس پر ہی رہنے کو کہا گیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ پچھ دن تک اس اسٹینڈیٹ کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے، پھر اس کے بعد کوئی فیصلہ ہوگا کہ کیا کرنا ہے۔ اس دوران ایکشن مہم میں کسی کو بھی ضرورت پڑنی ہے تو اس میں مدد کی جائے گی۔ جسپال کو مہم تیز کرنے کے بارے میں کہہ دیا گیا

تھا۔ اسی لیے وہ اوگی پنڈ کی طرف چل پڑا تھا۔

جسپال اس وقت اوگی پنڈ سے تھوڑی ہی فاصلے پر تھا جب اسے ہر پریت کی کال ملی۔

”وہ کہاں ہے؟“ اس نے اچھے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔ لیکن لہجہ کسی پریشانی کی چمکی کھا رہا تھا۔

”خیریت تو ہے نا پرتو؟“ اس نے خوشگوار انداز میں کہا، جس پر وہ قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اوگی تھانے سے پولیس آئی ہے، ان کے ساتھ گورد کی بھی پولیس ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ تمہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔ اور.....“ اس کے ساتھ ہی ہر پریت کی آواز آنا بند ہوئی لیکن فون کال نہیں کٹی تھی، اگلے ہی لمحے کسی

بھاری آواز والے نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”اور اگر تم نہیں آئے تو ظاہر ہے ہمیں یہیں سے کسی کو لے کر جانا ہوگا۔ تم کب تک پہنچ رہے ہو۔“

”دیکھو۔! گھر کی کسی عورت سے بدتمیزی نہ ہو۔ اور تم لوگ گھر سے باہر نکل کر میرا انتظار کرو، میں دس منٹ تک پہنچ رہا ہوں۔ میں گھر کے قریب ہی ہوں۔“

”ارے، تم بھاگ کیوں نہیں جاتے، ہم تمہیں ہار پہنانے نہیں، گرفتار کرنے آئے ہیں، اور ادھر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ دس منٹ ہی ہیں تمہارے پاس۔“ یہ

کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔

جسپال نے وقت دیکھا اور سب سے پہلے فون کو کور کر کے انتہائی اختصار سے ساری بات بتا دی، پھر فون بند کر کے انوجیت سے رابطہ کیا، اس نے فون رسبو کیا تو

پتہ چلا کہ اسے ابھی پتہ چلا ہے اور وہ گھر کی طرف آ رہا ہے۔ جسپال نے بلیمہ سنگھ پنچ کوفون کرنے کا کہا اور فون بند کر کے جیب میں رکھنے کی بجائے ڈیش بورڈ میں رکھ

دیا۔ پھر اس نے اپنی پنڈلی کے ساتھ رکھا ہوا اسلنگ نکال کر وہیں رکھ دیا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے گھر کی جانب

چل پڑا تھا۔

اس نے دور سے ہی دیکھ لیا۔ اس کے گھر کے سامنے کافی ساری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جسپال کو یہ اندازہ ہو گیا

کہ وہ یونہی نہیں آئے ہیں، بلکہ کوئی پکا کاغذ لے کر ہی آئے ہوں گے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ اس لیے اس نے کار لے جا کر گیٹ پر روک دی۔

پھر بڑے سکون سے اتر کر اندر چل دیا۔ راستے میں جا بجا پولیس والے کھڑے تھے۔ سبھی پورچ میں وہی اسے سی پی دکھائی دیا۔ جسپال چلتا ہوا اس کے پاس جا ٹھہرا۔

”ویل کم، جسپال سنگھ ویل کم، دیکھو، میں تمہیں تمہارے گھر پر ہی تمہیں ویل کم کہہ رہا ہوں۔ خیر۔! میں تمہیں گنڈر سنگھ کے قتل کے جرم میں گرفتار کرنے آیا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

”بالکل بھی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ایک ذمہ دار آفیسر ہیں، بنا کسی گیدڑ بچھکی کے آپ نہیں آئے ہوں گے۔ دکھائیں گے مجھے وہ گیدڑ بچھکی؟“ جسپال نے کہا تو

اسے سی پی نے مسکراتے ہوئے ایک کاغذ اس کی جانب بڑھا دیا۔ اور طنزیہ لہجے میں کہا۔

”یہ لو۔“

جسپال نے ایک نگاہ اسے دیکھا۔ اسے شک میں گرفتار کیا جا رہا تھا۔ اس نے وہ کاغذ اپنی جیب میں رکھا اور اسے کہا۔

”میں نے کہا تھا کہ گھر سے باہر رہنا، مگر تم پھر بھی اندر آ کر بیٹھ گئے۔ کس کی اجازت سے؟“

”بہت ہوگی اخلاقی گفتگو، اب چلو۔“ پھر اپنے کسی ماتحت کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”گرفتار کر لو اسے؟“

اگلے ہی لمحے ایک پولیس مین آگے بڑھا اور اس کے ہتھ کڑی لگا دی گئی۔ جسپال نے دیکھا، دروازے کی اوٹ میں سے ہر پریت اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھایا اور پلٹ پڑا۔ انہی لمحات میں

انوجیت کی کار اندر داخل ہوئی۔ وہ جلدی سے باہر نکلا اور تیزی سے بولا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ لوگوں کو خبر نہیں کہ.....“

”جی اے سی پی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔“

”تم اگر ایکشن میں امیدوار ہو تو صرف امیدوار ہی

”ولید! خیر تو ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”خیر ہی ہے، آپ سے ملاقات ہونی ہے تو بتاتا ہوں
 ناجی میں۔“ وہ اسی لہجے میں ہی بولا۔
 ”کہاں ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میں گل سے یہیں لاہور ہی میں ہوں۔ آپ کی
 فون کال کا انتظار کر رہا ہوں۔“ اس نے بتایا
 ”ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

میں نے ایک دم ہی اس کے پاس جانے کا فیصلہ کر
 لیا۔ میں فون بند کرتے ہوئے اٹھ گیا۔ اس وقت سندھپ
 کو اپنے کمرے میں تھی اور بانیتا کو جاگ گئی تھی۔ میں
 نے اسے سمجھ دیا باہر جانے کے لیے کہا اور کار لے کر نکل
 گیا۔ میرا رخ علامہ اقبال ٹاؤن کی جانب تھا، جہاں ولید
 میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں جس وقت نہر کے پل پر پہنچا اس وقت مغرب ہو
 چکی تھی۔ میں نہر کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسی وقت
 میرے من میں نجانے کیوں شاہ جمال کے مزار پر ملنے
 والے وہی سفید ریش بزرگ مجھے یاد آنے لگے۔ میں سمجھ
 رہا تھا کہ یہ یاد یونہی نہیں ہے۔ اس لیے جیسے میں فیروز پور
 روڈ پر چڑھا تو پھر چلتا چلا گیا، یہاں تک کہ بابا شاہ جمال
 کے مزار تک جا پہنچا۔ میں نے کار پارک کی اور اندر چلا
 گیا۔ میں نے دیکھا وہی بزرگ انہی قبروں کے درمیان
 سفید کپڑا بچھائے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں مسکراتے ہوئے
 ان کے پاس چلا گیا، انہوں نے میری طرف دیکھا اور
 گہری سنجیدگی سے کہا۔

”آؤ بیٹھو۔“
 میں ان کے سامنے جا بیٹھا۔
 ”کیا میں نے تمہیں دیکھا نہیں دکھایا تھا، اس کے
 بارے میں بتانا نہیں، کیا تم اسے نہیں سمجھے ہو؟“
 ”حضور، اگر میں نہیں سمجھا تو آپ پھر سے مجھے سمجھا
 دیں۔“ میں نے عاجزی سے کہا تو چند لمحوں میری طرف
 دیکھتے رہے، پھر بولے۔

”جہلی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کثرت جو ہے یہ

رہو، قانون کے راستے میں مت آؤ۔ ہم نے اسے ہر
 قیمت پر لے کر جانا ہے سمجھے، اس لیے خاموش ہو جاؤ۔“
 ”تم غلط کر رہے ہو، میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔۔“
 ”تم کچھ بھی نہیں جانتے ہو۔ پرے ہٹ جاؤ۔“ اسے
 سی پی نے حقارت سے کہا تو ہسپتال نے سر دھجے میں کہا۔
 ”اسے سی پی، اپنی جگہ بند رکھو، اور کتے کی طرح
 بھونکنے بند کرو۔“

اس پر اسے سی پی نے حیرت اور غصے سے اس کی
 طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہا تو وہ بولا۔ ”شٹ اپ۔! جب
 میں تیرے ساتھ جا رہا ہوں تو جا رہا ہوں، کسی بھول میں
 مت رہنا کہ تم مجھے گرفتار کر کے لے جا رہے ہو۔ میں
 چاہوں تو اب بھی تیرے ساتھ جانے سے انکار کر سکتا
 ہوں۔ جانا ہے یا ادھر ہی رہنا ہے۔“

غصے میں اسے سی پی سے بولا نہیں گیا۔ اس نے گھور کر
 دیکھا اور اپنے لوگوں کو اشارہ کیا۔ وہ اسے لے کر چل
 دیئے۔ ہسپتال چلتا ہوا پولیس دین میں جا بیٹھا۔ اس کے
 بیٹھے ہی دین چل دی۔

ہنہ..... ہنہ..... ہنہ

سہ پہر ہو گئی تھی۔ میں نہایا تو وہی بھینی بھینی مہک پھر
 سے تازہ ہو گئی۔ بھوک کا احساس ہونے کے باوجود میرا
 کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں لان میں چلا
 گیا۔ وہیں مجھے چائے دے دی گئی۔ میرا ذہن باس میں
 الجھا ہوا تھا۔ اس کی فون کال نہیں آئی تھی۔ اروند اور فہیم بھی
 اسے تلاش نہیں کر پائے تھے۔ تھوڑا بہت اُمر کامیابی ملی
 بھی تھی تو پھر بھی کنفرم نہیں کر پائے تھے۔ میرا اضطراب
 بڑھنے لگا۔ میں اب اروند یا فہیم کو بار بار فون کر کے تنگ
 نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں چائے پی رہا تھا کہ ولید کی کال آ
 گئی۔ میں نے رسبو کرتے ہوئے کہا۔

”سوری۔ میں دوبارہ رابطہ نہیں کر سکا، میں۔۔۔۔۔۔“

”سر، آپ مسروف ہوں گے، بھی رابطہ نہیں کیا، میں
 اب بھی نہ کرتا اُمر مجھے آپ سے ایک اہم کام نہ ہوتا۔“
 اس نے کافی الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

وحدت سے ہے اور وحدت ہی سے ساری کثرت ہے۔ ہر انسان ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے۔ کوئی تم سے جڑا ہے تو کیوں نہیں تم اس سے جڑ جاتے ہو۔ بس ذرا سا دھیان دو۔“

”کیسے؟ کیسے دھیان دوں باباجی؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”اچھا تمہیں پھر ایک اور بات بتاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہے پھر بولے۔ ”تمہارے خیال میں دینے کی حقیقت کیا ہے؟“

”حضور آپ بہتر سمجھتے ہیں۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”دینے کی حقیقت روشنی ہے۔ روشنی نہ ہو تو دینا بھی نظر نہیں آتا۔ میں تمہیں کھول کر ہی بیان کر دوں، دینے کو روشنی نے وجود دیا ہوا ہے۔ دینے کو جسم سمجھ لو اور جسم میں روشنی نہ ہو تو کسی کی بھی پہچان ممکن نہیں ہے۔ روشنی کی حقیقت سمجھ میں آئی تو سمجھ لو کوئی بھی تم سے چھپا ہوا نہیں ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”روشنی کی حقیقت کیا ہے؟“ میں نے بات بڑھانے کے لیے پوچھا۔ تو بولے۔

”جب انسان آنکھ کھولتا ہے تو اس کے سامنے زمان و مکاں ظاہر ہو جاتا ہے۔ دن، رات اور دن رات کے اندر انقلابات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور جو حقیقی زمانہ ہے وہ اس کے اندر ہے اور یہ اس کی ایک جھلک ہے۔ یہ سلسلہ دروزو شب ہی ہے جس میں زندگی اور موت دیکھی جا رہی ہے۔ مطلب پیدا ہونا اور مر جانا۔ یہ تغیرات کی نشانی ہے۔ تغیرات اور انقلابات اسی زمانہ کی مسلسل حرکت سے پیدا ہو رہا ہے۔ چونکہ ذات، تغیرات اور انقلابات سے مزہ ہے، اس لیے وہ زمان و مکاں سے بالاتر ہے۔ یہ سلسلہ دروزو شب اس کی تخلیق سے، سمجھو کن فیکون کا سلسلہ ہے۔ ازل کے ساز سے ایک نغمہ نکل رہا ہے یعنی زمانہ ذات کی تخلیقی فعالیت کا مظہر ہے اور بقید زمان و مکان میں عالم وجود میں چلی آ رہی ہیں۔ زمانہ بلاشبہ کائنات میں سب

”عشق کا زمانہ کے ساتھ کیا تعلق رکھتا ہے؟“ میں نے سمجھنے کے لیے پوچھا۔

”عشق ہومن کے اعمال میں رنگ دوام پیدا کر دیتا ہے۔ کیونکہ عشق اصل حیات ہے۔ اس پر فنا طاری نہیں ہوتی۔ اگرچہ زمانہ تیز تر ہند اور انتہائی رفتار رکھتا ہے۔ لیکن عشق اس سے بھی بڑھ کر سبک رفتار ہے۔ اس لیے وہ زمانے پر غالب آ جاتا ہے اور اسے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ عشق بڑی کامیابی سے زمانے کا مقابلہ کرتا ہے۔ زمانہ ہر شے کو فنا کر دیتا ہے مگر عشق کو فنا کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ زمانہ عشق کے سامنے بے بس ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب باباجی یہ بھی فرمادیں کہ روشنی اور عشق میں کیا تعلق ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”وحدت کی روشنی عشق ہے۔ دینے کی مثال سے اسے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس طرح ظاہری روشنی کے بغیر کچھ بھی دیکھنا ناممکن ہے۔ اسی طرح عشق کی باطنی روشنی کے بغیر کسی بھی شے کی حقیقت کو دیکھنا اور جاننا ممکن نہیں ہے۔ اور جان لو کہ روشنی ہی سے حاصل ہوتی ہے۔“ انہوں نے خود لطف لیتے ہوئے کہا تو میں نے تجسس سے پوچھا۔

”باباجی یہ کیسے، اس بات کو کھولیں؟“

میرے پوچھنے پر وہ بے ساختہ بولے۔

”اتباع..... اتباع محبوب۔“ یہ کہہ کر وہ ہلکا سا مسکرائے پھر جھوم کر بولے۔ ”اللہ کا رنگ کیا ہے، صبغت اللہ۔ اللہ کا رنگ، اتباع ہی سے چڑھتا ہے۔ یہ رنگ وہیں سے ملتا ہے۔ اب سنو۔! یہ کیسے چڑھتا ہے۔“

”حضور فرمائیں۔“ میں نے شوق سے کہا۔

”قطرہ آب نیساں جو صدف کی آغوش میں چھپ جاتا ہے۔ جب اس قطرہ کو خلوت نصیب ہوتی ہے، پردہ میں چلا جاتا ہے خلوت میں گوہر بن کر جلوت یعنی عالم ظاہر میں ظہور پا جاتا ہے۔ جب پانی کی بوند خودی کا حرف یاد کر لیتی ہے، اس میں خودی کی روشنی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اپنے بے حقیقت وجود کو موتی بنا لیتی ہے۔“

”واہ، سبحان اللہ۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اور وہ جذب میں کہہ رہے تھے۔

”عشق و مستی سے، پکی بے خودی سے، جسم و جان، موت و حیات، مکان و زمان سے گذر کر، دل میں ڈوب کر، خلوت میں، حق سے محکم ہو کر، اپنی خودی کو پا کر پھر کائنات میں ظاہر ہو کر، اپنے جان و جسم کو سخیتر کر کے کائنات کو مسخر کر لو۔“

”عشق کی اس منزل خودی تک فوری طور پر رسائی کیسے ممکن ہے۔“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”خودی ایک آنکھ سے اپنی خلوت کا مشاہدہ کرتی ہے اور دوسری آنکھ سے جلوت یعنی کائنات کا تماشا کرتی ہے۔“

اگر ایک بند ہو جائے تو گناہ ہے اگر دونوں آنکھوں سے دیکھتی ہے تو عین راہ سلوک ہے، یہی طریق قلندر ہے۔“

”کیسے باباجی۔“ میں نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔

”وہی..... جیسے دیپے کو روشن ہونے کے لیے اپنے وجود یعنی تیل کو جلانا پڑتا ہے ویسے ہی قلندر اپنے محبوب سے عشق کی آگ میں جلتا ہے تو خودی کی روشنی حاصل کرتا ہے۔“

یہ وہی روشنی ہے جو رب تعالیٰ نے اپنے محبوب کو دی اور انہوں پوری کائنات میں تقسیم فرمادی۔ سن لو۔! خودی

کیا ہے، غلامی محبوب ﷺ اور عشق رسول ﷺ ہے۔“ انہوں نے کہا۔ اور جذب سے شعر پڑھنے لگے۔

مقام مصطفیٰ ذر دل مسلمان است
آبروئے ما از نام مصطفیٰ است
موت و حیات نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود
پسند رُوح و بدن کی ہے ذمہ داری اس کو
کہ نہایت مومن ہے خودی کی عریانی
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کی پیچھے نہ حد سامنے
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی ﷺ
زمین و آسمانوں و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ساری خدائی
”واہ۔! قلندر راہوری نے خودی کو کیسے بیان کیا۔“

میں نے جذب میں کہا۔

”بس اتنا سمجھ لو، اتنا، جب حضرت اقبالؒ کے ہاتھوں میں آئی تو خودی بنی۔“

یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اٹھے، سفید کپڑا سمیٹا اور ایک جانب چل دیئے۔

میں نے غور کیا، میرے سامنے سب کچھ کھل گیا تھا۔ مجھے لگا کہ میں ہاتھ بڑھاؤں گا اور خودی کا جوہر میرے

ہاتھ میں ہوگا۔ مجھے خود پر رشک اور اپنے دشمنوں پر پیار آ رہا تھا۔ جن کی کوششوں سے آج میں اس عالی قدر راز

تک رسائی حاصل کر گیا تھا۔

میں اٹھا اور چل پڑا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں یہ کائنات تسخیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔

میرے سامنے ایک نئی دنیا طلوع ہو رہی تھی۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)



اللہ بخشر

انور گریوال

کبھی کبھی انسان کے ساتھ ایسے حالات اور واقعات پیش آتے ہیں جنہیں وہ تاحیات فراموش نہیں کر سکتا۔ قیام پاکستان کے وقت بھارت سے ہجرت کرنے والوں کے ساتھ بھی ایسی ہی کچھ ناقابل فراموش واقعات پیش آئے جو انہوں نے زندگی یاد رہیں گے۔ بھارت سے ہجرت کرنے والے ایک شخص کا احوال وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا، تھا تو معمولی بڑھا لکھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی خاص مہربانی سے اپنے ہاتھ پونے صراط مستقیم کی ہرجان عطا فرما دی تھی۔

کئے گئے ملک پاکستان اپنے خاندان سمیت چلا آیا۔ ہجرت کی سختیوں سے یوں آگاہی اس کے جھمکے میں آئی کہ راستے میں اس کی طبیعت خراب ہو گئی، خاندان کے باقی افراد چلے آئے، مگر وہ سفر کی سہولتیں برداشت کرتا ہوا کئی ماہ بعد اپنے خاندان سے آ کر ملا۔ پاکستان میں مختلف شہروں میں قیام کرتے ہوئے آخر گوجرہ (فیصل آباد) میں مستقل قیام پذیر ہو گیا۔ اس نے اپنی اصول پرستی اور فطرت سلیم کی بنا پر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ وہ فلاح و بہبود کے کاموں میں پیش پیش ہوتا تھا۔ وہ اپنی محدود دنیوی دنیا کا اہم رکن بن گیا۔ اس کی دینی کامیابی، نینداری تھا۔ اللہ کی قدرت ہے کہ ایک نظریہ کے لوگ اکتھے ہو جایا کرتے ہیں، خواہ وہ دنیا، اچھی ہو یا بری، طبیعت ایسی ہو جو کہ تہیں فطری بات ہیں۔ اس نے دیکھا کہ شہر میں بہت سے لوگ اسی نظریے کے حامی ہیں۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گیا اور ان کے شانہ بشانہ چلنے لگانے لوگوں کا طریقہ تھا کہ وہ اپنی تربیت کے لیے کچھ عرصہ بعد اکتھے ہوا کرتے تھے، ایک دفعہ اس نے بھی پروگرام بنایا کہ وہ بھی اس اجتماع میں شریک ہو، جہاں دعوت حق کے علمبردار اشاعت دین کے لیے پورے ملک سے اکتھے ہو رہے تھے۔ اس غرض کے لیے اس نے زحمت سفر باندھا، اپنی بیٹی کو ساتھ لیا اور اجتماع میں شرکت کرنے کے لیے لاہور پہنچ گیا۔

ان لوگوں کے لیڈر کا قول تھا کہ ”اگر تم لوگوں کے راستے میں رکاوٹ نہ آئے، تو سمجھ لو کہ تمہارا راستہ مشکوک ہے۔“

گوجرہ سے مغرب کی جانب کوئی گیارہ کلومیٹر دور ایک گاؤں کا ایک ویران سا چھوٹا سا قبرستان ہے، جس نے پہاڑی ٹیکڑوں، سرگندوں اور جھازوں وغیرہ کی بھرماری کی وجہ سے خوفناک سی صورت اختیار کر رکھی ہے۔ قریبی کھالوں میں مسلسل نہری پانی چلنے کی وجہ سے بھل کے بہت بڑے بڑے ٹیلے بھی ماحول کی ویرانی اور آلودگی میں اضافہ کرتے ہیں۔ پھر اس کے قرب و جوار میں کوئی آبادی بھی نہیں۔ کئی برس قبل اس قبرستان میں تیس سے زیادہ قبریں تھیں، مگر اب وہ حالات کے بے رحم تھپیڑوں کی نذر ہو چکی ہیں۔ اب وہاں صرف تین قبریں باقی ہیں، سال میں ایک دو مرتبہ اس قبرستان کی صفائی کر دی جاتی ہے، مگر چند ہی ماہ بعد ماحول جنگل کا روپ دھار لیتا ہے۔ زمین شور زد اور کھراٹھی ہونے کی وجہ سے قبریں بھی پھرنے لگتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان کی مرمت بھی کر دی جاتی ہے۔ چنگی ہوئی ان تین قبروں میں دو پہلو پہ پہلو ہیں، ایک میں ماں انچاس برس سے اور دوسری میں بیٹا پانچ سال سے مجبور خواب ہے۔ تیسری قبر ماں کے قدموں کی طرف ہے، اس میں بیٹے کی زوچہ اور ماں کی بہو چوبیس نومبر ۲۰۰۲ء سے تہہ خاک کھواستراحت ہے۔

وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا، تھا تو معمولی بڑھا لکھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی خاص مہربانی سے اپنے بتائے ہوئے صراط مستقیم کی پہچان عطا فرمادی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی ابتدائی چوبیس بھاریں بھارت (لہریانہ) میں گزاریں۔ اور اسی سال وہ اللہ تعالیٰ کا نظام نافذ کرنے کے لیے حاصل

بہر حال اب کے ایسی رکاوٹ آئی کہ ان کے راستے کے درست ہونے کا واضح ثبوت مل گیا۔ یہ قصہ ۱۹۶۳ء کا ہے، ملک پر ایوب خان کی حکومت تھی، آمریت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ تاریخ پچیس اکتوبر اورون جمعہ المبارک کا تھا۔ حکومت نے اجتماع کو نا کام بنانے کے لیے لاؤڈ اسپیکر پر بھی پابندی لگا رکھی تھی۔ اس کا متبادل بندوبست یہ کیا گیا کہ ایک طرف سٹیج تھا، تو چھ کچھ فاصلے پر میز رکھے گئے، جن پر افراد نے کھڑے ہو کر اپنے لیڈر کی آواز کو آگے پہنچایا۔ ان کا لیڈر ایک یا دو جملے بولتا تھا، وہی جملے ایک میز پر گھڑا مکر اور کرتا تھا اور اسی طرح دوسرا اور آگے سے آگے۔ یوں آخر تک قائد کا پیغام پہنچتا تھا۔ اجلاس شروع ہوا تو ایک طرف سے شور مابلند ہوا، ہنگامہ بڑھا تو تشویش بڑھی۔ کتابوں کے اسٹال اٹھنے لگے، قاتلوں کی رسیاں کٹنے لگیں، خواتین کے کیسپ میں بوتلیں برسنے لگیں۔ ایک طرف لاؤڈ اسپیکر نہیں کہ اس قسم کی صورت حال کا مانیک پر اعلان کیا جائے، دوسری طرف معاملہ بڑھ رہا تھا۔ کرائے کے حکومتی غنڈے تھے، جنہیں ہر قسم کے سرکاری تحفظ کا یقین دلا کر اجتماع لانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ہنگامہ آرائی اور ہوائی فائرنگ کے دوران ایک فوجی خواتین کے خیمے پر تعینات اسی دیہانی کے سینے پر تکی اور چند ہی لمحوں میں وہ اپنا فرض زندگی چکا گیا۔ پائیز و صفت، سفید پوش سیاہ ریش دیہانی خون سے لمت پت ہو کر سرسک پر گرا، تڑپا اور اس فانی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اسی وقت تک اس نے عمر عزیز کی چالیس بہاریں دیکھی تھیں۔ لوگوں نے شہید کی میت کو ساتھ والے کیسپ میں رکھ دیا، اجتماع کی کارروائی معمولی قسط کے بعد جاری ہوئی۔ قاتل آزاد تھا، پکڑنے والا قانون کی موٹی کی ہٹل میں منہ چھپائے کسی کو نے میں بیٹھا تھا۔ ایک کارکن نے قاتل کو پکڑ لیا، اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈالا، پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ مگر معلوم ہوا کہ بعد میں پولیس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اجتماع میں آئے ہوئے صوبہ خیر پختونخوا (تب سرحد) کے کارکنوں نے اپنے قائد سے قاتلوں سے بدلہ لینے کی اجازت چاہی، انہیں جواب ملا کہ یہی تو حکومت چاہتی ہے کہ ہم جذبہ ملی ہو کر بدلہ لیں اور

رحالات خراب ہوں اور حکومت کو ایکشن کرنے کا موقع ملے۔ فائرنگ کے دوران یہی وہ موقع تھا جب قائدین نے سید مودودی کو بینہ جانے کے لیے کہا، اس موقع پر انہوں نے تاریخی الفاظ کہے، ”اگر میں بیٹھ گیا تو کھڑا کون رہے گا؟“ وہ مقتول جب گاؤں سے گیا تھا تو عام دیہانی تھا، مگر جب لوٹا تو اتنے بخش شہید تھا، اس کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی (جو کہ اس کے ساتھ تھی) ایک عام دیہانی بچے تھے، مگر اپنے باپ کی واپسی پر وہ یتیم تو ہو چکے تھے، مگر ایک شہید کی اولاد قرار پائے۔ تریپن برس قبل آبادی بہت کم تھی، اس وقت تیز رفتار ٹریفک تھی اور نہ ہی برقی رفتار میڈیا۔ اس کے گاؤں میں بجلی کا گزر بھی نہ ہوا تھا، ٹیلی فون کا تو تصور بھی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دیہات کے لوگ بہت جلد سو جایا کرتے تھے۔ گاؤں میں کھیتوں میں کام تو مغرب کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے تھے، لوگ گھر پہنچ کر کھانا کھاتے اور عشاء کی نماز کے بعد تو بہت ہی کم لوگ جاگتے تھے۔ جب گاؤں کو مکمل خاموشی نے اپنے دامن میں ڈھانپ رکھا تھا، جب سارا عالم کو خواب تھا، فضا میں خشکی اتر آئی تھی، ایسی خشکی جس سے پللیں بوجھل ہو جایا کرتی ہیں۔ جب دن بھر کے تھکے ماندے کسان نیند کے ہاتھوں بے بس ہو چکے تھے۔ ایسے میں لوگوں نے گھر رگھر کی آوازیں سنیں، بہت سے لوگ جڑ بڑا کر اٹھے، چھوٹا سا گاؤں ایک من خانہ کی صورت رہتا تھا، بڑے دیکھنے کو آتے، خواتین بھی آٹھل سنھالے دروازوں کے پاس آتیں بڑے کے ہالے کھنکھانے، یہ کیسی آواز ہے، یہ کیا منظر ہے؟ ان کے گاؤں میں ایک ٹرک آیا تھا، انہوں نے اس سے کھل اپنے گاؤں میں ٹرک نہ دیکھا تھا، ان کے لیے یہ نہایت اہم واقعہ تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اس ٹرک پر انہی کے گاؤں کا سب سے نمایاں شخص اتنے بخش سوار ہے، مگر اب وہ شہادت کے تحفے کے ساتھ واپس لوٹا تھا۔ گاؤں کا سونا ہوا ماحول جاگ اٹھا، صبح ملاقات میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دیہاتیوں کے لیے یہ ایک انوکھا واقعہ تھا، بعض لوگوں نے اس بات پر اظہار افسوس کیا، ”... اس کام میں کیا رکھا تھا، وہاں نہ جاتے نہ یہ حادثہ ہوتا۔“ وغیرہ وغیرہ۔ وہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ یہ

اپنے والد کے ساتھ تھیں، نے بتایا کہ... جب اجتماع پر جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں، تو حالات کی کمی کی خبریں بھی گرم تھیں، ہر طرف دسواس تھے، حالات کشیدہ تھے، کوئی نہ جانتا تھا کہ کیا ہوگا؟ والدہ محترمہ نے پوچھا کہ اگر وہاں گولی چل گئی تو...؟ کہنے لگے وہاں اتنے لوگ ہوں گے، عام لوگوں کو کس نے پوچھنا ہے۔ انہی دنوں میں وہ شہادت کو زیادہ یاد کرنے لگ گئے تھے، وہ صحابہ کی شہادتوں کے واقعات پڑھتے تھے اور روتے تھے۔ اگر کوئی کہے کہ کوئی دیہاتی لاہور اجتماع میں گیا، ہنگامہ ہوا، فائرنگ ہوئی تو اچانک ایک گولی اسے لگ گئی، تو یہ سب کچھ ایسے ہی نہیں ہو گیا۔ وہ بروقت با وضو رہتے تھے۔ میں نے ان سے زیادہ طہارت و پاکیزگی اور صفائی کا اہتمام کرتے ہوئے اور کسی کو نہیں دیکھا۔ ان کی شہادت دراصل ان کے اہل خانہ کی تکمیل تھی۔ وہ شہادت کی رورو کر آرزو کرتے تھے... ان کی بیٹی اجتماع میں ان کے ساتھ گئی تھیں، مگر انہیں اس واقعہ کی خبر نہ ہوئی۔ اجتماع کے آغاز میں ہی ہنگامہ شروع ہو گیا تھا، غنڈے خواتین کے کیسپ میں بوتلیں پھینک کر بھگدڑ مچانا چاہتے تھے۔ خواتین کے خیمے میں یہ خبر بھی پہنچی کہ لائل پور کا ایک شخص شہید ہو گیا ہے، وہ نو عمر تھیں، اس ہنگامہ خیز صورت حال سے دل ٹھہرا رہا تھا، مگر یہ خیال نہیں تھا کہ وہ یتیم ہو چکی ہیں۔ اگلے ہی روز اجتماع اوجھڑا چھوڑ کر چند عزیز رشتہ دار خواتین شہید کی مینی کو لے کر واپس روانہ ہو گئیں، راستے میں ہزار دوسووں نے حیران لالے رکھا، ہم واپس کیوں جا رہے ہیں؟ یہ خواتین ساتھ کیوں جا رہی ہیں؟ اگلے روز گاؤں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ وہ باپ کی شفقت سے محروم ہو چکی ہیں۔ وہ مزید کہتی ہیں... اس زمانے میں اخلاقی اقدار بہت تھیں۔ والد صاحب اپنے گاؤں کے غیر اعلانیہ سربراہ تھے، مگر وہ گاؤں کی چھوٹی سی مسجد میں نماز بھی پڑھاتے اور بچوں کو قرآن پاک بھی۔ خواتین کو سر ڈھانپنے کی تلقین کرتے۔ ان معاملات میں حکمت سے گپ شب کے انداز میں اور مذاق مذاق میں اصلاح کرتے، پھر وہ وقت آیا کہ جب خواتین دور سے ہی والد صاحب کو آتا دیکھتیں تو احتراماً سر ڈھانپ لیتی تھیں۔

دل کی گمی کا کوئی اچانک یا بے اختیاری میں پیش آنے والا واقعہ نہ تھا۔ وہ شخص دعوت حق کی واوی پر خار میں تھسپت کرنا لایا گیا تھا، بلکہ وہ پورے شعور، سوچ بچار، یکسوئی اور صدق دل کے ساتھ اس میدان میں اتر اتر تھا۔ تمام گھر والوں اور جماعت اسلامی کے احباب کا رویہ دیکھ کر بھی وہ لوگ حیران و پریشان تھے کہ اتنے بڑے حادثے اور صدیوں کے بعد کہ جس میں ایک بوڑھی ماں، ایک بیوی اور چھ کمسن بچوں کا واحد لقیل انہیں بے سہارا چھوڑ گیا، ان کا کیا بنے گا، کون ان کی سرپرستی کرے گا، کون ان کی دُجوئی کرے گا، کون ان بچوں کے جوان ہونے تک ان کا سہارا بنے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے گھر والوں کو اطمینان قلب نصیب فرمایا، صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائی، یقیناً وہی سب سے بہتر وارث ہے۔

اللہ بخش اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے ایک مربع زمین کے واحد مالک تھے۔ اس علاقے میں ایک مربع زمین کافی سمجھی جاتی تھی، وہاں معمولاً دو، چار، چھ ایکڑ والے کسان ہی تھے۔ اس لیے مربع کا مالک چوہدری کہلاتا تھا۔ انہیں بھارت سے آئے ہوئے دو ایک سال ہی ہوئے تھے کہ اپنے ایک عزیز کے توجہ دلانے سے جماعت اسلامی کی دعوت کی طرف رجوع کر لیا۔ پھر سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں دینیات، خطبات وغیرہ ان کے زیر مطالعہ آئیں۔ ایشیا اور ترجمان القرآن بھی باقاعدہ ان کے پاس آنے لگے۔ وہ جماعتی مصروفیات میں روزانہ گاؤں سے شہر (گوجرہ) جاتے۔ کسی پروگرام سے ناقد نہ کرتے۔ لائل پور سے پروگراموں کے لیے لوگ آتے تو یہ اس میں لازمی شرکت کرتے۔ مقامی سطح پر جماعت کو جتنے فنڈز کی ضرورت ہوتی، اس سے بڑھ کر دیتے۔ بعض اوقات اگر ہنگامی طور پر فنڈز کی ضرورت پڑی یا کسی معاملے میں پیسے کی کمی ہو جاتی، تو وہ اللہ بخش پوری کر دیتے تھے، کیونکہ وہ اس وقت کے دیگر ساتھیوں سے مالی طور پر مستحکم تھے۔ عجیب بات تھی، لاہور کے اجتماع میں ملک بھر سے لوگ جمع تھے، مگر یہ شہادت کا اعزاز دور دراز کے اس دیہاتی کے ہاتھ لگا تھا۔

اللہ بخش شہید کی ایک بی بی تھیں، جو اس سفر میں

ملی کہ رات اس آڑھتی کا انتقال ہو گیا ہے۔ ترمین برس قبل چھ ہزار کھنے کے برابر ہوں گے...؟

اللہ بخش چالیس برس کی عمر میں چھ بچوں کو اللہ کے حوالے چھوڑ کر خود اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچ گئے۔ جب ان کے شہید ہونے کی خبر جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی تک پہنچی تو انہوں نے اپنی لاکھی ہوئی تقریر روکی، مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی اور اعلان کیا کہ ”ہم یہ مقدمہ کسی عدالت میں درج نہیں کروائیں گے، میں نے یہ مقدمہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں درج کروا دیا ہے، وہی بہتر انصاف کرنے والا ہے۔“ انہوں نے حکمت اور تحمل سے ماحول کو ایک بڑے ہنگامے اور سانحے سے بچالیا تھا، جو کراؤ کی صورت میں رونما ہو سکتا تھا۔ حکمران اپنے چند روزہ اقتدار کے نشے میں کیسے کیسے کام کر جاتے ہیں، بے تصور اور بے نہ لوگوں کا دل اپنے سر لے جاتے ہیں۔ گنہ گیر وہ بھی کرتے ہیں اور اس کا احساس بھی ان کو نہیں ہوتا۔ یہ قتل ناحق کس کی گردن پر ہوگا، اس کا ذمہ دار کون تھا، تب کا فوجی سربراہ مملکت یا تب کا گورنر مغربی پاکستان یا صرف وہ قاتل جس نے گولی چلائی تھی۔ اگر پاکستان کی کسی عدالت میں اس کا مقدمہ درج نہیں ہوا، تو کیا، فیصلے کے دن تو اس مقدمے کی سماعت ہو کر ہی رہے گی، کیونکہ ہر انسان کو اپنے کئے کا حساب دینا ہے، جس کے اعمال میں نیکی کا ذرہ بھی ہوگا اس کے سامنے آجائے گا اور جس نے ذرہ بھر بھی برائی کی ہوگی سامنے آجائے گی۔ تب نہ کسی قاتل کو اس کی دنیاوی حکمرانی بچا پائے گی، نہ کالا باغ کی جاگیریں کسی کے کام آئیں گی۔



اپنے اہل خانہ جن میں ہماری دادی، والدہ شامل تھیں، کے علاوہ عزیز واقارب کی خواتین کو بھی نماز کی تلقین کرتے۔ انہوں نے گاؤں کی بہت سی بچیوں کو قرآن پاک مع ترجمہ پڑھایا۔ قرآن پاک کا ترجمہ پڑھنے پر بہت زور دیتے تھے، وہ مجھے کتابوں میں سے عنوانات چن چن کر بتاتے تھے، یہ پڑھو، یہ پڑھو۔“

قدرت کا کرشمہ تھا کہ اللہ بخش اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے، ان کی زوجہ کی بھی صرف ایک بہن تھیں، جو کہ ہندوستان میں ہی انتقال کر گئی تھیں، جن کا ایک بیٹا تھا، جسے انہوں نے بی پالا، پڑھایا اور اس کی شادی بھی انہوں نے ہی کی۔ وہ چونکہ ہندوستان سے ساتھ آئے تھے، اس لیے انہیں اللہ بخش کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور ان کی براہ راست تربیت کا سب سے زیادہ فائدہ بھی انہی کو ملا۔ انہوں نے بتایا کہ... مرحوم سے بھی سچھ بھی قضا نہ ہوئی تھی۔ وہ سب سے زیادہ توجہ اور زور نماز پر دیا کرتے تھے، وہ چونکہ خود نہایت خشوع و خضوع سے نماز ادا کرتے تھے، اس لیے جب وہ کسی دوسرے کو نماز کی تلقین کرتے تو اس پر مثبت اثرات مرتب ہوتے تھے۔ انہوں نے جھنگ سے باقاعدہ ایک مولوی صاحب کا انتظام کیا تھا، اس سے قرآن پاک ترجمہ کے ساتھ پڑھا تھا۔ وہ مولوی صاحب کی بہت خدمت کیا کرتے تھے، ان کی ہر ضرورت اور خوشی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ اپنا کوئی لمحہ بغیر تعمیری اور ضروری گفتگو کے ضائع نہ کرتے تھے۔ وہ عشر اور زکوٰۃ کی نہایت تہمتی سے پابندی کرتے تھے۔ ایک روز مسر کے بعد شہر جانے کی تیاری کرنے لگے تو میں نے اتنی تاخیر سے شہر جانے کی وجہ دریافت کی، کیونکہ آبادی کم اور راستے خراب ہونے کی بنا پر لوگ سر شام ہی دیہات کو لوٹ جاتے تھے، سائیکل پر گوجرہ آنے جانے پر تقریباً دو گھنٹے صرف ہوتے تھے۔ خانو نے بتایا کہ جس آڑھتی پر ہم زرقی اجناس وغیرہ بیچتے ہیں، وہ آڑھتی سخت خسار سے دوچار ہو گیا ہے، اور اب سخت بیمار بھی ہے، میں نے اس سے چھ ہزار روپے لینے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ میں اسے چھ ہزار روپے معاف کراؤں، ایسا ہی ہوا، وہ اپنا کام کر کے واپس آئے تو رات کے اندھیرے گہرے ہو چکے تھے۔ اگلے ہی روز انہیں اطلاع

ننگ و وطن

عمر فاروق ارشد

سیاست دان چاہے دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتا ہو ہونا وہ سیاست دان ہی ہے۔ نئے افق قارئین کے لیے سیاسی کرائم نمبر کے لیے بطور خاص مصر اور اسرائیل کی جنگ کے پس منظر میں لکھی تحریر۔ ایک ہوائی جہاز کے اغوا کی داستان جب اغوا کاروں نے قاہرہ کسی سینٹرل جیل اپنے ایک ساتھی کی رہائی کی خاطر جہاز کے مسافروں اور عملے کے افراد کی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔

قاہرہ ایئر لائنز کا طیارہ ایس کیو 117 ترکی کے استنبول ایئر پورٹ سے اڑان بھر کر فضا میں بلند ہوا اور چند جھٹکوں کے بعد اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی پرواگی کی اطلاع قاہرہ ایئر پورٹ پر موصول ہوئی تھی یہ معمول کی اطلاع تھی جو ایک ہوائی اڈے کا عملہ دوسرے ہوائی اڈے کے عملے کو دیتا ہے۔ طیارے کو اڑے ہوئے ابھی پچیس منٹ ہوئے تھے کہ اچانک طیارے کی عقبی نشستوں سے چار نوجوان تیزی سے اٹھے اور آگے بڑھتے نظر آئے۔ تین نوجوانوں کے چہروں پر نقاب تھے اور چوتھے نے ہاتھ میں کچھ پکڑ رکھا تھا چوتھا نوجوان سیدھا کاک پت میں داخل ہو گیا۔ باقی تین نوجوانوں نے جہاز کے مختلف حصوں میں اپنی پوزیشن سنبھال لی انہی میں سے ایک نے زوردار آواز میں بولنا شروع کیا۔

”آپ لوگوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ جہاز اغوا ہو چکا ہے اپنی اپنی سیٹوں پر موجود رہیں۔ کسی نے کوئی حرکت یا شرارت کی تو جان لیوا ثابت ہوگی اگر آپ لوگوں کی آواز بھی نکلی تو ہمارے ہاتھ اور ہتھیار چلنا شروع ہو جائیں گے۔“ ہائی جیکر نے اپنی بات کا ثبوت بھی فوراً مہیا کر دیا اس نے اپنے نزدیک بیٹھے آدمی کو زانے دار پھینک کر دیکھا جس کی آواز طیارے کے

کے عقب تک صاف سنائی دی۔ پورے طیارے میں خوف اور سراسیمگی پھیل گئی۔ مسافروں نے ایک دوسرے کی طرف بڑے کرب سے دیکھا چند ایک نے بولنے کی کوشش کی لیکن ہائی جیکر کی دہار سے سب سہم گئے۔ طیارے میں موت جیسا سکوت طاری ہو گیا کاک پت کی طرف جانے والا ہائی جیکر کیسٹن کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور ایئر ہوسٹس کو باہر دھکیل دیا۔ طیارے کا پائلٹ اور معاون پائلٹ ہکا ہکا رہ گئے کیسٹن ان پر ڈیڑھ سو سے زائد مسافروں کی سلامتی کا بوجھ تھا اس لیے انہوں نے اپنے اوسان بحال رکھنے کے لیے قدم بٹے پتلے نوجوان ہائی جیکر کے ایک ہاتھ میں کوئی گریڈ نما چیز تھی اور دوسرے ہاتھ میں کھلا ہوا شکاری چاقو تھا اس نے انتہائی خوفناک نظروں سے دونوں کو گھورا چند لمحے کے لیے کیسٹن میں مکمل خاموشی طاری رہی۔

کیسٹن سے باہر کی فضا پر بھی تینوں ہائی جیکروں نے مکمل قابو پارکھا تھا اور سکوت طاری تھا پھر دہلے پتلے ہائی جیکر نے خاموشی توڑی اس کی آواز بھاری بھر کم اور گونجدار تھی اس نے پائلٹ اور معاون پائلٹ کو خبردار کیا۔

”طیارہ اغوا کر لیا گیا ہے اب صرف ہمارے

میں مصر کے علاوہ باقی عرب دنیا محض قربانی کا بکرا بنائی گئی تھی۔ مصر کے ہٹ دھرم اور خود پسند صدر جمال عبدالناصر نے نہایت بے وقوفی کے ساتھ اپنے ذاتی مفادات اور ضد کی خاطر عرب دنیا کو جنگ کی بجھی میں جھونک دیا تھا اور اسی لیے مصر فرنٹ لائن پر اسرائیل کا مقابلہ کر رہا تھا۔

دارالحکومت قاہرہ میں جنگی سرگرمیاں عروج پر تھیں اسی دوران وزارت خارجہ کے حکام کو عراق سے مصری ہائی کمشنر نے اطلاع دی کہ قاہرہ ایئر لائنز کا ایک مسافر طیارہ جس میں ڈیڑھ سو سے زائد مسافر موجود ہیں ہائی جیک ہو چکا ہے جب سیکرٹری خارجہ یہ خبر لے کر وزیر خارجہ کے پاس پہنچا تو اسے زیادہ حیرانی نہیں ہوئی وزیر خارجہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ شراب و شباب کی محفل سجائے بیٹھا تھا۔ ایک مہنگی ہوئی انگریز حسینہ اس کی آغوش میں دہکی پڑی تھی اس نے اطمینان کے ساتھ خبر سنی اور وہ فائل دیکھنے لگا جس میں ہائی جیکرز کے مطالبات لکھے ہوئے تھے چند لمحے بعد اس نے سر اوپر اٹھایا سرخ سرخ آنکھوں سے اپنی سیکرٹری کو گھورا۔

”ہائی جیکرز کا یہ مطالبہ ماننا پڑے گا ڈیڑھ سو مسافروں کی زندگی کے لیے اگر ہمیں ایک مجرم کو چھوڑنا پڑتا ہے تو اس میں اتنے گھائے والی کوئی بات نہیں۔“ سیکرٹری خارجہ کے لیے یہ جواب غیر متوقع نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اہم عہدوں پر تعینات مصری حکام جنگ کے ان دنوں میں امریکہ کی طرف سے بھیجی گئی حسینوں سے بھرپور استفادہ کر رہے ہیں۔

ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کھلے ہوئے شباب کے سامنے مفلوج ہوئی پڑی ہیں اور وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ جنگ کا رسوا کن نتیجہ بڑی

احکامات پر عمل کیا جائے گا۔“ دونوں نے کوئی بات کیے بغیر سر تسلیم ختم کر دیا ہائی جیکر نے حکم دیا۔ ”تم معمول کی پرواز جاری رکھو ریڈیو پر کسی کو ہائی جیکنگ کی اطلاع نہیں دی جائے گی۔ پہلے بصرہ ایئر پورٹ پر لینڈنگ ہوگی اس کے بعد ہم خود کنٹرول ٹاور سے بات کریں گے۔“ رات کے سو گیارہ بجے تک ہائی جیکرز نے طیارے میں اپنی تمام کارروائی مکمل کر لی تھی۔ بصرہ کے کنٹرول ٹاور سے بار بار رابطے کے لیے کہا جا رہا تھا۔

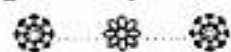
اب رات کے بارہ بج کر ہیں منٹ ہو چکے تھے پائلٹ نے ہائی جیکر کے کہنے پر اس کا رابطہ کنٹرول ٹاور سے کر دیا۔ دوسری طرف سیکرٹری خارجہ کی نرم آواز سنائی دی۔

”آپ لوگ ہمیں اپنی شناخت کروائیں اپنے نام بتائیں یہ بہت ضروری ہے۔“

طیارے سے جواب آیا۔ ”اس کی کوئی ضرورت نہیں آپ ہمارے مطالبات نوٹ کریں۔“ جواب دونوں اور واضح تھا۔

”ٹھیک ہے آپ اپنے مطالبات پیش کریں ہم کوشش کریں گے کہ کم سے کم وقت میں انہیں پورا کر سکیں۔“ اب طیارے سے ہائی جیکر نے بولنا شروع کیا۔

”قاہرہ کی سینٹرل جیل میں ہمارا ایک آدمی ولیم ڈیوڈ قید ہے تین گھنٹے کے اندر اس کی رہائی کا بندوبست کیا جائے اس کے بعد ہم مسافروں کو رہا کر دیں گے۔ ہمیں دو بجے تک بتا دیا جائے کہ ہمارے مطالبات پر عمل شروع ہوا ہے یا نہیں۔“ اس کے ساتھ ہی جہاز سے رابطہ منقطع ہو گیا۔



عرب اسرائیل جنگ کا یہ تیسرا روز تھا اس جنگ

اقتدار کے نچلے ایوانوں میں سے کسی تعلق کی طرح اڑتی ہوئی اعلیٰ غلام گردشوں میں پہنچ گئی۔ صدر ناصر جو کہ عالم اسلام کا نام نہاد ہیرو بننے کے لیے یہ سب جتن کر رہا تھا اس نے ہائی جیکرز کا مطالبہ ٹھکراتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ اسٹیشنل اسرائیلی ایجنٹ کی رہائی کسی بھی صورت ممکن نہیں اور اس سلسلے میں ہائی جیکرز وقت کا تقاضہ یہ تھا کہ مذاکرات کے ذریعے ہائی جیکرز کو الجھا کر کوئی حل نکالا جائے چونکہ مصری صدر اسرائیل سے پھڈا لے کر پھنس چکا تھا اس لیے وہ پوری طرح جنگ میں مصروف عمل تھا مگر بے خبر تھا کہ دیگر مصری سیاسی قیادت جام پر جام لہن ڈھانے میں مصروف ہے اور قاہرہ کسی بازارِ حسن کا منظر پیش کر رہا ہے۔



جہاز میں موجود ہائی جیکرز کی برہمی اور گام گلوج سے مسافروں نے اندازہ لگا لیا کہ ان کا مطالبہ دوسری طرف سے مسترد کیا جا چکا ہے۔ مسافروں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ہائی جیکرز بڑی طرح دباؤ رہے تھے اور شدید رد عمل کی دھمکیاں دے رہے تھے چند لمحات کے بعد چاروں ہائی جیکرز جہاز کی عقبی سمت میں اکٹھے ہوئے اور آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ بصرہ کے ہوائی اڈے پر اس وقت صبح سحری کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

ایئر پورٹ کی انتظامیہ اس بات سے خفا تھی کہ مصر کی طرف سے بالکل غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا گیا تھا اگر وہ چاہتا تو کمانڈو ایکشن کے ذریعے کامیابی کے امکانات کافی روشن تھے مگر چونکہ تقریباً تمام مسافر فلسطین اور دیگر غیر معروف عرب ریاستوں کے باشندے تھے اس لیے مصر کو کچھ خاص پریشانی نہیں تھی۔

تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ سیکرٹری خارجہ نے اپنی فائل اٹھائی اور اگلے قدموں واپس لوٹ گیا۔ دشمن کے لیے مصری فضا سب سے بڑا مسئلہ ہی زمینی جنگ میں تو ان کا پلہ کسی قدر بھاری تھا مگر ہواؤں میں مصر نے اسرائیل کو ایسا پچھاڑا کہ اس کی پشت پر موجود امریکہ چونک اٹھا اور تب ہی امریکہ نے دو محاذوں پر اسرائیل کی خاموش مدد کا سلسلہ شروع کیا، پہلے مرحلے میں ہوشربا حسن کی مالک دو شیراز میں عیاش مصری سیاستدانوں اور فوجی حکام کی خلوتوں میں پہنچائی گئیں ان کے ذریعے وہ سب ممکن ہو گیا جو عام حالات میں بڑے سے بڑا جاسوس اور سیکرٹ ایجنٹ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

دوسرے مرحلے میں مصری فضا سب پر ایک کاری اور فیصلہ کن ضرب لگانے کا پروگرام بنایا گیا جس میں پہلے منصوبے کے تحت اس خاص اسرائیلی ایجنٹ کی ضرورت پیش آئی جو دوران جنگ مصری فوج کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد قاہرہ کی سنٹرل جیل میں قید تھا اس کے سینے میں مصر کے ایسے فوجی راز تھے کہ اسرائیلی فوجی حکام انہیں حاصل کرنے کو بے چین تھے اور اس کے لیے کسی بھی حد تک جانے پر تیار تھے۔

قاہرہ ایئر لائنز کی فلائٹ ایس کیو 117 کا انگوٹہ اسی مقصد کو پانے کی ایک کوشش تھی زمین مزاج اور نشہ زن میں مدہوش وزیر خارجہ بغیر کسی قومی مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ انتہائی حساس معاملہ اپنی دانست میں حل کر کے پھر جام و سرور میں گم ہو گیا۔ اس کے احکامات کی تعمیل میں وزارت خارجہ کی جانب سے ہائی جیکرز سے رابطے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ ابھی انہیں یہ اطلاع دی جانی تھی کہ ناعاقبت اندیش مسلمان ان کا مطالبہ تسلیم کر چکے ہیں مگر یہ اہم خبر

کیا کر سکتے تھے۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد جہاز نے زمین کا رخ کیا تو مسافروں میں بے چینی پھیل گئی وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے کہ ہائی جیکرز اب جہاز کو کہاں لے آئے ہیں جب جہاز نے رن وے کو چھوا تو ہوائی اڈے پر ہونے والی اناؤنسمنٹ مسافروں کو کچھ یوں سنائی دی۔

”ویلم ٹوٹل ایئر پورٹ۔“ مسافروں نے دیکھا کہ جہاز کو اسرائیلی آرمی نے گھیر رکھا ہے۔



طیارہ ہائی جیکنگ کا منصوبہ کامیاب ہونے کے باوجود اسرائیلی کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا اس کو اگر کوئی کامیابی ملی تھی تو وہ یہ تھی کہ اسرائیلی حکام مصر کے ذمہ داران کو عیاشی کی دلدل میں دھلیل چکے تھے اور یہی چیز مستقبل قریب میں اسرائیل کی فتح میں تبدیل ہونے والی تھی۔

اپنے گرفتار ایجنٹ کو رہا کروانا اس کی بقا کا مسئلہ تھا اور پھر اس مقصد کے لیے دوسرا پلان تیار کیا گیا اس کے لیے انہوں نے قاہرہ سنٹرل جیل کے سپرنٹنڈنٹ کا انتخاب کیا۔

”یہ جیل سپرنٹنڈنٹ تھا الفتح ثناوی۔“ جو اپنی قوم کی تاریخ کا ایک سیاہ باب رقم کرنے جا رہا تھا۔ ابتدائی چند راپٹوں میں ہی یہ غدار وطن چاروں شانے چت ہو گیا اس نے یورپی عورتوں کی خود سپردگی اور جنسی میلان سے متعلق عجیب عجیب کہانیاں سن رکھی تھیں جب اسے ان کہانیوں کا کردار بننے کی پیشکش ہوئی تو وہ بھلا کیونکر رد کرتا اور جس رات وہ بدبسی حسینہ کے جسمانی نشیب و فراز نا پنے میں مصروف تھا۔ قاہرہ کی سنٹرل جیل کا دروازہ کھلا اور لمبا تڑنگا اسرائیلی ایجنٹ گردن آکراتے ہوئے باہر نکل گیا گویا

دوسری طرف اسرائیل کے سخت انتظامات اور میڈیا پر کنٹرول کی وجہ سے دنیا اس واقعہ سے بے خبر تھی۔ آخر طویل اعصابی کشمکش کے بعد مسافروں نے دیکھا کہ ہائی جیکرز کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہیں۔ گرنیڈ بردار نو جوان واپس کا کہہ بیٹ میں داخل ہو گیا جبکہ باقی تینوں نے اپنی سابقہ پوزیشن سنبھال لی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی جہاز زمین کو چھوڑ کر فضا میں اڑان بھر چکا تھا۔ مسافروں کے چہرے زرد پڑ گئے چھ گھنٹوں کی ذہنی جنگ سے بعض کمزور دل مسافروں کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔

ایسا ہی ایک ادیب عمر آدمی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا ہائی جیکرز نے اس پر گن تان لی۔

”اے بڈھے..... بیٹھ جاؤ۔“ مگر وہ مسافر مسلسل ہائی جیکر کو گھورتا رہا۔

”ہمارا قصور کیا ہے؟ تمہارے مطالبات پورے نہ ہونے میں ہماری کوئی نخلطی نہیں خدا کے لیے ہمیں چھوڑ دو۔“

”میں کہہ رہا ہوں بیٹھ جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔“ ہائی جیکر دہاڑا۔

اپنا تک ہی اس شخص نے اپنی سیٹ سے جست لگائی شاید وہ ہائی جیکر سے گن چھیننا چاہتا تھا مگر گن اپنی خوفناک آواز میں گرجی اور ادیب عمر شخص اچھل کر ساتھ بیٹھی ہوئی ایک خاتون کے قدموں میں جا کر اودہشت زدہ ہو کر چلائی۔

گولیوں نے اس شخص کے سینے کو چھید دیا تھا ابو کا جیسے فوارہ سا پھوٹ پڑا طیارے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد اس شخص کا جھٹکے لیتا جسم ساکت ہو گیا ہائی جیکر نے گن لہرائی۔

”کسی اور کے دل میں اگر بیرو بننے کی خواہش ہے تو سامنے آ جاؤ۔“ خوفزدہ مسافر خاموشی کے سوا اور

زبان حال سے کہہ رہا۔

کے باوجود یہ نہیں جان پایا تھا کہ مصری فضاہیہ کی طاقت کا سرچشمہ کون سا ہوائی اڈہ ہے۔ یہ بات وہ ایجنٹ بخوبی جانتا تھا جو قاہرہ جیل سے فرار کے بعد تل ابیب پہنچ چکا تھا۔ اسرائیل کو مصری صفوں سے غدار خریدنے میں صرف سات گھنٹے لگے تھے اور وہ فیصلہ کن ضرب لگانے کے لیے تیار تھا اس ضرب کے جس کے بعد جنگ کا بجٹا ہوا ٹھیل رک جاتا اور عرب دنیا کے لیے ذلت و رسوائی کی شکست مقدر ہوتی جو ننگ وطن اسرائیل کے ہاتھوں کے وہ کچھ یوں تھے۔

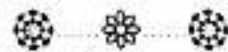
”انصامن ہوائی اڈے کا سیکورٹی چیف ابن الراشد آرمی طیاروں کے ہدف اور روٹس ترتیب دینے والی پندرہ کئی ٹیم کا سربراہ الکبیر طاکن اور تیسرا ننگ ملت تھا مصری ریڈار سسٹم کا انچارج نقیب الکریخی یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دشمن کو اپنا ضمیر بیچ دیا تھا انہیں جنگ کے بعد یورپی شہریت دینے کا وعدہ بھی کیا گیا تھا پوری دنیا میں خصوصاً مسلم ممالک کا یہ المیہ رہا ہے کہ غریب قوم اپنے نمائندوں کو سب سے پہلے سیاستدان کا روپ عطا کرتی ہے اور پھر ان کو اقتدار کے ایوانوں میں چھینتی ہے صرف اس امید پر کہ شاید ان غریبوں کی مسیحائی ہو جائے مگر تاریخ گواہ ہے کہ طاقت اور اقتدار والے یہی لوگ بڑے بڑے ایوانوں میں بیٹھ کر وطن کی مٹی تلک بیچ دیا کرتے ہیں۔

یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد وہ رات آگنی جنس رات ذلت آمیز شکست کے بادل مصر کے درو دیوار پر ڈیرے ڈالنے والے تھے۔

انصامن ہوائی اڈے پر جیسے ہی تاریکی نے اپنے پنکھ پھیلائے تو خلاف معمول چہل پہل شروع ہو گئی۔ لمبی لمبی گاڑیوں میں لوگ آنے لگے ایئر

”مسلمانو! تمہارے اندر سے میر جعفر و صادق کبھی ختم نہیں ہو سکتے اور جب تک یہ موجود ہیں ہمارے قدموں میں پڑا رہنا تمہارا مقدر بن چکا ہے۔“

دوسری طرف غیر ملکی حسینا میں قاہرہ کے سیاستدانوں کے لبو میں کس طرح سرایت کر چکی تھیں اس کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ سنٹرل جیل سے یہودی ایجنٹ کا فرار جنگ کے خاتمے تک منظر عام پر نہیں آسکا کیونکہ غلی سطح سے لے کر ہر اعلیٰ افسر و سیاستدان کے بستر پر رات کو ایک یورپی و امریکی حسینہ ضرور موجود ہوتی تھی۔ سرحدوں پر لڑنے والے فوجی اپنے سیاستدانوں کے یہ کارنامے مسلسل سن رہے تھے اور اپنے حوصلوں کو پست ہوتا محسوس کر رہے تھے۔ دوسری طرف اسرائیل اپنی تمام چالوں کو سمیٹ کر ایک فیصلہ کن ضرب لگانے کی تیاری کر چکا تھا مگر اس کے لیے بھی چند غداروں کی ضرورت تھی اور بالآخر وہ بھی مل گئے۔



دار الحکومت قاہرہ سے بالکل باہر انصامن فوجی ایئر پورٹ واقع تھا یہ صرف فوجی ہوائی اڈہ ہی نہیں بلکہ مصری فضاہیہ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ یہاں فضاہیہ کا ہیڈ کوارٹر تھا اس کے علاوہ مایہ ناز اور اعلیٰ کارکردگی کے حامل جنگی طیارے یہیں سے اڑان بھر کے میدانوں میں کامیابی کے جھنڈے گاڑا کرتے تھے۔ اس کی حد درجہ اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے سیکورٹی کے خصوصی انتظامات کیے گئے تھے مگر دشمن کی نظروں میں اس کو بے وقعت بنانے کے لیے یہ تمام تر انتظامات خفیہ تھے۔

اسرائیل اپنی تمام تر ایشیائی جنس استعمال کرنے

مارے جاتے ہیں۔ اب دشمن کے جنگی طیاروں کا رخ اس عمارت کی طرف ہوا جہاں شراب و شباب کیجا ہو کر سب کچھ بھلا چکے تھے۔ ایک اور کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا برہنہ جسم چتھڑے بن کر اڑ گئے۔ ام انجیٹ کی خوب صورت بوتلوں کی کھنک ایک دم سے ختم ہو گئی ذرا سی دیر میں ہولناک خاموشی چھا چکی تھی۔ طیاروں کی گزراہٹ آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔ قوم کی غیرت کا سودا کرنے والے اور اس کے لیے استعمال ہونے والی حسینا میں یہ بات بھول گئے کہ بازی جیت جانے کے بعد مہروں کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ انعام و اکرام کا لالچ دیکھنے والی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

اگلے دن کا سورج اپنے دامن میں لاتعداد رسوائیاں لیے مصر کے افق میں نمودار ہوا جس وقت بد قسمت ملت کے سیاستدان ہتھیار ڈال کر عرب علاقوں کی بندر بانٹ میں مصروف تھے عین اس وقت تل ابیب کی ایک جیل میں اغوا شدہ طیارے ایس کیو 117 کے مسافروں کو قطار میں کھڑا کر کے گولیوں سے چھلنی کیا جا رہا تھا۔

آہ..... شاید کہ کسی اور نے بہایا ہوا اتنا اے سیاست تیرے دامن میں جتنا ہو ہے



پورٹ سے کافی ہٹ کر ایک شاندار عمارت میں ان لوگوں کے استقبال کا پورا انتظام ہو چکا تھا۔ چیف سیکورٹی کی طرف سے ارسال کیے گئے دعوت نامے میں یہ لکھا گیا تھا اور چونکہ ہماری افواج ہر محاذ پر دشمن کو نیست و نابود کر رہی ہیں اور فتح قریب ہے اس خوشی میں آج رات ایک خصوصی محفل کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ہوائی اڈے کے مختلف حساس مقامات پر ڈیوٹی دینے والے اہلکار بھی محفل کی رنگینیوں سے پوری طرح واقف تھے اس لیے دوسرے لوگوں سے قس قس ہی پہنچ چکے تھے۔ گوری چمڑی والی حسینا میں ایسے جلوے بکھیر رہی تھیں کہ کسی کی نظر چوکنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔

شراب کے جام چھلکے تو ہر حدنوٹ گئی حسین زن کی سرگوشیاں اور لذت بھری سسکاریاں نشے کو دو گنا کیے جا رہی تھیں۔ عالم یہ تھا کہ ایک مرد کی آغوش میں کئی کئی حسینا میں لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ کہیں دور کھڑا ہوا اہلیس اپنی جیت پر مسکرا رہا تھا اور پھر فضا ایک خوفناک گزراہٹ سے گونج اٹھی۔ درجنوں اسرائیلی طیارے ہوائی اڈے کو گھیرے میں لے چکے تھے۔ چند لمحوں کا کھیل کھیلا گیا طیاروں نے ہوا میں قلا بازیاں کھاتے ہوئے ان گنت بموں کا مینہ برسا دیا۔ بارود کی بے رحم بارش نے زمین پر کھڑے مایہ ناز مصری طیاروں کو طے میں تبدیل کر دیا ملبہ بننے والے ان بد قسمت ہوائی جہازوں کے رکھوالے تھوڑی دور ایک عمارت میں دانیس دے رہے تھے۔

مصر کا سارا فضائی اور دفاعی نظام ملیا میٹ ہو چکا تھا۔ ایئر پورٹ کی بلند و بالا عمارت زمین بوس ہو چکی تھی مگر ابھی ایک کام ہونا باقی تھا جس سے ہر غدار وطن کو سبق سیکھنا چاہیے ملک و ملت سے غداری کرنے والے اپنے بیرونی آقاؤں کے ہاتھوں

یارب

غلام میراں

عدم ادراك سے ادراك تک کی داستان. ایک مجرم کی روداد جسے
اس کے احساس ندامت نے مجرم نہ رہنے دیا. کسی برگزیدہ ہستی کی
نظر کا کرشمہ. ایک بے وفا کی بے وفائی کا فسانہ.
کسی کی بے لوث چاہت کی کہانی.
ایک عظیم ذی روح کی عظمت کا احوال جو موت کی اذیت بھلا کر
اخبار کے گرد آلو ٹکڑے پر معاف لکھتا رہا.
ایک بلند حوصلہ باپ کی بھنا جو اپنے بیٹے کی وصیت پر پابند
رہا.
سلاحوں کے پیچھے مفید قیدیوں کے لیے امید کی ایک کرن.
آشوقہ دلروں کے لیے بطور خاص آنسوؤں کی روشنائی سے لکھا
جانے والا ناول

آج پندرہ سالوں بعد میں اپنے دہلیس کی
فضاؤں میں لوٹ رہا تھا کچھ ہی سے میں ہم غلام
اقبال انٹرنیشنل ائر پورٹ کے رن وے پر اترنے
والے تھے۔ ہوائی جہاز کی میزبان حفاظتی بیلٹ
باندھنے کے لیے اعلان کر رہی تھی۔ میں نے
بائیں جانب گردن گھما کر دیکھا میرے دونوں
بچے تانیا اور آیان اعلان سنتے ہی اپنے اپنے
حفاظتی بیلٹ باندھ رہے تھے۔ یہ تسلی ہو جانے پر
کہ دونوں نے اچھے سے حفاظتی بیلٹ باندھ لیے
تھے میں نے دائیں جانب میرے ساتھ بیٹھی یومنا
کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد پر مسرت دکھائی دے
رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح ڈرتے ہوئے اس نے
میرے ایک بازو کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں
لے رکھا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سر کو
اپنے کاندھے سے لگا لیا اور وہ نگاہیں اٹھائے
مسکاتے ہوئے دائیں جانب دیکھتی

رہی اور میں سوچ رہا تھا کہ ان پندرہ سالوں میں،
میں نے ایسا وہ سب کچھ پایا تھا جو میں نے کبھی
خواب و خیال میں نہ سوچا تھا اور ایسا کچھ اتنا کھویا
تھا کہ جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ آج
برسوں بعد میں پھر سے عجب سیمائی کیفیت میں
بتلا ہورہا تھا جہاز کی سیرھیاں اترتے ہوئے مجھے
یہ احساس ہورہا تھا کہ مجھ سے جڑے خواب، خیال
اور یادیں میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ یہ وہی
ائر پورٹ تھا جہاں میں غیرہ کو راحت عبدالغنی سے
ملوانے لایا تھا راحت میرے لیے وہ ہستی تھی جس
لمحے مجھے عشق واقعتاً عشق کا مفہوم سمجھایا تھا جس
ذات سے میں نے عشق کے آداب و تقاضے سیکھے
اور میرا عشق فقط ایک بساط کا ٹھیل، دھیرے
دھیرے جہاز کی سیرھیاں اترتے ہوئے میں
اپنے ماضی میں پہنچ چکا تھا۔
اس روز گھر میں عجب تلاطم پاتا تھا بڑے ابا کو میں

کرتی پھرے۔“ آخری بات کہتے ہوئے بڑے ابا کی رعب دارا داز میں قدرے پستی اور ملال تھا اور میں جو یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس سارے معاملے سے بے خبر ہوں بڑے ابا کہ مجھ سے سوال اٹھانے پر اب سبھی کا رد عمل دیکھنے کو بڑی ہمت جتا کر میں نے اک لمحہ بھر کو نگاہ اٹھا کر دیکھا سب سے پہلی نگاہ جو چچا مرزا پر پڑی وہ شدید غصہ میں لگ رہے تھے۔ ان کی آگ برساتی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے میری نظر ساتھ ہی کھڑی پان پر پڑی وہ مجھے متعجب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جن میں ان گنت سوال تھے۔ میرے قریب ہی میرے ابا خورشید عالم کھڑے تھے میری نگاہ جو ان سے ملی تو جیسے نخلستان میں پیاسے کو پانی مل گیا ہو۔ وہ مجھے فقط چپ رہنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ وہ دو ایک قدم چل کر ذرا سا میرے قریب ہوئے وہ مجھے کان دھسے سے تھا سے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے مخاطب کیا۔

”میں یہ سب کیا سن رہا ہوں، تمہارے بڑے ابا یہ کیا بول رہے ہیں، ط۔“ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے وہاں خڑے گھر کے سبھی لوگ اسے میرے ابا کی طرف سے سرزنش سمجھ رہے ہوں گے۔ انہیں ایسا ہی محسوس ہوا ہوگا لیکن لفظ میں یہ بات جانتا تھا کہ درحقیقت انہوں نے مجھے پھلی لگائی تھی۔

وہ چوہدری عبدالغنی جو ابا کے مقابلے میں ہر سال ایکشن جیت جایا کرتے تھے جو ابا کے سیاسی حریف تھے۔ راحت عبدالغنی انہی کی بیٹی تھی اور میرے ابا خورشید عالم جانتے تھے کہ جو مہرہ ان کے ہاتھ لگا تھا وہ سیاست کی بساط میں کسی بھی لمحے بازاری پلٹنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ وہ اسی مقصد سے مجھے پھلی لگا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ بڑے ابا

نے پہلے کبھی اتنا شدید غصے میں نہ دیکھا تھا انہوں نے حویلی کے وسیع صحن میں سبھی چھوٹے بڑوں اور ملازموں کو جمع کر رکھا تھا جب سبھی وہاں جمع ہو گئے تو بڑے ابا کی رعب دارا داز آواز سن کر میں بھی ایک جانب سے سڑھیاں اترتے ہوئے ان کے قریب جا کھڑا ہوا تھا وہ میرے اتنا پیار کرنے والے بڑے ابا تھے کہ کبھی جو جوش و آرزوی سے میں عصب سے آ کر انہیں اپنی ہانہوں کے حصار میں لے کر اٹھا لیا کرتا تو وہ پھر چھوٹے ہی کیسے لائھی اٹھائے میرے آق قب میں دوڑتے تھے اور میں جو اپنے دونوں بازوؤں کو ڈھال بنا کر زمین پر بیٹھ جایا کرتا تھا تو پھر میرے قریب پہنچ کر حاکے مجھے مارنے کے لائھی پھینک کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا کرتے تھے۔ گویا میں آج بھی ان کے لیے وہی دو چار سال کا نٹ کھٹ سا ط عالم تھا۔

آج انہی بے پناہ محبت دینے والے بڑے ابا کے سامنے مجھے نگاہیں اٹھانے کی جرأت نہیں ہو پا رہی تھی اور اب جو وہ بول رہے تھے اس نے میری ہمت اور بھی پست بنا دی تھی مجھے فقط ان کا ایک ہاتھ دکھائی دے رہا تھا جس ہاتھ سے انہوں نے لائھی تھام رکھی تھی جو پینڈولم کی طرح مسلسل بل رہا تھا اور دوسرا ہاتھ جو میری جانب اٹھا تھا اسے دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

”پوچھو اس سے کہ اس گھر کی دلہیز پار کرتے ہوئے جسے اپنے والدین کی عزت کا خیال تک نہیں آیا وہ اس وقت کہاں سے؟ کہاں چھپا رکھا ہے چوہدری عبدالغنی کی بیٹی کو؟ میں کہتا ہوں اسے میرے سامنے لاؤ میں اس سے خود پوچھتا ہوں کہ اسے اُتر اپنے خاندان کی عزت غیرت کا پاس لحاظ باقی نہیں رہا تو ہماری عزت کو تو یوں داغ دار نہ

میں نہ تھی کہ خوشی محمد کے محلے کی عزت کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے ایسی بزدلانہ حرکت کوئی رات کی تاریکی میں ہی کر سکتا تھا بڑے ابا دن بھر سونے اور رات پہرے دار بنے مورچے میں سپاہی کی طرح چاک و چوبند حفاظت کے لیے کھڑے رہتے۔ یہ بڑے ابا کی جرات و لیری ہی تھی کہ دشمنوں تک بھی یہ خبر جا پہنچی تھی کہ موسیٰ بھائی کی بیٹی کی طرف کوئی نگاہ اٹھانے کی بھی جرات نہ کرے ان کی عزت کی رکھوالی خود خوشی محمد کر رہے تھے۔ کئی روز تک بڑے ابا پہرا دیتے رہے اور ایک روز موسیٰ بھائی جھیل آنکھوں کے ساتھ بڑے ابا کے پاس آئے انہوں نے اپنی دختر کو کسی اچھے سے گھرانے میں عزت کے ساتھ رخصت کر دیا تھا وہ بڑے ابا کے بے حد مشکور تھے۔

”یہ کیا بتائے گا بھی کسی چور نے بھی کہا ہے کہ چوری میں نے کی ہے یہ ساری تمہاری ذہیل کا تجربے خورشید عالم۔“ میں چچا مرزا کی بات سن کر ایک دم سے خیالوں کے دائرے سے پلٹا وہ میرے ابا سے بات کرنے کے بعد بڑے ابا سے مخاطب تھے۔

”اسے باہر روٹ اکٹھے کرنے سے فرصت ملے تو دیکھے ناں کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے ہماری اپنی بیٹیاں بھی تو کل کو جوان ہوں گی ان کے ذہنوں پر کیا اثر ہوگا۔“ ایسا کہتے ہوئے چچا کا غصے اور ندامت سے سر جھک گیا وہ بڑے ابا کے سامنے سر جھکائے ان کے فیصلے کے منتظر تھے لیکن فیصلہ تو تب ہونا تھا جب یہ ثابت ہو جاتا کہ واقعتاً چوہدری عبدالغنی کی بیٹی آج اس حویلی میں موجود تھی۔

راحت عبدالغنی سے میری پہلی ملاقات اکیڈمی میں ہوئی تھی۔ میں تو اس کا نام تک نہیں جانتا تھا

کے رعب و دبدبے کے سامنے بے حد ڈرے ہوئے بھی لگ رہے تھے انہیں خوف اس بات کا تھا کہ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ واقعتاً ان کے سیاسی حریف چوہدری عبدالغنی کی دختر اور ان کے بیٹے طے کے درمیان کوئی معاملہ ہے تو پھر آج ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ ہاتھ لگا موقع ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا ان کے ہاتھ ایسا تاش کا پتالہ تھا جسے وہ موقع آنے پر ہی پھینکنا چاہتے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ اگر یہ بات دہی رہے کہ ان کا چراغ کیا گل کھلا رہا ہے۔ نجانے کس بد بخت نے بڑے ابا کے کان میں پھونک دیا تھا کہ آج چوہدری عبدالغنی کی بیٹی کا لا عبا یا اوڑھے ان کے گھر داخل ہوئی تھی اور پھر میرے اور راحت کے درمیان چل رہے عشق کے کھیل کا بھی انہیں پتا لگ چکا تھا وہ چوہدریوں کی عزت پر سایہ کیے رہتے وہ اپنی عزت لنتے کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ مجھے اچھے سے پاد ہے جب ہمارے ہمسائے ماں جائے موسیٰ بھائی کی بیٹی کو کسی نے اٹھا لے جانے کی دھمکی دی تھی تو موسیٰ بھائی بڑے ابا کے پاس یہ کہنے بھی نہ آئے تھے کہ خوشی محمد میری عزت کو بچالے تیرا تو زور بھی چلتا ہے انہیں تو فقط ہمیں سے یہ بھٹک لگی تھی کہ جہاں کہیں ان کی دختر کا لگن طے ہوا تھا وہ بعد میں معلوم پڑا کہ کوئی اچھے لوگ نہ تھے موسیٰ بھائی نے لگن توڑ دیا اور وہ ایسا کرتے ہی انہیں اوقات دکھانے آگئے جس روز بڑے ابا کو اتنا معلوم پڑا انہوں نے اسلحہ کی پیٹیاں گھر میں ڈھیر لگائی۔ اوپر چھت کا عتبی حصہ جہاں سے موسیٰ بھائی کے گھر داخل ہونے نکلنے کے سبھی راستوں پر نظر رکھی جا سکتی تھی بڑے ابا وہاں مورچہ لگا کر بیٹھ گئے وہ جانتے تھے کہ دن کے اجالے میں ایسی جرات کسی

جھٹ سے نوٹ بک اپنے بیگ میں رکھی تیز تیز قدم بڑھاتا بائیک اسٹینڈ تک پہنچا اور بیٹھتے ہی کٹک لگا کر دوسری اکیڈمی کی جانب چل پڑا بس یہی معمول تھا میرا نہ تو کوئی لڑکا یہاں اس اکیڈمی میں میرا دوست تھا اور نہ ہی مجھے اتنی فرصت تھی کہ میں چوری چوری نگاہوں ہی نگاہوں میں کسی لڑکی سے تعلق بنانے کی جہد کرتا۔

اگلے روز میں معمول کے مطابق وقت پر اکیڈمی پہنچا تھا لیکن اس روز میرے ساتھ ایک خلاف معمول واقعہ پیش آیا تھا اس روز راحت عبدالغنی کو اکیڈمی پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی سبھی پہلی قطاریں پڑھیں اور آج فقط میرے ساتھ والی نشست خالی پڑی تھی مجھے نہیں علم وہ کب میرے پاس پڑی خالی نشست پر آ کر بیٹھ چکی تھی۔ پیریڈ کے اختتام پر ایک ہاتھ میری جانب بڑھا

”مجھے راحت عبدالغنی کہتے ہیں اور آپ۔“ میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا وہ مسکراتے ہوئے بے حد حسین لگ رہی تھی اور اس کا ہاتھ ابھی تک ہوا میں ہی معلق تھا الاحوال میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

”جی مجھے طہ عالم کہتے ہیں۔“

”ٹائٹس ٹو میٹ یو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی اور چلی گئی اور میں جیسے دھیرے دھیرے کچھ سوچتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھا وہ دروازے سے باہر جا رہی تھی جب ایک بار پھر سے اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔

”ہائے۔“ اس نے وہیں کھڑے، ہاتھ کے اشارے سے مجھے الوداع کیا اور جواہا میں نے فقط اپنا سر بلانے سے ہی کام چلایا پھر میں بھی بائیک اسٹینڈ تک باہر آ پہنچا تب تک وہ بی ایم ڈبلیو سے

تب تک میں نہیں جانتا تھا کہ وہ چوہدری عبدالغنی کی بیٹی تھی۔ میں تو بس اسی جنون میں رہتا تھا کہ مجھے بھی مصطفیٰ عالم کی طرح صوبے بھر میں پوزیشن لینا تھی۔ ہم دونوں مختلف کالجوں سے ایف ایس سی کر رہے تھے لیکن وہ شہر کی واحد اکیڈمی تھی جس کی فیکلٹی بہت عمدہ تھی سبھی ٹاپ پوزیشن ہولڈرز اس اکیڈمی سے رخصت ہوتے تھے خود بڑے بھائی مصطفیٰ عالم بھی اسی اکیڈمی سے فارغ التحصیل تھے اس روز معمول کے مطابق میں اکیڈمی پہنچا لیکن مجھے کچھ تاخیر ہو چکی تھی پروفیسر لیکچر کا آغاز کر چکے تھے پہلی دو قطاروں میں لڑکیاں بیٹھا کرتی تھیں اور اس کے بعد بال کے عقبی حصے تک لڑکے بیٹھے ہوتے تھے ظاہری بات تھی مجھے کچھلی ہی کسی نشست میں جگہ ملا کرتی تھی لیکن آج جب مجھے اکیڈمی پہنچنے میں دیر ہو چکی تھی تو وہاں مال میں پہنچ کر میں نے نظر دوڑائی کچھلی ساری نشستیں پر ہو چکی تھیں میں نے اگلی قطاروں میں دیکھا ایک نشست خالی پڑی تھی اس سے پہلے کہ میں بال کے عقبی حصے کی جانب بڑھتا اور آج کھڑا ہو کر لیکچر سنتا مجھے ہمارے استاد نے اشارے سے لڑکیوں کی قطار میں موجود پہلی خالی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں کچھ جھجکتا شرماتا اس خالی کرسی پر جا بیٹھا۔ بیٹھتے ہی میں نے اک نگاہ اٹھا کر اپنے بائیں جانب بیٹھی لڑکی کی طرف دیکھ میں اسی لمحے اس نے بھی میری جانب ایک اچھتی سی نگاہ ڈالی اور پھر وہ بھی لیکچر نوٹ کرنے میں لگ گئی اور میں نے بھی جھٹ سے اپنی نوٹ بک نکالی اور لیکچر سنتے ہوئے جہاں کوئی خاص بات ہوتی اسے میں اپنی نوٹ بک میں درج کر لیتا۔ مختصر دورانیے کا یہ پیریڈ یوں ہی اپنے اختتام کو پہنچا اور میں نے

لے کر آگے بڑھ چکی تھی۔

بندوق سے ننھی منی چیز یوں کا شکار ہو یا نہر کنارے
سارا دن کا ننا ڈالے پھلے گئے کا انتظار بگو کے گھر
سے پیر اور امرود چرانے ہوں یا سائیکل کی ریس وہ
ہر کام میں مجھ سے دو ہاتھ آگے ہی رہتا تھا لیکن
اب اس کے دو ہی شوق باقی تھے۔ ڈور، دھاگہ
پتنگ اور ون ویلنگ اور میں جانتا تھا کہ وہ مجھے اس
وقت کہاں مل سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکلا
اور سیدھا چھت پر جا پہنچا اگلے نیلے آسمان پر کہیں
کہیں دودھیا سفید بادل دکھائی دے رہے تھے
بلکی بلکی ہوا چل رہی سرد ہوا سورج کی کرنوں سے
دھبہ کر نرم گرم سی محسوس ہو رہی تھی اور میری نگاہیں
آسمان کی دستکوتوں پر ہی مرکوز تھیں۔ ضیا مجھے اپنی
چھت پر دکھائی نہیں دیا تھا لیکن اس کی موجودگی یا
غیر موجودگی کا پتا آسمان پر اڑتی پتنگ سے ہی لگایا
جاسکتا تھا اور اگلے ہی پل مجھے اوپر بہت اوپر
بادلوں سے بھی آگے پڑی کی طرح اڑتی اس کی
پتنگ دکھائی دی اور میرا من اس لمحے چاہا میں
چھتیں پھلانگتا ہوا جاؤں اور ضیا جس ڈور سے
پتنگ اڑا رہا تھا اس ڈور سے جڑا میں بھی اوپر بہت
اوپر بادلوں سے بھی آگے پہنچ جاؤں اور جب نیچے
دیکھوں تو مجھے راحت عبدالغنی اپنے گھر کی چھت پر
کھڑی دکھائی دے جائے۔ راحت کا خیال آتے
ہی میں نے ہوا سے اڑتے بے ترتیب ہوتے
اپنے بالوں کو ہاتھ بڑھا کر اپنی جگہ بٹھانے کی
نا کام کوشش کی اور پھر اگلے ہی لمحے گھر کی چھت
پھلانگ کر میں ضیا کے گھر کی چھت پر جا پہنچا وہ
چھت پر پڑی چار پائی پر لیٹا ہوا تھا میں پتنگ کی ڈور
تھا سے ننھی منھی دھوپ میں جیسے اونٹھلنے والا ہی تھا
جب میں دبے پاؤں چپکے سے جا کر اس کے پاس
چار پائی پر جا بیٹھا ایک اس نے اپنے قریب کسی

آج بائیک کو کھل لگا کر میں اڑا ہی جا رہا تھا
دل تھا کہ سینے سے پھٹ کر باہر آنے کو بے تاب
ہوئے جا رہا تھا۔ فروری کی سرد ہوا مجھ میں نرم گرم
کوسا کوسا احساس جگا رہی تھی۔ مچلتی بہار، میٹھی
میٹھی دھوپ پورب سے چلتی پرانی آجی کچھ اتنا
بدلا بدلا سا کیوں لگ رہا تھا گلے میں سردی سے
بچنے کے لیے لٹکے رومال کو کھول کر ہوا میں لہرانے
کوئی چاہ رہا تھا۔ اس روز میں دوسری اکیڈمی نہیں
گیا ویسے بھی دوسری اکیڈمی میں نے فقط ٹیسٹ
دینے کے لیے ہی جوائن کر رکھی تھی۔

گھر پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا
اور دیر تک آئینے میں کھڑا خود کو دیکھتا رہا ابھی خود کو
ہی دیکھ کر مسکرانے لگتا تو کبھی بال بنانے لگتا۔

”مجھے راحت عبدالغنی کہتے ہیں۔“ مجھے اپنی
جانب بڑھا اس کا ہاتھ گویا پھر سے دکھائی دے رہا
تھا جی مجھے طے عالم کہتے ہیں میں نے آئینے کے
سامنے اپنا ہاتھ بڑھایا اور پھر اسی ہاتھ کو اپنے بالوں
میں گھما کر اچھل کر بند پر چھلانگ لگا دی۔

”کون ہے وہ؟ مسرطہ عالم۔“ میں خود سے
ہی مخاطب تھا بی ایم ڈبلیو سے تو لگتا ہے کوئی بات
بن سکتی ہے کسے بتاؤں اکیڈمی میں تو میں نے کوئی
دوست بھی نہ بنایا تھا ابھی پڑھائی سے سرائٹھانے کی
فرصت ہی نہ ملی تھی کہ دوست بناتا اور اللہ نے
ذہن بھی ایسا عطا کیا تھا کہ مجھے ضرورت نہ تھی کہ
میں کسی سے مدد حاصل کرنے کے لیے دوستی کرتا
پھر یکا یک مجھے ضیا کا خیال آیا میرے گھر سے
ایک گھر چھوڑ کر تیسرا گھر اس کا تھا۔ وہ میرا قریبی
ہمسایہ اور بچپن کا دوست بھی تھا بچپن میں کی آجی
شرارتوں کا ماسٹر ماسٹر وہی ہوا کرتا تھا چہرے والی

ہوں لیکن جیسے ہی لیکچر ختم ہوا مجھے ایک ننھے سے بچے کی آواز سنائی دی۔

”راحت آپی جلدی آ جائیں۔“ اس آواز پر میں ہی نہیں سمجھی نے گردن گھما کر ہال میں داخل ہونے والے دروازے کی جانب دیکھا جہاں ایک بہت پیارا سا بچہ اسکول یونیفارم میں کھڑا تھا وہ اس آواز پر جھٹ سے اٹھی اور پھر ہال سے باہر نکل گئی میں بھی اس کے تعاقب میں تیز قدم بڑھاتا باہر کی جانب بڑھا ابھی وہ گاڑی میں بیٹھ ہی رہی تھی گاڑی میں پہلے سے ایک چھوٹی بچی موجود تھی۔ مطلب وہ دو نہیں اور ایک ہی اس کا بھائی تھا جب تک اس کا ڈرائیور گاڑی آگے بڑھاتا میں اپنی بائیک پر بیٹھا ہیلمیٹ پہن رہا تھا میں نے پہلے بھی ایسی حرکت نہ کی تھی اور کبھی ایسا واقعہ بھی تو پیش نہ آیا تھا جب میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور اس سے پہلے کہ ان کی گاڑی میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی میں نے اپنی بائیک اس کی گاڑی کے پیچھے لگا دی۔ اب میں اس کی گاڑی کے تعاقب میں جا رہا تھا۔ میری بائیک اور اس گاڑی کے درمیان فاصلہ نہ تو بہت کم تھا اور نہ ہی بہت زیادہ لیکن بھی سنٹل پر رکتے ہوئے مجھے یہ احساس ضرور رہتا کہ میں اس کی گاڑی سے قریب ہی رہوں۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے کچھ حیرت کا احساس ہو رہا تھا کہ جس راستے سے میں گھر لوٹتا تھا یہ وہی راستہ بالآخر ایک جگہ پہنچ کر اس کی گاڑی رک گئی اور مجھے ابھی تھوڑا اور آگے جانا تھا۔ اس کی گاڑی تو رک گئی لیکن میں نے نہ تو اپنی رفتار کم کی اور نہ ہی میں نے رک کر یہ پتا کرنے کی کوشش کی کہ بالآخر وہ گاڑی کون سے گھر میں داخل ہو گئی اور میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا

کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا سورج کی تیز کرنوں سے بچنے کے لیے وہ آنکھیں موندے پڑا تھا آنکھیں کھلتے ہی وہ مجھے اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر مسکراتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ شہزادے آج میری یاد کیے آ گئی اس نے پتنگ کی ڈور کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور اپنا ہاتھ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے اگلے ہی لمحوں اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر خود سے ذرا قریب کر لیا اور پھر راز دارانہ انداز میں اسے بیٹے دو دنوں کی ساری رو داد سنا دی۔ میری باتیں سن کر جیسے اس کی آنکھوں کی چمک ذرا بڑھ گئی تھی وہ سمجھ گیا تھا کہ اسے سب کچھ بتانے کے پیچھے میرا کیا مقصد تھا مجھ سے دریافت کرنے لگا کہ تم اسے جانتے ہو وہ کون ہے۔ کہاں رہتی ہے! علمی کا اظہار کرنے پر وہ مجھے بتانے لگا کہ کیسے میں پہلے یہ پتا لگاؤں کہ وہ کون ہے، خاندان کونسا ہے رہتی کہاں ہے اور جب ضیا سے یہ ساری باتیں جان کر میں گھر واپس لوٹ رہا تھا تو مجھے ضیا بہت پیارا لگ رہا تھا۔ ایک ایسا دوست جسے میں اپنی ساری کہی ان کہی کہہ سکتا تھا۔

اگلے روز کلاس میں پھر ایک غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔ راحت عبدالغنی آج کسی مجبوری سے نہیں بلکہ خود اپنی منشا سے میرے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھی میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر لیکچر شروع ہو گیا۔ کل اکیڈمی سے لوٹ کر میں نے اپنا بیگ تک نہ کھولا تھا اسی وجہ سے مجھے لیکچر کو سمجھنے میں کچھ دشواری کا احساس ہو رہا تھا اور میں یہ بھی چاہ رہا تھا کہ لیکچر جلد سے جلد ختم ہو تو میں راحت سے کوئی بات کر سکوں اور شاید وہ بھی جانتا چاہتی تھی کہ میں کہاں سے ہوں کون سے خاندان سے

”یہ تو آپ جانتے ہی ہیں بندی کو راحت
عبدالغنی کہتے ہیں اور اگر آپ کچھ نہیں جانتے تو
شاید وہ یہ ہے کہ میں چوہدری عبدالغنی ایم این اے
ہیں کی صاحبزادی ہوں۔“

”کیا۔“ اس کی بات سن کر حیرت سے جیسے
میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور بے ساختہ میرے منہ
سے حیرت کے اظہار میں ”کیا“ نکل گیا۔

وہ اب متعجب سی میری جانب دیکھ رہی تھی اور
پھر میرے حیرت زدہ ہونے پر چونکتے ہوئے مجھ
سے دریافت کر رہی لیا۔

”کیا آپ کو یہ جان کرا چھان نہیں لگا میرے ابا
کوئی ایسے ویسے ایم این اے نہیں ہیں وہ تو بالکل
غیر سیاسی ہیں انہیں تو سیاست آتی ہی نہیں۔ اہل
علاقہ نے انہیں کیسے اس منصب پر فائز کر دیا ہے
ایسا میں نہیں جانتی اور اگر انہیں کچھ آتا ہے تو وہ ہے
احساس کرنا شاید یہی وہ جذبہ ہے کہ ڈیڈی کو خدا
نے آج یہ مقام دیا ہے میں آپ کو ان سے ملو اوں
گی۔“ اس نے بات کرتے ہوئے ایک دم سے
میرے چہرے کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے
کہا۔ آپ کو ان سے مل کر بہت اچھا لگے گا۔

”یقیناً اور آپ یہ تو جان ہی چکی ہیں کہ اس
ناچیز کو طے عالم کہتے ہیں لیکن آپ یہ نہیں جانتی
ہوں گی کہ بندہ خورشید عالم کا بیٹا ہے۔“ میں نے
اس کے ہی انداز میں اسے جواب دیا اور اب وہ
بھی میری بات سن کر حیرت زدہ سی مسموم سی بیٹھی تھی
پھر ذرا توقف کہ بعد وہ سنجیدگی سے مجھے دیکھتے
ہوئے بولی۔

”طے آپ کے دادا خوش محمد تو کسی تعارف اور
تعریف کے محتاج نہیں ہمارے گھر میں اکثر ان کا
تذکرہ رہتا ہے خود ڈیڈی انہیں بہت عزت کی نگاہ

کہ میں ایسا کیوں کر رہا تھا۔

اگلے روز اکیڈمی میں لیکچر کے اختتام پر جب
سبھی کلاس سے نکل رہے تھے تو فقط میں اور راحت
عبدالغنی اپنی اپنی نشست پر بیٹھے رہے مجھے تعجب
اس بات پر ہو رہا تھا کہ ہم ساتھ بیٹھے تھے اور اپنی
نوٹ بک قلم بیگزمیں رکھتے ہوئے ایک دوسرے
سے کوئی بات ہی نہ کر پارہا تھے لیکن پھر راحت کی
بات پر میں ایک دم سے چونکا وہ مجھ سے ہی
مخاطب تھی۔

”کمال ہے آپ اکیڈمی سے میرے گھر تک
میری گاڑی کا پیچھا کرتے آئے اور جب آپ
سے ملنے کے لیے میں نے ڈرائیور سے کہہ کر
گاڑی رکوائی تو جناب رکے ہی نہیں۔“ وہ اتنا کہہ
کر اب سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی
تھی۔ اس کی پہلی بات پر تو جیسے میں خیر آ گیا تھا
جیسے میرا اوپر نیچے کا سانس رکنے لگا تھا۔ مجھے لگا وہ
یہ جاننے کے بعد کہ میں کل اکیڈمی سے نکلنے کے
بعد اس کی گاڑی کے تعاقب میں رہا تھا وہ کہیں
میرے بارے میں غلط رائے نہ قائم کرے اس کی
اگلی ہی بات پر کہ اسے جب پتا چل گیا تھا کہ میں
اس کی گاڑی کے تعاقب میں ہوں اور اس نے خود
ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی رکوائی تھی مجھے یہ سن کر
بہت اچھا لگا اور میری ہمت بندھی کہ میں اس سے
بات کر سکوں وہ ابھی تک جواب کی منتظر سوالیہ
نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ جب میں
نے اسے جواب دیا۔

”آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی
نہیں۔“ میں فقط اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا تھا اور میری
یہ بات سنتے ہی بال نما کمرے میں ایک مترنم سا
قبوہ گونجا اور ساتھ ہی وہ اب مجھ سے مخاطب تھی۔

بھائی دے رہی تھی اور میرے ابا کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ تھے۔ چچا مرزا جائیداد میں موجود اپنا حصہ لے کر الگ ہو جانا چاہتے تھے اور میرے ابا کو بھٹک لگ چکی تھی کہ چچا جائیداد میں ملنے والا حصہ فروخت کر کے گاؤں منتقل ہونا چاہتے ہیں وہ نہیں چاہتے تھے کہ جائیداد خاندان سے باہر کسی غیر کے ہاتھوں فروخت ہو اور اتنا پیسہ ان کے پاس موجود نہ تھا کہ وہ اتنی بڑی رقم چچا مرزا کو ادا کر کے ان کا حصہ بھی اپنے نام کر لیتے۔ ابھی چند ماہ پہلے ہی وہ انکیشن بارے تھے اور انکیشن بارے کا مطلب جو بار جانے کے مترادف تھا انہوں نے اپنا سبھی کچھ جمع پونجی اس انکیشن پر لگا دی تھی اور وہ سبھی کچھ ہار گئے تھے۔ میں اکثر اپنے بڑے ابا کی زبانی اپنے ابا کو مرز نش کرتے سنتا تھا وہ انہیں کہا کرتے تھے۔

”خورشید عالم سود پر پیسہ نہ دیا کر یہ تیرے باقی پیسے کو بھی کھا جائے گا نہ لوگوں کی مجبور یوں سے کھیلا کر یہ وقت اور پیسہ کسی کے ساتھ سدا نہیں رہتا؟“ لیکن ابا بڑے ابا کی بات کو خاطر میں ہی نہ لاتے تھے آج ہوئے فساد کو لے کر بڑے ابا بہت پریشان تھے وہ چچا مرزا کو ایک طرف لے گئے اور نئی گھنٹوں کی نشست کے بعد وہ چچا مرزا کو جائیداد فروخت نہ کرنے پر قائل کرنے میں کامیاب ہوئی گئے اور اسی روز شام کو انہوں نے دونوں بھائیوں کی صلح بھی کرا دی۔

اگلے روز کالج اور اکیڈمی بند تھی۔ چھٹی ہونے کی وجہ سے گھر پر ہی موجود تھا اور ضیاء سے ملنے کے لیے بے تاب بھی میرے لیے یہ بات جس قدر حیران کن تھی کہ راحت چوہدری عبدالغنی کی بیٹی تھی ضیاء بھی یہ خبر سن کر چونکے والا تھا۔ دس بجے کے قریب اٹھتے ہی میں چھت پر جا پہنچا سورج کی

سے دیکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر وہ بھی ہمارے گھر ڈیڑی سے ملنے آ جایا کرتے ہیں مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ ایسے انسان کے پوتے ہیں۔“ وہ اپنی بات کہہ چکی تھی لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے میرے ابا کے بارے میں ایک بات تک بھی نہ کہی تھی نہ تو اس نے یہ کہا کہ وہ جانتی ہے کہ خورشید عالم اس کے ابا کے سیاسی حریف ہیں اور نہ ہی اس نے کوئی اچھے یا برے کلمات کہے وہ تو فقط بڑے ابا خوشی محمد کے بی گن گاتی رہی اور مجھے اپنا موہاں نمبر دے کر رخصت ہو گئی ہمارا رشتہ تو بننے سے پہلے ہی سیاست کی بھینٹ چڑھ گیا مجھے اس کی یہ بات ذرا ناگوار گزری تھی کہ اس نے میرے ابا کا ذکر تک نہ کیا تھا کیا وہ اتنے ہی برے تھے۔

اس روز گھر پہنچ کر ایک اور منظر میرا منتظر تھا گھر داخل ہونے سے ذرا پہلے میں ٹھٹک کر رہ گیا گھر کے بیرونی دروازے پر لوگوں کا جم غفیر جمع تھا۔ ایسی بھیڑ سیاستدانوں کے گھروں کے باہر ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی لیکن انکیشن گزر چکے تھے اور کوئی نئی مہم شروع ہوئی ہو ایسا بھی میرے علم میں نہ تھا پھر یہ بھیڑ کیسی تھی میں بھی گھر سے باہر کھڑی ان گنت گاڑیوں کے بیچ اپنی بائیک کھڑی کر کے گھر میں داخل ہوا تو مجھے جان کر شدید صدمہ ہوا کہ فساد تو اپنے گھر میں ہی پھا تھا۔

چچا مرزا اور میرے ابا خورشید عالم کے درمیان جائیداد کو لے کر جو جھڑا شروع ہوا اور جس کی جھڑپیں اکثر پیشتر چلتی رہی تھیں آج نوبت اسلحہ تک آن پہنچی تھی میری نظر بڑے ابا پر پڑی وہ کسی قدر رنج و غم میں شہنائے لگ رہے تھے انہیں گویا ان دونوں بھائیوں میں مفاہمت کی کوئی راہ ہی نہ

باس موجود ہوتا وہ ان کا ذکر چھیڑ دیا کرتی تھیں لیکن آج تو وہ ضیا نامہ کھول کر بیٹھ گئیں۔ پاس ہی رکھی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیا تب تک ضیا پتنگ کی تلامیں ڈال کر اسے اڑانے لگا تھا اور مجھے دادی کے چنگل میں پھنسا دیکھ کر مجھ پر ہنس رہا تھا اس کے پاس یہ نعمت تھی میرے پاس نہیں تھی ناں میں ادب سے بیٹھا ان کی باتیں سننے لگا وہ مجھ سے مخاطب تھیں۔

”اچھا بھو اطہ جو تم مجھے مل گئے پتر اپنے دوست ضیا کو بھی سمجھایا کرو تم لوگ تو بڑھ لکھ گئے تمہاری ماں نے تم لوگوں پر بڑی محنت کی ہے۔ مصطفیٰ کو دیکھتی ہوں وہ تو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے بڑی خوشی ہوتی ہے پر بیٹا اپنے اس نالائق دوست کو بھی ساتھ لے کر چلو سارا دن پتنگ بازی کرتا رہے گا تعلیم تو ادھوری چھوڑ دی ساتھ ہی اپنی جان کی بھی پروا نہیں اسے۔“

ایسا کہتے ہوا اچانک دادی نے ایک دھپا میرے بازو پر لگا یا اور کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

”وہ کیا ہوتا ہے پتر جو پرہیہ اٹھاتے ہیں۔“
دادی کی اس بات پر اپنی ہنسی کو دباتے ہوئے میں نے کہا۔

”جی دادی ماں دن دینگ۔“

”آہو، آہو پتر مجھے اس کی ماں بتاتی ہے بڑا خطرناک حیل ہوتا ہے جان کا خطرہ ہوتا ہے سمجھایا کر اپنے دوست کو پھر یہ کہتے ہوئے وہ چار پائی سے اتر کر اپنا جوتا ڈھونڈنے لگیں۔ میں نے جھٹ سے جوتا اٹھا کر ان کے آگے کر دیا وہ دعا میں دیتے ہوئے انھیں اور بولی۔

”پتر جی آپ نے اسے سمجھانا ہے میں ذرا تمہارے کھانے کو کچھ بھیجتی ہوں۔“ ایسا کہہ کر وہ

سنہری کرنوں نے مجھے خوش آمدید کہا مارچ کی ایک اجلی لکھری صبح ڈھل رہی تھی لیکن مینا، چڑیا، کوا ابھی تک خوشی کے نیت سنار بے تھے۔ بہار سے مہکتی فضا میں پھولوں کی عجب سی باس رچی بسی ہوئی تھی لیکن ضیا چھت پر موجود نہ تھا اور نہ ہی اس کی پتنگ مجھے فلک سے ہوس و کنار کرتی دکھائی دی۔

میں چند لمحوں تک یونہی کھڑا اس کی چھت پر آمد کا انتظار کرتا رہا جب وہ مجھے ہاتھوں میں ڈورا اور بہت سی پتنگیں لیے چھت پر آتا دکھائی دیا اسے دیکھ کر میری خوشی دیدنی تھی میں اس کے بعد اپنے گھر کے درمیان کی چھت پھلانگ کر اس تک جا پہنچا ابھی میں نے وہاں پہنچ کر اسے سلام کیا ہی تھا کہ اس کے عقب میں موجود سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی دادی ماں بھی چھت پر آ پہنچی تھی۔ مجھے ضیا کے ساتھ کھڑا دیکھ کر وہ اپنی سینک سنبھالتی دونوں ہانہیں پھیلائے یوں میری جانب بڑھی کہ مجھے اپنی جگہ سے ہٹنے کا موقع ہی نہ ملا جب انہوں نے یوں میرے پاس آ کر مجھے اپنی ہانہوں میں بھینچ لیا۔

”پتر بڑے دنوں کے بعد دیکھا تجھے کہاں ہوتے ہو۔“ وہ اپنے جھریوں سے بھرے ہاتھ جن پر موٹی موٹی سہولیوں سی رگیں ابھری ہوئی تھیں میرے چہرے پر پھیرتے ہوئے بولیں۔

”دادی ماں میں تو آپ کے پاس ہی ہوتا ہوں۔“ میں نے ان کی بات کا جواب دیا میری دادی ماں اب اس دنیا میں نہ تھی۔ وہ میرے ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے سے اس جہان فانی سے رخصت ہو چکی تھیں اور میں بچپن سے ضیا کی دادی ماں کو اپنی دادی ماں کی طرح ہی سمجھتا تھا وہ انہیں یاد بھی بہت کرتی تھیں۔ میں جب کبھی ان کے

عقبی جانب سے جہاں ہم لوگ کھڑے تھے دیکھا جائے تو وہ بہت دور نہ تھا ابھی میری نگاہیں اس پرستان کا طواف ہی کر رہی تھیں کہ جب ضیا بولا۔

”یار تم نے اس سے کوئی رابطہ نمبر ہی لے لینا تھا۔“ ضیا کی بات سنتے ہی میں نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور راحت کے نام سے جو نمبر محفوظ کیا تھا اسے ڈائل کیا یہ دیکھ کر ضیا نے میرے کاندھے پر ہتھکی لگا کر جیسے مجھے داد دی اور اب ہم دونوں ہی دوسری جانب سے کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگے ہم دونوں ہی جس قدر بے تابی سے کال ریسیو ہونے کا انتظار کر رہے تھے دوسری جانب سے اتنی ہی تاخیر سے کال ریسیو کی گئی۔

”ہیلو کون بول رہا ہے؟“ کال ریسیو کرتے ہی کسی ننھے سے بچے کی آواز سنائی دی۔ جسے میں فوراً ہی پہچان گیا تھا اس روز اکیڈمی میں، میں یہ آواز سن چکا تھا۔

”راحت آپ جلدی آ جائیں۔“ یہ آواز سنتے ہی ساری کلاس نے جو مز کر دروازے کی جانب دیکھا تھا تو وہاں اسکول یونیفارم میں ایک پیارا سا بچہ کھڑا تھا۔

”ہیلو کون ہے؟“ موبائل کے کھلے اسپیکر سے پھر آواز سنائی دی جب میں سوچ رہا تھا کہ میں اس بچے کو کیا جواب دوں اور ضیا مجھے مسلسل ٹہوکے لگا کر بات کرنے پر اصرار کر رہا تھا جب اسپیکر پر پھر سے ننھے بچے کی آواز ابھری۔

”انکل آپ طہ بات کر رہے ہیں۔“ اس کی بات سن کر جیسے ہم دونوں نے یوں حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور میں نے فوراً جواب دیا۔

”جی بیٹا میں طہ بات کر رہا ہوں۔“ ابھی فقط

سیرھیاں اترنے لگیں اور میں نے پلٹ کر ضیا سے پتنگ چھیننے کے لیے اس پر انیک کر دیا۔ ہم لوگ دیر تک داوی ماں کی باتوں پر قہقہے لگاتے رہے پتنگ اوپر بہت اوپر آکاش کا طواف کر رہی تھی جب ایک دم سے مجھے راحت کا خیال آیا آج چھٹی تھی پھر آج وہ کیا کر رہی ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی میں ضیا سے مخاطب ہوا۔

”جانتے ہو راحت کون ہے؟“ میری یہ بات سن کر وہ جھٹ سے بولا۔

”اگر مجھے علم ہوتا تو تمہیں اس کا پتا کرنے کو کیوں کہتا۔“ اس کی بات ختم ہوتے ہی میں بھی سرعت سے بولا۔

”تو پھر سنو راحت چوہدری عبدالغنی کی بیٹی ہے۔“ میری بات سنتے ہی اس کے ہاتھ سے پتنگ کی ڈور چھوٹ گئی اور وہ اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑتا ہوا یوں حیرت سے بولا۔

”کیا وہ چوہدری عبدالغنی ایم این اے کی بیٹی ہے۔“ ضیا نے ایم این اے لگا کر جیسے مجھ سے تصدیق چاہی۔

”جناب وہ انہی ایم این اے کی بیٹی ہے۔“ میری یہ بات سن کر اس نے میرا ایک بازو تھاما اور مجھے جیسے گھسینتا ہوا ایک طرف کولے گیا اور اسے ایسا کرتے دیکھ کر میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کیا ہو گیا جب چھت کے پردے کے پاس پہنچ کر جہاں سے شہر بھر کی عمارتوں کا نظارہ کیا جاسکتا تھا وہ ایک ہاتھ اٹھا کر مجھے انگلی کے اشارے سے بتانے لگا۔

”طہ وہ جو نیلی ٹانگوں والی کوٹھی دکھائی دے رہی ہے نا وہ ہے، چوہدری عبدالغنی کا گھر۔“ میں نے اس کی بات سن کر اس گھر کی جانب دیکھا اگر

میں نے اتنا ہی بولا تھا جب دوسری جانب سے مجھے وہی مترنم آواز سنائی دی۔
 ”جی السلام علیکم طہ میں راحت بول رہی ہوں۔“

”وعلیکم السلام، میں نے پہچان لیا آپ کیسی ہیں۔“ اس کی آواز سننے ہی میں نے جھٹ سے جواب دیا اور ضیا میرے قریب کھڑا کچھ عجیب سی حرکتیں کرنے لگا جو ذرا دیر سے مجھے سمجھ میں آ گئیں کہ وہ کہہ رہا تھا کہ میں اسے کہوں کہ وہ اوپر چھت پر چلی آئے جہاں اس طرح میں بھی چھت پر کھڑا تھا جب میں نے یہ بات راحت سے کہی تو وہ فون کان سے لکائے فوراً ہی چھت پر چلی آئی۔ ایک ہاتھ سے اپنے سارے بالوں کو جو میری آنکھوں تک جھک آئے تھے اٹھا کر ہاتھ کو سر کے اوپر لگاتے ہوئے میں نے اس نیلی ٹائلڈ والی کونھی کی جانب دیکھا وہ اسی پرستان کی کوئی ننھی پری ہی لگ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا اسے بھی حیرت ہو رہی تھی کہ ہمارے گھروں کی چھتیں اتنا قریب تھیں پھر میں نے اسے کہا کہ میں تمہیں کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے یہ کہتے ہوئے میں نے ضیا کو پتنگ نیچے اتارنے کو کہا ضیا نے سرعت سے ڈور نیچے کھینچنا شروع کر دی میں نے ضیا سے قلم مانگا وہ پتنگ میرے ہاتھ میں تھا کر قلم لینے چلا گیا جب تک ضیا قلم لے کر لوٹا میں راحت کو بتانے لگا کہ ابھی ایک پتنگ اس کی چھت پر آ کر گرے گی اس پر کچھ تحریر ہو گا وہ یہ سب سن کر دیوانہ وار قہقہے لگانے لگی اور اس طرف میری یہ حالت ہو رہی تھی کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پونہی اپنی مترنم آواز سے ہنستی رہے اور میں اسے یونہی سنتا ہوں جب ضیا قلم لے

کر میرے پاس پہنچا تھا میں نے قلم اس کے ہاتھ سے لیا اور پتنگ پر لکھنے لگا۔

”راحت اچھی بچی ہے اور کل دوپہر میں درگاہ پر مجھ سے ملنے آ رہی ہے۔“ میں پتنگ پر اپنے دل کی بات لکھ چکا تھا اور میرے لکھتے ہی ضیا کو مجھے کچھ سمجھانا بھی نہیں پڑا۔ جب وہ تنگ ہوا میں تیرنے لگی تھی ہم دونوں ہی دھڑکتے دل کے ساتھ اوپر فضاؤں میں بلند ہوتی پتنگ کو دیکھ رہے تھے ہوا خاصی تیز تھی کبھی پتنگ یوں پھڑ پھڑانے لگتی کہ مجھے لگتا وہ اس تک پہنچنے سے پہلے ہی تار تار ہو کر گر نہ جائے میں دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ یا رب یہ پتنگ اس تک پہنچ جائے ضیا نے میری جانب اشارہ کیا۔ وہ پتنگ بازی میں جو مہارت رکھتا تھا اب اس کا کمال دکھانا چاہتا تھا پتنگ اب فضاؤں میں اس قدر بلند ہو چکی تھی کہ اگر اسے نیچے جھکاؤ دیا جائے تو وہ راحت کے سر کے اوپر سے اسی کے قدموں میں جا کرے ضیا پتنگ کو اتنا جھکا رہا تھا کہ اب وہ پتنگ اس کے چھت سے عین اوپر تیز ہوا میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ پھر ضیا نے اسے اس کے سر کے پاس یوں جھکا کر اوپر اٹھا لیا کہ ایک بار پھر سے اس کے قہقہے مجھے فون پر سنائی دینے لگے۔ وہ اپنے سر پر آ پل سنبھالتی کبھی چھت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنی نگاہیں اٹھائے پتنگ کے چھت پر گرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ جب میرا اشارہ پا کر ضیا نے پتنگ کو چھت پر گرا دیا۔ وہ پتنگ پر کھسی عمارت پڑھنے کے لیے جھکی اور میں اسے پھر سے دیکھنے کے لیے بے چینی سے اس کی چھت کی طرف دیکھنے لگا وہ اب مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ پتنگ اپنے سامنے رکھے اس پر درج عبارت کو

اٹھ کر کپڑے بھاڑتے ہوئے اس قدر تھکے لگائے کہ دادی کھانے پینے کی چیزیں رکھ کر اسے پیروں واپس لوٹ گئیں۔

اس رات نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور کہیں جا بیٹھی تھی۔ میں سونے کے لیے آنکھیں بند کرتا تو پھر سے ضیا کے ساتھ اس کے گھر کی چھت پر جا پہنچا تھا کبھی مجھے دادی ماں کے پاس بیٹھا دیکھ کر ضیا کا کھلکھلاتا چہرہ دکھائی دیتا تو کبھی میرے فون کرنے پر راحت کے چھت پر چلے آنے کا منظر میری نگاہوں میں ٹھہر جاتا کبھی میں پھر سے پتنگ پر لکھ رہا ہوتا۔ "راحت اچھی ہو گی ہے اور کل درگاہ پر مجھ سے ملنے آ رہی ہے۔" اور کبھی مجھے اچلے نیلے آسمان پر مسکراتی ہوئی پتنگ دکھائی دیتی جو اب راحت کا جوابی پیغام میرے نام لائی تھی اور ضیا اور اس میں اس پتنگ کو حاصل کرنے کے لیے کیسے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے پتنگ کی ڈور کبھی میرے ہاتھ آ جاتی تو کبھی ضیا سے چھین کر چھت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مجھے اپنے پیچھے دوڑتا رہا اور پھر اس کا جوابی پیغام میری نگاہوں میں جم کر رہ گیا تھا میری لکھی عبارت کے تین نیچے اس نے لکھا تھا۔

"آپ بھی بہت اچھے ہیں طہ میں آپ سے ملنے درگاہ ضرور آؤں گی۔" میں یونہی سوچتا کروٹیں بدلتا رہا اور پھر نہ جانے رات کے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

رات دیر سے سونے کی وجہ سے صبح میری آنکھ بھی دیر سے کھلی تھی آنکھ کھلتے ہی میں نے نیند کے گہرے اثرات کو مٹانے کے لیے اپنے ہاتھوں کو چہرے پر پھیرا اور پھر جیسے ہی میری نگاہ ٹھڑی پر پڑی میں اچھل کر اٹھ بیٹھا گیارہ بج رہے تھے اور

دیکھتے ہوئے یہی سوچ رہی ہوگی کہ اسے مجھ سے ملنے کے لیے درگاہ پر آنا چاہیے کہ نہیں پھر فون پر بھی مسلسل خاموشی پا کر میں نے ضیا کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اس نے مجھے اشارتاً انتظار کرنے کو کہا۔ ابھی چند لمحے ہی بیتے تھے جب ہمیں اچانک سے راحت دکھائی دی۔ پتنگ اس کے ہاتھوں میں تھی اور اب وہ ہمیں پتنگ واپس کھینچنے کا اشارہ کر رہی تھی ضیا نے اشارہ پاتے ہی ڈور کو مخصوص انداز سے کھینچا اور پتنگ راحت کے سر کے اوپر سے فضا میں تیرنے لگی۔ یہ دیکھ کر وہ اپنی چھت پر کھڑی ننھے بچوں کی طرح خوشی سے اٹھتے ہوئے تالیاں بجا رہی تھی۔ میں نے فون ابھی تک کان سے لگا رکھا تھا۔ جب ضیا کی گنگنائی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"میرے ننھے مجنوں دوست فون رکھ دے پیغام پتنگ پر ہواؤں میں تیرتا ہوا آ رہا ہے۔" ضیا کی بات سن کر میں نے اس پر ایک کر دیا اور اب میں مسلسل اس سے پتنگ چھیننے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا ہمیں یوں لڑتا جھگڑتا دیکھ کر راحت اب واپس نیچے جا چکی تھی ہلّا خراس کا پتنگ پر لکھ کر بھیجا جواب مجھ تک پہنچ ہی گیا اس نے میری عبارت کے بالکل نیچے لکھا تھا۔

"آپ بھی بہت اچھے ہیں طہ، میں آپ سے ملنے درگاہ ضرور آؤں گی۔" راحت کا لکھا جواب پڑھ کر اب کی بار جو ضیا نے مجھ پر ایک کیا تو اب اس سے بچنے کے لیے میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا جب میں اتنی وقت دادی ماں چھت پر آ پہنچی اور ہمیں یوں جھٹم جھٹما دیکھ کر بولی۔

"میں اسی لیے کہتی تھی کچھ سمجھاؤ تو بندہ خود ہی برابرتا ہے۔" دادی کی بات سن کر ہم لوگوں نے

درگاہ کی طرف چل پڑا۔ درگاہ شہر سے چند کوس مسافت پر تھی۔ شہر کی بھینٹ بھاڑ سے نکلنے ہی ہم لوگ جلد ہی درگاہ تک پہنچ گئے تھے پہلے پہل یہ درگاہ آبادی سے کافی مسافت پر ہوئی تھی لیکن پچھلے کئی برسوں سے آبادی کے بڑھتے تناسب سے اب یہ درگاہ آبادی سے قریب ہی لگ رہی تھی۔ درگاہ سے قریب ہی درگاہ میں داخل ہونے والے راستے میں ایک نہایت بلند قامت آدم کا پیڑ تھا جس کے گھنے سائے تلے ہم لوگوں نے اپنی گاڑی روک دی تھی اگرچہ اس درگاہ پر فقط جمعرات کے روز ہی میلے کا سماں دکھائی دیتا تھا لیکن آج اتوار کا دن تھا شاید تعطیل ہونے کی وجہ سے خاصے زائرین یہاں موجود تھے ضیا کو وہیں گاڑی کے قریب کھڑا کر کے میں درگاہ کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اندر کھلے احاطے میں داخل ہو گیا۔ سامنے کھلے احاطے میں بڑا سا برگد کا پیڑ تھا جس کے عین نیچے کئی اینٹوں کا تھڑا بنا ہوا تھا۔ بہت سے بوڑھے اور بچے اس تھڑے پر بیٹھے درگاہ میں آتے جاتے لوگوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ کچھ بچے برگد کی لگی لمبی لمبی ڈالیوں سے جھول رہے تھے مزار پر حاضری کے بعد چند لوگ ساتھ لایا تبرک بھی تقسیم کرتے دکھائی دے میں نے وہاں کھڑے ہو کر چار سو نظر دوڑائی مگر مجھے راحت کہیں دکھائی نہ دی آگے بڑھ کر میں نے مزار کے اندرونی حصے میں بھی جھانک کر دیکھ لیا لیکن وہ وہاں نہ ملی، مطلب ہم راحت کے پہنچنے سے پہلے پہنچ چکے تھے یہ سوچتے ہوئے میں ضیا کے پاس واپس چلا آیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ راحت ابھی درگاہ پر نہیں پہنچی تھی اور اب ہم اسی راستے پر اس کی آمد کا انتظار کرنے لگے جہاں سے

ابھی مجھے تیار ہو کر ضیا کو بھی ساتھ لینا تھا ہاتھ روم جانے سے پہلے ہی میں نے ضیا کو بھی کال کر دی تاکہ وہ وقت مقررہ پر تیار ہو جائے اور پھر میں تیاری میں لگ گیا۔ جب میری تیاری مکمل ہوئی تو پونے بارہ ہو رہے تھے پھر جھٹ سے جو کمرے سے باہر پہنچا تو سامنے ماں کھڑی تھی چھٹی والے روز میں گیارہ بارہ بجے تک ہی سو کر اٹھتا تھا اور اب وہ مجھے جگانے آئی تھیں لیکن اب اپنے سامنے مجھے خوشبو میں مہکتا سوٹ بوٹ پہنے کھڑا دیکھ کر وہ مسکرائی اور ان کے مسکراتے ہی میں نے ان کی پیشانی چوم لی۔ ویسے یہ کام وہ کرنے والی تھیں اور اب وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

”بیٹا جی آج ماں پر بڑا پیارا رہا ہے۔“ ان کی بات سن کر میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”ماں پلیز آج کچھ وقت کے لیے ابا کی گاڑی کی چابی چاہیے۔“ ماں نے میری بات سن کر ہاتھ بڑھا کر میرے گال کو سہلایا اور پھر بولی۔

”بس، چلو میرے ساتھ آؤ۔“ ان کی بات ختم ہوتے ہی ایک قدم ان کے ساتھ آگے بڑھاتے ہوئے میں نے ہاتھ بڑھا کر ان کے کاندھے کو سہلاتے ہوئے کہا۔

”ماں یہ ہوتی نا بات۔“ اپنے کمرے میں پہنچ کر ماں نے مجھے گاڑی کی چابی دی اور ایک بار پھر سے ماں کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے میں نے ان کا شکر یہ ادا کیا اور پھر گاڑی لے کر ضیا کے گھر جا پہنچا پہلے ہم دونوں ہی اپنی اپنی بالیکس پر درگاہ جانے والے تھے لیکن اب میری منی پجارو اپنے گھر کے سامنے کھڑی دیکھ کر ضیا بھی میری طرح خوش دکھائی دے رہا تھا پھر ضیا کو ساتھ لیے میں

پڑھی گئی تھیں وہ سبھی لمس احساس مجھے کسی الگ ہی دنیا میں لے گئے تھے۔

وہاں آم کے پیز کی گھنی چھاؤنی تلے کھڑے ہمیں کافی وقت بیت چکا تھا لیکن راحت ابھی تک نہ آئی تھی اور اب میں ضیا سے کہہ رہا تھا کہ ہمیں واپس چلنا چاہیے لیکن اسی کے اصرار پر میں مزید وہاں کھڑا موہوم سی امید کے ساتھ اس کا انتظار کرنے لگا لیکن پھر وہ موہوم سی امید بھی نوٹ گئی جب وہ مزید وقت گزرنے کے باوجود نہ پہنچی تھی۔ اب کی بار جو میں نے ضیا کو واپس چلنے کو کہا تو اس نے میری بات نہ مانی اور ہم دونوں ہی بچھے ہوئے دل کے ساتھ واپس لوٹ آئے۔

اگلے روز میں اسے اکیڈمی میں ملا تو میں اس سے سخت خفا تھا اور اسے بھی اس بات کا بخوبی احساس تھا کلاس ختم ہوتے ہی اب وہ معذرت پیش کر رہی تھی۔

”ظ گھر پر کوئی بھی نہ تھا فقط چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ میں تنہا تھی اور انہیں تنہا چھوڑ کر میں نہیں آ سکتی تھی میں جانتی ہوں تمہیں بہت برا لگا لیکن میں بھی تو کتنی مجبور تھی۔“ اس کی مجبوری والی بات سن کر میں نے جو پلٹ کر اس کے چہرے کی جانب دیکھا تو وہاں آنکھوں کے ساغر اس کی زبان کی صداقت کی گواہی دے رہے تھے۔ اس کی معصومیت پر مجھے پیارا آنے لگا تھا اور پھر مجھے مسکراتا دیکھ کر وہ جھٹ سے اپنا بیگ کھول کر اس میں سے کچھ نکالنے لگی۔

”ظ میں کل آتے ہوئے آپ کے لیے یہ گفٹ لا رہی تھی اسے رکھ لیجیے۔“ اس کا میری جانب بڑھا ہاتھ ہوا میں ہی معلق تھا جب اس کے ہاتھ سے گفٹ لیتے ہوئے میں نے فوراً اسے اس

زائرین کے آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا اور ساتھ ہی میں بیٹنی اور بے بیٹنی جیسی صورت حال کا شکار ہو رہا تھا جو وقت ہم لوگوں نے مقرر کیا تھا وہ بیت رہا تھا لیکن وہ آئے گی بھی یا نہیں یہی سوچ کر میرا یقین ڈمگانے لگا تھا جب مجھے ضیا کی آواز سنائی دی وہ پاس سے گزرتے ایک بچی اور بچے سے مخاطب تھا جو بہن بھائی لگ رہے تھے۔

”پیارے بچوں ہمیں بھی تھوڑا تبرک کھلا دو۔“ بچی کے ہاتھ میں ایک تھال تھا جس پر ایک ریشمی کپڑا پڑا تھا ضیا کی بات سن کر بچی نے مسکراتے ہوئے اپنے ساتھ کھڑے بھائی کی طرف دیکھا جو اس سے بھی زیادہ شرمایا رہا تھا ضیا ان بچوں کے روکتے ہی میری جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے ذرا اور ان کے قریب چلا گیا۔ اس کے قریب ہوتے ہی بچی نہایت احترام سے بولی۔

”بھائی جان یوں تو اب یہ باقی بچا تھوڑا سا تبرک ہم اپنے گھر کے لیے لے جا رہے ہیں لیکن اب آپ نے روکا ہے تو آپ کو ضرور کھلا میں گے۔“ یہ کہتے ہوئے بچی نے ریشمی کپڑا جو تھال پر دھرا تھا اسے ہٹایا تو نیچے شکر، گھی، آنے سے بنی روٹی کے چند ٹکڑے پڑے تھے۔ دو ٹکڑے اٹھا کر اس نے ضیا کی جانب بڑھا دیے۔ جب میں نے عقب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ضیا یہ بچے تو بہت ذہین ہیں۔“ میری بات سن کر بچوں نے پلٹ کر ایک بار مجھے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ضیا نے پلٹ کر اک ٹکڑا مجھے دیا اور ایک اس نے خود کھالیا میں نے جو ضیا کے ہاتھ سے تبرک کا ٹکڑا لے کر اپنے منہ میں رکھا تو کیا عجب احساس تھا۔ مجھے لگا جن ہاتھوں نے اسے بنایا تھا اور پھر جو آیت مبارک

دو، دو ہو گئیں۔ یوں ایک حصہ میں نے اس کی کلائی پر باندھ دیا اور دوسرا خود رکھ لیا۔ وہ میری اس حرکت سے کافی محفوظ ہو رہی تھی جب ویٹر کھانا لے آیا چائیز رائس سے اڑتی بھاپ اور خوشبو نے ہماری بھوک اور بڑھادی تھی میں نے راحت کو شروع کرنے کی دعوت دی تو کالج کی بھاری نفیس پلیٹ جس پر ہونٹوں کا لوگو بھی لگا تھا راحت اس میں رائس ڈالنے لگی اور ساتھ ہی وہ پلیٹ اس نے میری جانب بڑھادی شکر یہ کہہ کر میں نے وہ پلیٹ اس کے ہاتھ سے لی اور پھر وہ اپنے لیے رائس پلیٹ میں ڈالنے لگی۔ جب وہ ایسا کر رہی تھی میں نے کانٹا اور چمچ ہاتھ میں تھامتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

”راحت آپ کو دیر تو نہیں ہو رہی۔“ میری بات سن کر اس نے پلیٹ جس میں ابھی اس نے رائس ڈالے تھے اپنے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

”ط میں نے کبھی کوئی بات اپنے ڈیڈی سے نہیں چھپائی ہماری پہلے روز ہوئی ملاقات سے آج اس ٹیبل پر کھانا کھانے تک وہ سب جانتے ہیں۔ وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتے ہیں اور میں ان کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی اسی لیے میں کہوں گی کہ میں تو آپ سے ملنے آپ کے گھر بھی آسکتی ہوں۔“ آخری بات کہتے ہوئے وہ واقعی پر اعتماد لگ رہی تھی اور میں جو حیرت زدہ سا ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا آخری بات پر چونکتے ہوئے بولا۔

”یار ایسی ویسی کوئی حرکت نہ کرنا میرے گھر والے ذرا پرانے خیالات کے ہیں۔“ میری بات سن کر اس نے وہی مترنم سا قبضہ لگایا اور ہم لوگ ریسٹورنٹ میں بج رہی ہلکی ہلکی موسیقی میں کھانا کھانے لگے کھانے سے فراغت کے بعد ہم لوگ

کے ہی بیگ میں رکھ دیا وہ حیرت زدہ سی سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی جب میں نے اسے جواب دیا۔

”آپ کا یہ تحفہ میں سب قبول کروں گا جب آپ میرے ساتھ کھانا کھانے کسی ریسٹورنٹ چلیں گی ابھی اسی وقت۔“ وہ میری بات سن کر کچھ دیر تک سوچتی رہی اور پھر جھٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تو چلیں۔“ اس کے اس جواب پر میں نے بھی حیرت سے اٹھتے ہوئے ایک سوال پوچھا۔

”راحت اگر آپ میرے ساتھ ریسٹورنٹ چلی گئیں اور ڈرائیور آپ کو لینے یہاں آیا تو آپ کیا جواب دیں گی۔“ یہ بات ابھی ابھی میرے ذہن میں آئی تھی جسے سن کر وہ فوراً بولی کہ آج وہ ڈرائیور کے ساتھ نہیں آئی اور وہ اپنی بھی وہ رکشہ پر ہی جائے گی اس کی یہ بات سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور یوں اس روز میں پہلی بار کسی لڑکی کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہا تھا۔

راستہ بھر وہ مجھے اپنی پسند کے ریسٹورنٹ بتاتی رہی اور میں اسے اپنی پسند بتاتا رہا پھر ایک ریسٹورنٹ پر ہم دونوں ہی متفق ہو گئے اب ہم اسی ریسٹورنٹ میں موجود تھے وہاں بیٹھتے ہی میں نے مینوراحت کی جانب بڑھایا دیا تاکہ وہ اپنی پسند کا آرڈر دے اور جب وہ آرڈر دے چکی تو اس نے پہلے وہ تحفہ اپنے بیگ میں سے نکالا جو میں نے واپسی اسی کے بیگ میں رکھ دیا تھا میں نے وہ تحفہ راحت کے ہاتھ سے لے کر اسی کے سامنے کھولا اور اس میں ایک فرینڈ شپ بینڈ تھی اور ایک خوشبو جو مجھے بہت پسند آئے اور میں نے اس کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے فرینڈ شپ بینڈ کو یوں دو حصوں میں الگ کر لیا کہ جو چار کڑیاں ملی ہوئی تھیں اب وہ

ریسٹورنٹ سے نکلے میں نے اسے رکشہ پر بٹھایا اور خود بانیک پر گھر چلا آیا۔

میرے گھر پہنچنے تک دن ڈھل چکا تھا اپنے کمرے میں پہنچ کر بیگ وہاں رکھنے کے بعد اب میں ضیا سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ آج راحت سے ہوئی ملاقات ریسٹورنٹ میں کھانا، فرینڈ شپ بینڈ، خوشبو کا تحفہ میں اسے سبھی کچھ بتانا چاہتا تھا۔ اسی مقصد سے میں گھر سے نکلا اور ضیا کے گھر جا پہنچا میری دوسری ہی دستک پر چھوٹی نے دروازہ کھولا اور مجھے سامنے کھڑا پا کر وہ خوشی سے بے ساختہ اپنی توتلی زبان سے بولی۔

”مما طے بھائی آئے ہیں۔“ اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھ کر گود میں اٹھا لیتا وہ شرمناک بھاگ گئی اور اب آنٹی میرے سامنے کھڑی تھیں۔

”السلام علیکم!“ میں نے سلام میں پہل کی تو انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے چند سیکنڈ میں مجھ سمیت میرے سارے حجر و نسب کا حال پوچھ ڈالا۔

”آنٹی ضیا گھر پر ہی ہے۔ میں ضیا سے ملنے آیا تھا۔“ آنٹی نے مجھے بیٹھنے کو کہا جب میں نے کھڑے کھڑے ان سے ضیا کے بارے میں دریافت کیا تو آنٹی جیسے بے زاری سے بولیں۔

”ہاں جینا اوپر چھت پر ہے۔ آج چودھویں کی رات ہے نا آج رات بھی وہ دیر تک پتنگ ہی اڑاتا رہے گا۔“ آنٹی کی بات سن کر شکر یہ ادا کرتے ہوئے میں میٹھیوں چڑھتے ہوئے جا پہنچا۔ فروری کے درمیانی دنوں کی ایک صاف شفاف رات شروع ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی رات کی رانی کی پراسرار مسکراہٹ ہی خوشبو سے بھری رات، چودھویں کا چاند، ننھے ننھے منے تاروں سمیت

اپنے پورے اہل و عیال کے ہمراہ آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا اور میرا راضیا، سفید رنگ کی پتنگ اپنے پاس ڈھیر لگائے آسمان پر کسی کے ساتھ پیچھا پھنسا لے کھڑا تھا۔ جب مجھ دیکھتے ہی وہ چلایا۔

”طے ادھر آ دیکھ یہ میری ڈور سے تیری پتنگ بوکاتا ہوگی۔“ اس کی بات ختم ہونے تک میں اس کے قریب جا پہنچا تھا لیکن میرے نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھنے تک اس کی اپنی ہی پتنگ کٹ چکی تھی اور اب وہ برا سا منہ بناتے ہوئے ڈور کھینچ رہا تھا۔ جب میں نے راحت کی دی فرینڈ شپ بینڈ اس کے سامنے کر دی۔ یہ دیکھتے ہی اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ڈور ایک طرف پھینکی اور میرے ہاتھ سے بینڈ لیتے ہوئے جھٹ سے بولا۔

”تم راحت سے ملے تھے اور آج اس نے تمہیں یہ فرینڈ شپ بینڈ دی اور تم نے لے لی اور اس دن جو اس نے ہمیں سارا دن ذلیل و خوار کیا اس کا کیا ہوا۔“ اس کی یہ ترش بات سن کر میں مسکراتا ہوا اس کا بازو تھامے اسے چار پائی تک لے گیا جہاں بیٹھے میں اسے بتانے لگا کہ وہ کیا مجبوری تھی جو اس اس روز ہمیں ملنے درگاہ پر نہ آ پائی تھی پھر میں نے ریسٹورنٹ میں کھائے کھانے اور اس سے ہوئی باتوں کی ساری تفصیل اسے بتائی جسے سنتے ہی وہ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا وہ میرا بازو تھامے مجھے نیچے لے گیا اس نے اپنی بانیک نکالی اور اب وہ میرے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ میں اس کا سارا پلان سمجھ گیا تھا میں بھی تیزی سے اپنے گھر داخل ہوا اور جب لوٹا تو میں اپنی بانیک کے ساتھ تھا۔ میری خوشی تو دیدنی تھی ہی ضیا آئے سے باہر لگ رہا تھا ہم لوگوں کا رخ راحت کے گھر کی طرف ہی تھا۔ جب راحت کے گھر سے ذرا پہلے ضیا نے اپنی

سجھ لو

۱۔ نہ اتنا مینھا بنوں کہ لوگ تمہیں نگل لیں، نہ اتنا کمزور بنوں کہ لوگ تمہیں تھوک دیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی اتنی عبادت کرو جتنا تم اس کے محتاج ہو۔

۳۔ آخرت کی اتنی ہی تیاری کرنا جتنا تم نے وہاں جا کر رہنا ہے۔

۴۔ گناہوں پر اتنی جرات کرنا جتنا جہنم کی آگ میں جلنے کا حوصلہ ہو۔

۵۔ جب کوئی گناہ کرنے کا ارادہ کرو تو پھر ایسی جگہ تلاش کرنا جہاں پر اللہ تعالیٰ نہ دیکھ سکے۔

زمین المدین صدیقی..... کراچی

تھی یہی وجہ تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں وہاں ایسبولینس آپہنچی تھی میں ضیا کے ساتھ ہی ایسبولینس میں بیٹھا تو ایسبولینس کا عملہ ابتدائی طبی امداد دیتے ہوئے اسپتال کی جانب بڑھ چکا تھا راستہ بھر میں ضیا کے ہوش میں آنے کی دعائیں کرتا رہا لیکن اسپتال پہنچنے تک بھی اسے ہوش نہیں آیا راستے میں ہی میں نے بڑے بھائی مصطفیٰ عالم کو ضیا کو پیش آنے حادثے کی اطلاع کر دی تھی اور پھر ہمارے ضیا کو ایسبولینس سے ایمرجنسی وارڈ میں لے جانے تک سبھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ یہ تو اچھا ہوا جو ضیا کے اماں اور ابا کے ساتھ دادی ماں نہیں آئی تھی وہ شاید یہ برداشت نہ کر پائی اس لیے وہ انہیں اپنے ہمراہ نہ لائے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ میں ان کے سوالوں کے جواب انہیں ہرگز دے پاتا۔ میرے ماں بڑے ابا اور مصطفیٰ عالم بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ ضیا کے ماں اور ابا کو دلا سے دے رہے تھے اور میں بامشکل چھلکتی آنکھوں کے

بائیک کی ریس بڑھائی اور ساتھ ہی اگلا وہیل اٹھا لیا اب وہ ٹریفک کے درمیان دن ویٹنگ کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں نے بھی اپنی بائیک کی ریس بڑھائی میں اس تک پہنچ کر اسے ایسا کرنے سے روکنا چاہتا تھا ابھی چند روز پہلے ہی دادی ماں نے ضیا کی شکایت لگاتے ہوئے مجھے یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ میں اسے اس خطرناک جان لیوا کھیل سے باز رہنے کو کہوں اور آج جبکہ میں اس کے ہمراہ ہی تھا وہ بے تحاشا ٹریفک کے درمیان دن ویٹنگ کرتا ہوا جا رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں اس تک پہنچتا اور اسے ایسا کرنے سے منع کرتا میرے دیکھتے ہی دیکھتے ضیا کا تو وزن بگڑا بائیک اس کے پیچھے سے نکلی اور لڑھکتی ہوئی ایک طرف کوچلی گئی اور ضیا فٹ ہال کی طرح اچھلتا زمین سے رگڑتا فٹ پاتھ کے پاس جا رہا اسے یوں گرتا دیکھ کر جیسے میرا دل دھک سے رہ گیا رات کی تاریکی میں جیسے میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں تھیں۔ میں نے بائیک کو روکتے ہی کھڑا کھینچ لیا اور اسے وہیں پھینک کر ٹریفک کے بیچ میں سے بچتا بچتا فٹ پاتھ تک جا پہنچا جہاں چند لوگ مجھ سے بھی پہلے ضیا کے پاس موجود تھے۔ میں نے اس کے پاس پہنچتے ہی ضیا کا سر اپنی گود میں رکھا اور اس کے گال تھپتھپاتا ہوا اسے ہوش میں لانے کو آوازیں دینے لگا۔ میں نے اس کے سر کا معائنہ کیا اسے بظاہر نہیں چوٹ لگائی تھی اس کے بازو ہاتھ نہیں سے کوئی خون بہتا دکھائی نہیں دیا تھا لیکن پچھلے چند سیکنڈز گزرنے کے باوجود وہ ہوش میں نہ آیا تھا کوئی میرے پاس کھڑا اس کی نبض دیکھ رہا تھا اور کوئی میری طرح سر کا معائنہ کر رہا تھا پھر کسی نے ایسبولینس کو کال کر دی

آگے بڑھ کر ضیا کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیا۔

”تم ٹھیک ہو جاؤ گے ضیا تم فکر مت کرو ہم سب ہیں نا تمہارے پاس۔“ میں تو فقط اسے دلا سہ دے سکتا تھا۔ اسے یقین دلا رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا وہی ضیا جو چند گھنٹوں پہلے چودھویں کی رات میں سفید چنگ اڑائے پچھا لگا رہا تھا تاروں سے جگمگاتے آسمان تک خوش و خرم دکھائی دے رہا تھا اور پھر میری اور راحت کی ریسٹورنٹ میں ہوئی ملاقات کا احوال جان کر مجھ پر فریفت ہوا جا رہا تھا اور کیسے پھر اس نے بایک نکالی اور شہر کی جگمگاتی روشنیوں کے بیچ وہ سڑک پر دن دینگ کرتا ہوا اپنا توازن برقرار نہ رکھ پایا تھا جیتے چند لمحوں نے ہی اسے کہاں سے کہاں لا چنچا تھا۔ وہی ضیا جو آج مجھ سے گریڈ پارٹی لینے والا تھا۔ اب ایمر جنسی میں ہمارے سامنے بے بسی سے چلا چلا کر ہمیں پکار رہا تھا کہ اسے دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ کیوں کچھ نہیں دیکھ پارہا؟ اس سوال کا جواب ہم میں سے کسی کے پاس نہ تھا اس کے اس سوال کا جواب ڈاکٹر ہی دے سکتا تھا۔ ضیا کے ہوش میں آتے ہی ڈاکٹر بھی اس کے پاس ہی موجود تھا اور اب وہ ضیا کی آنکھوں کا معائنہ کر رہا تھا جب اس نے ضیا کے سامنے ہی سہی کو بتایا کہ ضیا کی آنکھیں بظاہر بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہی تھیں اور مزید تفصیلات جاننے کے لیے انہیں ضیا کے سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی اور مزید کچھ ٹیسٹ کرنے ہوں گے ڈاکٹر یہ سہی ٹیسٹ لکھ کر ہمیں دے گیا تو تھوڑی ہی دیر میں ہم ضیا کو ٹیسٹ کے لیے لیبارٹری لے گئے۔

اسپتال کی لیبارٹری میں ہی ضیا کے سہی ٹیسٹ

ساتھ ان کے سوالوں کے جواب دے پارہا تھا۔
”طہ تم نے اسے روکا کیوں نہیں۔“ ضیا کی ماں کی یہ بات سن کر میں انہیں کوئی جواب نہیں دے پایا۔

”یا اللہ میرے بچے کی حفاظت فرما۔“ ان کے منہ سے دعا نکلی تو میں نے اپنی نرزی زبان سے دل ہی دل میں آمین کہا۔

ضیا کہ پاس زیادہ لوگوں کو رکھنے کی اجازت نہ تھی اس کے پاس اندر ایمر جنسی میں اس کے اماں ابا اور مصطفیٰ عالم تھے اور میرے ماں باپ اور بڑے ابا ہم کبھی باہر وارڈ میں کھڑے تھے اور ضیا کے ہوش میں آنے کی دعائیں مانگ رہے تھے پچھلے پون گھنٹے سے وہ بے ہوش پڑا تھا ڈاکٹر نے ابھی تک یہی بولا تھا کہ ہوش میں آنے تک وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پھر ہماری دعائیں اللہ نے سن لیں اور بھائی مصطفیٰ عالم ہمیں یہ بتانے کے لیے ایمر جنسی سے باہر آئے کہ ضیا کو ہوش آ گیا ہے۔ ہم کبھی جو اس سے ملنے کے لیے بے تاب تھے۔ اس کے پاس پہنچے تو جہاں اس کے ہوش آنے کی بے حد خوشی تھی وہیں ایک بڑی خبر بھی ہماری منتظر تھی۔

”ماں مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ابا میں کچھ نہیں دیکھ پارہا۔“ اس کے قریب پہنچتے ہی ہمیں ضیا کی ایسی حالت دیکھ کر شدید دھچکا پہنچا چہروں پر چھائی خوشی اب زردی میں بدل گئی تھی۔ میں بے ساختہ ضیا کے سامنے جا پہنچا اور اسے آوازیں دینے لگا۔

”ضیا میں یہاں تمہارے سامنے کھڑا ہوں وہ ہاتھ بڑھائے بے بسی سے مجھے پکارنے لگا۔

”طہ میں کچھ نہیں دیکھ پارہا مجھے تم دکھائی نہیں دے رہے میں دیکھ کیوں نہیں رہا طہ۔“ اس کی باتوں نے وہاں موجود سہی کو رلا دیا تھا میں نے

تک ٹھیک ٹھاک پہنچنی چاہیے وہ اتنا بڑا ہو چکا ہے کہ اب وہ ان سب باتوں کو سمجھ سکتا ہے اس گھڑی میں ضیا کے ساتھ ہی بیٹھا تھا جب اس کی ماں اور ابا کے بجائے بھائی مصطفیٰ عالم نے نیوروسرجری والی بات ضیا کو بتائی وہ اسے یوں سمجھا رہے تھے جب اچانک ضیا نے ایک سوال پوچھ لیا۔

”مصطفیٰ بھائی نیوروسرجری میں نپھنے کا چانس کتنے فیصد ہوتا ہے۔“ ضیا کا یہ سوال سنتے ہی کمرے میں جیسے سناٹا چھا گیا۔ اس کے اس سوال پر مجھ سمیت سبھی کا دل جیسے دھک سے رہ گیا۔ ضیا کی ماں خود کو سنبھال نہیں سکی وہ اپنے چہرے کو آئینل میں چھپائے باہر چلی گئیں ضیا کے ابا بھی ان کے پیچھے ہی چلے گئے میں نے جو ہاتھ بڑھا کر ضیا کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ میں نے دیکھا مصطفیٰ بھائی بھی کوئی جواب دیے بغیر باہر نکل گئے تھے۔

اب فقط میں ہی ضیا کے پاس موجود تھا جب وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔
”ط میں زندگی بھر تم سے کھیل کے ہر میدان میں آگے رہا ہوں اور اب.....!“ وہ کچھ سوچتے ہوئے رک گیا۔

”اور اب ضیا۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا اور اب..... میں دنیا سے بھی تم سے پہلے.....!“ میں نے اگلی بات سننے سے پہلے ہی اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پھر ہم دونوں ہی رو پڑے۔

اسی روز مجھے راحت کی کال آئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ میں اکیڈمی کیوں نہیں آیا میں نے اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو پھر وہ بھی فوراً ہی اسپتال آ پہنچی تھی۔ جب وہ کمرے میں

لیے گئے تھے اور واپسی تک ضیا کے ابا اس کے لیے دی آئی پی روم تک بک کر اچکے تھے اب ہم اسے سیدھا وہیں لے آئے تھے۔ ایک دم سے اپنی آنکھوں کی بینائی کھو جانے پر وہ صدمے میں لگ رہا تھا اور بار بار مجھے اپنے لیے دعائیں کرنے کو کہہ رہا تھا اور میں اسے تسلی اور دلاسا دیتا رہا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا اور ہم لوگ پھر سے اس کے گھر کی چھت پر کھڑے رنگ برنگی چٹنگیں اڑائیں گے۔ میں اس کے ذرا قریب بیٹھا اسے کہنے لگا ضیا ہم ایک اتنی بڑی چٹنگ اڑائیں گے جس کے ایک طرف ضیا اور دوسری طرف ط لکھا ہوگا۔ وہ میری یہ بات سن کر تہتہ لگا کر ہنسنے لگا نہیں ط اب ضیا نہیں اب چٹنگ کے ایک طرف ط اور دوسری طرف راحت لکھا ہوا میں وہ چٹنگ ضرور اڑاؤں گا ط اور پھر اسے ہم راحت کے گھر کی چھت پر گرا دیں گے۔

اگلے روز صبح ہی تمام رپورٹس آ گئیں تو ڈاکٹر نے ہمیں ایک اور بری خبر سنا دی۔ ضیا کو دکھائی نہ دینے کی وجہ اس کے سر پر لگنے والی دماغی چوٹ تھی۔ خون اس کے سر سے باہر نکلنے کی بجائے اس کے دماغی خلیوں میں ہی جم کر رہ گیا تھا اور ڈاکٹر اب اس کا واحد علاج نیوروسرجری ہی بتا رہے تھے۔

ضیا کے ماں اور ابا یہ بات جان کر سکتے میں لگتے تھے وہ یہ بات ضیا سے چھپائے رکھنا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ضیا کو معلوم پڑے کہ چند روز بعد ہی اسے نیوروسرجری جیسے خطرناک آپریشن سے گزرنا پڑے گا۔ لیکن پھر بھائی مصطفیٰ عالم نے انہیں سمجھایا کہ ہمیں یہ بات ضیا سے ہرگز نہیں چھپانا چاہیے نہیں تو یہ اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کے مترادف ہوگا جو بھی بات ہے وہ ضیا

اگلے روز صبح ہم سبھی ضیا کے پاس موجود تھے ہم اسے حوصلہ اور یقین دلا رہے تھے کہ اس آپریشن کے بعد وہ بالکل ٹھیک اور تندرست ہو جائے گا وہ پھر سے اپنی آنکھوں سے اس دنیا کی خوب صورتی کو دیکھ سکے گا۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی بھی اس کے ارد گرد موجود تھے اور چھوٹی جو ابھی اتنی چھوٹی تھی کہ وہ یہ سبھی باتیں ابھی نہ سمجھتی تھی وہ بھی ضیا کے قریب سہمی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ میں اسے بار بار کہہ رہا تھا۔

”چھوٹی اللہ تعالیٰ سے دعا کرو ضیا بھائی جلدی ٹھیک ہو کر گھر چلے جائیں۔“ وہ میری بات سن کر اسے دہرا رہی تھی۔

”اللہ تعالیٰ ضیا بھائی جلدی ٹھیک ہو جائیں۔“ اب پونے دس ہو رہے تھے جب ضیا کو آپریشن تھیز لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ جب اچانک اس نے یوں بچوں کی طرح چلانا شروع کر دیا تھا وہ یہ آپریشن کرانا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی چند لمحوں پہلے تک ہمیں اندازہ نہ تھا کہ ضیا جسے ہم ایک روز پہلے سے امید دلا رہے تھے اسے حوصلہ رکھنے کی تلقین کرتے رہے تھے اب آپریشن سے ذرا پہلے وہ اتنا خوف زدہ ہو جائے گا کہ آپریشن کرانے سے ڈرنے لگے گا۔ ضیا کے ابا اسے ایسا کرتا دیکھ کر اس پر جھکے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں چومتے ہوئے بولے۔

”میرے بیٹے ہم تمہیں تندرست دیکھنا چاہتے ہیں۔“ قریب ہی گھڑی ضیا کی یاں یہ سب دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پائی تھی اور میری ماں انہیں دلاس دے رہی تھی دادی ماں سینک کے پیچھے ٹپ ٹپ کرتے موتیوں کی لڑی کو اپنے آنچل میں

چبچتی تو اس وقت ضیا کے پاس کمرے میں فقط میں ہی موجود تھا میں ضیا کے سر ہانے بیٹھا تھا اور راحت پھولیوں کا بو کے اٹھائے ضیا کے پیروں کی سمت کھڑی تھی اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کمرہ خوشبوؤں سے مہک اٹھا تھا۔ جب میں نے دھیرے سے ضیا کے کان میں کہا۔

”ضیا تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔“ ضیا یہ سنتے ہی اٹھ بیٹھا وہ اس گھڑی بالکل بھی بیمار نہیں لگ رہا تھا یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بھلا چنگا ہو کر اٹھ بیٹھا ہو اس کے چہرے پر ایک پیاری سی مسکراہٹ تھی تھی اور پھر اس نے یہ بتا کر کہ اس کے سامنے راحت کھڑی ہے۔ اس نے ہم دونوں کو ہی حیران کر دیا تھا۔ راحت کی موجودگی تک کمرہ قہقہوں سے گونجتا رہا پھر میرے ماں اور ابا بھی کمرے میں آ پہنچے تھے۔

یہاں آج پہلی بار میں نے انہیں راحت کا تعارف کرایا تھا اس روز بڑے ابا ان کے ہمراہ نہ آئے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ یہ بات نہیں جانتے تھے کہ راحت اور میں ایک ساتھ اکیڈمی میں پڑھتے تھے اس کے گاڑی میں بیٹھنے تک میں اسے اپنے دوست ضیا کے لیے دعا کہیں کرنے کو کہتا رہا۔ پھر اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور گاڑی لے کر آگے بڑھ گیا اور میں پلٹ کر واپس ضیا کے پاس چلا آیا تھا۔

اسی روز ضیا کے ابا ڈاکٹر سے ملے تھے جب ڈاکٹر نے انہیں اگلے دن صبح دس بجے آپریشن کا وقت دے دیا تھا۔ وہ چند روز تک ادویات دیتے رہے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ ادویات سے ہی کچھ بہتری آجائے لیکن اب ڈاکٹر مزید دیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔

سموتی جا رہی تھی۔ ضیا کے ابا انہیں ذرا سہارا دے کر ضیا کے پاس لے آئے اور وہ اپنی بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

”ضیا پتر تھے کچھ نہیں ہوگا، کبر اندہ پتر۔“ وہ ابھی اتنا ہی بول سکی تھی جب اسپتال کا عملہ ضیا کو آپریشن تھیمز لے گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں آپریشن تھیمز کی لال بتی جل اٹھی۔ اس کا مطلب تھا آپریشن کا آغاز ہو چکا تھا ہم سبھی دل ہی دل میں ضیا کی صحت کے لیے دعائیں کرنے لگا۔ میرے قریب ہی ضیا کی دادی ماں بیٹھی سر جھکائے سنبھل پڑھ رہی تھی اس سے پہلے کہ وہ اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر میری طرف دیکھتی میں نے جگہ بدل لی۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ میں دادی کی نگاہوں میں اٹھتے سوالوں کے جواب دے پاتا ابھی چند روز پہلے ہی تو انہوں نے ضیا کی شکایت لگاتے ہوئے میری ایک ڈیوٹی لگائی تھی کہ میں ضیا کو دن ویٹنگ جیسے خطرناک کھیل سے روکوں اور پھر ون ویٹنگ کرتے ہوئے پیش آئے حادثہ کے وقت میں ہی تو اس کے ہمراہ موجود تھا اس سے پہلے کہ میں اسے ایسا کرنے سے روکتا ضیا کو حادثہ پیش آچکا تھا۔

اب جس جگہ میں دیوار سے لگا کھڑا تھا اس جگہ دیوار کے مخالف سمت میرے مین بالکل سامنے اسلامک کیلی گرائی کا ایک کافی بڑا فن پارہ نصب تھا جس پر اسماء الحسنیٰ اور اسماء محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہایت خوب صورتی سے لکھے گئے تھے اللہ تعالیٰ اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر صفاتی نام کی نسبت اور تاثیر کی مناسبت سے مختلف رنگوں کا استعمال اس فن پارے کو بنانے والے کے دل میں اللہ اور اس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے بے پناہ عشق کا ثبوت تھا۔ وہی کھڑے کھڑے

نہ جانے کیسے میرے دل میں اس آرٹ کو سیکھنے کی خواہش نے جنم لیا اور میں سوچنے لگا کہ جب ضیا اچھا ہو جائے گا اور مجھے فرصت کہ کچھ لمحے میسر آئیں گے تو میں اسلامک کیلی گرائی کے اس فن کو ضرور سیکھوں گا اور ساتھ ہی ساتھ میں اسماء الحسنیٰ اور اسماء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ورد کرتے ہوئے ضیا کی صحت یابی کے لیے دعا کرنے لگا۔ بالآخر ایک طویل آپریشن کے بعد جب آپریشن تھیمز کی لال بتی اچانک بجھی تو ڈاکٹر کو باہر آتا دیکھ کر سبھی جو بیٹھے تھے وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور اگلے ہی لمحے ڈاکٹر کی زبانی یہ الفاظ سن کر کہ ضیا اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا وارڈ چیف وپکار سے گونج اٹھا عین اس لمحے مجھے لگا اتر میں نے دیوار کا سہارا نہ لیا تو میں اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو پاؤں گا میں دیوار سے پیشانی ٹکائے بے بسی سے روتا رہا میرے عقب میں ضیا کے ماں ابا، دادی اور خود میرے گھر والوں کا بھی یہی عالم تھا ضیا ایک ہی پل میں ہم سے پھڑک کر عالم برزخ میں جا پہنچا تھا جہاں سے پھر پلٹ کر کوئی نہیں آتا ہم چاہے کتنا ہی روپیٹ لیں گئی کئی روز تک ان کو یاد کرتے کھانا پینا چھوڑ دیں ہمیں اسے خالق کی رضا بارضا ہی ہونا پڑتا ہے۔

ضیا سے چھڑنا میرے لیے اس لیے قدر شدید صدمہ تھا کہ پھر کئی روز تک میں نے خود کو گھر میں ہی قید کر لیا تھا۔

ایک روز مجھے راحت کی کال آئی وہ بھی ضیا کی اچانک ہوئی موت پر بے حد غم زدہ تھی اور اب مجھ سے ملنا چاہتی تھی اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ وہ مجھ سے ملنے میرے گھر آ رہی ہے۔

چچا مرزا کی بات سن کر میں ایک دم سے

خیالوں کے دائرے سے پلٹنا اور با آواز بلند مجھ پر ہی برس رہے تھے۔

”یہ کیا بتائے گا لڑکی کہاں ہے کبھی کسی چور نے بھی اپنی چوری قبول کی ہے لڑکی اگر گھر میں آئی ہے تو اسے ہم خود ہی کھول لیں گے۔ چلو عبدالقادر اور مائیکل تم بھی میرے ساتھ چلو۔“ چچا اتنا کہہ کر آگے کمرے کی جانب بڑھ گئے اور بڑے ابا غصے کے عالم میں مجھے خستہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے جب ماں میرے پاس آتے ہی بولی۔

”ظہ یہ سب کیا ہو رہا ہے میں یہ سب کیا دیکھ رہی ہوں بیٹا؟“ ماں حیرت زدہ ہی میرے قریب آ کر مجھ سے سوال کر رہی تھی۔ جانے یہ مرزا کیوں میرے اور میرے بچوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ مجھے ٹھوکا سا لگا کر اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھ گئے اور اب ہم دونوں باپ بیٹا چچا مرزا کے پیچھے ہو لیے ہمارے ان تک پہنچنے تک وہ ایک کمرے کا معائنہ کر چکے تھے اور پھر وہ بابا عبدالقادر اور مائیکل کو کچھ ہدایات دیتے ہوئے میرے کمرے کی جانب بڑے انہیں اپنے کمرے کی جانب بڑھتا دیکھ کر میں نے اپنے ابا کی جانب دیکھا وہ میرا چہرہ دیکھتے ہی سارا معاملہ سمجھ گئے تھے وہ چچا کو میرے کمرے میں جانے سے روکنے کے لیے آگے بڑھتے ہوئے چچا سے مخاطب تھے۔

”رک جاؤ مرزا۔“ لیکن ابا کے انہیں آواز دینے تک وہ میرے کمرے میں داخل ہو چکے تھے ابا نے بابا عبدالقادر اور مائیکل کو باہر ہی رکنے کا اشارہ کیا اور پھر چچا کے پیچھے ہی میں اور ابا بھی کمرے میں پہنچ گئے چچا نے ابھی ایک پردہ بنایا

ہی تھا جب وہ ابا کی آواز پر وہی رک گئے۔

”مرزا یہ سب تم بہت غلط کر رہے ہو۔ کیا ظہ یا مصطفیٰ تمہارے بچوں جیسے نہیں۔“ چچا مرزا جو ابا کی بات سن کر رک گئے تھے اور جو غصے سے بے قابو ہو رہے تھے۔ انہوں نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور خستہ نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔

”میرے بچوں جیسے ہیں اسی لیے تو انہیں سزا دینا چاہتا ہوں کہ کہیں یہ تم جیسے نہ ہو جائیں خورشید عالم۔“ چچا اتنا کہہ کر غصے سے ہاتھ ملتے باہر نکل گئے اور ابا کچھ دیر تک ساکت کھڑے چچا کی بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے رہے اتنے میں، میں نے راحت کو باہر آنے کو کہا اور وہ ہمارے عقبی جانب لگے پردے کے پیچھے سے باہر چلی آئی۔ ابا نے اسے دیکھتے ہی جیسے اپنا مزاج درست کیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے پیار دیتے ہوئے تسلی دینے لگے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اس کے گھر چھوڑ کر آئیں گے۔

ابھی ابا وہاں کھڑے اسے تسلی دے ہی رہے تھے کہ جب ماں بھی ہمارے تعاقب میں میرے کمرے تک آ پہنچی اور پھر جیسے وہ ایک بار پھر سے میرے اور ابا کے درمیان کالا عبا یا پہنے کھڑی راحت کو دیکھ کر ششدر سی ہو کر رہ گئی راحت نے انہیں سلام کیا تو جیسے انہیں یقین آیا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہی بلکہ ان کے سامنے واقعی ہی چوہدری عبدالغنی کی بیٹی راحت عبدالغنی کھڑی تھی۔

اسے دیکھتے ہی ماں سارا ہی کھیل سمجھ چکی تھی۔

بڑے ابا کے شدید غصے سے بھرے کلمات، چچا مرزا کی سارے گھر میں چھان بین اب یہ راز ان پر عیاں ہو چکا تھا پچھلے کئی لمحوں سے وہ باہر لگی پگھری میں کھڑی جو کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی اب وہ

منے گھر آئیں گے۔

گازی واپس موڑتے ہوئے اپنے گھر پہنچنے تک ابا نے جو بھی باتیں مجھ سے کیں ان باتوں نے ساری ہی رات مجھے جگائے رکھا میرے ابا کی انہی باتوں کی وجہ سے ان لمحوں کو بھی بھول گیا تھا جب بڑے ابا اور چچا مرزا مجھے خطا اور ثابت کرنے کی کوشش میں لگے تھے اور چچا تو واقعتاً ایسا کر گزرتے اگر ابا ان کے تعاقب میں میرے کمرے میں پہنچ کر انہیں روکتے نا اور میرے وہی بے حد اچھے ابا راحت کو اس کے گھر پہنچا کر راستہ میں مجھ سے دریافت کرنے لگے کہ اگر ان کا بیٹا اور راحت ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں تو پھر وہ چوہدری عبدالغنی سے ان کی بیٹی کا ہاتھ اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیتے ہیں۔“

ابا کی یہ بات سن کر چند لمحوں تک تو مجھے اپنی سماعت پر ہی یقین نہیں آیا کہ میرے ابا جو چوہدری عبدالغنی کے سیاسی حریف تھے وہ اتنی بات کہہ سکتے تھے کہ وہ خود چوہدری عبدالغنی کے گھر جا کر اپنے بیٹے کے لیے ان کی دختر کا ہاتھ مانگیں گے پھر راستہ بھر ابا اور میں اسی موضوع پر بات کرتے تھے اور اب اپنے کمرے میں پہنچ کر یہی سوچتے ہوئے جیسے میری ذہن ہی اڑ چکی تھی ابھی تو فقط ابا نے مجھ سے اس سلسلے میں بات ہی کی تھی لیکن میں جیسے ابھی سے راحت کو پالنے کی خوشی میں پھولے نہ سمارا تھا۔ جب ایک دم سے مجھے ضیا کا خیال آ گیا آج اگر وہ زندہ ہوتا تو اسے یہ سن کر کتنی خوشی ہوتی ضیا کا خیال آتے ہی میں مضطرب سا ہو کر اس کی مغفرت کے لیے سوہنے رب کے حضور دعائیں کرنے لگا۔

اگلے روز صبح سویرے ہی ماں میرے کمرے

عقدہ ان پر کھل چکا تھا میں نے اور ابا نے انہیں اس بات سے بے خبر رکھا تھا اس بات کو محسوس کرتے ہوئے ماں جیسے کمرے میں داخل ہوئی تھی اب راحت کو میرے اور ابا کے ساتھ کمرے میں موجود پا کر لائے پیروں لوٹ گئی۔ ماں کے راحت سے بات کیے بغیر باہر نکل جانے پر راحت نے حیرت سے میری جانب دیکھا وہ تو فقط مجھ سے میرا حال دریافت کرنے آئی تھی اور پھر اس کے میرے کمرے میں آتے ہی میں نے پہلے اسے پردے کے پیچھے چھپا دیا پھر دیر تک وہ وہیں چھپی میرے لوٹنے کا انتظار کرتی رہی پھر چچا مرزا جو اسے ڈھونڈتے کمرے میں آ پہنچے تھے وہ باتیں بھی اس نے سن لی تھیں اور اب ماں کا رویہ بھی اسے عجب لگ رہا تھا لیکن اس سے پہلے جب سبھی میرے مخالف ہو گئے تھے۔ میرے ابا نے جو میرا ساتھ دیا تھا اور بڑے ابا کی نگاہ میں مجھے کرنے سے بچا لیا تھا۔ میں ان کا یہ احساس بھی نہیں بھول سکتا تھا چاہے اس وقت میرا ساتھ دینے کے پیچھے ان کے کتنے ہی مفاد چھپے تھے لیکن اس سب کے باوجود ان کا وقار میری نظر میں بہت بڑھ گیا تھا پھر ابا کچھ دیر تک مجھے اور راحت کو کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں جب وہ لوٹے تو انہوں نے مجھے اور راحت کو اپنے ساتھ باہر آنے کو کہا باہر پورج میں آنے تک میں نے دیکھا ابا نے ساری ہی بتیاں بکھا دی تھیں پھر وہ خود ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اور انہوں نے گازی چوہدری عبدالغنی کے گھر سے ذرا پہلے ہی روک دی راحت گازی سے اتر کر مجھے اور ابا کو گھر چلنے کے لیے اصرار کرتی رہی لیکن اب اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دیتے ہوئے بولے کہ وہ جلد ہی اس سے

بات کرنے گئے تھے کہ وہ چوہدری عبدالغنی کے ہاں طے کے لیے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے جانا چاہتے ہیں پھر ماں میرے ساتھ شادی کی تیاری تک کی باتیں کر کے چلی گئی اور میں اپنے بستر پر پڑا سوچنے لگا کہ جب میرے ابا خورشید عالم بڑے ابا سے میرے اور راحت کے رشتے والی بات کریں گے تو کیا وہ اس رشتے پر راضی ہوں گے یہ خیال ذہن میں اٹھتے ہی اب میں مجب سیمائی کیفیت میں مبتلا ہو رہا تھا ایک رات پہلے میں نے بڑے ابا کو کس قدر شہید غصے میں دیکھا تھا جب کسی نے انہیں یہ اطلاع کر دی تھی کہ چوہدری عبدالغنی کی بیٹی چوری چھپے ان کے پوتے سے ملنے ان کے گھر موجود تھی لیکن پھر میرے ابا خورشید عالم کی مداخلت پر وہ یہ ثابت نہیں کر پائے تھے کہ راحت واقعتاً گھر میں موجود تھی یا نہیں اور پھر یہ سوچ کر مجھے کچھ سکون ملا اور ساتھ ہی میں دعائیں کرنے لگا کہ یا اللہ میرے بڑے ابا کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ ہو کیونکہ ایک وہی تھے جن کے راضی ہونے پر بات آگے بڑھ سکتی تھی تھوڑی دیر تک میں یونہی خیالوں میں مگن بستر پر پڑا رہا اور پھر بستر سے نکل کر تازہ دم ہو کر میں نے اپنے کمرے سے ایک قدم باہر رکھا ہی تھا کہ جب میں نے دیکھا ابا میری طرف ہی بڑھ چلے آ رہے تھے انہوں نے قریب آتے ہی مجھے اپنے گئے سے لگا لیا وہ بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے انہی کی زبانی مجھے معلوم پڑا کہ بڑے ابا کو میرے اور راحت کے رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ انہیں تو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی تھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی جوان اولاد غلط راہ پر چل نکلے ابا یہ خوش خبری سنا کر چلے گئے اور میں جو یہ خوش خبری سن کر پھولے نہ مارا تھا مجھے ایک بار پھر اپنے

میں آئی وہ جو رات غصے کے عالم میں راحت سے ملے بغیر ہی کمرے سے چلی گئی تھی۔ اب یکسر بدلی ہوئی لگ رہے تھی۔ وہ کمرے میں پہنچتے ہی پہلے مجھے یوں پیار سے جگانے لگی جیسے میرے بچپن کی ہر صبح وہ میری پیشانی چوم کر مجھے جگانا کرتی تھی۔ میں نے جاگتے ہی اپنا سر ماں کی گود میں رکھ دیا اور وہ پیار سے میرے بال سہلاتے ہوئے بولی۔

”میرا بیٹا اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اب وہ مجھ سے اپنی باتیں بھی چھپانے لگا ہے۔“ میں ماں کی بات کا مفہوم سمجھ چکا تھا کہ وہ مجھ سے کس بات کے چھپانے کا شکوہ کر رہی تھی بس میں کچھ دیر تک یونہی خاموش رہا اور پھر بولا۔

”ماں میں نے آپ کو راحت سے ملوایا تھا جب ضیا اسپتال میں تھا وہ اس سے ملنے آئی تھی وہیں آپ اور ابا کو میں نے راحت سے ملوایا تھا۔“ میری یہ بات سنتے ہی ماں جھٹ سے بولی۔

”ہاں بیٹا جی یاد ہے مجھے تم نے اسے اپنے ابا کو اس سے ضرور ملوایا تھا اور ہمیں پوچھے بنا ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ راحت تمہارے ساتھ اکیڈمی میں پڑھتی ہے۔“ اور پھر اگلی بات کہنے سے پہلے ماں نے میرے گال پر اپنے ہاتھ سے ایک چپت لگائی اور بولی۔

”بیٹا جی آپ نے یہ بات تو ہم سے چھپائے ہی رکھی کہ آپ اور راحت ایک دوسرے سے بے پناہ محبت بھی کرتے ہیں۔“ ماں کی یہ بات سن کر میں شرمناک ماں کی گود میں اور بھی سمٹ گیا تھا۔ جب اگلی بات سن کر میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں ماں کی گود میں سر رکھے یونہی پڑا رہوں اور ماں میرے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولتی رہی۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ میرے ابا، بڑے ابا سے اس سلسلے میں ہی

دوست ضیا کا خیال آ گیا اور میں وہیں سے اگلے بیروں اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔

اگلے روز جب ماں، مصطفیٰ عالم ابا اور بڑے ابا چوہدری عبدالغنی کے ہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے عین وقت پر چچا مرزا نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ چچی جو ابھی ابھی اپنے کمرے سے تیار ہو کر باہر آئی تھی وہ بھی چچا کا انکار سن کر حیرت زدہ سی رہ گئی کہ اچانک سے یہ انہیں کیا ہو گیا تھا وہ بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ باقی سب جاتے ہیں تو جائیں لیکن وہ نہیں جائیں گے بلکہ وہ بڑے ابا کو بھی ساتھ جانے سے روکتے رہے پھر میرے ابا کے استفسار پر کہ وہ ان کے ہمراہ کیوں نہیں جانا چاہتے انہوں نے تلخ کلامی سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ چوہدری عبدالغنی بھی اس رشتے کو قبول نہیں کریں گے اور وہ وہاں جا کر اپنی بے عزتی نہیں کرانا چاہتے۔ اس سے پہلے کہ چچا کے ایسے جواب کا میرے ابا کوئی جواب دیتے بڑے ابا نے انہیں اشارہ کیا ایسا کرنے سے روک دیا اور پھر وہ ابا سے کہنے لگے کہ اگر مرزا نہیں جانا چاہتا تو یہ ان کا اپنا فعل ہے وہ خاندان بھر کی خوشیوں میں اگر شریک نہیں ہونا چاہتا تو نہ ہو ہم کسی کے ساتھ کوئی زور زبردستی کا معاملہ نہیں رکھیں گے اگر چوہدری عبدالغنی اس رشتے سے انکار کرنا چاہتے تو پھر وہ ہمیں گھر بلاتے ہی کیوں، وہیں کھڑے کھڑے پچانے بڑے ابا کی یہ باتیں سن کر چچا کو اشارہ کیا اور پھر وہ ساتھ چلنے کے لیے راضی ہو گئے یہ دیکھ کر ماں، ابا، بڑے بھائی، مصطفیٰ عالم اور بڑے ابا ہم سبھی خوش ہو گئے کہ ایسے موقع پر سب کو ایک ساتھ ہی ہونا چاہیے تھا۔

جب سبھی چوہدری عبدالغنی کے ہاں بات طے

کرنے کو چلے گئے تو میں اب گھر پر تنہا ہی تھا اور میرا وقت گزارنا بے حد دشوار ہو رہا تھا میں نے راحت سے گپ شپ لگانے کو جو کال کی تو چند ایک باتوں کے بعد اس نے بھی یہ کہہ کر کال کاٹ دی کہ وہ بے حد مصروف ہے یوں وہ ایک ایک پل میں نے گن گن کر گزارا اور پھر جو رات گئے سبھی واپس لوٹے تو مبارک باد یوں اور بیٹھے بیٹھے قہقہوں سے ساری حویلی جھوم اٹھی۔ چوہدری عبدالغنی نے مہمان نوازی اور خاطر مدارت میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی چچی اور چچا مرزا جن کو ہمراہ لے جاتے ہوئے کچھ تلخ کلامی بھی ہو گئی تھی اب گاڑی سے اترتے ہی انہوں نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے مبارک باد دی تو حویلی کے کسی کونے میں دیکھی بیٹھی چچا مرزا کی دونوں صاحبزادیاں آمنہ اور یومنہ بھی یہاں آوازیں سن کر وہاں پہنچ گئیں یومنہ تو اس وقت بہت چھوٹی تھی آمنہ نے بھی مجھے مبارک باد دی۔ وہ بھی بہت خوش لگ رہی تھی اور جب میں نے ماں سے مصطفیٰ کی رسم کے حوالے سے دریافت کیا تو گویا انہوں نے مجھے یہی بتا کر حیران کر دیا کہ ابھی تو چوہدری عبدالغنی نے سوچنے کے لیے کچھ مہلت طلب کی تھی لیکن ساتھ ہی وہ مجھے بتانے لگی کہ سبھی وہاں دونوں خاندانوں کے جڑنے سے اتنا خوش تھے کہ سمجھو کہ رشتہ تو پکا ہو ہی چکا ہے پھر ان کی یہ بات سن کر مجھے کچھ تسلی ہوئی۔

اگلے روز یہ خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی میرے وہ دوست جن سے ابھی میں نے راحت کا ذکر تک نہ کیا تھا وہ بھی مجھے کال کر کے مبارک باد دے رہے تھے باہر طرح طرح کے تبصرے ہو رہے تھے کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہ تھا اور کوئی اس فیصلے کو

سبھی کو اپنے پاس طلب کر لیا مجھ سمیت سبھی کا خیال یہی تھا کہ شاید بڑے ابا چچا مرزا اور خورشید عالم کے درمیان چل رہی رخصت کو منانے اور دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے سبھی کو اکٹھا کر رہے تھے لیکن جب سبھی وہاں جمع ہو گئے تو بڑے ابا نے نہایت افسوس کے ساتھ یہ بات بتائی کہ چوہدری عبدالغنی نے اپنی بیٹی کا ہاتھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ بڑے ابا کی زبانی یہ بات سن کر مجھ سمیت سبھی نے تاسف سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا جیسے انہیں بھی میری طرح اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا پھر بڑے ابا ذرا تفصیل سے بتانے لگے کہ چوہدری عبدالغنی نے فون پر ان سے رابطہ کیا اور بتایا کہ انہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا لیکن اب وہ مجبور تھے انہوں نے جب اپنے خاندان والوں سے بات کی تو انہوں نے اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ اپنے خاندان کے خلاف نہیں جانا چاہتے تھے بڑے ابا بھی یہ ساری تفصیل بتا رہی رہے تھے کہ جب چچا مرزا اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اور ڈھول پینتے پھر سارے شہر میں کہ ہم لوگوں نے چوہدری عبدالغنی کے ہاں رشتہ پکا کر لیا ہے۔“ وہ عجیب محکمہ خیر انداز میں بات کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

(بائی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

⑤

درست قرار دے رہا تھا۔ کئی جوار یوں نے تو جوا لگا دیا تھا اور میں ابھی تک نہیں جانتا تھا کہ جیت کے ملنے والی تھی ہارنے والا کون تھا میں تو فقط اس نشے میں ڈوبا مست ہوا رہتا تھا کہ راحت میری ہونے جا رہی تھی میری پہلی چاہت میرا اسکھ چین راحت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری ہو رہی تھی۔

ابھی اس بات کو چند روز ہی بیتے تھے کہ گھر میں پھر ایک نیا فساد برپا ہو گیا میرے ابا خورشید عالم اور چچا مرزا کے درمیان پھر سے جھگڑا شروع ہو گیا تھا اور اس جھگڑے کی شروعات وہاں سے ہوئی جب چچا مرزا نے بڑے ابا سے آمنہ اور میرے بڑے بھائی مصطفیٰ عالم کے رشتے والی بات کی وہ چاہتے تھے کہ اگر میرے ابا نے میرا رشتہ خاندان سے باہر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو پھر اپنے بڑے بیٹے مصطفیٰ عالم کے لیے ان کی بیٹی آمنہ کا رشتہ قبول کر لیں اور جب طہ کی منگنی ہو تو پھر ساتھ ہی ان کی بیٹی اور مصطفیٰ عالم کی منگنی بھی ایک ساتھ ہو جائے لیکن جب بڑے ابا نے چچا مرزا کی خواہش ابا کو بتائی تو ماں نے ابا سے یہ بات سن کر فوراً ہی اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا وہ چاہتی تھی کہ ان کا بیٹا جو ایم فل کر رہا تھا پہلے اپنی تعلیم مکمل کرے تو پھر وہ اس کی شادی کے حوالے سے سوچیں گے لیکن ماں کی کہی یہ بات فقط رشتے کو ٹالنے کا ایک جواز تھا درحقیقت تو اس رشتے سے انکار کی وجہ آمنہ کی تعلیم تھی وہ ایف اے کے بعد تعلیم چھوڑ چکی تھی اور یوں چچا یہ انکار برداشت نہ کر سکے تھے انہوں نے پھر سے جائیداد کا مطالبہ اٹھالیا۔

میرے ابا اور چچا مرزا کے درمیان ابھی یہ سرد جنگ جاری ہی تھی کہ جب ایک روز بڑے ابا نے

لائسنس آف افغانستان

زرین قمر

زرین قمر کا نام نئے افغان قارئین کے لیے نیا نہیں ہے۔ آپ اکثر ان کی کہانیاں پڑھتے ہیں۔ چڑیا کا گھونسلہ، ادھورا خواب، انجانے فیصلے، بددعا، غزہ کی سسکیاں اور پناہ گزین جیسی ان کی متعدد لازوال کہانیاں رسالے کی زینت بن چکی ہیں۔ وہ ہر موزوں پر قلم اٹھانے کی قدرت رکھتی ہیں۔ ان کے کردار ہمیں اپنے معاشرے میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ سیاسی کرائم نمبر کے لیے اس بار انہوں نے بطور خاص افغانستان کے سیاسی پس منظر کو اپنا موزوں قلم بنایا ہے۔ ایک امریکی فوجی کمانڈر کا احوال، جسے عراق سے براہ راست بلا کر افغانستان میں تعینات کیا گیا تھا تاکہ افغان جنگ جو امریکا کے ہاتھ سے نکل رہی تھی اس پر اپنی گرفت مضبوط کی جائے، لیکن وہ ایک جنگی رپورٹر کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔

سرخ و سفید رنگت، بھورے بال، ملکہ سرمئی رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس ایک براؤن کلرنگی بڑی سی چادر کا اندھوں پر ڈالنے ہاتھوں میں کلاشنکوف پکڑے وہ بڑی پھرتی سے ایک پہاڑی کی اوٹ سے نکل کر دوسری پہاڑی کے پیچھے روپوش ہو گیا تھا۔ اس نے میٹھلے کے اوپر جو واسکٹ پہنی ہوئی تھی اس میں بہت سی بیٹریں تھیں جن میں گولیاں بھری تھیں۔ اس کے علاوہ اس کی واسکٹ کے ساتھ ہینڈس کی پیٹیاں بھی لٹک رہی تھیں اس کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت جھمک رہی تھی اس نے پشاور کی چپل اور پشاور کی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں موزے اور چہرے پر داڑھی تھی، پہلی نظر میں وہ کوئی مقامی افغان لگتا تھا لیکن دراصل یہ امریکی فوج کا بہادر کمانڈر نیم گینٹ تھا جسے عراق سے براہ راست بلا کر افغانستان میں تعینات کیا گیا تھا تاکہ افغان جنگ جو امریکا کے ہاتھ سے نکل رہی تھی اس پر اپنی گرفت مضبوط کی جائے اور نیم گینٹ کو اس کی ضمانت سمجھا رہا تھا کہ وہ امریکی فوجیوں کے لیے افغانستان میں سازگار فضا پیدا کر لے گا، اس نے عراق میں بھی بڑے کارنامے سرانجام دیئے تھے اور ”بہادری“ کے کئی تمغے حاصل کیے تھے۔ اس کی چال میں چیتے جیسی پھرتی

آنکھوں میں مومڑی جیسی عیاری تھی اور اس کا ذہن منصوبے بنانے اور دشمن کے خلاف جال بننے میں ماہر تھا اس نے افغانستان آتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہر حالت میں اس ہاری ہوئی جنگ کو امریکا کی فتح میں تبدیل کر دے گا اور اس کے لیے اس نے سب سے پہلے قدم یہ اٹھایا تھا کہ افغانستان میں آتے ہی اپنا حلیہ تبدیل کر دیا تھا اور مقامی لوگوں جیسا لباس اور حلیہ بنایا تھا اسے جو فوجی دیئے گئے تھے وہ امریکا سے حال ہی میں بھجوائے گئے تھے جو کم عمر اور نہ تجربہ کار تھے اور گینٹ نے انہیں تربیت دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کام میں اس کا ایک دوست پیٹر یو اس کے ساتھ تھا جو امریکی آرمی میں کمانڈر کے عہدے پر فائز تھا اور افغانستان میں خدمات انجام دے رہا تھا۔ اسی کی درخواست پر گینٹ کو عراق سے افغانستان بلا یا گیا تھا کیونکہ گینٹ کے بہادری کے کارنامے پیٹر یو کے پاس پہنچ چکے تھے اور اس نے گینٹ سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گینٹ پھر فائرنگ کرتا ہوا پہاڑی کی اوٹ سے نکلا، تھا اور تیزی سے بھاگتا ہوا آچھو فاصلے پر لگی جھار یوں میں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے ارد گرد پہاڑیوں میں اس کے ساتھی بھی اسلحہ سے لیس موجود تھے اس وقت ان

کا مقابلہ دور پہاڑیوں میں چھپے طالبان سے ہو رہا تھا۔ گینٹ اپنی فوجی اصطلاح میں اپنے ساتھیوں کو ہدایت بھی دیتا جا رہا تھا۔

اس نے ایک مخصوص سمت اشارہ کر کے اپنے ایک فوجی کو فائرنگ کا آرڈر دیا اور اس فوجی نے اس سمت نشانہ لے کر فائرنگ کر دی۔ اس سمت سے آتی ہوئی گولیاں کچھ دیر کے لیے رک گئی تھیں۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دوسری طرف سے فائرنگ کرنے والا یا تو زخمی ہو گیا ہے یا اپنی پوزیشن بدل چکا تھا۔

تیم گینٹ کا طالبان سے یہ مقابلہ ایک جنگی مقابلہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسے فوجیوں کی ٹریننگ بھی تھی۔ وہ انہیں راتوں رات ٹرینڈ کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے جن حالات کا سامنا تھا اس میں اس کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ وہ الگ سے وقت دے کر انہیں تربیت دے اسے تو ہر وقت دشمن کا سامنا تھا۔

”تمہیں عراق سے آئے ہوئے ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا ہے۔“ اس کے دوست پیٹیرو نے ایک دن اس سے کہا۔ ”اور تم نے اپنا حلیہ بالکل مقامی لوگوں جیسا بنالیا ہے آ خر تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟“

”میں چاہتا ہوں کہ طالبان مجھے مقامی باشندہ سمجھیں۔“ گینٹ نے جواب دیا۔

”لیکن طالبان اتنے احمق نہیں کہ انہیں یہاں ہماری موجودگی کا احساس نہ ہو صرف حلیہ بدل لینے سے ہم افغان نہیں بن سکتے۔“ پیٹیرو نے کہا۔

”میں جانتا ہوں ابھی اس سلسلے میں بہت کام کرنا ہے۔“ گینٹ نے کہا۔

”لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ ان باتوں میں وقت ضائع کریں۔ ہمیں ہر وقت دشمن کا سامنا ہے۔“ پیٹیرو نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”میں جانتا ہوں اور کسی چیز سے بے خبر نہیں ہوں جب مجھے یہاں بھیجا گیا ہے تو میں اپنے افسروں کی امید پر پورا اتروں گا اور انہیں مایوس نہیں کروں گا۔“

دراصل میرا کام کرنے کا طریقہ بہت مختلف ہے۔“ تیم گینٹ نے اسے سمجھایا۔

”تمہیں جو فوجی دیئے گئے ہیں وہ بھی نا تجربے کار ہیں تم یہ جنگ کیسے جیتو گے؟“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو بس جیسے میں کہتا جاؤں ویسے کرتے جاؤ میرا طریقہ کار مختلف ہے اور میں اپنے اس طریقے کی مدد سے سب کر لوں گا اور سب کو حیران کر دوں گا۔“ گینٹ نے کہا اور واقعی اس نے بہت کم مہر سے میں ان نا تجربہ کار فوجیوں کو تربیت دے کر اپنی مرضی کے مطابق تیار کر لیا تھا۔ اس نے ان سب کو فوجی وردیوں کے بجائے مقامی لباس پہنا دیا تھا اور یہی نہیں بلکہ ان کو مقامی زبان بھی سکھائی خود بھی سیکھی تھی اور وہ بات کرنے کے لیے زیادہ تر مقامی لوگوں سے ان ہی کی زبان میں بات کرتے تھے ان کا اٹھنا بیٹھنا ان کی بول چال ان کا پہننا اور چھنا سب کچھ مقامی لوگوں جیسا تھا اور دور سے انہیں دیکھ کر کوئی بھی دھوکا کھا جاتا تھا۔

پہاڑیوں میں طالبان سے ان کی جھڑپیں معمول کی بات تھیں۔ اس روز بھی کچھ دیر کی جھڑپ کے بعد وہ خاموشی سے اپنے فوجی بیس میں واپس آ گئے تھے۔ ان کا یہ فوجی بیس چاروں طرف سے اونچی اونچی پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ یہ جگہ کونا دروہا کے کنارے واقع تھی اور کونز صوبے کا حصہ تھی جو پاکستان کے بارڈر کے ساتھ واقع تھا اور افغانستان کی خطرناک ترین پوسٹوں میں سے تھا اور مشرقی افغانستان میں واقع تھا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں کسی مقامی اہم شخصیت سے تعلقات پیدا کیے جائیں۔ ایک شام گینٹ نے اپنے دوست کمانڈر پیٹیرو سے کہا تو وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”اس طرح ہمیں اپنے کام میں ان کی مدد حاصل ہو جائے گی۔“ گینٹ نے جواب دیا۔

”بھلا وہ ہماری مدد کیوں کریں گے؟“

سرگرم ہے۔ اس طرح پہلے تو کسی نے مجھ تک یوں رسائی کی کوشش نہیں کی۔ ”نور افضل نے تنقیدی نظروں سے گھٹت کو دیکھتے ہوئے براہ راست سوال داغ دیا۔ وہ ایک دوسرے سے مصافحہ کرنے کے بعد زمین پر بچھے قلابین پر بیٹھ گئے تھے جس کے چاروں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ گاؤں تکے لگے ہوئے تھے اور کمرے کے وسط میں دیوار کے ساتھ ساتھ ایک بنگلہ بچھا ہوا تھا جس پر افغان طرز کا بستر تھا نور افضل اس پر ہی بیٹھا ہوا تھا اس کے سامنے گھٹت اور پیٹریو کے ساتھ فرش پر بیٹھے ہوئے تھے اور اپنے سردار کی باتوں پر آہستہ آہستہ سر ہلاتے جا رہے تھے۔

”ہاں تم درست کہہ رہے ہو۔“ گھٹت نے کہا۔ اس نے افغانستان آنے کے بعد جلد ہی مقامی زبان سیکھ لی تھی کیونکہ اسے جس انداز سے کام کرنا تھا یہ اس کا ایک ضروری حصہ تھا۔ چنانچہ وہ اس وقت نور افضل سے افغانی میں بات کر رہا تھا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ اس سے پہلے کسی نے تم سے اس طرح رابطہ نہیں کیا لیکن ان کا طریقہ کار مختلف تھا۔ میں جہاں جاتا ہوں وہاں کے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہوں۔“ گھٹت نے دل کی بات کہہ دی اور نور افضل چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا مطلب؟ کیا تم اپنی اس بات کی وضاحت کر دو گے؟“

”میرا مطلب یہ ہے کہ میں یہاں تمہارے یا تمہاری قوم کے خلاف لڑنے نہیں آیا یہاں پر یہی تصور لیا جاتا ہے کہ امریکی فوجیں افغانستان میں اپنی برتری جماتے آتی ہیں یا وہ یہاں پر قبضہ کرنا چاہتی تھیں۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔“ گھٹت نے وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی وہ سوچتا جا رہا تھا کہ اپنی بات کی وضاحت کس طرح کرے کہ اسے نور افضل کی مدد بھی حاصل ہو جائے اور امریکی فوج پر لگا ہوا چارہ داری کا ایک دھبہ بھی مٹ جائے۔

”کیونکہ ہم ان کے دوست بن جائیں گے۔“ گھٹت نے مسکراتے ہوئے کہا وہ آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل کو سہلار ہاتھا۔

”لیکن تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ مسلمان کسی کے دوست نہیں ہوتے وہ کسی دوسرے مسلمان کے مقابلے میں ہماری مدد نہیں کریں گے۔“ کمانڈر پیٹریو نے یقین سے کہا۔

”تم درست کہہ رہے ہو لیکن تم دیکھتے جاؤ میں جس طریقے سے ان کے قریب ہوں گا اور جو کچھ ان سے کہوں گا وہ میری مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔“ اس بار گھٹت کے لہجے میں پیٹریو سے زیادہ یقین جھٹک رہا تھا۔

”تمہاری بات پر مجھے یقین نہیں ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا کہ میں تمہاری مدد کر سکوں اور کسی اہم شخصیت سے رابطے میں آ جاؤں۔“ کمانڈر پیٹریو نے کہا۔

پھر چند ہی روز میں پیٹریو نے اسے خوش خبری سنائی تھی کہ افغانستان کے مہمند قبیلے کے سردار نور افضل تک رسائی ہوئی ہے وہ اس علاقے کا بہادر ترین سردار ہے اور اسے سینکڑوں مل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پھر گھٹت نے اس سے ملنے میں دیر نہیں کی تھی وہ اپنی وردی کے بجائے مقامی لباس میں ہی اس سے ملنے گیا تھا جب وہ اپنے دوست کمانڈر پیٹریو کے ساتھ نور افضل کے ڈیرے پر پہنچا تو اسے اپنا منتظر پایا تھا۔ نور افضل نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا تھا لیکن اس کے چہرے پر کچھ بے چینی سی تھی اور اس کی آنکھیں بار بار کمانڈر گھٹت کا تنقیدی جائزہ لے رہی تھیں۔ نور افضل کے ڈیرے پر اس کے کچھ قریبی دوست بھی موجود تھے جو اس قبیلے کے انتظامات میں اس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ نور افضل بہت محتاط انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ اس کے ڈیرے کے باہر اس کے اپنے مسلح افراد تعینات تھے جو بہت ہی چاق و چوبند تھے۔

”یو ایس آرمی تو 2001ء سے اس علاقے میں

دوں گا۔“ نور افضل نے کہا اور کمرے میں باادب کھڑے ایک شخص کو ہاتھ سے اشارہ کیا وہ فوراً ہی باہر چلا گیا اور چند لمحوں میں ان لوگوں کے سامنے دسترخوان بچھا کر کھانا رکھ دیا گیا تھا یہ خاص افغان کھانا تھا جس سے بہترین خوشبو میں اٹھ رہی تھیں۔ افغانوں نے اپنی مہمان نوازی کا ثبوت دے دیا تھا۔ گینٹ اور اس کے ساتھیوں نے سیر ہو کر کھانا کھایا تھا جس کے بعد انہیں گرم گرم تہو و پیش کیا گیا تھا۔

”میں آپ کے پاس پھر آؤں گا اور آپ کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات پر آپ کو مطمئن کرنے میں مجھے خوشی ہوگی۔“ گینٹ نے رخصت ہوتے ہوئے نور افضل سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں بھی امید کرتا ہوں کہ جیسا آپ نے کہا ہے ویسا ہی ہوگا۔“ نور افضل نے اپنی ہنسی سمرنی دازھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا جس کے بعد گینٹ پینیرو کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ ابھی اس کے ذہن میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے بہت سے پوائنٹ موجود تھے لیکن وہ تمام برف آیب ہی نشست میں حاصل نہیں کر سکتا تھا اور یہ مناسب بھی نہیں تھا۔ استا ہستہ ہستہ موقع کے حساب سے جب جب لوہا گرم ہوتا تھا اس پر چوٹ لگانا بھی تاکہ اس کے منصوبے کی ناکامی ممکن ہی نہ ہو اور اسے سو فیصد کامیابی نصیب ہووے جس مشن پر تھا اس پر ذرا سی بھی غلطی نہ صرف اس کے منصوبے کو فیل کر سکتی تھی بلکہ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی جان کو خطرہ بھی ہو سکتا تھا اس صورت میں اسے طالبان اور القاعدہ سے متعلقہ کے ساتھ ساتھ مقامی آبادی کا بھی سامنا کرنا پڑتا کیونکہ اگر انہیں یہ یقین ہو جاتا کہ وہ ان سے ہمدردی صرف اور صرف اس لیے حاصل کر رہا ہے کہ ان کی مخالفت سے بھی بچ جائے اور ان کی مدد بھی حاصل کر لے تو اس کا کام بہت مشکل ہو جاتا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا نور افضل تمہاری مدد

دیکھو! ہم سمجھتے ہیں کہ افغان مسلمانوں کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے یہاں القاعدہ اور طالبان کے دہشت گرد برسرِ پیکار ہیں اور افغان عوام ان تربیت یافتہ دہشت گردوں کا مقابلہ تنہا نہیں کر سکتے ہم لوگ آپ کی مدد کرنے آئے ہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“ گینٹ نے کہا اور نور افضل بے یقینی کے انداز سے اسے دیکھنے لگا۔

”یہ کیسے مان لوں کہ امریکا ہم سے ہمدردی رکھتا ہے۔“ نور افضل نے پوچھا۔

”اگر امریکا آپ کی مدد نہ کرنا چاہتا تو ہمیں یہاں کیوں بھیجا جاتا اور اس جنگ میں اتنا پیسہ اسلحہ اور فوجی کیوں لگائے جاتے۔ امریکی فوجیوں کی جانوں کو بھی خطرہ ہے یہاں۔ اب تک کتنے ہی امریکی فوجی مارے گئے ہیں یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔“ گینٹ نے وضاحت کی اور نور افضل سوچ میں پڑ گیا۔

”ہوں..... س..... اس نے سوچتے ہوئے کہا۔“

”اگر تمہاری بات کو درست مان لیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟“

”میں صرف اور صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ لوگ ہماری مدد کریں ہماری لڑائی صرف طالبان اور القاعدہ کے ساتھ ہے ہم آپ لوگوں کو ان سے تحفظ دلوانے آئے ہیں اور ان کا قلع قمع کرنے آئے ہیں۔ اس میں ہمیں آپ کی مدد درکار ہوگی۔“

”اس قسم کی مدد؟“ نور افضل نے پوچھا۔

”ویسے تو ہم خود بھی طالبان کے ساتھ جنگ میں مصروف ہیں اور ان کے ساتھ ہماری جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔“

”میں جانتا ہوں آپ کو آپ کے لوگوں نے Sitting Buld سیٹنگ بل کا لقب یونہی نہیں دیا۔ آپ بہت بہادر ہیں اور ان کا مقابلہ جو امرودی سے کرتے ہیں۔“ گینٹ نے نور افضل کی تعریف کی تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”ٹھیک ہے میں اس بارے میں سوچ کر جواب

کرنے کو تیار ہو جائے گا۔“ پیٹریو نے واپسی میں راستے میں اس سے پوچھا وہ دونوں اپنی فوجی جیب میں بیٹھے اپنے فوجی بیس کی طرف جا رہے تھے۔ رات کا وقت تھا اور جیب اپنی بیڈ لائٹس کی روشنی میں مابھوار زمین پر جھکولے کھائی آگے بڑھ رہی تھی اس وقت بھی فضا میں گرمی کی شدت کو محسوس کیا جاسکتا تھا جو سورج غروب ہونے کے بعد آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔

”ہاں مجھے امید ہے اگر اس میں ذرا بھی تسلس ہے تو وہ اس پیش کش کو ضرور قبول کرے گا۔“ گینٹ نے کہا۔

”لیکن ایسا وہ اس صورت میں ہی کرے گا جب اسے یہ یقین ہو جائے کہ ہم واقعی اس سے ہمدردی کر رہے ہیں۔“ پیٹریو نے کہا۔

”ہاں یہ یقین دلانے کے لیے ہمیں مواقع کا انتظار کرنا ہوگا اور ان سے فائدہ اٹھانا ہوگا اس کے لیے شاید ہمیں کچھ قربانیاں بھی دینا پڑیں۔“

”قربانیاں؟“ پیٹریو نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... میں اس کی وضاحت ابھی نہیں کر سکتا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے مواقع آئیں گے جب ہم انہیں اپنا ہمدرد بنا سکیں گے۔“ گینٹ نے کہا اور پیٹریو نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بے پروائی سے کانڈھے اچکائے اور جیب کی گھڑکی سے باہر اندھیرے میں دیکھنے لگا۔ گینٹ بھی خاموش ہو گیا تھا اور سگریٹ سلگا کر اس کے پلکے پلکے کش لگا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں اپنے مشن کو کامیاب کرنے کے منصوبے سر اٹھارے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ انہیں کیسے عملی جامہ پہنائے۔

کچھ ہی دیر میں وہ اپنے کیپ میں پہنچ گئے تھے۔

”اچھا گینٹ! صبح ملاقات ہوگی۔“ پیٹریو نے جیب سے اترتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا اور فوجی کیپ میں واقع اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ کیپ کے باہر اور اندر امریکی فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ گینٹ نے ایک جائزہ لیا اور پھر وہ بھی آہستہ آہستہ چلتا

ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

رات کا پچھلا پہرہ تھا۔ ہر طرف اندھیرا اور خاموشی تھی کبھی کبھی دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ جاتی تھیں یا پھر گشت کرتے ہوئے فوجیوں کے جوتوں کی آہٹ محسوس ہوتی تھی۔ گینٹ بے خبر سو رہا تھا کہ اچانک اندھیرے میں ایک سایہ نمودار ہوا جو چپکے چپکے چلتا ہوا گینٹ کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر وہ سایہ ایک لمبی راہداری سے گزر کر گینٹ کے کمرے کے دروازے پر رک گیا تھا اس نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا اور آہستہ آہستہ گینٹ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

گینٹ کی آنکھ اپنے سر کے بالوں میں کسی کے اٹھکیاں پھیرنے سے کھلی تھی اندھیرے میں اسے کچھ نظر تو نہیں آیا تھا صرف ایک سیاہ بولا سا تھا لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ صرف اور صرف اس کی محبوبہ این اسکاٹ ٹائسن ہے کیونکہ وہی اس طرح اس سے ملنے آتی تھی۔ این ٹائسن واشنگٹن کے ایک اخبار کی رپورٹر تھی اور افغانستان میں رپورٹنگ کرنے آئی ہوئی تھی وہ گینٹ کی بہادری سے بہت متاثر تھی۔ 2010ء سے جب سے گینٹ افغانستان میں تعینات ہوا تھا وہ اس کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہر محاذ پر جاتی تھی۔ جنگ کی وینڈیو ز بناتی تھی اور رپورٹ لکھتی تھی جسے واشنگٹن میں اپنے اخبار کو بھیجتی تھی لیکن اس کے اور گینٹ کے دل میں اٹھنے والے محبت کے طوفان کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا کیونکہ یہ گینٹ کی فوجی ذمہ داریوں کے خلاف تھا چنانچہ دونوں نے اس کو راز ہی رکھا تھا۔

”تم کہاں تھیں؟“ گینٹ فینڈ سے بھرے لہجے میں ٹائسن سے پوچھا۔

”میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“ ٹائسن نے کہا۔

”مجھے آئے ہوئے تو بہت دیر ہوگئی۔“ گینٹ نے نارنج کی روشنی میں گھڑی پر نظر ڈالی۔

”ہاں لیکن تمہارے پہرے دار تو جاگ رہے

ہائسن نے اپنی صحافیانہ مہارت سے کینٹ کو وہ معلومات دینے کی کوشش کی جو وہ پہلے سے جانتا تھا کیونکہ کمانڈر پیٹریو نے اسے تفصیل سے نورافضل کے بارے میں بتا دیا تھا۔

”ہاں میں جانتا ہوں۔“ کینٹ نے کہا۔
 ”پھر بھی تم اس سے ملنے گئے؟“ این نے کہا۔
 ”ہاں یہ ضروری تھا۔“ کینٹ نے بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن اس میں تمہارے لیے خطرہ ہے۔ وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے اس کے آدمی کتوں کی طرح امریکیوں کا پیچھا کرتے ہیں۔“ این نے کہا۔

”میں سب جانتا ہوں۔ لیکن اگر ان کا سردار ہی میری مدد میں آجائے تو وہ اس کے احکامات کے خلاف نہیں جاسکتے۔“ کینٹ نے ہنستے ہوئے کہا اور این اسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

”تم بہت چالاک اور موقع شناس ہو۔“ اس نے تعریفانہ انداز میں کہا۔

”ہاں! یہ تو ہے۔“ کینٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”دیکھو میں نے تمہاری محبت سے بھی تو فائدہ اٹھایا ہے۔ ابھی تم جیسی خوبصورت بہادر اور ہوشیار صحافی میری بانہوں میں ہے۔“ کینٹ نے کہا اور ہائسن اس سے چمٹ گئی۔

دوسری صبح ناشتے پر کینٹ کی ملاقات پیٹریو سے ہوئی تھی وہ بہت پریشان لگ رہا تھا اور اس کی آنکھوں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ رات بھر سو یا نہیں ہے۔

”کیا بات ہے پیٹریو۔۔۔ تم کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔“ کینٹ نے پوچھا۔ وہ دونوں اس وقت کینٹ کے کمرے میں موجود تھے اور ناشتے پر تباہی تھے۔

”ہاں۔۔۔ مجھے تمہاری فکر ہے۔۔۔ تم یہاں طالبان سے جنگ کے لیے جو طریقہ اپنانا چاہتے ہو وہ بہت خطرناک ہے۔۔۔ اگر امریکی افسران کو اس کا پتہ چل گیا کہ تم لوگوں میں حمل مل رہے ہوتے تو یہ خطرناک ہوگا۔“ پیٹریو

ہیں۔“ ہائسن نے مسکراتے ہوئے کہا اور کینٹ نے اس کی طرف غور سے دیکھا نارنج کی مدھم روشنی میں اس کے بھورے کھٹکریالے بال اس کے شانوں پر بکھرے بہت اچھے لگ رہے تھے اس نے یہاں آتے وقت جو چادر اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی وہ اتار کر کمرے میں رکھی گرتی پر ڈال دی تھی اور اس وقت کینٹ کی ہدایت کے مطابق مقامی خواتین کی طرح کاشلوار قمیص پہنا ہوا تھا جس کے ساتھ دو پینڈ بھی تھا جو اس نے گلے میں ڈالا ہوا تھا وہ کینٹ کے ساتھ بستر پر بیٹھی تھی۔

”م شام کو پیٹریو کے ساتھ کہاں گئے تھے؟“ اس نے کینٹ سے پوچھا۔

”میں مہمند قبیلے کے سردار نورافضل سے ملنے گیا تھا۔“ کینٹ نے بلاجھبک اسے بتایا حالانکہ اپنے فوجی راز وہ کسی کو بھی بتانے کے لیے پابند تھا اسے اجازت نہیں تھی کہ وہ کسی سے بھی ان کا ذکر کرے اسی طرح اس کی جو فوجی دستاویزات تھیں جن میں اس کے آئندہ منصوبے اور یو ایس آرمی کے حکام سے اس کی خط و کتابت اس کی ملاقاتوں اور افغانستان میں ان افسران کے دوروں کی تفصیلات درج تھیں وہ بھی اس کی تحویل میں تھیں اور بروقت اس کے کمرے میں اس کے پاس ہوتی تھیں اور ان تمام دستاویزات تک این ہائسن کی رسائی تھی اسے زاوی تھی کہ وہ جو دستاویز چاہے اور جب چاہے دیکھ سکتی تھی جڑھ سکتی تھی اس کی کاپی تک محفوظ کر سکتی تھی کیونکہ کینٹ کو اس پر بھرپور اعتماد تھا اور وہ اس کی شدید محبت میں گرفتار تھا۔ این کے اپنے پاس بیٹھتے ہی وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور کینٹ کی انگلیاں این کے بالوں سے کھیلنے لگی تھیں۔

”تم مہمند قبیلے کے سردار سے ملنے کیوں گئے تھے؟ وہ تو کٹر مسلمان ہے اور بہت بہادر ہے۔ اسے سینکڑوں نام سے شہرت حاصل ہے۔ وہ اور اس کے لوگ امریکیوں پر بھروسہ نہیں کرتے اور انہیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ این

نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”میں سب جانتا ہوں پیٹر یو۔“ گینٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تم جانتے ہو میں نے افغانستان آنے سے پہلے عراق میں پچاس ماہ تک جنگ لڑی ہے اور وہاں کامیابی حاصل کی ہے مجھے امریکا کا سلور ایوارڈ بھی ملا جو بہت کم فوجیوں کو نصیب ہوا ہے اور امریکی حکومت میری مداح ہے۔ میری تعریف کرتی ہے اور میرے طریقہ کار کو پسند کرتی ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں میں یہ سب جانتا ہوں۔“ پیٹر یو نے کہا۔ ”مجھ سے زیادہ کون جانتا ہوگا میں نے ہی تمہیں یہاں بلوایا ہے اور میں نے ہی امریکی فوجی افسران کو مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ افغانستان کی باری ہوئی جنگ جیتنا چاہتے ہیں تو تمہیں عراق سے یہاں بلوائیں اور یہاں کی کمانڈ تمہیں دے دیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“

”تو پھر تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اگر تم امریکی افواج کے اصولوں کی خلاف ورزی کرو گے تو مجھے بھی ذمہ دار سمجھا جائے گا۔“ پیٹر یو نے قدرے برہمی سے کہا۔

”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم دیکھتے جاؤ۔ میں نے سوچ لیا ہے میں اپنے منسوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پہلے افسران سے ملوں گا ان سے اپنے منسوبے کی تحریری اجازت لوں گا پھر کام کروں گا۔“ گینٹ نے پیٹر یو کو سمجھایا اور وہ پراٹھیمینان انداز میں سر بلانے لگا اسی وقت این ٹائسن ہنستی ہوئی گینٹ کے کمرے میں داخل ہوئی اس نے سرمئی رنگ کا مقامی لباس پہنا ہوا تھا اور گھٹے میں سفید چادر پڑی تھی جسے اس نے پشت کی طرف ڈال رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں حسب معمول ویڈیو کیمرہ تھا جسے وہ ہر وقت ساتھ رکھتی تھی۔

”اچھا تو تم دونوں ابھی ناشتہ کر رہے ہو؟“ اس نے ہنستے ہوئے کہا اور قریب رگی خالی کرتی پرہیزگاری سے دیکھتے ہی گینٹ کی آنکھوں میں پیار بھری چمک آئی تھی جسے پیٹر یو محسوس نہیں کر سکا تھا وہ اب تک یہی سمجھ

مہکتی کلیاں

جو شخص نگاہ کی التجا کو نہ سمجھے اس کے سامنے زبان کو مت شرمندہ کرو۔

تم اس شخص کو تو بھول سکتے ہو جس کے ساتھ ہنسے ہو لیکن اس کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے جس کے ساتھ روئے ہو۔

مسکراہٹ محبت کی زبان ہے۔

دوسروں کے حال پر غور کرنے سے نصیب ملتا ہے۔

جو لوگ زندگی کو مقدس فریضہ سمجھ کر بسر کرتے ہیں وہ کبھی بھی ناکام نہیں ہوتے۔

فیاض اسحاق مہماندہ۔۔۔۔۔ سلانوالی

رہا تھا کہ این سرف ایک صحافی کے طور پر یہاں تعینات ہے اور ذمہ داری سے اپنا کام کر رہی ہے وہ ہر وقت سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتی ہے اور خبر اور ویڈیو بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔

”ہاں ہم ابھی سو کر اٹھے ہیں۔“ گینٹ نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا اسے حیرت تھی کہ اسے افغانستان آئے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا اور وہ یہاں آتے ہی این کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا لیکن اس کے کسی ساتھی کو بھی اس محبت کا علم نہیں ہوا تھا اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ این کو بھی فوجی تربیت دی تھی وہ بھی کبھی کبھی فوجی وردی میں اس کے ساتھیوں میں موجود ہوتی تھی یہ اور بات تھی کہ اس کے ہاتھوں میں ہتھیاروں کے بجائے کیمرے ہوتے تھے لیکن کبھی اگر ضرورت پڑے تو وہ رائفل بھی اٹھا لیتی تھی۔ گینٹ اس سے بہت خوش تھا اور گینٹ کے علاوہ بھی این دوسرے فوجیوں کا خیال رکھتی تھی ان سے بے تکلف تھی چنانچہ کسی کو بھی گینٹ اور اس کے معاشرے کا شک نہیں ہوا تھا۔

”پیٹر یو! تم تو یہیں لڑتے لڑتے بوزھے

ہو جاؤ گے۔“ این نے ہنستے ہوئے پیٹریو کو چھیڑا۔

”کوئی بات نہیں یہ تو میرا پیشہ ہے میں اپنے وطن کے لیے جوانی کیا اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔“ پیٹریو نے کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

”ہاں..... ٹھیک ہے..... مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ این نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اسی وقت دور سے فائرنگ کی آواز آئی سٹائی دی اور اس کے ساتھ ہی ایک فوجی بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے غلٹ میں سلوٹ کیا تھا۔

”سر! یہاں سے تھوڑے فاصلے پر طالبان نے ہماری پیٹریو لنگ پارٹی پر فائرنگ شروع کر دیا ہے وہ پہاڑیوں سے فائر کر رہے ہیں۔“ اس نے تیزی سے بتایا اور اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پیٹریو اور گینٹ کھڑے ہو گئے تھے پھر انہوں نے اپنے ہتھیار سنبھالے تھے اور کمرے سے نکل گئے تھے۔ این بھی اسی تیزی سے ان کے ساتھ باہر آ گئی تھی اور پھر چند فوجیوں کو لے کر گینٹ بکتر بند گاڑی میں بیٹھ کر اس سمت روانہ ہو گیا تھا جہاں یہ حادثہ رونما ہوا تھا این بھی اس کے ساتھ تھی اور بہت چاق و چوبند نظر آ رہی تھی۔

جائے وقوع پر پہنچ کر اس نے فوجیوں کو مختلف سمتوں میں ڈیوٹیز پر لگا دیا تھا۔ جنہوں نے فوراً ہی اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لی تھیں اور موقع پر موجود دوسرے فوجیوں کے ساتھ حملے کا جواب دینے لگے تھے۔ این نے بڑی مہارت سے اس لڑائی کی ویڈیو بنانا شروع کر دی تھی لیکن گینٹ نے اس کو ایک قدر سے محفوظ چٹان کے پیچھے چھپ کر یہ کام کرنے کی ہدایت کی تھی اسے ہمیشہ ہی این کی حفاظت کا خیال شدت سے رہتا تھا اور کیوں نہ رہتا وہ اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ پیٹریو گینٹ کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا تھا اور فائرنگ کا جواب دیتا ہوا گینٹ کے ساتھ ہی ایک محفوظ پہاڑی کی اوت میں چلا گیا تھا۔

”پتہ نہیں ان طالبان نے ان پہاڑیوں میں کیسے

ٹھکانے بنائے ہوتے ہیں کہ اچانک ہی غائب ہو جاتے ہیں اور پتہ نہیں چلتا کہ کہاں گئے۔“ گینٹ نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

”یہاں جگہ جگہ پہاڑیوں میں غار بنے ہیں اور اکثر کی چھت میں قدرتی طور پر سوراخ بنے ہیں وہ ان سوراخوں کی مدد سے ان غاروں میں اتر جاتے ہیں ان کے پیچھے ان غاروں میں اترنا خطرناک ہے کیونکہ وہاں ان کا تمام اسلحہ اور جنگجو سامھی موجود ہوتے ہیں اور نیچے اترنے والے فوجی کو زندہ نہیں چھوڑتے بلکہ بڑی اذیت سے مارتے ہیں تمہارے یہاں آنے سے پہلے ہمارے کئی فوجی اس طرح مارے جا چکے ہیں۔“

”ہوں..... اسی لیے میں نے ان سے لڑنے کے لیے اپنا طریقہ بدل دیا ہے..... ہمارے پاس اتنی فوج نہیں کہ ان کا مقابلہ کر سکیں چنانچہ مقامی لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر ضروری تھا۔ اور میں اس پر بھی کام کر رہا ہوں وہ بھی طالبان اور القاعدہ کی کارروائیوں سے پریشان ہیں اور آئے دن ان کی زیادتیوں کا نشانہ بنتے ہیں وہ بڑی آسانی سے ہماری مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔“ گینٹ نے کہا۔

”لیکن وہ مسلمان ہیں..... وہ ہمارا ساتھ شاید نہ دیں۔“ پیٹریو نے ایک بار پھر اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

”نہیں تم نے یہ نہیں سنا کہ مسلمان اور خاص طور سے افغان بہت مہمان نواز ہوتے ہیں اور اپنی پناہ میں آئے ہوئے شخص کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ کرتے ہیں۔“

”تو اس بات سے ہمارا کیا تعلق ہے؟“

”ہم بھی تو ان کے مہمان ہو سکتے ہیں۔“ گینٹ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور دشمن کی طرف سے آنے والی ایک گولی کے جواب میں اس سمت ایک فائر داغ دیا اس کے ساتھ ہی برابر دشمن کے فائر کا جواب دے رہے تھے۔

”اور ہم ان کی پناہ میں بھی اپنے آپ کو دے سکتے ہیں۔“ گینٹ نے اصروری بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

پیٹریو کے نزدیک بلا جواز تھی۔

”تمہیں یہ بات بعد میں سمجھاؤں گا۔“ اس نے پیٹریو کی حیرت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ لیکن این نے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ویڈیو کیمرے کو الٹ پلٹ رہی تھی۔

پھر دو دن بعد ہی پیٹریو نے گینٹ کی ملاقات نور افضل سے طے کر دی تھی اور اس بار گینٹ اس سے ملنے نہیں گیا تھا بلکہ نور افضل اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس کے آرمی بیس پر آیا تھا اس خواہش کا اظہار نور افضل نے خود ہی کیا تھا کہ اس بار وہ گینٹ کا مہمان ہوگا شاید وہ اس کی فوجی ساکھ کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

”مجھے خوشی ہوئی کہ آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔“ گینٹ نے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا تو نور افضل مسکرانے لگا۔

”ہاں جب ہم دوست بن ہی گئے ہیں تو پھر تم مجھ سے ملنے آؤ یا میں تم سے ملنے آؤں ایک ہی بات ہے۔“ نور افضل نے ہنستے ہوئے کہا اس کے لہجے میں بہادریوں کے لہجے والی بے باکی جھلک رہی تھی اس روز گینٹ اور نور افضل کی ملاقات خاصی طویل ہوئی تھی اور اس ملاقات میں گینٹ نے اس کا تعارف این سے بھی کروایا تھا۔ این بھی نور افضل کے ساتھ بڑے تپاک سے ملی تھی۔

”تم بہت بہادر ہو اپنے وطن سے اتنی دور اپنے گھر واؤں کو چھوڑ کر صرف اپنے میگزین کے لیے خبریں جمع کرنے یہاں آئی ہو۔“ نور افضل نے تعریفی انداز میں کہا لیکن اس کے لہجے میں حسرت بھی پوشیدہ تھی۔

”ہاں یہ میری ملازمت کا حصہ ہے اور میں یہاں افغان عورتوں سے بھی ملنا چاہتی تھی میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ بہادر عورتیں کس طرح زندگی گزارتی ہیں اور کس طرح اپنے شوہروں اور بیٹوں کے ساتھ طالبان کے ساتھ جنگ میں ان کا ساتھ دیتی ہیں۔“ این نے گینٹ کے روتائے ہوئے الفاظ بڑی مہارت سے ادا کیے۔

”لیکن اس کے لیے ان کی ہمدردیاں حاصل کرنا ہوں گی۔“ پیٹریو نے سانسے پہاڑیوں کی طرف فائر کرتے ہوئے اپنی جگہ بدلی تھی اور اسی لمحے اس پہاڑی سے ایک طالبان لڑھکتا ہوا نیچے آگرا تھا۔ شاید گولی لگنے سے اس کی موت واقع ہوئی تھی پھر تھوڑی ہی دیر میں طالبان کے کئی ساتھی مارے گئے تھے اور ان کی طرف سے آنے والے فائر بھی بند ہو گئے تھے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد گینٹ کو واپس پر اطلاع ملی تھی کہ طالبان کا گروہ پیچھے ہٹ گیا تھا پھر گینٹ نے بھی اپنے ساتھیوں کو واپسی کا اشارہ کیا تھا اور اس پوسٹ پر کچھ مزید فوجیوں کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔

”میں نے ان طالبان کے گولی کھا کر مرتے ہوئے مناظر کی ویڈیو بنائی ہے۔“ این نے واپسی پر بتایا۔

”ٹھیک ہے یہ ویڈیو نہ صرف تمہارے لیے تمہارے میگزین کے لیے ہی اتنا مشین ہے بلکہ یہاں پر میری کارکردگی کے ریکارڈ میں رکھے جانے کے لیے ایک بہترین ثبوت بھی ہے۔“ گینٹ نے کہا تو این منسنے لگی۔ پیٹریو اس وقت بھی ان کے ساتھ موجود تھا اور اعلیٰ سے گائری کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

”یہاں بہت خطرہ ہے ہم کس طرح یہاں سے بچ کر نکلیں گے۔“ پیٹریو نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

”ہم ضرور کامیاب ہوں گے مجھے یقین ہے میری کوشش ہوگی کہ میرے فوجیوں کو کم سے کم نقصان اٹھانا پڑے۔“ گینٹ نے کہا پھر اچانک وہ چونکا جیسے اسے کوئی خاص خیال آیا ہو۔

”پیٹریو تم ایک دو روز میں ہی نور افضل سے ملنے کا بندوبست کرو تمہیں اپنے کام میں تیزی لانا ہوگی یوں ہم طالبان کے حملوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے اس بار این بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔“ اس نے کہا تو پیٹریو چونک کر اسے دیکھنے لگا اسے حیرت اس بات پر نہیں تھی کہ وہ نور افضل سے ملنا چاہتا تھا بلکہ اس بات پر تھی کہ اس نے این کو ساتھ لے جانے کی فرمائش کی تھی جو

ذیرے کے قریب ہی ہے اور اس طرح این کی رسائی وہاں تک حاصل ہو سکتی ہے۔

”ہاں کیوں نہیں ضرور..... اور جب میرے یہاں آنے کا مقصد ہی آپ لوگوں کی مدد اور حفاظت کرنا ہے تو ہماری ملاقاتیں تو ہوتی رہیں گی ہمیں یہ جنگ مل کر ہی لڑنا ہے۔“ گینٹ نے کہا اور نور افضل کے چہرے پر اپنی بات کے رد عمل پر آنے والے تاثرات تلاش کرنے لگا۔

”ہاں..... مجھے تمہاری بات سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔“ نور افضل نے کہا اس کے چہرے پر یقین بھری مسکراہٹ تھی جس کو دیکھ کر گینٹ کو احساس ہوا کہ اس نے آدھا معرکہ سر کر لیا ہے۔

”ہمارا اور تمہارا دشمن مشترک ہے۔ القاعدہ اور طالبان کا ہاتھ نائین الیون کے امریکی حادثے میں ہے یہ بات ثابت ہو چکی ہے اور وہی تمہارے بھی دشمن ہیں جو تمہارے ملک میں چھپے ہیں اور تمہارے لیے ایک نئی جنگ چھیڑ دی ہے۔“ گینٹ نے نور افضل کو سمجھانے والے انداز میں کہا اور نور افضل اثبات میں سر ہلانے لگا۔

”ہاں..... میں تمہاری بات سمجھتا ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور گینٹ کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑی۔

پھر متواتر ان کی کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور وہ آپس میں ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے لگے تھے۔ اب این کی پہنچ نور افضل کے گھر کے اندر تک ہو گئی تھی۔ اس نے نور افضل کی بیوی اس کی پڑوسی عورتوں اور بچوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا وہ اکثر ان میں تحفے اور تحائف تقسیم کرتی تھی ان کے کاموں میں ان کا ہاتھ بناتی تھی اور وہ اسے مقامی لباس رسم و رواج کے بارے میں بتاتی تھیں اور اس پر بہت بھروسہ کرنے لگی تھیں اب وہ لوگ گینٹ اور اس کے ساتھیوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے تھے۔

نور افضل اور گینٹ کی دوستی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ایک روز گینٹ کے فوجیوں کا سامنا پھر طالبان کے ساتھ ہو گیا۔ گینٹ کو اطلاع ملی تو وہ بھی ہمیشہ کی طرح

”ہاں..... ضرور..... ضرور..... میں تمہیں ان سے ضرور ملواؤں گا۔“ نور افضل نے ہنستے ہوئے کہا اور گینٹ کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے اسے افغانوں کے گھروں میں گھس بیٹھنے کے منصوبے میں کامیابی کی پہلی کرن نظر آئی تھی اس روز کی ملاقات میں نور افضل نے گینٹ کو پیش کش کی تھی کہ وہ اس کے گھر کے قریب ہی ایک گھر میں اس کے ساتھ رہائش رکھ سکتا ہے اس طرح وہ افغانوں کے ساتھ ہوگا اور زیادہ محفوظ ہوگا۔ گینٹ کے دل کی مراد پوری ہو گئی تھی اور اس نے جلد ہی اس گھر میں منتقل ہونے کا وعدہ کر لیا تھا اس روز گینٹ نے بھی نور افضل اور اس کے ساتھیوں کی خوب تواضع کی تھی اور انہیں قیمتی تحائف بھی دیئے تھے۔ جس سے اس کی دوستی اور مضبوط ہو گئی تھی۔

پندرہ روز بعد وہ اس جگہ منتقل ہو گیا تھا جو نور افضل نے اس کے لیے منتخب کی تھی یہ جگہ افغانستان کے تپتے ہوئے میدان میں بکولک کو تار دریا کے کنارے پہاڑوں کے دامن میں تھی کچی پکی اینٹوں کا بنا ایک چھوٹا سا گھر تھا جس میں دو کمرے اور پاتھروں بنا ہوا تھا اس گھر کے باہر کوئی چہار دیواری نہیں تھی اور بچر میدان میں جگہ جگہ خود رو جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ جن میں سے زیادہ تر سوکھی ہوئی تھی دور دور تک کوئی اور گھر نہیں تھا بظاہر وہ جگہ بڑی پرسکون لگ رہی تھی لیکن یہاں بھی طالبان کی کارروائیوں کا ڈر تھا کیونکہ چاروں طرف پھیلی پہاڑیاں ان کا مسکن تھیں۔

”ویسے تو میں زیادہ وقت اپنے فوجیوں کے ساتھ ہی گزاروں گا کیونکہ میں اپنی فوجی ذمہ داریوں کو نہیں بھول سکتا لیکن ابھی آرم کر کے لیے یہ جگہ بہت اچھی ہے۔“ گینٹ نے اس جگہ کی تعریف کی تو نور افضل مسکراتے لگا این اس وقت بھی اس کے ساتھ تھی۔

”ہاں جب تمہارا دل چاہے تو تم میرے ذیرے پر بھی آ سکتے ہو۔“ نور افضل نے کہا اور گینٹ اثبات میں سر ہلانے لگا اسے معلوم تھا کہ نور افضل کا گھر اس

شدید قسم کی برین انجری کا سامنا ہے اور وہ کافی عرصے تک ٹھیک نہیں ہو سکے گا۔

”کیا ہوا تھا؟“ اس نے ہوش آتے ہی این سے پوچھا تھا جو اس کے قریب رکھی پر بیٹھی تھی۔ وہ کافی فکرمند محسوس ہو رہی تھی۔

”راستے میں سڑک کے کنارے ایک بم نصب تھا جس سے تمہاری گاڑی ٹکرائی تھی گاڑی کے پرچھے اڑ گئے تھے لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم بچ گئے۔ تمہیں شدید زخم آئے ہیں خاص طور سے سر میں۔“ این نے اسے بتایا۔

”بانی لوگ..... اور طالبان کا حملہ..... وہ سب لڑ رہے تھے کیا برا؟ کوئی مارا تو نہیں گیا؟“ گیٹ نے پوچھا۔

”نہیں..... کچھ فوجی زخمی ہوئے ہیں ان کو طبی امداد دی جا رہی تھی۔ ہم نے اس معرکے میں طالبان کو مار بھگا یا تھا۔ نور افضل بھی بہاری مدد کر رہا تھا۔“ این نے کمرے میں موجود نور افضل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ آگے بڑھا۔

”ہاں..... تم فکرمند کرو گیٹ..... ہم تمہارے ساتھ ہیں..... میرے ساتھی اپنی جان دے کر بھی تمہاری مدد کریں گے..... ہم تمہیں تنہا نہیں چھوڑیں گے تم بھی تو ہماری خاطر آئے ہو..... ہماری مدد کرنے۔“ نور افضل کے منہ میں گیٹ کی زبان بول رہی تھی اور گیٹ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اسے ساتھ ہونے والے حادثے کا اسے افسوس ضرور تھا لیکن وہ ذہنی طور پر تیار تھا کہ افغانستان میں اپنی ذیوقی کے دوران اسے خطروں اور حادثات سے دوچار ہونا ہی تھا۔

”میں تمہارا مشکور ہوں۔“ گیٹ نے کہا۔

”تمہیں پتہ ہے اس بار کی چھڑپ میں القاعدہ والوں کے ساتھ اسامہ بن لادن بھی دیکھا گیا انہوں نے جگہ جگہ راستوں میں بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں ایسی ہی ایک بارودی سرنگ سے تمہارا ٹرک بھی ٹکرا کر حادثے کا شکار ہوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ کوئی جانی

ان کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا اس بار بھی اس کے ساتھیوں کی خاصی تعداد اس کے ساتھ تھی ان کی گاڑیاں جو اسلحہ سے لیس تھیں این اپنے موبوی کیمرے کے ساتھ موجود تھی اس بار طالبان کا حملہ کافی شدید تھا۔ گیٹ کے ساتھی مقامی لباس میں تھے لیکن ان کے ہتھیار ان کی گاڑیاں جن پر لیٹینا نصب تھا ان کے امریکی ہونے کی چغلی کھا رہی تھیں گیٹ کا قافلہ اس جانب تیزی سے سفر کر رہا تھا جہاں طالبان کے ساتھ اس کے فوجی معرکہ رانی میں مصروف تھے نور افضل کو بھی اس حملے کی اطلاع دے دی گئی تھی اور وہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گیٹ کی مدد کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

دشمن کی طرف سے شدید فائرنگ اور گولہ باری ہو رہی تھی جس کا جواب گیٹ کی آرمی کی طرف سے دیا جا رہا تھا۔ گیٹ کی گاڑی تیزی سے منزل کی طرف بڑھ رہی تھی اس کے ساتھ چلنے والی دوسری گاڑی میں این اپنے کیمروں اور ہتھیاروں کے ساتھ سوار تھی اچانک چلتے چلتے گیٹ کی گاڑی سڑک کے کنارے نصب ایک بم سے ٹکرائی جو بظاہر نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے وہاں بڑی مہارت سے نصب کیا گیا تھا اور وہ ایسی جگہ تھا کہ کوئی بھی گزرنے والی گاڑی اس سے ٹکرا سکتی تھی۔ اچانک ہی زور دار دھماکا ہوا تھا اور گیٹ کی گاڑی الٹ گئی تھی۔ اس کے پرچھے اڑ گئے تھے اور گیٹ کو گرتے ہوئے سر اور اپنی سیدھی ٹانگ میں شدید درد کی لہر محسوس ہوتی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک مقامی اسپتال میں بیڈ پر موجود تھا اور این کے علاوہ نور افضل بھی وہاں موجود تھا اسے بے انتہا سیکورٹی میں رکھا گیا تھا اور نور افضل کے لوگ اسے سیکورٹی دے رہے تھے اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کو کئی دن گزر چکے تھے۔ اس حادثے میں اس کی ٹانگ کے ساتھ ساتھ اس کے سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں جس کی وجہ سے اس کے سر کا آپریشن بھی کیا گیا تھا اور ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ اسے

اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہے۔
 ”تم مجھ سے شادی کرو گی؟“ اچانک ہی اس نے
 این سے پوچھ لیا اور وہ حیران رہ گئی اسے گینٹ سے توقع
 نہیں تھی کہ وہ این کے ساتھ اپنی رومانی داستان کو کوئی
 حقیقی رشتہ دے گا۔

”کیا.....؟“ اس نے حیرت سے کہا۔
 ”ہاں جب ہم ایک دوسرے کو اتنا پسند کرتے ہیں تو
 پھر شادی کرنے میں کیا حرج ہے؟“ گینٹ نے کہا۔
 ”نہیں..... میں ایسا نہیں کر سکتی..... تم جانتے ہو
 میرا ایک شوہر ہے..... چار بچے ہیں..... وہ مجھ پر بہت
 اعتماد کرتا ہے اس نے مجھے ہر طرح کی آزادی دے رکھی
 ہے۔ میری خواہش پر اس نے مجھے افغانستان جیسے
 خطرناک ملک میں رپورٹنگ کرنے کی اجازت بھی
 دے دی اور میں..... میں اسے بدلے میں دھوکا دوں
 ؟“ این نے کہا۔

”تو پھر ہمارا انجام کیا ہوگا؟ کیا ہم یونہی چھپ
 چھپ کر ملتے رہیں گے؟“ گینٹ نے کہا۔
 ”کیا کروں.....؟ میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور
 ہوں میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ چار بچے ہونے کے
 بعد مجھے اپنے خوابوں کا حقیقی شہزادہ مل جائے گا۔“ این
 کے لہجے میں خودی کے ساتھ ساتھ حسرت بھی تھی۔

”ہاں..... میں نے بھی کبھی ایسا نہیں سوچا تھا.....
 مجھے اپنی بیوی اور بچوں سے بہت ہی پیار ہے..... میں
 انہیں کبھی چھوڑنے کا تصور نہیں کر سکتا اور تمہیں بھی۔“
 گینٹ نے این کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔
 ”اور میرا حال بھی بالکل یہی ہے گینٹ۔“ این نے
 بے بسی سے کہا۔ ”میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوں نہ
 انہیں چھوڑ سکتی ہوں اور نہ تمہیں اور ہم لوگ شادی بھی
 نہیں کر سکتے۔“

”لیکن شادی تو میں تم سے ضرور کروں گا۔“ گینٹ
 کے لہجے میں ارادے کی پختگی جھلک رہی تھی۔
 ”نہیں گینٹ یہ ممکن نہیں۔“ این اس کے قریب

نقصان نہیں ہوا۔ کچھ فوجیوں کو زخم آئے ہیں۔ انہیں طبی
 امداد دی جا رہی ہے لیکن تمہارے سر کی انجری بہت
 خطرناک تھی۔ آپریشن کرنا پڑا اور تمہارے جسم پر بھی غیر
 معمولی زخم آئے ہیں۔“ نور افضل نے اسے بتایا تو
 گینٹ نے مسکرا کر این کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں
 میں این کے لیے بے پناہ محبت جھانک رہی تھی اور این
 بھی اس سے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے بہانہ
 ڈھونڈ رہی تھی۔ پھر اسی رات انہیں قدرت نے ایک
 موقع دیا تھا۔ اسپتال میں دن کی تمام مصروفیات سے
 فارغ ہو کر تمام لوگ اپنے اپنے کمروں اور اپنی اپنی
 ڈیوٹیوں پر چلے گئے تھے۔ این گینٹ کے کمرے میں
 موجود تھی یوں تو شروع ہی سے اس کی دیکھ بھال کر رہی
 تھی لیکن یہ پہلا موقع تھا جب حادثے کے بعد گینٹ
 ہوش میں آیا تھا۔

”گینٹ! میں تمہارے لیے بہت فکر مند تھی۔ ہم لوگ
 ناامید ہو چکے تھے تمہارے سر کی انجری بہت خطرناک تھی۔“
 این کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

”خدا کا شکر ہے کہ میں بچ گیا ہوں۔“ گینٹ نے
 محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں اور نہ میں کبھی تمہارے ساتھ ہی مر
 جاتی۔“ این نے دوسرے ہاتھ سے اس کے سر میں
 انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”پھر تمہارے چاروں بچوں کا کیا ہوتا جو واشنگٹن
 میں تمہارے منتظر ہیں۔“ گینٹ نے شرارت بھرے
 لہجے میں کہا۔

”تمہیں میرے بچوں کی فکر ہے اور اپنے بچوں کے
 بارے میں تمہارا کیا خیال ہے وہ بھی تو چار ہیں اور
 تمہاری واپسی کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔“ این
 نے کہا۔

”ہاں! ان کی ماں بہت اچھی ہے وہ ان کا بہت
 خیال رکھتی ہے۔“ گینٹ کے لہجے میں ٹھوٹھو افسردگی تھی۔
 شاید یہ احساس اسے ستا رہا تھا کہ این سے محبت کر کے وہ

اس کے بستر پر ہی دراز ہو گئی اس نے اپنا سر گینٹ کے سینے پر رکھ دیا تھا۔

”اس بارے میں مجھے کوئی جلدی نہیں ہے این..... تم اچھی طرح سوچ لو۔“ گینٹ نے کہا۔

”گینٹ تمہیں پتہ ہے جب تمہارا حادثہ ہوا تو میں بہت روئی..... میں بہت پریشان تھی تو نور افضل کی بیوی نے مجھے بہت دلاسا دیا وہ مجھے اپنے گھر لے گئی اس نے مجھے کئی دنوں تک اپنے ساتھ رکھا..... اور.....

میری حالت دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ میں تم سے کتنی قریب ہوں اور تمہاری محبت میں بھی گرفتار ہوں.....

پھر اس کے پوچھنے پر میں نے اسے سچ بتا دیا وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے مجھے بہت سے خوبصورت کپڑے دیئے جن کے ساتھ مقامی طرز کے زیورات بھی ہیں۔ وہ اکثر ضد کر کے مجھے وہ پہناتی ہے اس نے مجھے کئی افغانی کھانے پکانا سکھائے ہیں اور میں نور افضل کی فیملی کے ساتھ بہت مل جل گئی ہوں۔“

”بہت خوب“ گویا میری انگریزی کی وجہ سے تم نے میری غیر حاضری میں میرا کام سنبھالا ہوا ہے تم نے میرے پلان کے مطابق نور افضل پر اعتماد قائم کر لیا ہے اور تمہاری پہنچ اس کی فیملی تک ہو گئی ہے۔“ گینٹ کے چہرے پر خوشی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

”لیکن اس کے لیے مجھے زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑی کیونکہ کچھ تو حادثے کی وجہ سے نور افضل کی بیوی کو مجھ سے ہمدردی ہوئی تھی اور پھر اس کے خیال میں ایک عورت کا اپنے مرد کے بغیر اتنے فوجیوں میں اکیلے رہنا ٹھیک نہیں تھا چنانچہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر ہی میں ہوں اس کے بچے مجھے بہت پسند کرتے ہیں میں انہیں انگریزی سکھاتی ہوں اور وہ مجھے افغانی سکھاتے ہیں۔“

”بہت خوب! مجھے خوشی ہوئی تمہارا کام کرنے کا طریقہ وہی ہے جو میں چاہتا ہوں۔“ گینٹ ابھی تک فوجی انداز ہی سے سوچ رہا تھا وہ اسے اتفاق ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ گینٹ نے کچھ دیر بعد اس سے پوچھا۔

”کس بات کا؟“

”یہی کہ تم مجھ سے شادی کر لو۔“

”میں ذرتی ہوں..... ایسا کرنا ہمارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے..... اس کی وجہ سے تمہارا اور میرا کیریئر تباہ ہو جائے گا ہمارے گھروں میں ہمارے لیے جگہ نہیں ہوگی..... ہم پوری طرح برباد ہو سکتے ہیں۔“ این نے خدشات کا اظہار کیا۔

”میں بھی یہ سب جانتا ہوں۔“ گینٹ نے کہا۔ ”لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں ہے میں ان چیزوں سے ڈر کر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔“

نور افضل نے اسے

رت

جانندی کے ورق میں لپٹی خوشیاں دل کے نہاں خانے سے پھٹھڑی کی مانند پھوٹی ہیں اور جب یہ فضاؤں میں جلتی رنگ کی طرح نکھر جائیں تو پھر رت چاہے کوئی بھی ہو صرف دل کا منظر گلابوں سا کھلا کھلارات کی رانی سا مہرکا مہرکا ہو جاتا ہے سچ سچ..... خوشی کی کوئی خاص وجہ ہوتی ہے اور نہ ہی اسے کسی ناپ تول کی اکائی سے ناپا جا سکتا ہے۔ کبھی پانی کی روانی دیکھ کر دل کی ویرانی میں خوشی کے غنچے کھل اٹھتے ہیں تو کبھی آسمان پر ہراتے پرندے مسکرو شادماں کرتے ہیں۔ خوشی کسی خاص شے احساس سے قطعاً مشروط نہیں کبھی تو پتی کی سرسراہٹ چیزوں کی چمکا رہا تب شادوں کا شور۔ چاند چاندنی ستارے شبنم جگنو تیتلیاں رنگ برنگے پھول بارش کی ننھی ننھی بوندیں چیزوں کی کھنک رنگ کی دھنک مہندی کے رنگ مٹی کی خوشبو اور گجرے کی مہک تک دل کے پور پور میں مہک خوشی کی بھر جاتی ہے اور پھر من خود بہ خود ہی گنگنائے سجے سنورے کو مچھلے لگتا ہے۔

پروین افضل شاہین..... بہاؤ شکر

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ گینٹ نے کچھ دیر بعد اس سے پوچھا۔

”کس بات کا؟“

”یہی کہ تم مجھ سے شادی کر لو۔“

”میں ذرتی ہوں..... ایسا کرنا ہمارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے..... اس کی وجہ سے تمہارا اور میرا کیریئر تباہ ہو جائے گا ہمارے گھروں میں ہمارے لیے جگہ نہیں ہوگی..... ہم پوری طرح برباد ہو سکتے ہیں۔“ این نے خدشات کا اظہار کیا۔

”میں بھی یہ سب جانتا ہوں۔“ گینٹ نے کہا۔ ”لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں ہے میں ان چیزوں سے ڈر کر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔“

نور افضل نے اسے

ہونے کے ناتے میں تمہاری مدد کروں گا اور کسی کو بھی اس راز کا پتہ نہیں چلے گا سب یہی سمجھیں گے کہ این شخص تمہاری تہارداری کے لیے یہاں ہے۔“ نور افضل نے وضاحت کی۔

”ٹھیک ہے۔“ گینٹ نے مطمئن ہو کر کہا اور اس کے بعد وہ این کے ساتھ وہاں رہنے لگا۔ آرمی بیس سے اس کے کمرے کا کافی سامان وہاں منتقل کر دیا گیا جس میں اس کی خفیہ دستاویز کا بیگ بھی تھا ان دستاویز میں وہ تمام منصوبہ بندیاں تحریر تھیں جو گینٹ نے افغانستان میں آزمانی تھیں۔ ان میں وہ خطوط بھی تھے جن میں اس نے افغانستان میں جنگ لڑنے کی نئی ترکیب اختیار کرنے کی اجازت امریکی افسران سے لی تھی اور امریکی افسران کا وہ جواب بھی تھا جس میں اسے یہ نئی ترکیب آزمانے کی اجازت دی گئی تھی کہ وہ افغانوں میں نکل مل جائے اور ان کی مدد سے طالبان اور القاعدہ کا مقابلہ کرے اس مقصد کے لیے اس نے اجازت مانگی تھی کہ

اسے اپنے فوجیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر افغانوں میں گھس بیٹھنے کی اجازت دی جائے اور انہی کا مذاق میں وہ اجازت بھی موجود تھی۔ پھر مختلف موقعوں پر افغانستان میں اس سے ملنے امریکی حکام آتے رہتے تھے اس کا ریکارڈ بھی موجود تھا اور یہ ساری دستاویزات گینٹ کے بعد صرف این کی دسترس میں تھیں وہ جب چاہے انہیں دیکھ سکتی تھی جبکہ یہ فوجی اصولوں کے خلاف تھا اور گینٹ کے علاوہ ان خفیہ دستاویزات تک کسی کی رسائی ممکن نہیں تھی لیکن گینٹ این کے معاملے میں بہت بے پردا واقع ہوا تھا شاید یہ اس کی محبت اور این پر بے حد اعتماد کا نتیجہ تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ آہستہ آہستہ گینٹ کی حالت بہتر ہوتی گئی اور وہ دوبارہ سے اپنی روزمرہ فوجی ذمہ داریوں میں مصروف ہو گیا تھا لیکن اب اس نے ایک اور ذمہ داری کا اضافہ کر لیا تھا کہ وہ اکثر این کے ساتھ افغان قبیلوں میں نکل جاتا تھا وہ ظاہر یہ کرتا تھا کہ وہ

”دیکھو گینٹ مجھے وقت دو۔۔۔۔۔ میں اس بارے میں سوچوں گی۔“ این نے اس وقت اس کا دل توڑتا مناسب نہیں سمجھا اور گینٹ بھی خاموش ہو گیا اس رات بہت عرصے بعد ان دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا اور محبت کی دو بے قرار رو میں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گئیں۔

کافی عرصہ اسپتال میں گزارنے کے بعد گینٹ کو اسپتال سے فارغ کر دیا گیا تو نور افضل اسے اسی کھر میں لے گیا جو پہاڑوں کی وادیوں میں اس کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ تھا اور گینٹ کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی تھی کہ وہاں ایک چھوٹی ٹیمیلی کے رہنے کے لیے تمام انتظامات تھے گینٹ نے سوالیہ نظروں سے نور افضل کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ نور افضل اتنا نادان نہیں ہے اسے ایک فوجی کی ضروریات کے درمیان تمیز نہ ہو اس کے چہرے پر سوالیہ نشان دیکھ کر نور افضل مسکرانے لگا تھا۔

”مجھے معلوم ہے تم این سے محبت کرتے ہو اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتے پھر ابھی تمہیں خاص دیکھ بھال کی ضرورت بھی ہے اور اس کے لیے این سے بہتر کوئی نہیں تم یہاں اس کے ساتھ سکون سے رہ سکو گے چاروں طرف تمہارے فوجی اور میرے قبیلے کے لوگ تمہاری حفاظت کے لیے پہاڑوں میں موجود ہیں۔“

”لیکن میں نے کسی پر بھی اپنی محبت کو ظاہر نہیں ہونے دیا یہ این اور میرے درمیان ایک راز ہے۔۔۔۔۔ ہم چھپ کر ملتے ہیں۔۔۔۔۔ ویسے تو وہ سارا دن میرے ساتھ ہوتی ہے لیکن محض ایک رپورٹر کے طور پر اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے کسی کو پتہ نہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔“ گینٹ نے وضاحت کی۔

”میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔ اس کا اظہار کرنے میں تمہارے لیے بھی خطرہ ہے اور این کے لیے بھی۔۔۔۔۔ اس کی فوری جاسکتی ہے اور تمہاری بھی یہ فوجی اصولوں کے خلاف ہے لیکن۔۔۔۔۔ اس سلسلے میں تمہارا دوست

والے انداز میں کہا۔
 ”تم نے کہا تھا کہ تم اس بارے میں سوچو گی اب کافی دن گزر گئے ہیں۔ بتاؤ تم نے کیا فیصلہ کیا؟“
 ”میں اسے بچوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔“ این نے کہا۔
 ”اور میں بھی..... لیکن ہمیں شادی کر کے بچوں کو چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے ہم ان سے ملتے رہیں گے۔“ گینٹ نے کہا۔

”لیکن لوگ ہمارے کردار پر انگلیاں اٹھائیں گے۔“ این نے کہا۔
 ”وہ کوئی نئی بات نہیں ہے..... سب پیار کرنے والوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔“ گینٹ نے ہاتھ میں پکڑی شراب کی بوتل سے کئی گھونٹ بھر لیے۔
 ”تم بہت زیادہ پینے لگے ہو۔“ این نے تشویش سے کہا۔

”ہاں..... اس کی وجہ تم ہو..... میں تمہاری بے رخی برداشت نہیں کر سکتا۔“ گینٹ نے کہا۔
 ”لیکن میں تو تم سے ملنے آتی ہوں۔“
 ”ہاں لیکن یہ خیال تو میرے دل میں رہتا ہے کہ تم کچھ عرصے بعد مجھ سے ٹھہر جاؤ گی۔ تم میری نہیں ہو۔ تمہیں میری محبت کی پروا نہیں ہے۔“

”کیسا مت کہو۔ گینٹ میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“
 ”تو پھر مجھ سے شادی کر لو۔“ گینٹ نے کہا۔

”ابھی نہیں..... ابھی ضد نہ کرو..... ابھی میں ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔“ این نے کہا اور گینٹ بے بسی سے بستر پر لیٹ گیا وہ خاصہ دل برداشتہ نظر آ رہا تھا اور بہتر زیادہ نشے میں تھا۔ این کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد واپس کمپ میں چلی گئی تھی۔

دوسرے روز این کو گینٹ کے ساتھ افغان کی ایک ہستی میں جا کر لوگوں سے ملنا تھا اس نے نور افضل کی بیوی کا دیا ہوا مقامی لباس زیب تن کیا تھا اور اس کے ساتھ افغان جیولری بھی پہنی تھی وہ ایک خوبصورت

این کے ساتھ سیر کے لیے نکلا ہے لیکن اس کا مقصد مقامی لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنا اور ان میں کھل مل جانا تھا اس کے لیے وہ ان کے مسائل بھی سنتا تھا اور انہیں کسی حد تک حل کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا لیکن اسے اس کی اعزازت نہیں تھی کہ وہ عام افغانوں میں یوں بغیر سیکورٹی کے گھومے اس سے اس کی جان کو خطرہ بھی ہو سکتا تھا لیکن اس نے کبھی اس کی پروا نہیں کی اور اسی طرح اس نے امریکن آرمی کے ایسے ہی بہت سے قوانین بھی توڑے وہ سب سے الگ انداز میں کام کرتا چاہتا تھا اور عراق میں حاصل ہونے والی فتح اس کے لیے کامیابی کی ضمانت بھی جاری تھی امریکی اعلیٰ حکام کا بھی خیال تھا کہ اس کی جنگ کی نئی ترکیب اسے کامیابی سے ضرور ہمکنار کر دے گی اب اسے کئی حلقوں میں لارنس آف عربیہ کے کردار سے مماثلت دی جا رہی تھی اور کئی موقعوں پر اسے لارنس آف افغانستان کا خطاب بھی دیا گیا تھا خود امریکی حکومت نے بھی ایک موقع پر اسے لارنس آف افغانستان کے نام سے پکارا تھا وہ اس کامیابی پر بہت خوش تھا اور اسے بھی پختہ یقین تھا کہ کامیابی ضرور اس کے قدم چومے گی۔

”این تم نے سوچ لیا جو میں نے پیش کش کی تھی اس کے بارے میں؟“ ایک رات اس نے این سے پوچھا جو اس کے ساتھ موجود تھی اور اپنی والہانہ محبت کا اظہار کر رہی تھی۔

”ہوں..... کون سی پیش کش؟“ این نے انجان ہنستے ہوئے کہا۔
 ”مجھ سے شادی کی پیش کش۔“ گینٹ نے کہا۔
 ”تم جانتے ہو گینٹ یہ بہت خطرناک ہے۔“ این نے کہا وہ واقعی خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں..... کیا ہم ہمیشہ یونہی مل سکیں گے؟ یہاں سے واپس جانے کے بعد بھی؟ کیا ہمیں موقع ملے گا..... یہ راز تو پھر بھی فاش ہوگا..... ہم کب تک ڈرتے رہیں گے؟“ گینٹ نے اسے سمجھانے

افغان عورت لگ رہی تھی جب وہ گیٹ سے ملنے پہنچی تو وہ اس کو دیکھتا رہ گیا اس لباس میں اس کا حسن اور بھی نکھر گیا تھا۔ گیٹ نے بھی اس وقت مقامی لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے کاندھے پر ایک بڑی سی چادر پڑی ہوئی تھی ہاتھ میں گن تھی۔

”تم تیار ہو؟“ این نے اس سے پوچھا۔

”ہاں..... میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ گیٹ نے کہا پھر وہ دونوں گھر کے باہر کھڑی اس جیب میں بیٹھ گئے تھے جس میں این اس سے ملنے آئی تھی۔

وہ افغانوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی یہاں کچے مکان بنے ہوئے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کے لوگ خاصے غریب ہیں۔ ان کے لباس اور ان کے گھر اس بات کا اظہار کر رہے تھے۔ گیٹ سے پہلے اس کی شہرت وہاں پہنچ چکی تھی اور وہ لوگ گیٹ کے منتظر تھے۔ گیٹ نے وہاں جاتے ہی ان لوگوں میں ضرورت کی چیزیں، کپڑے اور مختلف تحائف تقسیم کیے تھے۔ بستی کے لوگوں کے چہروں پر اطمینان اور خوشی کی جھلک نظر آ رہی تھی خاص طور سے بچے بہت خوش تھے پھر گیٹ نے ان سے چھوٹا سا خطاب کیا تھا جس کی ویڈیو این نے بنائی تھی۔

”ہم یہاں آپ لوگوں کی مدد کرنے آئے ہیں۔ ہم بیماری کے خلاف جہالت کے خلاف اور طالبان کے خلاف ہیں ہم سلسلے میں آپ کی مدد کریں گے اگر آپ پسند کریں گے تو ہم آپ کے بچوں کو تعلیم بھی دیں گے۔ ہم آپ کے دوست بننا چاہتے ہیں اور آپ کے مہمان ہیں۔“ گیٹ نے مہمان کا لفظ خاص طور سے استعمال کیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسلمانوں میں مہمان کو کیا درجہ دیا جاتا ہے اور مسلمان مہمان کی جان کی حفاظت ہر چیز سے بڑھ کر کرتے ہیں اور پھر ایسا مہمان جوان کی حفاظت کرنے آیا ہو گیٹ کو اپنی سوچ سے بھی زیادہ پزیرائی ملی تھی ہر افغان کی خواہش تھی کہ گیٹ ان کا مہمان بنے اور این کو تو بچوں نے گھیر لیا تھا وہ بچوں

میں ہر اعزیز ہونے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ اس کی دلچسپ باتیں اور مسکراہٹ بچوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی اور وہ اس کے گردیدہ ہو جاتے تھے اس نے عادت کے مطابق یہاں بھی بچوں میں مٹھائیاں، کیک اور کہانیوں کی بالخصوص کتابیں تقسیم کی تھیں۔ جنہیں حاصل کر کے سارے بچے خوش تھے اس بستی کا ان کا یہ دورہ مزید کامیاب یوں ہوا تھا کہ انہوں نے بیماروں کے لیے ایک مفت کیمپ لگا دیا تھا جہاں فوجی ڈاکٹر موجود تھے لیکن سب پروگرام کے مطابق مقامی لباس میں تھے اور مقامی بولی بول رہے تھے انہوں نے بستی کے لوگوں کا معائنہ کیا تھا اور انہیں مفید دوا میں فراہم کی تھیں وہ کیمپ کئی روز تک لگا رہا تھا اور اس کی وجہ سے گیٹ کی مقبولیت میں خاصا اضافہ ہوا تھا اور اس کی پذیرائی بڑھی تھی۔

اس رات جب گیٹ اپنی رہائش گاہ میں این کے ساتھ موجود تھا تو بہت خوش تھا۔

”این آج مجھے ایک اور کامیابی ملی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اس کے ہاتھ میں اس وقت بھی شراب کی بوتل موجود تھی جو اب اس کی عادت بن چکی تھی۔

”میں تمہارے ساتھ کام کرتی رہی ہوں لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم یہاں طالبان سے لڑنے آئے ہو..... انہیں ختم کرنے آئے ہو اور اس کام سے زیادہ تم یہاں کے لوگوں سے دوستیاں کرنے میں مصروف ہوئیے بات امریکی قانون کے خلاف ہے۔“

”ہونہہ..... امریکی قانون۔“ گیٹ کے لہجے میں موجود حقارت کو این نے محسوس کر لیا تھا۔

”کیوں؟ کیا بات ہے تم اپنے ہی ملک کے قانون کو ایسا کیوں کہتے ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ان لوگوں کو لڑنے کی صحیح اسٹریٹیجی نہیں آتی یہ دشمن پر واضح کر دیتے ہیں کہ ہم تمہارے دشمن ہیں اور تمہیں ختم کرنے آئے ہیں اس طرح انہیں کہیں بھی ہمدردی نہیں ملتی اور وہاں کی فوج کے ساتھ ساتھ وہاں کے عوام

بھی ان کے خلاف ہو جاتے ہیں پھر انہیں دو محاذوں پر لڑنا ہوتا ہے۔“ گینٹ نے کہا۔

”لیکن دشمن کے ساتھ دوستی؟“ این نے سوال کیا۔

”یہ ضروری ہے۔ تم دیکھو ویت نام میں اتنے

سال جنگ کے بعد امریکہ کو شکست ہوئی اور بھی جگہوں

پر انہیں منہ کی کھانی پڑی۔ افغانستان ان کے حلق میں

انکا ہوا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ ان کا طریقہ جنگ

غلط ہے اور وہ کھل کر مقابلے پر آ جاتے ہیں اس سے

انہیں نقصان ہوتا ہے جبکہ میں نے یہ طریقہ بدل دیا

ہے۔ دیکھو عراق میں ہمیں فتح ہوئی ہے اس

کا سہرا میرے سر ہے میں نے امریکہ کے روایتی طریقے

نہیں اپنائے اور اب میری بہادری اور میرے لڑنے

کے نئے انداز ہی کی وجہ سے مجھے یہاں تعینات کیا گیا

ہے تاکہ میں افغانستان میں امریکہ کی باری ہوئی جنگ کو

فتح میں بدل دوں یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔“ گینٹ

نے کہا وہ آہستہ آہستہ شراب کے گھونٹ لیتا جا رہا تھا اور

زیادہ پی لینے کی وجہ سے اس کی آواز اس کا ساتھ نہیں

دے رہی تھی۔ الفاظ بھی صاف ادا نہیں ہو رہے تھے۔

”بس کرو گینٹ۔ تم نے بہت پی لی ہے۔“ این

نے اس کے ہاتھ سے بوتل لیتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ رہنے دو۔۔۔۔۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ ہار

کو جیت میں کیسے بدلتے ہیں۔“ اس نے این کو چھینچ کر

اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے میری وہ ٹیبلٹ

دے دو میں سکون چاہتا ہوں۔“

”تم بہت زیادہ نشہ کرنے لگے ہو یہ شراب کیا کم تھی

کہ اب تم نشے کی دوائیں بھی لے رہے ہو۔“

”تم بس دے دو۔ مجھے سکون چاہیے تم دیکھنا۔۔۔۔۔

یہ افغان۔۔۔۔۔ یہ سب سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی مدد کرنے

آئے ہیں اور یہ اس جنگ میں طالبان اور القاعدہ کے

خلاف ہماری مدد کریں گے۔ ہم جیتیں گے۔“ گینٹ

نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

این نے اسے بستر پر لٹا دیا تھا اور اس کی نشہ آور

گولیاں اسے دے دی تھیں۔

”ہمیں دو محاذوں پر لڑنا نہیں پڑے گا اب افغان

ہمیں دشمن سمجھ کر ہم سے لڑنے کے بجائے ہمیں دوست

سمجھ کر ہماری مدد کریں گے۔“ گینٹ نے کہا آخری

جملہ ادا کرتے کرتے اس پر غنودگی چھا گئی تھی اور این

اس کے قریب بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ

اس جنگ میں گینٹ نے بہت سے فوجی تو انہیں توڑے

ہیں اگر وہ یہ جنگ نہ جیت سکا تو اس کا کیا انجام ہوگا؟

اگلے دن گینٹ دیر سے سوکر اٹھا تھا۔ این اس کے

قریب اس کے بستر پر ہی موجود تھی۔

”تم رات بہت بہک رہے تھے۔“ این نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ لیکن میں افغانوں کے دل جیتنے میں

کامیاب ہو گیا ہوں۔“

”ہوسکتا ہے۔۔۔۔۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا اگر میں

موقع پر انہوں نے تمہارا ساتھ دیا اور تمہیں کامیابی بھی

نصیب ہوگئی تو شاید تمہیں کئی امریکی تو انہیں توڑنے کی

وضاحت نہ کرنی پڑے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ دیکھا جائے گا۔“ گینٹ نے بے

پروائی سے کہا۔

”فی الحال تو میرا مقصد افغانستان میں امریکہ کی

باری ہوئی جنگ کو جیتنا ہے۔“ گینٹ نے کہا اور پھر این

کی طرف دیکھنے لگا۔

”این! تم نے کیا سوچا؟ مجھ سے شادی کے بارے

میں۔۔۔۔۔؟“ اچانک ہی اس نے این سے سوال کر دیا۔

”تم ابھی تک اسی بات پر اڑے ہوئے ہو۔“ این

نے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں

کر سکتا۔۔۔۔۔ تم میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہو تمہیں پتہ

ہے میں اپنی ذی پونی بھی پورے طور پر ادا نہیں

کر پار ہوں کیونکہ تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے

ذہن سے نہیں نکال سکتا۔“

کر دیا..... میں تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گا۔“ اس نے
والہانہ انداز میں کہا۔

”لیکن یہ کام کیسے ہوگا؟ ہمارا راز فاش ہو جائے
گا۔“ این کی آنکھوں میں خوف جھلکنے لگا۔

”تمہیں..... میں پوری رازداری رکھوں گا۔ میں اس
کام میں اپنے دوست پیٹر یو اور نور افضل کی مدد لوں گا۔“

گینٹ نے کہا اور پھر ہوا بھی یہی تھا اس نے نور افضل کو یہ
خوشخبری سنائی تو وہ بھی بہت خوش ہوا وہ پہلے ہی جانتا تھا
کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور اب وہ
شادی کر کے رشتہ ازدواج میں بندھنا چاہتے ہیں تو اس
نیک کام میں وہ اس کی مدد کرنے کے لیے تیار تھا۔

پھر اسی شام نور افضل کے ڈیرے پر یہ کام کیا گیا تھا۔
شادی کی اس مختصر سی تقریب میں گینٹ اور این کے علاوہ
نور افضل اس کے گھر والے گینٹ کا دوست پیٹر یو شامل
تھے۔ نور افضل کی بیوی نے این کو افغان دہن کا لباس
پہنایا تھا اور اسے تیار کیا تھا اس شادی کی رسومات
ادا کرنے کے بعد وہ رات گینٹ اور این نے نور افضل
کے ڈیرے پر ہی گزار دی تھی اور اس شادی کا علم اس میں
شریک ہونے والوں کے علاوہ کسی کو نہیں ہوا تھا۔

شادی ہونے کے بعد بھی گینٹ اور این وہی معمول
کی زندگی گزارتے رہے تھے جو شادی سے پہلے گزار
رہے تھے اسی طرح گینٹ اپنے فوجیوں کے ساتھ
طالبان کے مقابلوں کے لیے جاتا تھا این اسی طرح
کیمرہ کے ساتھ ان مقابلوں کی رپورٹنگ کر کے
واشنگٹن اپنے میگزین کو بھیجتی تھی اور معرکوں کے موقع پر
اپنا کام کرنے کے ساتھ ساتھ گینٹ کی مدد بھی کرتی تھی
اس کا کام رپورٹنگ کے علاوہ گینٹ کے فوجیوں کو اگلے
مورچوں پر اسلحہ فراہم کرنا بھی تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ
وہ دونوں پہاڑیوں کے درمیان بننے نور افضل کی طرف
سے تھنے میں دیئے گئے گھر میں ایک شادی شدہ بھرپور
زندگی گزار رہے تھے لیکن ڈیوٹی کے اوقات میں گینٹ
کبھی بھی اپنے فوجی کیمپ سے غیر حاضر نہیں ہوتا تھا ان

”تم جانتے ہو..... میں شادی شدہ ہوں.....
میرے چار بچے ہیں۔“ این نے اسے سمجھانے والے
انداز میں کہا۔

”میں جانتا ہوں..... میں بھی شادی شدہ ہوں اور
میرے بھی چار بچے ہیں لیکن یہ عشق و محبت..... میں اس
کا کیا کروں یہ دل میرے بس میں نہیں ہے۔“

”تم اپنے لیے خطرناک مسائل پیدا کر رہے ہو،
تمہارا قوانین کو توڑنا..... افغانوں سے بے تکلفی
نشہ کرنا اور میرا عشق تمہیں برباد کر دے گا..... عقل کے
ناخن لو..... اور صرف اپنی ذمہ داریوں پر توجہ دو۔“

”میں نہیں کر سکتا..... برگز بھی نہیں کر سکتا“ میرا
ذہن میرے ساتھ نہیں ہے..... اگر تم میرا ساتھ دینا
چاہتی ہو اور یہ چاہتی ہو کہ مجھے کامیابی نصیب ہو تو
تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔“ گینٹ نے کہا این اسے
حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

”تم بتاؤ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟“ گینٹ
نے پوچھا۔

”کرتی ہوں..... تم میرے سپنوں کے شہزادے ہو۔
میں نے ہمیشہ ایسے ہی بہادر آدمی کی خواہش کی تھی لیکن
..... این خاموش ہو گئی اس کے چہرے پر بے بسی تھی۔
”لیکن کیا..... لیکن کیا این؟“ گینٹ نے اسے
کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”میں ڈرتی ہوں۔“ این کی آنکھوں میں آنسو
جھلملا رہے تھے۔

”ڈرو نہیں..... کوڈ پڑو..... اسٹیپ آن۔ اس نے
فوجی اصطلاح میں کہا اور این چند لمحوں تک اسے محبت
بھری نظروں سے دیکھتی رہی پھر جیسے بارمان گئی تھی اور اس
نے گینٹ کے کاندھے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔
”ٹھیک سے..... میں تیار ہوں۔“ این نے اس کے
کان میں سرگوشی کی تھی اور گینٹ خوشی سے پاگل
ہو گیا تھا۔

”اوہ..... تھینک یو این..... تم نے مجھے خوش

تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ غلطیاں سب ہی کرتے ہیں تم ان کی غلطیوں سے فائدہ اٹھانا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے نسوار بھی کھاتا جا رہا تھا جو اس نے نور افضل سے سیکھا تھا تا کہ اصل افغان دکھائی دے۔

”اپنی طرف سے لڑائی میں پہل مت کرنا لیکن اگر کوئی تم سے لڑنا چاہے تو بہادری سے اس کا مقابلہ کرنا اور اسے مار دینا ورنہ تمہارا دشمن تمہیں مار دے گا۔۔۔۔۔ یہ جان لو کہ مقامی لوگ بھی تمہاری مدد جب کریں گے جب تم اپنے دفاع یا ان کے دفاع کے لیے لڑ رہے ہوں گے تم نے لڑائی کرنے میں پہل کی تو ان کی ہمدردیاں تمہیں نہیں ملیں گی۔“

”لیکن رابرٹ کی وجہ سے ہم پریشان ہیں۔“ ایک فوجی نے کہا۔

”ہاں میں جانتا ہوں وہ ہمارا اسٹاف فوجی سارجنٹ روبرٹ ہیلٹر تھا اس کی حماقت کی وجہ سے ہم زیادہ خطرے میں ہیں جنگ بڑھ جانے کی وجہ سے وہ فرار ہو گیا ہے۔ اور اس نے گاؤں کے سولہ لوگوں کو ذبح کر دیا ہے لیکن ہمیں یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ طالبان کی کارروائی ہے۔۔۔۔۔ ہمارے فوجی نے ایسا نہیں کیا۔۔۔۔۔ لیکن تمہیں کسی کو جواب دینے کی ضرورت نہیں میں یہ معاملہ خود دیکھ لوں گا۔“ گینٹ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”دیکھو آج رات تمہیں خود کو محفوظ رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔“ اس نے ایک ایک فوجی کی طرف اشارہ کیا۔

”تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ میں تم سب کو کہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔ اس کی فکر مت کرو کہ وہ بھیڑیے کس پوزیشن میں ہیں۔۔۔۔۔ تمہیں ساری رات پیرونگ کرنا ہے۔۔۔۔۔ اوکے۔۔۔۔۔ جاگتے رہنا۔۔۔۔۔ اور کل سہ پہر تک چھپے رہنا اس کے بعد ان بھیڑیوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا ہے۔۔۔۔۔ صورت حال خراب بھی ہو سکتی ہے پتہ چلا ہے کہ اسامہ بن لادن کو بھی یہاں دیکھا گیا ہے۔۔۔۔۔ وہ بھوکے بھیڑیے کی طرح پھر رہا ہے۔۔۔۔۔ وہ کوئی موقع نہیں چھوڑے گا۔“

دونوں کی ملاقاتیں رات کے وقت ہوتی تھیں پھر ان کی زندگی میں ایک اور کٹھن وقت آیا جب امریکی فوجیوں نے کونار جیل میں ایک آپریشن کے دوران غلطی سے قرآن پاک جلادیا۔ انہیں اطلاع ملی تھی کہ کونار جیل میں کچھ طالبان چھپے ہوئے ہیں اور انہیں وہاں تحفظ دیا جا رہا ہے فوجیوں نے وہاں آپریشن کیا اور اس موقع پر غلطی سے قرآن پاک جلادیا گیا اس پر افغان عوام اور طالبان میں بھی نفرت اور غصے کی لہر دوڑنی اور امریکیوں کے خلاف ان کی کارروائیوں میں شدت آگئی گینٹ کو جب اطلاع ملی تو اس نے اپنے اہم فوجی حکام کو فوجی کیمپ میں اپنے آفس میں طلب کیا اور انہیں کچھ اہم ہدایات دیں اس موقع پر وہ بہت چاقی و چوبند نظر آ رہا تھا اور یہ میٹنگ رات کے وقت کی گئی تھی۔ انہیں ہر لمحے طالبان کے حملے کا ڈر تھا کیونکہ کسی بھی وقت وہ جوانی کارروائی کر سکتے تھے گینٹ کا بریفنگ روم چٹانوں پر بنا ہوا تھا اس کی بنیادیں سیمنٹ کی اینٹوں کی تھیں جن کے اوپر چٹانوں نے دیواروں کی صورت اختیار کی ہوئی تھی جب وہ اپنے فوجیوں کو ہدایات دے رہا تھا اس وقت وہ خود اور اس کے فوجی بھی اپنے فوجی وردی ہی میں تھے ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔

”تمہیں بہت ہی محتاط رہنا ہوگا۔“ اس نے اپنے فوجیوں کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اس کے ہاتھ میں پانی کی ایک خالی بوتل تھی جسے وہ آہستہ آہستہ اپنی پٹھلی پر مارتا جا رہا تھا۔

”اپنے سامان کو بچانا۔۔۔۔۔ وہ تمہارے سامان پر قبضہ کریں گے اور تمہیں نہتا کر دیں گے۔۔۔۔۔ انہیں شکست دینا آسان ہے۔۔۔۔۔ اپنے چاروں طرف نظر رکھنا۔۔۔۔۔ چاہے تم کچھ بھی کر رہے ہو چوکے رہنا اپنے اطراف سے باخبر رہنا۔۔۔۔۔ زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے تمہیں نقصان ہوگا۔ باتیں کرنے کے لیے آواز اور الفاظ کا استعمال کرنے کے بجائے اشاروں کا استعمال کرنا تمہاری ذرا سی غلطی

اس میننگ کے بعد گیٹ نے نور افضل کے ڈیرے پر مقامی لوگوں سے بھی میننگ کی - وہاں سارے اہم افغان لیڈر موجود تھے۔

”طالبان سے اپنے گھروں کی حفاظت کرو اپنے بچوں کی حفاظت کرو..... میں یہاں لڑتے نہیں آیا تمہاری مدد کرنے آیا ہوں اگر ہم پر حملہ کیا تو ہم تیار ہیں ہم ان کے حملوں کا جواب مل کر دیں گے..... ہم بھی لڑنے میں پہل نہیں کریں گے..... ہمارے پاس بہترین ماؤرن اسلحہ ہے..... تربیت یافتہ لوگ ہیں..... بہترین گاڑیاں ہیں جن میں ضرورت کے مطابق اسلحہ بھی ہے اور ان پر ریڈار بھی لگے ہوئے ہیں جو بل پل ہمیں دشمن کے ٹھکانوں کی نشاندہی کریں گے۔“ گیٹ بڑی مہارت سے افغانوں کو سمجھا رہا تھا۔

پھر دوسرے دن اس کے خدشہ کے مطابق ان کے فورس میں پر طالبان نے حملہ کر دیا تھا رات کا وقت تھا وہ سب اپنے کیمپوں میں آرام کر رہے تھے ایک فوجی دستہ کیمپ کے باہر پہرہ دے رہا تھا اور کچھ فاصلے پر مقامی لوگ جن کی کمانڈ نور افضل کر رہا تھا موجود تھے اور ایسے ہی کسی حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے فورس کیمپ میں اسلحہ سے بھری ہوئی فوجی گاڑیاں موجود تھیں جیسے ہی حملہ ہوا تمام فوجی اپنی اپنی پوزیشنوں پر پہنچ گئے تھے اور حملے کا بھرپور جواب دے رہے تھے۔ گیٹ بھی ایک..... میں موجود تھا اور این بڑی مہارت سے فورس میں میں ہونے والے معرکے کی ویڈیو بنا رہی تھی۔

افغان طالبان نے بہت شدید حملہ کیا تھا گولیاں کسی لمحے رک نہیں رہی تھیں فورس کمپاؤنڈ میں کھڑا ہونا ممکن نہیں تھا جو فوجی گولیوں کا جواب دے رہے تھے وہ بھی کسی دیوار کسی گاڑی یا کسی ٹینک کی آڑ میں رہ کر جواب دے رہے تھے دن بھر فاروں کا تبادلہ ہوتا رہا تھا وقتے وقتے سے گرینینڈ بھی پھینکے جا رہے تھے۔ رات کے قریب اس حملے میں کمی آئی تھی اب امریکی فوجی نور افضل کے مجاہدوں کے ساتھ مل کر باہر سے طالبان کے

حملوں کا جواب دے رہے تھے اور کمپاؤنڈ کے اندر سے گیٹ اپنے ساتھیوں کے ساتھ فارنگ کر رہا تھا۔ رات کے آخری پہر میں گولیوں کا یہ تبادلہ بند ہو گیا تھا یا تو طالبان تھک گئے تھے یا ان کا اسلحہ ختم ہو گیا تھا۔ رات گئے گیٹ نے نور افضل کے مجاہدوں اور اپنے فوجیوں کے ساتھ ایک ساتھ میننگ کی تھی اور انہیں ضروری ہدایات دی تھیں اور چند گھنٹوں بعد طالبان کا حملہ دوبارہ شروع ہو گیا تھا اور دونوں طرف سے دھواں دھار لڑائی شروع ہو گئی تھی۔

اس بار کے حملے میں کئی فوجی اور نور افضل کے کئی مجاہد زخمی ہوئے تھے جنہیں امریکی بیس ہی میں ٹریٹمنٹ دیا گیا تھا امریکی فوجیوں اور نور افضل کے فوجیوں کو طبی امداد دیتے اور ان کا علاج کرنے میں کسی تفریق کا اظہار نہیں کیا جا رہا تھا گیٹ بذات خود اس کام کی نگرانی بھی کر رہا تھا اور این اس کے ساتھ رہتے ہوئے ایک ماہر نرس کے فرائض بھی انجام دے رہی تھی۔

”تم بہت بہادر ہو۔“ ایک موقع پر نور افضل نے این سے کہا وہ ایک زخمی کو دوایا رہی تھی۔

”میں نے تم جیسی بہادر عورت نہیں دیکھی جو یوں اپنی آسان زندگی چھوڑ کر ایک مشکل ترین زندگی گزار رہی ہے۔“

”میں یہ سب اپنے وطن اور گیٹ کے لیے کر رہی ہوں۔ اس کے علاوہ غریب انسانیت کی خدمت کرنا میرا مذہب ہے مجھے مظلوموں کی مدد کر کے سکون ملتا ہے۔“

این نے جواب دیا جس سے نور افضل بہت متاثر ہوا۔

پھر طالبان کے حملے کا تیسرا دن تھا جب یہ اطلاع ملی کہ طالبان نے اس شے میں ایک قریبی گاؤں پر حملہ کر دیا ہے کہ ان کی جان کا دشمن گیٹ اپنی منظور نظر این کے ساتھ وہاں موجود ہے حالانکہ گیٹ اپنے کیمپ میں موجود تھا لیکن شاید طالبان کو غلط فہمی تھی یا غلط اطلاع دی گئی تھی انہوں نے کئی ہفتے شہریوں کے گھروں میں تلاشی بھی کی تھی لیکن اس واقعے کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی

”اور..... یہاں؟..... یہاں کون ہوگا؟“ این نے پوچھا۔

”کوئی اور..... میرے جیسا سر پھرا..... یا پھر تو این پر چلنے والا کوئی بہادر۔“ گینٹ نے ہنس کر کہا۔

”میں تمہیں سمجھاتی تھی کہ یہ کام خطرناک ہے..... میں اسی لیے شادی کے لیے رضامند نہیں تھی..... دیکھو تمہارا اور میرا کیرئیر تباہ ہو گیا۔“

”کوئی بات نہیں..... مجھے ملازمت جانے کا دکھ تو ہے لیکن تمہیں پانے کی خوشی اس سے کہیں زیادہ ہے۔“ گینٹ نے کہا این حیرت اور خوشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

انگلے ہی روز وہ دنوں امریکہ کے لیے روانہ ہو گئے تھے اس کی رجسٹر میں سب کو یہ خبر پتہ چل گئی تھی اور ہر کسی کو ان سے ہمدردی تھی انہیں گینٹ کی بہادری اور ہوشیاری پر پورا بھروسہ تھا وہ اس کا ساتھ دینا چاہتے تھے لیکن مجبور تھے کیونکہ گینٹ پر قانون توڑنے کا الزام لگ چکا تھا اور جو جیسے جھٹلا یا نہیں جاسکتا تھا۔

امریکی آرمی نے بڑے خفیہ انداز میں اس کیس کو دو سال تک ڈیل کیا اور اس بارے میں کوئی خبر عام لوگوں تک نہ پہنچنے دی لیکن پھر جون ۲۰۱۳ میں شام سنات نیج کر ۲۱ منٹ پر ABC نیوز پر اس کا انٹرویو نشر ہوا اور لوگوں کو حیران کر گیا۔

”میں نے اپنی ایک ذاتی تنیلاتی دنیا بسائی تھی جس میں این کے ساتھ رہتا تھا اس سے محبت کرتا تھا میں طالبان کے درمیان تھا اور میں نشہ آور گولیوں کا اور شراب کا بھی عادی ہو گیا تھا لیکن میں اس زندگی سے خوش تھا۔“ اس نے ABC نیوز کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔

”میں نے جب این سے شادی کی درخواست کی تو وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی لیکن آخر کار میں نے اس کا دل جیت لیا تھا۔“

”مجھ سے ریٹائر ہونے کے لیے کہا گیا۔ مجھ سے

کہ نورافضل اور گینٹ کچھ ساتھیوں کے ساتھ موقع پر پہنچ گئے تھے اور چند گھنٹوں ان کا مقابلہ کرنے کے بعد انہیں مار بھگا یا تھا پھر فورس کیمپ پر بھی طالبان کے حملے کا زور ٹوٹ گیا تھا اور وہ رات گینٹ اور اس کے ساتھیوں نے سکون سے گزاری تھی۔

انگلے صبح گینٹ این کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا کہ اسے امریکی ہیڈ کوارٹر سے ایک خط موصول ہوا جو یلینڈ جنرل جان مالہولینڈ کی طرف سے تھا اور جان مالہولینڈ اس وقت امریکی فوج میں اسپیشل آپریشن برانچ میں تھا اور ڈپٹی کمانڈر آف اسپیشل برانچ تھا اس خط نے گینٹ کے ہوش اڑا دیے وہی ہوا تھا جس کا خطرہ تھا کسی نے اس کی مخبری کر دی تھی اور اسپیشل آپریشن برانچ کو پتہ چل گیا تھا کہ گینٹ اپنی مرضی سے افغانستان میں امریکی قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے ساتھ ساتھ آپریشن کے دوران ایک امریکی رپورٹر عورت کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے اور نشے کا بھی عادی ہو گیا ہے اس کا یہ جرم ناقابل معافی ہے۔

جان مالہولینڈ نے اپنے خط میں گینٹ کو مخاطب کیا تھا اور اس نے لکھا تھا۔

”ایک آفیسر ہونے کے باوجود تم نے اپنی عزت خود خاک میں ملائی ہے اور ہمیں افسوس ہے کہ اب تمہیں اعتبار کے قابل نہیں سمجھا جا رہا تمہیں فوراً واپس آنا ہے۔“ گینٹ کے ہاتھ سے خط چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔ این حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی پھر اس نے جھٹک کر خط اٹھا یا تھا وہ بھی اسے پڑھ کر حیران رہ گئی تھی اسے ڈرتا تھا کہ ان کا یہ راز ایک دن فاش ہو جائے گا لیکن اتنی جلدی یہ ہوگا اس کا اندازہ اسے نہیں تھا ابھی اسے گینٹ کے ساتھ یہاں محبت بھری زندگی گزارتے ہوئے صرف نو ماہ ہی ہوئے تھے۔

”اب کیا ہوگا؟“ اس نے آہستہ سے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”واپس جا میں گے۔“ گینٹ نے کہا۔

سے اس کی بیوی این نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اس پر اسامہ بن لادن کی طرف سے بھی حملہ کیا گیا تھا لیکن وہ بڑی مہارت سے بچ نکلا تھا اس واقعے کا ذکر این نے اپنی کتاب

spartan`the American
promise.the
mission and the Betrayal of
special forces Major jim cant.
میں کہا ہے

اپنے شہر کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے گھینٹ سوچتا ہے کہ ایک..... فورس کمانڈر کا انجام کیا یہی تھا کہ اسے یو ایس آرمی سے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا جائے صرف اس لیے کہ اس نے ایک جنگی رپورٹر سے محبت کی تھی اور شادی کی تھی اور این جس نے اپنی جاب کی تھی اس لیے چھوڑ دی تھی کہ اس نے گھینٹ کے ساتھ ایک سال تک خاموش زندگی گزاری تھی وہ بھی دنیا کی خطرناک ترین جگہ افغان پوسٹ پر..... لیکن وہ دونوں اپنی موجودہ زندگی سے بھی خوش ہیں اور محبت میں کامیابی ان کی فتح ہے۔

اکثر شام کو وہ دونوں جب اکٹھے بیٹھتے ہیں تو ماضی کی یادوں میں گم ہو جاتے ہیں اور افغانستان میں گزارے ہوئے محبت پھرے لمحات کو یاد کر کے محظوظ ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں محبت میں نہیں جو فتح حاصل ہوئی ہے وہ ملازمت جانے کی خوشی سے بہت زیادہ ہے۔



میرے اعزازات بھی لے لئے گئے لیکن میں نے این کے ساتھ رہ کر جو کامیابی حاصل کی یہ اس سے بہت کم ہے میرے لیے این کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات بہت قیمتی ہیں۔“ گھینٹ بہت افسردہ نظر آ رہا تھا ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا۔

”ہم دونوں جانتے تھے کہ ہم جو کر رہے ہیں وہ بہت خطرناک ہے لیکن اگر مجھے موقع ملے تو میں یہ سب دوبارہ کرنے کو تیار ہوں مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔“ اس نے مزید کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ میں اپنے عہدے سے بالاتر ہو کر غلط کام کر رہا تھا لیکن اصول توڑنے پر بھی کامیابی مل سکتی ہے..... میں نے بار کر بھی میدان نہیں چھوڑا..... میں نے بھی ایک آدمی کا نقصان بھی نہیں اٹھایا اور اپنی جدوجہد کی لڑائی کے بدلے مجھے تیس بہادری کے ایوارڈ ملے..... ہم نے ہر روز ان سے لڑائی کی اور اپنے تمام آدمیوں کو زندہ سلامت واپس لے کر آیا..... میں جانتا ہوں کہ اصولوں کو توڑ کر بھی بعض اوقات کامیابی حاصل ہو سکتی ہے..... میں نے لارنس آف عربیہ سے م کردار ادا نہیں کیا اور لوگ مجھے لارنس آف افغانستان یونہی نہیں کہتے۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گیا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

اب گھینٹ اور این اپنے وطن Seathle میں پرسکون زندگی گزار رہے ہیں لیکن گھینٹ کو اپنا عہدہ جانے کا بہت دکھ ہے۔

وہ اب بھی اپنی بیس سالہ زندگی میں ملنے والے رخصتوں کو یاد کرتا ہے اور اس خطرناک برین انجری کو یاد کرتا ہے جو اسے افغانستان میں سڑک کے کنارے پھینٹنے والے ایک بم دھماکے میں ہوئی۔

گھینٹ چھ گھنٹہ یا لے سے بھورے بالوں اور داڑھی کے ساتھ بلو جینز پہنے شہر کے کافی اور میوزک کے ماحول میں کھو گیا ہے اور موجودہ ذمہ داریاں پوری کر رہا

سیاست مکروہ

الشبه مخدوم

پاکستان کے زیادہ تر تعلیمی ادارے سیاست کا گزہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ملک کے سیاسی حالات کا ان پر براہ راست اثر پڑ رہا ہے۔ یہاں زہر تعلیم پر طالب علم کو کسی نہ کسی سیاسی گروہ کا ساتھ لازمی دنیا ہوتا ورنہ اس پر مذکورہ ادارے کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ سیاسی کرائم نمبر کے لیے بطور خاص اہک کالج کی طالبہ کا احوال جو اپنی شرارتوں، نہانت اور صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور تھی۔ وہ اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

وہ حادثہ تھا، اپنا حق مانگنے کی سزا جو بھی تھا میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ سدرہ کے بارے میں جیسے ہی یہ سنا کہ وہ ضلعی اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ وہ میری کلاس فیلو تھی اور کالج میں اپنی شرارتوں، ذہانت اور صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور تھی۔ وہ اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

ہمارے کالج میں بنیادی طور پر دو گروپ تھے۔ ایک گروپ شہری لڑکیوں کا اور دوسرا دیہاتی لڑکیوں کا تھا۔ میں شہر میں رہتی تھی اور وہ دیہات سے تعلق رکھتی تھی۔ لمبے قد کی گوری چینی اور بھر پور جسم کی مالک تھی۔ گہرے سیاہ گھنے بال، موٹی آنکھیں، بھرے بھرے گال تیز تیز باتیں کرنے والی۔ اسے لباس کے بارے میں اتنا سلیقہ نہیں تھا۔ یونیفارم تو تھا ہی لیکن کبھی کبھار جب کوئی فنکشن ہوتا تو اس میں وہ نری دیہاتی ہی لگتی تھی۔ وہ گہرے اور اوٹ پناٹگ قسم کے رنگ، گونا گونا کناری اور پرانے فیشن کی کنگ ڈالے لباس ہی پہنتی تھی۔ یہ سب ہونے کے باوجود وہ اپنی باتوں اپنے بولڈ پن اور بہادری کی وجہ سے ہر کسی کے دل میں گھر کر جاتی تھی۔ دیہاتی لڑکیوں کے گروپ میں ہونے کی وجہ سے وہ اتنا زیادہ شہری لڑکیوں میں گھلتی مٹی نہیں تھی۔

میرے ساتھ اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہی تھی کہ میرے خاندان میں وکیل کچھ زیادہ ہی ہیں اور سدرہ کی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کے وکیل بنے۔ اس کی یہ خواہش کیوں تھی؟ یہ اس نے کبھی نہیں بتایا تھا۔ بس اتنا کہہ دیا کرتی تھی کہ مجھے وکیل بننا اچھا لگتا ہے۔

کالج دور کے بعد بھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کے وکیل بننے کا خواب ابھورا تھا یا پورا ہو گیا تھا؟ مجھے اس بارے میں بھی کوئی خبر نہیں تھی۔

میں بی ایس ای کر گئی تو وہ بی اے کرنے کے بعد ایک دم سے م ہو گئی۔ بس ایک دن اس کا مجھے فون ملا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ تقریباً تین برس بعد اس کی آواز سنی تھی۔ اس نے مجھ سے ملنا چاہا تھا اور میں نے بخوشی اسے اپنے گھر بلا دیا تھا لیکن بجائے ملاقات کے اس کے بارے میں یہ خبر ملی کہ اس کے گھر کو آگ لگ گئی تھی جس میں وہ بری طرح جھس گئی تھی۔ مقامی اسپتال والوں نے سہولیات نہ ہونے کے باعث ضلعی اسپتال میں لے جانے کا مشورہ دیا تو اسے وہاں لے گئے۔

دو پہر کے وقت مجھے پتہ چلا۔ یہ خبر سننے کے دو گھنٹے تک میں اسے دکھ کے حصار سے نہ نکل سکی۔ مجھے دکھ کے ساتھ یہ جھس بھی تھا کہ آخر وہ مجھ سے ملنا

”لیکن میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم اگر اس کے بارے میں سن لو گی تو مجھے امید ہے کہ یہ سب سن کر تم وہاں نہ جانے کا فیصلہ کر لو گی۔“ اس نے کہا تو میں بولی۔

”ٹھیک ہے بتاؤ۔“

”چلو میں بتا دیتا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں خاموش رہی۔ وہ آہستہ آہستہ بتانے لگا۔



سدرہ کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ لیکن ایسا بھی غریب نہیں کہ وہ دو وقت کی روٹی کو ترس جائیں۔ ان کی زمین تھی جو کسی وقت اس کے دادا نے بنائی تھی۔ اس علاقے میں جن لوگوں کو زمین الاٹ ہوئی تھی وہ نو آباد کار تھے۔ حکومت نے اس علاقے میں نہر نکال کر گاؤں آباد کئے تھے۔ انہوں نے بھی یہ زمین اس لیے بنائی تھی کہ پانی کا وسیلہ ہے نہر کے ساتھ زمین ہے ہوتے ہوتے آباد ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ نہر کے منبع اور ان کی زمین کے درمیان کئی بڑے بڑے جاگیردار تھے۔ وہ سارا پانی روک لیتے۔ وہ لوگ ٹیلوں پر تھے۔ باوجود زمین دار ہونے کے ان کی زمین پانی نہ ہونے کے باعث فصل نہ دے سکتی تھی۔ یوں وہ تم پشتم وقت گزار رہے تھے۔ سدرہ بچپن ہی سے اس تنگ دستی کو دیکھتی چلی آرہی تھی۔ سارے علاقے کی طرح وہ یہی سمجھتی تھی کہ اگر ان کی زمینوں کے لیے پانی دستیاب ہو جائے جو ان کا حق ہے تو وہ لوگ بھی خوشحال زندگی گزار سکتے ہیں اور ان کی تمام تر تنگ دستی کے ذمہ دار وہی دو جاگیردار ہیں جو اپنے اثر و رسوخ اور طاقت کے باعث ان کا پانی روک لیتے ہیں۔

ان کی شنوائی کہیں نہیں تھی۔ اگر کوئی محکمے کو درخواست دیتا تو اس کی خیر نہیں ہوتی تھی۔ وہ کسی نہ کسی

کیوں چاہتی تھی؟ تبھی میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس سے ملنے ضرور جاؤں گی۔ گھر سے ضلعی اسپتال تک کا راستہ سوا گھنٹے کا تھا۔ میں نے اپنے کزن سے کہا کہ وہ مجھے ضلعی اسپتال لے جائے۔

”یہ تمہیں اچانک کیا کام پڑ گیا وہاں اور وہ بھی اس وقت؟“

”مجھے ضلعی اسپتال جانا ہے اپنی ایک دوست کی عیادت کرنی ہے اور واپس آ جانا ہے۔“ میں نے بتایا

”صبح چلیں گے۔ ابھی گئے تو واپس آتے رات ہو جائے گی۔“ اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا

”دیکھو گاڑی مجھے بھی چلانا آتی ہے میں خود چلی جاؤں گی۔“ میں نے رعب دکھایا۔

”کیا اتنا ہی ضروری ہے وہاں جانا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تبھی تو اس وقت جانے کا کہہ رہی ہوں۔“ میں نے اسے احساس دلایا۔

”مجھے اس وقت بھی تمہیں لے جانے پر اعتراض نہیں ہے لیکن پلیز مجھے بتاؤ تو۔ کوئی اتنی اہم ہی سہیلی ہے تمہاری کون ہے وہ؟“

تب میں نے سدرہ کے بارے میں بتا کر کہا

”پتہ نہیں وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی؟“

”میرے خیال میں اگر تم وہاں نہ ہی جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔ میں اس کے بارے میں جانتا ہوں بلکہ پوری بات سے آگاہ ہوں۔ اگر چاہو تو مجھ سے ساری بات سن لو۔“ میرے کزن نے صوفے پر پھیل کر اطمینان سے کہا۔

”تم چلو تو سہی اور جو تمہیں معلوم ہے وہ راستے میں بتا دینا اس طرح راستہ بھی آسانی سے کٹ جائے گا۔“ میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

اس کی شادی کر دی جائے۔ سدرہ آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ اس نے کچھ وقت کے لیے مہلت مانگی۔ جو اسے نہیں دی گئی۔ معاملہ کافی بڑھا۔ بات یہاں پر آ کر ختم ہو گئی کہ فی الحال اس کا نکاح کر دیا جائے۔ جب یہ وکالت پاس کر لے گی اور اس کا تایا زاد دوبارہ واپس آ جائے گا تو رخصتی ہو جائے گی۔ یہ تنازعہ طے ہوا لیکن اس کے ساتھ ایک دوسرے مسئلے نے سر اٹھا لیا۔ دونوں بھائیوں کی اولادیں یہ چاہتی تھیں کہ زمین بانٹ لی جائے۔ جس کے حصے میں جو آتی ہے اسے مل جائے۔ تایا زاد کا خیال تھا کہ زمین بیچ کر وہ شہر میں کوئی کاروبار کریں گے۔ یہاں کھیتی باڑی میں کہاں اتنی آمدن ہے۔ یہ معاملہ بھی تب تک کے لیے نالا جانے لگا۔ لیکن ایسا نہ ہوا اور ان کی زمین تقسیم ہوئی۔ سدرہ کا چونکہ ایک ہی بھائی تھا ساری زمین اسے مل گئی۔ باقی کو بہت تھوڑی تھوڑی آئی۔ جو بھی ہوا وہ وقت گزر گیا۔

سدرہ نے دوسرے شہر کی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور پڑھنے لگی۔ انہی دنوں اسے پتہ چلا کہ ان کے ساتھ والے گاؤں کا ایک لڑکا وسیم الحق بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ اس کا شعبہ الگ تھا۔ اکثر اوقات ان کا آمناسامنا ہو جاتا۔ پھر ان میں بات چیت بھی شروع ہو گئی۔ یہ بات چیت اس وقت گہری دوستی میں بدل گئی جب دونوں کو پتہ چلا کہ بنیادی طور پر وہ دونوں ہی اپنے علاقے کے سیاست دانوں کے خلاف ہیں۔ اور ان سے نجات کے نئے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ ان کی باتیں اسی موضوع کے گرد گھومنے لگیں۔

سدرہ ذہین تھی اس نے ان دونوں جاگیرداروں کے خلاف آواز بلند کرنا شروع کر دی۔ وہ اخباروں اور رسالوں میں لکھنے لگی۔ جب بھی وہ یونیورسٹی سے

طرح زخم کھا کر خاموش ہو جاتا اور اگر کوئی سر پھر اقسام کا افسر آ جاتا تو اس کی خیر نہیں ہوتی تھی۔ یا تو اس کا تبادلہ کر دیا جاتا یا پھر اس قدر ڈرایا دھمکایا جاتا کہ وہ خود ہی تبادلہ کروا کے چلا جاتا۔ موج اگر تھی تو چھوٹے عملے کی وہ ہر طرح سے کھاتے پیتے تھے۔ اس علاقے کے پٹواری دونوں ہاتھوں سے نوٹ کمار ہے تھے۔ وہ دو جاگیردار اگر صرف جاگیردار ہی ہوتے تو کہیں نہ کہیں سے شاید کوئی معاملہ حل ہو جانے کی امید ہوتی لیکن دراصل دونوں سیاست دان بھی تھے۔ اعجاز خان ہمیشہ ایم این اے کی سیٹ جیت جاتا اور اللہ یار ایم پی اے بن جاتا دونوں ایک ساتھ ہو کر پورے علاقے پر حکومت کر رہے تھے۔ انہیں روکنے والے کوئی نہیں تھا۔ وہ لوگ اپنے جرائم پر سیاست کا پردہ ڈالے ہوئے تھے۔

یہ وہ حالات تھے جس نے سدرہ کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس علاقے میں اگر سیاسی تبدیلی ہوگی تو ہی ان کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ ورنہ وہ تو یہ عذاب بھگت رہے ہیں ان کی آئندہ نسل بھی بھگتے گی۔ وہ دن رات یہی سوچتی رہتی۔ اس کے تعلیم حاصل کرنے کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما تھا۔ وہ بڑے خواب دیکھا کرتی تھی کہ وہ وکیل بنے گی وکالت کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کو ان دونوں سیاست دانوں کے بارے میں شعور دے گی کہ وہ لوگ کس طرح ان کا استحصال کر رہے ہیں اور ان کے اس ظلم سے کسے بچا جاسکتا ہے۔

اس نے کالج کی تعلیم ختم کی تھی اور آگے پڑھنے کا سوچ رہی تھی۔ وہ پیپر دے کر فارغ تھی اور رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی کہ انہی دنوں اس کی شادی کی بات ہونے لگی۔ اس کا تایا زاد وہی میں کام کرتا تھا۔ وہ آ یا ہوا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ اب یہ آیا ہوا ہے تو

ہے۔ اور خلق خدا کی خدمت عبادت ہے۔ یوں وقت گزرتا گیا اور ضلعی حکومتوں کے لیے ایکشن کا شور شروع ہو گیا۔ جس طرح ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ جیسے ہی ایکشن کا موسم آ جائے انہی دنوں نہ صرف نئے نئے لیڈر پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں بلکہ عوامی خدمت کا نقاب اوڑھ کر بہترے بہروپے بھی ایکشن میں کود پڑتے ہیں۔ مقابلہ کی فضا بن جاتی ہے۔ ان میں کئی لوگوں کی روٹی روزی نکل رہی ہے۔

ضلعی نظام کے اس ایکشن میں ہر یونین کونسل کی سطح پر ناظم اور نائب ناظم کے چناؤ کے ساتھ آٹھ دوسرے ممبران بھی چنے جانے تھے۔ پھر تمام یونین کونسلوں کے ممبران مل کر تحصیل کا ناظم اور نائب ناظم کا چناؤ کرنا تھا۔ مقابلے کی اس فضا میں انہی جاگیرداروں کی طرف سے ایک امیدوار کرم داد تحصیل ناظم کے لیے سامنے آ گیا اور اس نے اپنا گروپ تشکیل دے کر ایکشن کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تو دوسری طرف عبدالرحیم کا گروپ سامنے آ گیا اور ایکشن مہم شروع ہو گئی۔

عبدالرحیم گروپ کو لیڈی کونسلر نہیں مل رہی تھی۔ وسیم اس گروپ کا حصہ تھا۔ اس نے گروپ کی توجہ سدرہ کی طرف دلائی کہ لیڈی کونسلر کے لیے اس سے بہتر امیدوار کوئی نہیں ہے۔ وہ سارے کا سارا گروپ ان کے گھر آ گیا اور سدرہ کے باپ کو مجبور کر دیا کہ لیڈی کونسلر کے لیے سدرہ کو امیدوار بنا دیں۔ اس میں سدرہ کی بھی خواہش تھی۔ سو ایکشن مہم میں وہ بھی شامل ہو گئی۔ اس کی حامی عورتوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ این جی او والوں نے بھی اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا۔ دن بدن اس کی کامیابی کے امکانات روشن ہوتے چلے گئے۔

واپس آتی اپنے ارد گرد کی عورتوں اور خاص طور پر نوجوان لڑکیوں کو سمجھاتی کہ ان کے سب سے بڑے دشمن وہی دونوں سیاست دان ہیں۔ جوان کے وسائل پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ تقریباً ایک برس کے اندر اندر اس نے اپنے بہت سارے ہم خیال پیدا کر لیے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی جس شہر میں وہ پڑھتی تھی۔ وہاں کی ایک این جی او تھی۔ وہ لوگ میڈیکل کیمپ لگواتے تھے۔ وسیم اور سدرہ این جی او والوں سے ملے۔ وہ راضی ہو گئے اور ہر مہینے ایک میڈیکل کیمپ لگانے لگے۔ علاقہ وہی تھا لیکن ہر بار گاؤں بدل جاتا۔ اس علاقے کے ہر گھر میں سدرہ اور وسیم کا نام پہنچ گیا۔ جو نہیں جانتے تھے وہ بھی پہچاننے لگے۔ دونوں ہی علاقے کا چھوٹا موٹا کام کرنے لگے تھے۔ سدرہ نے گاؤں کی لڑکیوں کے لیے ایک سلائی اسکول بھی کھول دیا جہاں لڑکیاں سینے پرونے کا ہنر سیکھنے لگیں۔

جو علاقوں پر حکومت کرتے ہیں وہ بے خبر نہیں ہوتے۔ علاقے میں چلنے والی مخالف ہواؤں پر وہ ہمیشہ گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ انہیں سدرہ کی سرگرمیاں کھٹکنے لگیں۔ وہ اس کی ٹوہ میں رہنے لگے کہ وہ کیا کرتی ہے؟ وہ سدرہ اور وسیم کی سرگرمیوں بارے میں پوری طرح آگاہ تھے۔ انہیں یہ پوری طرح احساس ہو گیا کہ دونوں ہی ان کے خلاف بے حد نفرت رکھتے ہیں۔ ان کی نفرت کیوں تھی یہ بھی انہیں معلوم ہو گیا تھا۔

کوئی بھی حکمران اپنی مخالفت برداشت نہیں کر سکتا۔ اسے وہ خوشامدی تو پسند ہوتے ہیں جو اس کی رگوں میں مینھاڑ ہر اتارتے رہتے ہیں۔ جو انہیں سمجھ ہی نہیں آنے دیتے سیاست کا دوسرا نام عوامی خدمت

دل ایک سپر ہائی وے

نماز کے دوران دل میں غیر اختیاری دوسو سے آنے کی وجہ سے مایوس یا پریشانی کا شکار ہونے کی بالکل ضرورت نہیں؛ دراصل انسان کا قلب تو ایک سپر ہائی وے کی مانند ہے اس پر شاہی سواریاں بھی گزرتی ہیں۔ امیر کبیر بھی چلتے ہیں، غریب اور فقیر بھی گزرتے ہیں۔ خوب صورتیوں اور بد شکلوں کی بھی یہی گزرگاہ ہے، نیلو کاروں، پارساؤں، مجرموں اور گناہ گاروں کے لیے بھی یہ شارع عام ہے۔

عافیت اس میں سے کہ اس شاہراہ پر جیسی بھی ٹریفک آئے اسے خاموشی سے گزرنے دیا جائے اگر اس ٹریفک کی طرف متوجہ ہو کر اسے بند کرنے یا اس کا رخ موڑنے کی کوشش کی گئی تو دل کی سڑک پر پھیر جام ہونے کا شدید خطرہ ہے۔ اس راستے کا ٹریفک سگنل صرف سبز بتی پر مشتمل ہوتا ہے اس میں سرخ بتی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

شیخ سکندر قریشی..... لاڑکانہ

”کیوں نہیں۔“ یہ کہہ کر اس خاتون نے تفصیل بتانی شروع کر دی۔ وہ سارے کے سارے فونو اس کے یونیورسٹی اور ایک ریسٹوران کے تھے۔ جہاں وہ وسیم کے ساتھ گئی تھی۔ خاتون نے تو اسے اطلاع دے کر فون بند کر دیا مگر اسے سوچ میں ڈال دیا کہ یہ سب کیسے ہوا اور کس نے کیا؟

اسی دن وہ وسیم سے ملی۔ ساری بات سن کر اس نے کہا۔

”تمہیں آج پتا چلا ہے۔ مجھے تو ایک ہفتہ سے

ایکشن ہوا اور اس کا جو نتیجہ سامنے آیا اس میں عبدالرحیم گروپ تو ہار گیا، لیکن ان کے دو امیدوار سدردہ اور وسیم کا والد چوہدری نیاز کامیاب ہو گئے۔ اب اس سے اگلا مرحلہ تحصیل ناظم کے چننے کا تھا۔ ان کی یونین کونسل کا ناظم چوہدری منظور تھا۔ اس نے کرم داد کے ووٹوں کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ کرم داد گروپ کے لوگ بھی ان کے پاس آنے لگے۔ انہوں نے منت سماجت سے لے کر پیسوں کی آفر تک کی لیکن چوہدری نیاز نہیں مانا۔ تب انہیں دھمکیاں آنا شروع ہو گئیں۔ لالچ سے لیکر ڈرانے دھمکانے کا سلسلہ چنانچہ تک رہا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب تحصیل ناظم کا چناؤ ہونا تھا۔ انہوں نے مخالفت میں ووٹ دیا لیکن کرم داد تحصیل ناظم بن گیا۔ جس کا چوہدری منظور کو بے حد رنج تھا۔

ایکشن کا ہنگامہ ختم ہوا تو سدردہ پھر سے یونیورسٹی آ گئی۔ کچھ دن بعد وسیم بھی آ گیا۔ چونکہ ایکشن کے دنوں میں وہ بہت قریب رہے تھے اس لیے ان دونوں میں قربت ہو جانا فطری سی بات تھی۔ دن گذرتے گئے یہاں تک کہ ایک دن اسے اپنے ہی گاؤں سے ایک خاتون کا فون ملا۔ چند باتوں کے بعد اس خاتون نے پوچھا۔

”سدردہ! کیا تم وہاں یونیورسٹی میں وسیم سے عشق کا چکر چلا رہی ہو؟“

”یہ کیا کہہ رہی ہو اور ایسی بات تم سے کس نے کہی؟“ سدردہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”ارے یہاں تو ہر گھر میں یہ بات پھیلی ہوئی ہے تمہارے اور اس کے فونو بھی ہیں وسیم کے ساتھ۔“ جیسے ہی اس نے کہا اسے لگا کوئی سازش اپنا کام دکھا گئی ہے۔ اس لیے سدردہ نے بڑے جھل سے پوچھا۔

”کیسے فونو ہیں ان کے بارے میں بتا سکتی ہو؟“

گاؤں کا ہے۔ وہ گرم داد کے گروپ کا ہی ہے۔ ایکشن کے دنوں میں وہ بڑا سرگرم تھا۔ اسی نے سیل فون سے تصویریں بنوائی ہیں۔ اس نے کئی لوگوں کے سامنے اعتراف بھی کیا ہے۔ میں آج گاؤں جا رہا ہوں۔ اگر چاہو تو تم بھی آ جاؤ۔ اس پر سردرہ نے اگلے دن آنے کا کہہ دیا۔

سردرہ گاؤں آئی تو سب سے پہلے اسے اپنے والدین کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اس سے متحضر ہو چکے تھے۔ ان کا کوئی اور بس نہیں چلا تو یہی کہہ دیا کہ اب پڑھنا لکھنا بند یہ بمبری بھی ختم۔ وہ اس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ اس کے تایا کے بیٹے نے بھی بہت جلد آنے کی ہامی بھری لیکن سردرہ کا یہ سوال تھا کہ جب ایسا کچھ نہیں ہے تو پھر اسے یہ سزا کیوں دی جا رہی ہے؟ مگر کسی نے بھی اس کی نہیں سنی۔ اسے یونیورسٹی جانے سے منع کر دیا گیا۔ وہ خاموش ہو گئی تاکہ اس وقت تو ان لوگوں کو غصہ ہے لیکن کچھ دن بعد جب انہیں یقین آ جائے گا کہ وہ بے گناہ ہے اور اس کے خلاف سازش کی گئی ہے تو وہ دوبارہ سے یونیورسٹی چلی جائے گی۔ اسے انتظار کرنا تھا۔

ایک ہفتہ ہی گذرا تھا۔ وسیم نے اس لڑکے کو پکڑ لیا اور اس نے ساری بات اگل دی۔ وہ اس لڑکے کا کچھ نہیں کر سکتا تھا سوائے جوتے مارنے کے۔ وہ اس نے مار دیئے۔ اسے خوب ذلیل کیا۔ وہ لڑکا چوہدری منظور کے پاس چاہ پہنچا۔ انہوں نے وسیم کے خلاف تھانے میں اقدام قتل کا پرچہ کروا دیا۔ بات حد سے بڑھ گئی۔ ایک طرف اقتدار کی قوت تھی تو دوسری طرف سچائی۔ چوہدری منظور اور اس کے حواری تو یہ موقع تلاش کر رہے تھے کہ ایسا کچھ ہوا اور یونین کونسل میں یہ دو لوگ مخالفت کرنے والے ہیں یہ بھی ختم ہو جائیں۔ اور پھر وہ اپنی من مانی کریں۔ دوسرا وہ سیاسی

معلوم ہے۔“
”تو پھر تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ سردرہ نے تلخی سے پوچھا۔

”تم خواہ مخواہ پریشان ہوتی۔ اس نے تجھ سے جواب دیا تو اس نے غصے میں پوچھا۔
”کیا میں اب پریشان نہیں ہوں؟“

”ظاہر ہے بات پریشانی والی ہے۔ پریشان تو ہونا بنتا ہے۔ لیکن میں انتظار کر رہا تھا کہ مجھے یہ پتہ چل جائے کہ یہ حرکت کس نے کی ہے؟“ وسیم نے پھر محل سے کہا۔

”آپ کے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟“ سردرہ نے پوچھا تو وسیم بولا۔

”ایک دو دن میں معلوم ہو جائے گا۔ میں نے یہاں بھی اور گاؤں میں بھی بندے لگائے ہوئے ہیں۔ فکر نہ کرو میں.....“

”مگر میں اپنے گھر والوں کا سامنا کیسے کروں گی؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”دیکھو۔ اگر ہم میں کوئی غلط ہے تو پھر تمہیں ڈرنا چاہئے جب ہمارے درمیان ایسی کوئی بات ہی نہیں تو پھر ہمیں اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ تم اپنے گھر والوں کو بتاؤ کہ یہ غلط بات ہے اور کوئی ہمارے خلاف ایسا کر رہا ہے۔“ وسیم نے اسے سمجھایا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہیں یہ سیاسی مخالفین کا تو کام نہیں ہے؟“ سردرہ نے پوچھا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ خیر مجھے ایک دو دن دوسب کچھ سامنے آ جائے گا۔“ وسیم نے اسے حوصلہ دیا تو وہ کچھ دیر ساتھ رہنے کے بعد جدا ہو گئے۔

دو دن بعد اسے وسیم نے فون کر کے بتایا کہ اس بندے کا پتہ چل گیا ہے۔ اس نے یہ سب کچھ چوہدری منظور کے ایما پر کیا۔ وہ لڑکا ہمارے ہی

کام زیادہ کرنے لگی تاکہ اسے مزید ترقی دے سکے۔
دو ہفتے نہیں گزرے تھے کہ ایک خاتون نے انہی
کریکشن میں درخواست دے دی کہ سدرہ نامی لیڈی
کو نسل کرنے اس سے بھاری رشوت لی ہے تاکہ سرکاری
ملازمت دلا سکے۔ اب نہ تو وہ پیسے واپس کر رہی ہے
اور نہ ملازمت دلوا رہی ہے۔

اس درخواست کے بارے میں اسے پتہ ہی اس
وقت لگا جب پولیس اسے پکڑنے کے لیے ان کے
گاؤں آگئی۔ گاؤں میں کسی کے گھر پولیس یوں چھاپہ
مار دے تو ان کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوتا ہے۔
وہ لوگ مہر تھے کہ وہ سدرہ کو لے کر ہی جائیں گے۔
لیکن سدرہ ہمسائیوں کے گھر میں جا چھپی۔ یہاں
بھی وسیم کا والد چوہدری نیازان کے کام آیا۔ اس نے
لے دے کے ان پولیس والوں کو واپس بھیج دیا۔ ان
سے دو دن کی مہلت مانگی گئی۔

سدرہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے ساتھ یہ سب
کیوں ہو رہا ہے؟ اس دوران جہاں سدرہ کے گھر
والوں نے چوہدری نیازان کے ساتھ مل کر ضمانت
کروائی وہاں وسیم بھی اس کے کام آیا۔ اس نے
درخواست دینے والی عورت سے رابطہ کیا اور
درخواست واپس لینے کی بات کی۔ وہ عورت بہت
خرانت تھی۔ اس نے کرم داد گروپ سے پیسے لیے
ہوئے تھے۔ اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ہمیں
استغفی دے دو تو ہم درخواست واپس لے لیتے
ہیں۔ اس پر سدرہ مان جاتی لیکن اس کے تایا زاد نے
دوبئی سے فون کر کے اس کے رشتے ہی سے انکار کر
دیا کہ میں ایسی لڑکی کے ساتھ شادی ہی نہیں کرنا
چاہتا جسے پکڑنے پولیس گھر آگئی ہو۔ اس کے تایا
زاد کا فون کیا آتا تھا۔ گاؤں کے علاوہ پورے علاقے
میں افوہ ساز فیکٹریوں نے نجانے کیا کیا افواہیں

انتقام بھی تو لینا چاہتے تھے۔ وہ پورے علاقے پر اپنی
دھماک بٹھا دینا چاہتے تھے۔ لوگوں کو یہ بتا دینا
چاہتے تھے کہ وہ ہی ہیں جو پورے علاقے میں من
مانی کر سکتے ہیں۔ ان کے مخالفین ان کا سامنا نہیں کر
سکتے۔ انہیں نظر آ رہا تھا کہ آگے اسمبلیوں کے الیکشن
ہیں۔ ابھی سے علاقے کو اپنی گرفت میں لے لیں۔
وہ انہی دونوں کو پھل دینا چاہتے تھے۔

وسیم کو پکڑ کر حوالات میں ڈال دیا گیا تھا۔ یہ تو ان
کی قسمت اچھی تھی یا ان کا تھوڑا بہت اثر رسوخ
تھا جس کے بل بوتے پر اس کی ضمانت ہو گئی۔ اس
سارے تنازعے میں لوگوں کو بہر حال پتہ چل گیا کہ
سدرہ کے خلاف سازش کی گئی تھی۔ لیکن افواہیں اس
قدر تھیں کہ گرد میں معاملہ صاف نہیں ہوا۔ اس کے
گھر والوں کا من بھی کافی حد تک صاف تو ہو گیا۔
لیکن یونیورسٹی جانے کی اجازت پھر بھی نہیں دی گئی۔
چوہدری منظور اور کرم داد گروپ کے لوگ سدرہ
کے باپ کے پاس آئے اور بڑے آرام سے سدرہ کا
استغفی مانگ لیا۔ انہوں نے وسیم کی مثال دے کر کہا
کہ ایسا اس کی بیٹی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا
باپ تو پہلے ہی تیار تھا۔ اس نے کرم داد گروپ کے
بندوں سے استغفی دینے کا وعدہ کر لیا۔ جب اس کے
باپ نے بات کی تو اس نے یہی شرط رکھ دی کہ وہ وسیم
کے خلاف پرچہ واپس لے لیں تو وہ استغفی دے
دے گی۔ اس کی یہ شرط کرم داد گروپ کو ناگوار گذری۔
مگر وہ وقتی طور پر خاموش ہو گئے۔

سدرہ کے تایا زاد کو دوبئی سے آنے میں کچھ
رکاؤ نہیں درپیش ہوئیں تو اس نے دو ماہ بعد آنے کا کہہ
دیا۔ اب انہیں انتظار کرنا تھا۔ سدرہ نے پھر اپنے گھر
والوں سے یونیورسٹی جانے کی اجازت چاہی جو اسے
نہیں ملی۔ وہ خاموش ہو گئی لیکن اپنے سلائی اسکول کا

سارے کچھے چھٹے پریس کو دے دوں گی اور خود ہر اس
تھکے کو درخواست دوں گی جس..... اس نے کہنا چاہا تو
چوہدری منظور نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔
”کہنا نا جو مرضی کرو جس طرح ہم تمہیں عشق
کرنے سے نہیں روک سکتے۔“

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سدرہ کسی بگولے کی مانند
اٹھی اور اس نے چار قدم پر بیٹھے ہوئے چوہدری منظور
کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ
وہ ایسا کرے گی۔ کوئی بندہ بھی اسے پکڑنے کے لیے
آگے نہیں بڑھا۔ دوسری لیڈی کونسلر اویڈیٹر عمر عورت
تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ بھی سدرہ نے دہاڑتے
ہوئے کہا۔

”اب میرا ہاتھ کھل گیا ہے چوہدری منظور۔ کل
شام تک درخواست واپس لے لو۔ ورنہ میں جو
تمہارے ساتھ کروں گی وہ زمانہ دیکھے گا میں باہر کھڑی
تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ اب تو نے جو کرنا ہے کر۔“
سدرہ یہ کہہ کر وہاں سے نکل پڑی۔ باہر وسیم کھڑا
تھا۔ جس وقت تک سدرہ باہر آئی اسی طرح اندر کی
بازگشت بھی باہر آگئی۔ ایک دم سے پاپل چُج گئی۔
سدرہ یونین کونسل کے ان میں کھڑی تھی۔ کوئی بندہ
باہر نہیں آیا۔ بھی چوہدری نیاز ہی نے آکر اسے سمجھایا
بجھایا اور اسے ساتھ لے کر گاؤں چلا گیا۔ اپنے گھرا
آ کر اس نے سمجھایا

”دیکھو جینی! میں مانتا ہوں کہ انہوں نے بہت
برا کیا تھا اس پر تمہارا رد عمل کوئی نئی یا انوکھی بات
نہیں۔ لیکن یہاں کی سیاست جرم کی خوراک پر
پرورش پانی سے۔ تمہارا یہ رد عمل جرم کی ابتدا بن
جائے گا۔ ایک جنگ.....“

”جنگ شروع ہوتی ہے تو ہو جائے۔ انہوں نے
ذلیل کرنے کی اخیر کر دی ہے۔ کیا لڑکی ہونا جرم

گھڑیں اور پھیلا دیں۔ تبھی سدرہ دلیر ہو گئی۔ ان
نے اپنے من میں طے کر لیا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔
کچھ ہی دنوں بعد یونین کونسل کا اجلاس رکھ لیا
گیا۔ اس نے وسیم کو ملنے کے لیے کہا اور اسے بتا دیا
کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ جو بھی ہوگا وہ
اس کے لیے تیار ہے۔ اس نے بھی اس کی ماں میں
ہاں ملا دی۔ اجلاس والے دن وہ بڑے اہتمام سے
وہاں چلی گئی۔ وسیم بھی اپنے باپ کے ساتھ یونین
کونسل کے دفتر چلا گیا۔

اجلاس جاری تھا۔ تمام ممبران کے ساتھ کچھ
دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ بھی سدرہ نے چوہدری
منظور سے کہا

”جناب ناظم صاحب! مجھ پر جو جھوٹی اور ناجائز
درخواست دی گئی ہے اس بارے آپ جانتے ہیں؟“
”ہاں مجھے پتہ چلا ہے۔ اب تم نے رقم کھانی ہو
گی تو وہ غریب درخواست دینے پر مجبور ہوگی۔ ناظم
نے بڑے تفاخر اور طنز یہ انداز میں یوں کہا جیسے اس
بات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ بھی سدرہ نے انتہائی
غصے میں کہا

”نہیں چوہدری منظور! یہ درخواست صرف اور
صرف تمہاری بے غیرتی کی وجہ سے دی گئی ہے۔ اگر
کل شام تک وہ درخواست واپس نہ لی گئی تو میں
تمہارے ساتھ بہت برا کروں گی۔“

اس پر وہ طنز یہ انداز میں بولا۔
”جو کرنا ہے وہ بڑے شوق سے کرو۔ میں اس کا
دفاع کروں گا۔ سیاست میں تو ہوتا ہی ہے۔ تم ابھی
سے پاگل ہو رہی ہو۔“

”یہ سیاست نہیں غنڈہ گردی ہے۔“ سدرہ نے کہا
”تو یہی سمجھ لو۔“ اس نے یہ کہہ کر قبضہ لگا دیا۔

”دیکھو۔ درخواست واپس لے لو۔ ورنہ میں

ہے۔ کیا اپنے حق کی آواز اٹھانا جرم ہے۔“ سدرہ نے نہایت غصے میں کہا۔

”جرم ہے نہیں بنا دیا جاتا ہے۔ ہمارا سیاسی نظام ایسا ہے جس میں مجرم پیدا کئے جا رہے ہیں۔ جو بھی حق کی آواز اٹھاتا ہے اسے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جو کمزور ہوتے ہیں وہ یا تو دب جاتے ہیں یا پھر وہ ایسا شعلہ بن کر ابھرتے ہیں کہ جو جرم کی راہ پر اپنا آپ بھی جلا لیتا ہے۔ یہ طاقت کی جنگ ہے اور جرم ہی اس کو بڑھاتا ہے۔“

”کچھ بھی ہے تایا جی میں اب نہیں چھوڑوں گی۔ میں ابھی جاؤں گی اور اس عورت کا بھی بندوبست کرتی ہوں۔“ سدرہ نے کہا اور اٹھ گئی۔

”نہیں بیٹی! آج تم اس کی طرف نہیں جاؤ گی۔ آج شام یارات میں اس کا کوئی حل نکالتا ہوں۔ پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ حوصلے اور صبر سے کام لو۔ کل پھر بات کرتے ہیں۔“ چوہدری نیاز نے سمجھا سمجھا کر اپنے گھر بھجوا دیا۔

اس وقت سہ پہر ہو رہی تھی جب وہ گھر واپس لوٹی۔ اس کے گھر آنے سے پہلے ہی یونین کونسل میں پیش آنے والے واقعے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اس کے گھر والوں میں سے کسی نے اس سے بات نہیں کی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ایک ایسی مصیبت کو گلے لگا آئی ہے جس سے چھوٹا بہت مشکل ہے۔ وہ شام تک بھی اپنے گھر نہیں رہ سکی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ اپنے گھر میں نہیں رہے گی۔ وہ کل اپنا سب کچھ لے لی اور یونیورسٹی نکل جائے گی۔ پھر جب تک معاملہ حل نہیں ہو جاتا وہ وہیں رہے گی۔ وہ اپنے سلائی اسکول چلی گئی۔ اس نے رات وہیں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اسکول کا چوکیدار اس کے لیے اپنے گھر سے کھانا بنوانے چلا گیا۔ اس دوران سدرہ نے وہیں سے وسیم

کوفون کر کے پوچھا کہ وہ کہاں پر ہے۔ وہ اس سے مل کر اگلا لاکھ عمل تیار کرنا چاہتی تھی۔ وسیم شہر سے واپس آ رہا تھا۔ اس نے وسیم کو وہیں اسکول میں بلا لیا تاکہ سکون سے بات کر سکے۔ اس کے ذہن میں بہت کچھ چل رہا تھا۔ وسیم نے اس سے ملنے کا وعدہ کر لیا کہ وہ شہر سے واپسی پر سیدھا اس کے پاس آ رہا ہے۔

وہ کھانا کھا چکی تھی۔ جب وہ اس کے پاس آ گیا۔ ان دونوں نے وہیں بیٹھ گئے سارے حالات کا تجزیہ کیا۔ انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ اب کرم دادا اور اس کے سارے سیاسی گروپ کے ساتھ اسی زبان میں بات کی جائے گی جس زبان میں وہ بات کریں گے اگر کل شام تک انہوں نے درخواست واپس نہ لی تو وہ بھی اپنی کسی خاتون کے ذریعے درخواست دے دیں۔ اس کے علاوہ وہ ہر طرح کے رد عمل کے لیے تیار ہو گئے۔ تقریباً دس بجے کے قریب وسیم اس کے پاس سے اٹھ کر اپنے گھر کو چلا گیا اور وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔

رات کا پچھلا پہر تھا جب اچانک سلائی اسکول میں آگ لگ گئی۔ آگ لگانے والوں نے پہلے چوکیدار کو قبا بویا۔ پھر اسکول میں اس طرح آگ لگائی کہ وہ آگ دم سے بھڑک اٹھی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ سدرہ کی آنکھ کافی دیر بعد کھلی۔ اس نے شور مچایا۔ تو لوگوں کو پتہ چلا۔ وہ اسے بچانے کے لیے دوڑے۔ سدرہ کو بچا تو لیا گیا لیکن اس کی حالت بہت بری تھی۔



میرے کزن نے ساری تفصیل بتا دی تھی تو میں نے اس سے پوچھا۔

”تمہیں یہ سب کیسے پتہ؟“

”اس لیے کہ وسیم کے والد چوہدری نیاز کے ہم

کرپٹ سیاسی نظام کے سمندر میں ایک اور جرم یوں ڈوب جائے گا کہ اس کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔ اور اگر فریج گئی تو اس کی جتنی زندگی بھی ہوگی وہ جنگ کرتے گذرے گی۔ وہ بھی وہی ہتھکنڈے اپنائے گی جرم کی راہ پر چلے گی۔“

”ایسا کیوں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”دراصل ہمارے اس کرپٹ اور بدبودار سیاسی

نظام کی کوکھ سے جرم ہی پیدا ہو رہا ہے۔ اسی سیاسی نظام میں طاقت والے ظلم کر رہے ہیں اور مظلوم ظلم سہہ رہے ہیں۔ جو ظلم نہیں سہتے وہ باغی ہو جاتے ہیں اور ان کا انجام سدرہ کی طرح ہی ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا پھر مجھ سے پوچھا۔ ”اب چلو گی؟“

”نہیں، کل چلیں گے۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں رات بہت دیر تک سدرہ کے بارے میں سوچتی رہی۔ مجھے یہی لگا کہ اس سزا مند مارتے ہوئے سیاسی نظام میں باصلاحیت اور حساس لوگ ویسے ہی مر جاتے ہیں۔ میں اگر سدرہ سے مل بھی لوں گی تو کیا کر پاؤں گی؟

اگلے دن صبح صبح سدرہ کے فوت ہو جانے کی خبر آ گئی۔ میں فیصلہ نہیں کر سکی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔



وکیل ہیں۔ سدرہ کا کیس بھی ہم نے لڑا تھا۔ اور اب بھی ہمارے پاس ہی ہے۔“ میرے کزن نے کہا۔ جیسے کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرے خاندان میں زیادہ وکیل ہیں۔ بڑوں نے جھوٹوں کو سکھایا اور وہ سب ایک گروپ میں کام کر رہے ہیں۔

”تمہیں کیا لگتا ہے سدرہ کہاں تک ٹھیک تھی کیا اس نے یہ سب کر کے غلطی نہیں کی؟“

”ہاں ایشہ! اس نے بہت بڑی غلطی کی۔ جیسا تک میں سمجھتا ہوں وہ ایک بے وقوف لڑکی تھی اور.....“ اس نے کہا تو میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ”نہیں، میں نہیں مانتی کہ وہ بے وقوف تھی۔“

”میں اسے بے وقوف ان معنوں میں کہہ رہا ہوں کہ اس نے خواہ مخواہ یہ جنگ شروع کر دی تھی۔

حالانکہ جنگ اسی وقت لڑی جاتی ہے جب تھوڑی بہت بھی اس کے پاس قوت ہوتی۔ اسے یہ نہیں پتہ

تھا کہ اس کا مقابلہ جاہل بے غیرت اور کمینے سیاست دانوں سے ہے اور وہ ہمارے معاشرے کی ایک مجبور اور بے بس لڑکی۔ جس کے والدین بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔“ میرے کزن نے کافی حد تک جذبات سے کہا

”کیا اپنے حق کی آواز بلند کرنا جرم ہے کیا؟“ میں اس سے بحث کرتے ہوئے کہا

”دیکھو! امن صرف اس وقت قائم ہوتا ہے جب طاقت کا توازن ہو۔ یہ جو ہمارا سیاسی نظام ہے یہ

بہت کرپٹ ہو چکا ہے۔ اب دیکھو ہوگا کیا؟“

”کیا ہوگا؟ یہی ہوگا کہ وہ مر جائے گی یا اگر فریج گئی تو ان کے خلاف لڑے گی۔“ میں نے جواب دیا۔

”جب تک اڑنے کے لیے پَر پورے نہ ہوں اس وقت تک فضا میں اڑان نہیں بھری جاسکتی۔ اس نے بھی ایسا کیا اور زمین پر آ رہی۔ وہ مر گئی تو اس

غیر سیاسی انٹرویو

خورشید پیرزادہ

ہمارے ملک میں کتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ایسے ہیں جو ہاتھوں ہاتھ ڈگریاں لیے گھومتے ہیں مگر ان کو کہیں نوکری نہیں ملتی کیونکہ ہمارے ملک کا نظام ہی خراب ہے۔ یہاں صرف اس کو نوکری ملتی ہے جس کی کوئی بڑی سفارش ہوتی ہے یا پھر وہ رشوت دہنے کا اہل ہوتا ہے۔

حالات کی سبتانی ایک جرسٹن کی کا احوال جس نے ہلا کسی اجرت اعزازی رپورٹر بنا منظور کر لیا تھا۔
سیاسی کرائم نمبر کے لیے بطور خاص ایک غیر سیاسی انٹرویو

شریف کا ملک کے سیاسی اور فوجی شریفوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے) میں یہ بات آگئی کہ پاکستان کے کسی ٹی وی چینل میں اتنا شعور نہیں ہے کہ وہ میرے جیسی ہونہار جرنلسٹ کی نا تجربہ کاری سے فائدہ اٹھا سکے۔

اور جب غیر ارادہ طور پر یہ بات میں نے اپنے گھر والوں کے سامنے کہی تو سب ہی میرا مذاق اڑانے لگے کہ ہم تو پہلے ہی منع کر رہے تھے کہ اس آگ میں مت کودو مگر تم مانی ہی نہیں اب بھگتو لیکن میں بھی کہاں بارمانے والی تھی۔ میں نے سراسیمہ سے رجوع کیا کہ اب کیا کیا جائے آخر کیا وجہ ہے تو انہوں نے نہایت رسائیت کے ساتھ میرے دماغ میں یہ بات بٹھائی کہ میرے پاس نہ تجربہ ہے اور نہ ہی سفارش۔ میں بولی تو سر آپ ہی کہیں سفارش کر دیں نا انہوں نے کہا جیٹا میری سفارش بھی کسی کام نہیں آئے گی میں حیرت سے بولی کیوں سر آپ تو جرنلزم کے اتنے بڑے استاد ہیں آپ کو کون منع کرے گا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے میرا سب سے بڑا دشمن میرا تجربہ ہے جس کو دیکھتے ہوئے چینل میں پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں کو اپنی کرسیاں خطرے میں نظر آنے لگتی ہیں۔

میں ناکام و نامراد دل کے ساتھ گھر واپس آگئی اور سوچنے لگی کہ اب اس ڈگری کا کیا کروں اوپر سے بھائی بہنوں اور دوستوں کے طعنے میرے خون جلانے کے

میرا نام ہما انصاری ہے۔ ہمارا گھرانہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ نہ جانے وہ کون سی گھڑی تھی جب میں نے جرنلزم میں ایچ اے کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔ حالانکہ میرے گھر والوں اور دوستوں نے کافی سمجھایا تھا کہ یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے اس لیے اس سے گریز ہی کرو تو تمہاری ناتواں صحت کے لیے بہتر رہے گا لیکن چیونٹی کی طرح میرے بھی پر نکل آئے تھے سو میں نے لاکھ مخالفت کے باوجود یہ امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا کیونکہ سراسیمہ نے مجھے پڑھا یا ہی اتنے اچھے طریقے سے تھا۔

چلیں جی امتحان بھی ہو گئے اور میں پاس بھی ہو گئی اور اس پاس ہونے کے زعم میں ملک کے چیدہ چیدہ نیوز چینلز پر اپنی سی وی ارسال کر دی ارسال تو کر دی لیکن یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہی کہ اگر ایک ساتھ سارے ہی چینلز نے میری ڈیمانڈ کر دی تو میں کس چینل کو ہاں کہوں اور کس چینل کو نا۔ مگر ٹی وی چینلز نے میری یہ الجھن خود ہی ختم کر دی۔ وہ بولے کہ کسی نے میری سی وی پر دھیان ہی نہیں دیا اور ایک بار ایک چینل کے باہر کھڑے کھڑے تھک بار کر میں ٹھیلے والے سے پکڑے خریدے تو کیا دیکھتی ہوں کہ وہ میری سی وی میں لٹنے ہوئے ہیں جو میں نے اس چینل میں جمع کروائی تھی۔ اس کے بعد میری عقل شریف (اس

کہاڑ خانے کو دفتر کے درجے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ میں نے دروازے پر رک کر ٹکے ٹکے دستک دی اور کوئی جواب نہ پا کر میں ہمت کر کے اندر داخل ہوئی۔

میں جب اندر داخل ہوئی تو صرف ایک ساٹھ واٹ کا بلب جل رہا تھا اب پتہ نہیں چل رہا تھا یا سسک رہا تھا۔ ٹکے ٹکے اندھیرے میں ہر جگہ اخبار کے بندلوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہ یقیناً وہ اخبار تھے جو فروخت ہونے کی حسرت لے کر واپس اپنے مقام پر پہنچ گئے تھے۔

مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں میچائی اور جب آنکھیں اندھیرے میں کچھ کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے ایک بڑے سے ڈھیر کے پیچھے کوئی انسان نما چیز نظر آئی۔ میں نے اسے ہی غنیمت جانا اور قریب پہنچ کر جھٹ سے سلام جھڑ دیا۔

آن انسان نما وہ انسان میرے سلام کی آواز سنتے ہی اس بری طرح اچھلا جیسے میں نے اس کی بغل میں بیٹھ کر خود کش جیکٹ کا ربن کھینچ لیا ہو اور جب انہوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی ہے تو ان کی جان میں کچھ جان آئی اور دوسرے ہی لمحے وہ گیدڑ سے شیر بن چکے تھے۔

”جی فرمائیے۔ یہ کون سا طریقہ ہے کسی کے دفتر میں داخل ہونے کا۔“

میں شپٹا کر بولی۔ ”سر میں نے کئی بار دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا تو اندھا نامی پڑا۔“

”اوہ۔“ وہ ایک لمبی سی اوہ کر کے بولے۔ ”میں مصروف ہی اتنا رہتا ہوں کہ مجھے آس پاس کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ آخر ایک کامیاب اخبار نکالنا کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں ہے۔“

میں نے دوبارہ ایک نظر آفس پر اور اس میں دھرے ہوئے کامیاب اخبار کے بندلوں پر ڈالی۔ وہ صاحب بھی ایک کا یاں تھے۔ میرا مطلب سمجھ کر بولے۔ ”یہ بندل ہی اخبار کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ ظاہر ہے یہ سوال پوچھنا تو میرا حق بنتا

لیے کافی تھے بلکہ یوں سمجھ لیں کہ جرنلزم کو میری چیز بنا لیا گیا تھا۔ میں مایوس کی انتہائی حدوں کو چھو رہی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی صحافیانہ عظمت دی کو کہاں خرچ کروں۔ ایسے میں ایک دن سہرا امتیاز کا فون آ گیا ان کے لہجے میں ایک جوش بھرا ہوا تھا اور انہوں نے مجھے خوش خبری سنائی کہ ایک اخبار میں پوچھنے کل رپورٹر کی اسامی کے لیے اشتہار آیا ہے جو انہوں نے ایک پٹھان کے ہونل پر چائے پینے کے دوران اخبار خرابی کرتے ہوئے دیکھا تھا اور پٹھان کی نظر جو کتے ہی انہوں نے

وہ اشتہار پھاڑ کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ میں نے سمجھے ہوئے دل کے ساتھ کہا کہ سہرا اخبار کی جاب سے کیا ہوگا تو انہوں نے کہا کہ اسے پاگل یہ جاب نہیں ہے اعزازی رپورٹر کی پوسٹ ہے یعنی تمہیں تنخواہ وغیرہ نہیں ملے گی۔ میں نے حیرت سے کہا تو پھر وہ بولے

اس سے کم از کم کئی فائدے مل سکتے ہیں۔ میں نے کہا مثلاً۔ سرنے کہا پہلا تو یہ کہ تمہیں صحافت کا عملی تجربہ ہو جائے گا دوسرے یہ کہ تمہیں گھر پر بیٹھ کر لوگوں کی باتیں نہیں سننا پڑیں گی۔ تم مصروف ہو جاؤ گی۔ اس کے بعد تم کسی اچھی جگہ بھی اپلائی کر سکتی ہو کیونکہ تمہارے پاس تجربہ ہوگا۔

سہرا امتیاز کی باتیں سن کر مجھے امید کی ایک چھوٹی سی کرن نظر آئی جو کم از کم میری چھوٹی بہن کرن کی نسبت تو کہیں بہتر تھی جو اچھے بیٹھے کھاتے پیتے مجھے صحافی صاحبہ کہہ کر پکارتی تھی۔ حالانکہ صحافی پکارے جانے پر مجھے خوش ہونا چاہئے تھا مگر اس کے لہجے میں جو طنز بھرا ہوتا تھا وہ مجھے اندر سے کاٹ کر رکھ دیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پڑھائی کے چکر میں میں نے گھر کے کسی کام میں ہاتھ نہیں لگایا تھا اور مجھ سے پیاز تک نہیں کاٹی جاتی تھی۔ لیکن اب مجھے ایک راستہ نظر آیا تھا جس کے ذریعے میں ایک عملی صحافی بن سکتی تھی۔

میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسی دن مذکورہ اخبار کے دفتر پہنچ گئی۔ دفتر کیا تھا لگتا تھا کسی

ہی تھا۔

ایک مسلمان گھرانے کا یومیہ دستور العمل

سورے بے دار ہونا تاکہ نماز فجر بروقت ادا ہو۔
نماز فجر کے بعد مسنون اذکار کا معمول، تلاوت
قرآن مجید۔ چھوٹے بچوں کو وقت پر نیند سے بے دار
کرنا تاکہ وہ وضو، غسل، نماز اور ناشتے سے فارغ ہو
کر بروقت اسکول یا مدرسہ جا سکیں۔ طلوع آفتاب
کے وقت بلکی پھلکی ورزش اور سیر کرنا تاکہ سستی دور
ہو جائے۔ پانچوں وقت کی نماز باجماعت مسجد میں ادا
کرنا، بچے والد کے ساتھ مسجد میں جائیں اور بچیاں
اپنی والدہ کے ساتھ گھر میں نماز پڑھیں۔ گھر کے
بزرگوں کی خدمت میں جا کر خیریت پوچھنا۔ دینی
اعمال کو بخوشی بجالانا۔ بات بات میں اللہ کی بڑائی
بیان کرنا۔ گھر میں دینی سب فضائل اعمال، فضائل
صدقات، بہشتی زیور وغیرہ کی تعلیم کا اہتمام کرنا۔ بعد
از عشاء جلدی سونا۔

(مرسلہ: عاطف علی..... اسلام آباد)

”وہ ایسے کہ...“ وہ صفائی دیتے ہوئے بولے۔ ”اس
ملک کے عوام اور سیاست دانوں میں اتنا شعور ہی نہیں ہے
کہ میرے اخبار میں لکھی ہوئی باتوں کو سمجھ سکیں۔“
”چلیں سر یہ بھی بہت ہے کہ آپ خود تو سمجھ لیتے
ہیں نا۔“

”جی بات تو یہ ہے کہ۔“ وہ ناک پر سینک جھا کر
مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”کبھی کبھی میں خود
بھی نہیں سمجھ پاتا کہ میں نے یہ کیا لکھ دیا ہے اور کیوں
شائع کر دیا ہے۔ بہر حال۔ تم بتاؤ کون سے ادارے
کے لیے چندہ لینا ہے۔“

”مجھے اس اخبار کے ایڈیٹر صاحب سے ملنا ہے۔“

میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

انہوں نے مجھے غور سے دیکھنے کے لیے دوبارہ

سینک ناک پر سینک کی اور مجھ سے بھی زیادہ تیز لہجے میں

بولے۔ ”تو میں تم کو کیا نظر آتا ہوں۔ میں کون چپے اسی

لگ رہا ہوں جو اس دفتر کی صفائی کر رہا ہوں۔ ارے بی

بی میں ہی اس اخبار کا اکلوتا اسٹاف ہوں سمجھیں۔“

”سمجھ گئی سر۔ تو آپ ہی وہ ہستی ہیں جن سے مجھے

ملنا ہے۔“

”اور کس سلسلے میں ملنا ہے۔ یہ بھی بتا دو۔“

”ارے سر آپ نے اشتہار دیا تھا کہ آپ کے اخبار

کے لیے ایک پوٹینشل رپورٹر کی ضرورت ہے۔“

”میں نے اشتہار دیا تھا۔“ وہ اپنے آدھے منہ مجھے سر کو

کھاتے ہوئے گہری سوچ میں پڑ گئے۔ اتنی گہری

سوچ میں کہ مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں مجھے انہیں گہری

سوچ میں غرق کر دینے کے الزام میں گرفتار نہ کر لیا

جائے۔

پھر وہ بیٹھے بیٹھے اپنی کرسی پر اچانک یوں پھد کے

کہ اگر کوئی مینڈک بھی انہیں پھدکتے ہوئے دیکھ لیتا تو

یقیناً انہیں مینڈکوں کا گرو تسلیم کر لیتا۔

”ہاں یاد آیا۔“ انہوں نے اپنی یادداشت کو پکڑ کر

اپنے دماغ میں واپس لاتے ہوئے کہا۔ ”مگر وہ تو کئی

مہینے پہلے کی بات ہے اور اب تک۔“

”اور اب تک آپ اس پوسٹ پر کسی کو رکھ چکے

ہیں۔“ میں نے مایوس لہجے میں کہا۔

”ارے کہاں خاک رکھ لیا ہے۔“ انہوں نے گلا

کھنکارا اور ہلقم کا ایک بڑا سا گولہ ایک کونے میں داغنے

بولے بولے۔ ”حرام ہے جو کسی نے اس اشتہار کے

جواب میں جھوٹے منہ ہی اس دفتر میں جھانکا ہو۔“

یہ بات سن کہ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔

”سر ہو سکتا ہے کسی نے جھانکا ہو مگر اسے آپ نظر نہ آئے

ہوں تو مایوس ہو کر چلا گیا ہو۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔“ انہوں نے میری تائید میں

سر ہلایا تو ناک پر ٹکی ہوئی سینک نے اپنی جگہ چھوڑ

دی۔ ”تو تم نے اب پڑھا ہے وہ اشتہار۔“

”نہیں سر میں بھلا کیسے پڑھ سکتی تھی۔“

لیکن وہ بھی میری طرح ایک نمبر کا سنگی ہے اور کیوں نہ ہو آخر کو میرا چھوٹا بھائی جو ٹھہرا۔“

اس انکشاف پر میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ تو یہ ایڈیٹر صاحب اور امتیاز سر آپس میں بھائی ہیں اور صحافت کی سر بلندی کے لیے ان دونوں حضرات کی اپنی اپنی جگہ برکی گئی کوشش کو سراہتے ہوئے میری آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

”ارے اس میں رونے کی کیا بات ہے۔“ انہوں نے میری آنکھوں سے نکلنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے کہا اور ان کی ڈپٹ سن کر آنسو پھارے وہیں کے وہیں ٹھنک کر رہ گئے۔

خیر قصہ مختصر میں نے اپنی سی وی ان کے آگے رکھ دی جو انہوں نے اٹھا کر ایک طرف پھینک دی۔ ”امتیاز کا حوالہ دینے کے بعد اس سی وی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ امتیاز ہر کسی گھسیارے کو کہیں جانے کا مشورہ نہیں دیتا۔ خیر تم آگئی ہو تو اچھا ہی ہوا۔ ورنہ میں ہمت کر رہا تھا کہ خود ہی جا کر یہ کارنامہ سر انجام دوں۔“

”کون سا کارنامہ سر۔“

”ارے بھئی آج کل ایک خاتون سیاستدان کا بڑا چرچا ہو رہا ہے۔“

”مثبت یا منفی؟“ میں نے سوال داغ دیا۔

”بھئی واہ۔“ انہوں نے خوش ہو کر میری پیٹھ ٹھونکی جس کے نتیجے میں میں تین ٹانگوں والے اسٹول سے اوندھنے منہ گرتے گرتے پڑی۔

”سرا بھی میں گر جاتی۔“ میں نے شکایتی لہجے میں انہیں ٹوکا۔

”کوئی بات نہیں۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔ اور صحافت کے میدان سے زیادہ خطرناک تو جنگ کا میدان بھی نہیں ہوتا۔“

”لیکن آپ نے میری پیٹھ کسی خوشی میں ٹھونکی تھی یا ٹھکرے میں۔“

”لاحول والا۔ خوشی میں ٹھونکی تھی۔ مثبت یا منفی۔“

”ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بھی اس ملک کی اکثریتی آبادی کی طرح ہو۔“

”نن نہیں سر۔ میں نے ایم اے جرنلزم امتیازی نمبروں سے پاس کیا ہے۔“ میں نے بڑے فخر سے کہا۔

”مگر ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ میں بھلا کیسے پڑھ سکتی تھی۔“ وہ میرے بال کی کھال نکالتے ہوئے بولے۔

”سروہ اشتہار میں نے نہیں میرے استاد امتیاز صاحب کے ہتھے چڑھا تھا۔“

”تھے۔“ ایڈیٹر صاحب ایک دم ہتھے سے اگڑ گئے۔ ”جی لی یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ ہتھے چڑھ گیا۔ ارے ہمارا اشتہار تھا یا کوئی اشتہاری ملزم جو پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔“

”وہ۔ وہ۔ میرا مطلب تھا کہ۔“ میں نے بات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میرے استاد امتیاز صاحب نے پڑھا تھا اتفاقاً شاید انہوں نے بازار سے کوئی سودا لیا تھا وہ اخبار میں بندھا چلا آیا تھا۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔“ وہ ٹھنڈے ہو کر کرسی پر پھیلنے ہوئے بولے۔ حالانکہ وہ پھارے کتنا بھی پھیلنے بیکار تھا۔ اتنے شخصی سے تھے کہ ایک کرسی پر ان جیسے دو ڈھائی ایڈیٹر تو آرام سے استراحت فرما سکتے تھے۔ ”تو تمہارے استاد امتیاز صاحب نے وہ اشتہار دیکھا۔ امتیاز۔ امتیاز۔ جرنلزم۔ ارے کہیں یہ وہی امتیاز تو نہیں ہے جو یونیورسٹی میں جرنلزم پڑھانے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے۔“

”جی جی سر۔ وہی ہیں۔ کیا آپ ان کو جانتے ہیں۔“ میں یہ جان کر خوش ہو گئی کہ یہ سر امتیاز کے جاننے والے ہیں اب تو میرا کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔

”اس گدھے کو کون نہیں جانتا۔“ انہوں نے سر امتیاز کو شاندار خطاب سے نوازتے ہوئے کہا۔ ”میں کتنی بار اسے سمجھا چکا ہوں کہ میاں کیوں خواہ مخواہ بچے بچیوں کو جرنلزم پڑھا کر ان کا مستقبل تار یک کر رہے ہو۔“

واہ۔ اس کا مطلب ہے کہ تم میں صحافت کے جراثیم کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔“

”جی۔ صبح تین بجے؟“ میں حیرت سے بولی۔
”ارے ان سیاست دانوں اور شو بزز والوں کی صبح ہی سہہ پہر تین بجے ہوتی ہے۔ نئی ہوا ہستا ہستا خود ہی سمجھ جاؤ گی۔“

”جی سر۔ حالانکہ میرے گھر والوں نے کئی قسم کے اسپرے کر کے ان جراثیموں کو مارنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن۔“

”بہت بہت مہربانی سر۔ اچھا اب میں جاؤں۔“
”ارے ایسے کیسے جاؤں۔ چائے پانی کے بغیر کیسے جانے دیں۔“

”لیکن ناکام ہی رہے۔ گڈ۔ میں تمہارے اندر مستقبل کی نہایت کامیاب صحافی کو دیکھ رہا ہوں اور وہ دن دور نہیں جب ایک آنے والا میڈیا نیٹ ورک تمہیں خرید کر محنت کی تحفہ دیتا رہے گا تاکہ تم کچھ اور نہ لکھ سکو۔“

”نہیں سر۔ رہنے دیں۔ پھر کبھی سہی۔“ میں نے انکساری سے کہا۔

ایڈیٹر صاحب کے منہ سے اپنے لیے تعریفی الفاظ سن کر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ تعریف کا یہ نشہ مجھے ہوا میں نہ اڑا دے۔

”ایسے کیسے جانے دیں۔ طلب تو ابھی ہو رہی ہے۔ شاہاش انھو اور وہاں کونے میں چولہے پر چٹیلی رکھی ہے اس میں چائے بنا لو۔ خود بھی پیو اور مجھے بھی پلاؤ۔ شاہاش۔“

”مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ان صحافیوں میں سے نہیں ہو۔ اب تم جلدی سے تیاری پکڑ لو میں کل ہی نام لے کر تمہیں ان خاتون کے پاس انٹرویو کے لیے روانہ کر رہا ہوں۔“

اور یہ میری عملی زندگی کا پہلا کام تھا۔
☆☆☆

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کئی بار اپنے کانوں کو جھار اُٹھو صاف تھے۔

خیر جی میں نے ساری رات سوالات بنانے میں کالی کر دی۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ بس ایک دھن سوارھی اور یہ میرا پہلا عملی امتحان جس میں میں پورنی طرح سے کامیاب ہونا چاہتی تھی۔ اس کے لیے میں نے سزا تیار سے بھی مدد لی اور وہ بھی فون پر مجھے کئی نقطے سمجھاتے رہے۔

ایڈیٹر صاحب اس بار پھر سمجھ گئے۔ ”تم بالکل ٹھیک سن رہی ہو لڑکی۔ تم کل ہی اس انٹرویو کے لیے روانہ ہو رہی ہو اور صاف گوئی سے یہ بھی بتا دوں کہ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے۔ ورنہ۔“

اور دوسرے دن جب میری آنکھ کھلی تو گھڑی میں دو بج رہے تھے۔ اب میری سمجھا یا کہ مصروف لوگوں کی صبح اتنی دیر سے کیوں ہوتی ہے اور لا شعوری طور پر مجھے یہ سوچ کر بھی خوشی مل رہی تھی کہ اب میں بھی مصروف ہوئی ہوں۔

”ورنہ۔“
”ورنہ میں نے کہا تھا کہ مجھے خود ہی انٹرویو کرنا پڑتا اور میں عورتوں سے بات کرتے ہوئے بہت نروس سا ہو جاتا ہوں۔“

میں الناسیدہا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھا کر بھاگ بھاگ سی این جی رکشہ میں بیٹھ کر اخبار کے دفتر پہنچ گئی۔ اندر داخل ہوئی تو ایڈیٹر صاحب کے ساتھ ایک اور صاحب بھی براجمان تھے۔

”مگر سر آپ میرے ساتھ بات کرتے ہوئے تو ذرا بھی نروس نہیں ہوئے۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو۔
ایڈیٹر صاحب بولے۔ ”ارے بھئی یہ اپنے شہسی

”سوری۔ میں سیاسی عورتیں کہنا چاہتا تھا۔ اور تم تو صحافتی عورت۔ نہیں بلکہ لڑکی ہو۔ چلو جاؤ سوالات کی تیاری کرو اور کل صبح ٹھیک تین بجے انٹرویو کے لیے روانہ ہونا ہے۔“

اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ اکثر یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔

چوکیدار نے انٹرکام پر اندر اطلاع کی اور ایک ملازمہ نے ہمیں ریسیو کرتے ہوئے ایک بڑے سے ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھا دیا۔ میں وہاں کی آرائش دیکھ دیکھ کر مرعوب ہو رہی تھی اور تھکی میری مرعوبیت سے مخطوط ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ملازمہ نے مالکن کے آنے کی اطلاع دی تو تھکی کے اشارے پر میں بھی ان کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ بہت ہی شاندار عورت تھی مہنگا ترین لباس، دو کلو سے زیادہ میک اپ، زیورات سے لدی پھندی۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئیں اور کچھ بولے بغیر ہی تھکی نے اپنے بیگ سے کمرہ نکالا اور دھڑا دھڑا مختلف انداز میں ان کی تصاویر کھینچنے لگا۔ میں خاموش تماشائی کی طرح ایک طرف بیٹھی یہ سب دیکھتی رہی۔ صحافت کا یہ روپ میرے لیے بہت ہی انوکھا تھا اور ابھی تو مجھے نہ جانے اور کتنے روپ دیکھنے تھے۔

تقریباً چھ رول کی فوٹو گرافی کے بعد خاتون کے چہرے پر محض نمودار ہونے لگی تو تھکی رک گیا۔ ملازمہ نے فوراً پائنت میز پر لاگ دیا اور جب تک میں نے ایک سوسہ ختم کیا تھکی پوری پلیٹ کے ساتھ انصاف کر چکا تھا۔

”اچھا بیگم صاحبہ۔ میں یہ تصویریں تیار کر کے کل تک پہنچا دوں گا۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ اور یاد سے اپنا چیک بھی لیتے جانا اور ہاں یہ تصویریں سارے اخباروں اور رسالوں میں لگ جانی چاہیں۔“

”ارے بیگم صاحبہ کیوں نہیں لگیں گی۔ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کیا۔“

بیگم صاحبہ نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو وہ فوراً بولا۔ ”یہ بھی اخبار سے ہیں۔ یہ جو مانتی ہیں آپ دے دینا مجھے اجازت دیں۔“

یہ کہہ کر تھکی تو اپنا بیگ اٹھا کر چلتا ہوا اب بیگم صاحبہ

صاحبہ ہیں۔ اس فیلڈ کے نہایت مشہور فوٹو گرافر۔ یہ تمہارے ساتھ جائیں گے۔ تم انٹرویو کرو گی اور یہ فوٹو کھینچیں گے۔“

تھکی صاحبہ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ وہ اونٹ کی طرح جگالی کرتے ہوئے گزکا چہارے تھے۔ انہوں نے نہایت بے دردی سے تھکی کی پیک ایک بنڈل پر اچھالی۔ میں نے چونک کر ایڈیٹر صاحبہ کی طرف دیکھا مگر انہوں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تو میں سمجھ گئی کہ یہ مٹھے کا فوٹو گرافر ہے اس لیے اس کی ہر بد تمیزی روا ہے۔

”وہ۔ ان خاتون کو انٹرویو کے لیے انہوں نے راضی کیا ہے۔ یہ ان کے کئی فوٹو سیشن کر چکے ہیں۔ سمجھ رہی ہو نا۔“

میں نے نہ سمجھتے ہوئے بھی ہاں میں گردن بلانی اور رات بھر کی محنت کے بعد ترتیب دیا گیا سوال نامہ ایڈیٹر صاحبہ کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے ایک دو جگہ ایڈیٹنگ کی اور اوکے کہہ کر سوال نامہ میرے حوالے اور مجھے تھکی صاحبہ کے حوالے کر دیا۔

ہم دونوں دفتر سے اتر کر باہر روک پر آئے تو تھکی صاحبہ نے بڑے رعب سے ایک رکشہ کو آواز دے کر روک لیا۔ چالیس منٹ کی مسافت کے بعد تھکی صاحبہ نے رکشہ کو ڈیفنس میں واقع ایک بنگلے کے سامنے روک لیا۔ جیسے ہی رکشہ رکا تھکی صاحبہ اتر بنگلے کی طرف بڑھ گئے۔

”تھکی صاحبہ کراہیے۔“ میں نے ان کی توجہ دلاتے ہوئے کہا۔

وہ بغیر پلٹنے بولے۔ ”ہاں ہاں تم ہی دے دو۔ میں ہرگز برا نہیں مانوں گا۔“

میری توجہ ان ہی جل گئی۔ مگر کیا کرتی پیسے دے کر رکشے والے کو فارغ کیا اور تھکی صاحبہ کے پیچھے لگی۔ اتنی دیر میں وہ گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ چوکیدار نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا جس سے یہ

اور میں ون نوون آسنے سامنے بیٹھی تھیں۔

”ہاں تو آپ کیا لینے آئی ہیں؟“ بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

”آپ کا انٹرویو۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ شروع کرو۔“

میں نے اپنا چھوٹا سا نیپ ریکارڈرنکال کر بیچ میں میز پر رکھ دیا۔

”السلام علیکم۔“ لیکن بیگم صاحبہ خاموش ہی رہیں۔ ”میں نے آپ کو سلام کیا ہے۔ کم از کم اس کا جواب تو دے دیں۔“

”میں نے آج تک کسی کو کچھ دینا سیکھا ہی نہیں ہے۔“

میں سمجھ گئی کہ یہ انٹرویو اسی طرح شروع ہوگا۔ اس لیے میں بھی اشارت ہوتی۔

”تو آپ نے کیا سیکھا ہے؟“

”سیاست کرنا۔“

میں نے تپ کر کہا۔ ”فی الحال تو آپ میرے ساتھ سیاست کرنا بند کریں اور سیدھے طریقے سے میرے سوالوں کے جواب دیں۔“

میرا یہ کہنا تھا کہ وہ صوفی پر مردے کی طرح اکتڑ کر بیٹھ گئیں اور صبح خراش لہجے میں بولیں۔ ”ابھی موبائل پر نبل ماروں گی۔ اور میرے گارڈز تمہیں اٹھا کر ایسی جگہ جیل میں لے جائیں گے۔ جسے ابھی تک امریکانے بھی دریافت نہیں کیا ہے۔“

”میں نے ایسی کیا بات کہہ دی ہے کہ آپ انتہا پسندی پر اتر آئی ہیں۔“ میں نے کچھ گھبراتے ہوئے کہا۔

”میں جب تمہیں کہہ چکی ہوں کہ مجھ سے کچھ لینے کی امید مت رکھنا۔ تو بار بار کہے جا رہی ہو کہ سوالوں کے جواب دیں۔ کیسے دے دوں۔ اپنی روایت توڑ دوں تمہارے لیے۔“

”عمر بیگم صاحبہ یہ تو انٹرویو ہے۔ اس سے تو آپ کی واہواہ میں اور اضافہ ہوگا۔“ میں نے اپنے پٹارے

میں سے مکھن نکال کر لگاتے ہوئے کہا۔

کیا کچ کبہ رہی ہو۔ کہیں تم مجھ سے وہ والا کھیل تو نہیں کھیل رہیں۔ جو ہم نے ایل ایف او کے نام پر کھیلا تھا۔ وہ خوش ہو کر گولوں کی کیفیت میں بولیں۔

”مجھے سیاست سے سخت چڑ ہے۔“ میں نے کہا۔

”اب میں مطمئن ہوں۔ تم کئی جرنلسٹ لگتی ہو۔ ویسے یہ انٹرویو کون کون پڑھے گا۔“ وہ صوفی پر کشن کے سہارے پھیلتے ہوئے بولیں۔

”وہ سب۔ جنہیں آپ پڑھوانا چاہتی ہیں۔ عوام وغیرہ۔“ میں نے اپنے تئیں بہت بڑھیا بات کہی۔

”ارے عوام کو تو مارو گولی۔ وہ اخبار میں یہ انٹرویو دیکھے نہ دیکھے میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے اور تمہاری صحت پر تو بالکل ہی نہیں پڑنا چاہئے۔ بس وہ ضرور دیکھیں جن کے دیکھے سے چہرے پر رونق آ جاتی ہے۔“ بیگم صاحبہ نے کہیں دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔

”آپ فکر نہ کریں انہیں تو ہم کئی اعزازی کاپیاں بھجوادیں گے۔“

”یہ ہوئی نا بات۔ انٹرویو بھی تو ایسا ہونا چاہئے جس سے سیاسی قدم میں اضافہ ہونہ ہو۔ بڑے صاحب کے سامنے اپنے نمبروں میں اضافہ ضرور ہونا چاہئے۔“

”سب سے پہلے تو آپ اپنا تعارف کروائیے۔“

میں انٹرویو کا باقاعدہ آغاز کرتے ہوئے کہا۔

وہ تپ کر بولیں۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا ہیں۔ میں اتنی مشہور سیاست دان ہوں ملک کا بچہ بچہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے۔“

”مجھے بھی معلوم ہے کہ وہ سب تمہیں کیوں جانتے ہیں۔ لیکن یہ تو انٹرویو کا اصول ہے۔ آخر آپ کو اپنے بارے میں بتانے پر کیا اعتراض ہے۔“

”مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا۔ ویسے پروگرام کی حد تک بتا دیتی ہوں کہ نام تو میرے دادا ہانے کچھ اور رکھا تھا۔“ وہ سنبھالا لیتے ہوئے بولیں۔

سیاست میں بھی کبھی کبھار دوسری پارٹیوں کو بولنے کا موقع دے ہی دیتے ہیں۔“

”چلو اب میں بھی تم کو موقع دے رہی ہوں۔“ میں نے حاتم طائی کی قبر پر لالت مار کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو۔ ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ میرا نام تو کچھ اور تھا لیکن اب حضور نے مجھے کئی بیگم کا لقب دیا تھا۔“

”وہ کس خوشی میں؟“

”جس دن میں پیدا ہوئی تھی نا اسی دن الیکشن تھے اور اب حضور بڑی اکثریت سے وہ الیکشن جیت گئے تھے۔“

”تو انہوں نے سوچا کہ تم ان کے لیے کئی ثابت ہوئی ہو۔“

”بالکل یہی بات تھی۔“

”کاش عوام کے لیے بھی ثابت ہوتیں۔“ میں نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔

”کیوں میں نے عوام کے کون سے کان کتر لیے ہیں جو تمہیں عوام کی اتنی فکر کھائے جا رہی ہے۔ میں ایک بات صاف صاف بتائے دیتی ہوں کہ میرے سامنے یہ عوام شوام کا ٹانگ مت کرنا۔ جو پوچھنا ہے میرے بارے میں ہی پوچھنا۔“

”مگر آپ کو عوام سے اتنی چیز کیوں ہے؟“ میں نے انہیں کریدتے ہوئے پوچھا۔

”سیاستدان جو بھبری۔“

”مگر یہ عوام ہی تو ہیں جو لائونوں میں لگ کر تمہیں ووٹ دیتے ہیں۔“

”اے لو۔ یہ تم سے کس نے کہا دیا کہ ہمیں عوام ووٹ دیتے ہیں۔“ انہوں نے بلند آواز قبقرہ لگا کر میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

”میں نے تو بچپن سے یہی دیکھا ہے۔“

”اے تم تو بہت پرانی ہے۔ یہ تو شاید پچھلی صدی کی بات ہے۔ بی بی اپنے بچپن کو بھول جاؤ اور بڑی ہو کر جوانی کی طرف آ جاؤ۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”کہاں رکھا تھا۔ کہیں رکھ کر بھول گئے تھے یا۔“

”یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہوں۔ مجھے مذاق اچھا نہیں لگتا ہاں اور کسی صحافی کا تو بالکل بھی نہیں۔ مجھے تو تم سب زہر لگتے ہو۔“

”اور یہ زہر پینا بھی کسی کسی کا کام ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا ایک اور تیر چلایا۔ ”ہاں تو تم بتا رہیں کہ تمہارا نام کہیں کھو گیا تھا۔“ میں ان کے ساتھ ٹوٹراک سے اس لیے بات کر رہی تھی کہ میں سمجھ چکی تھی کہ یہ بندی یہی زبان زیادہ بہتر سمجھتی ہے۔ اگر میں نصابی گفتگو شروع کر دیتی تو پھر مجھے ہر سوال کے ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی بیان کرنی پڑتی۔

”یہ تم سے کس نے کہا دیا کہ نام کھو دیا تھا۔ بہت زیادہ بول رہی ہو تم۔“

”بولنے کے ہی تو میسے ملتے ہیں۔ اگر خاموش بیٹھی رہوں گی تو اخبار والے مجھے بھگا کے کسی اور کو لائٹھا میں گے۔“ ایک اور صاف گوئی۔

”تم جیسی صحافی جو ہوتی ہیں نا۔ وہ ہمیشہ ہی کسی نہ کسی اخبار یا چینل کی محتاج رہتی ہیں۔ ہمیں دیکھو ہم بیک ڈور چینل سے بھی اپنا کام چلا لیتے ہیں۔“

”نام تو وہیں رہ گیا۔“ میں نے انہیں یاد دلاتے ہوئے کہا۔

”وہ چیز کر بولیں۔۔۔۔۔“ تو اٹھا لے۔ ارے تجھے بڑی فکر لگی ہوئی ہے میرے نام کی۔ اتنی تو مجھے خود بھی نہیں ہوتی۔“

”میں ان ناموں کی بات نہیں کر رہی ہوں جو عوام نے مختلف دور میں آپ کو دیئے ہیں۔ میں تو ذاتی نام کی بات کر رہی ہوں۔“ میں بھی ان سے پیچھے رہنے والی نہیں تھی۔ اور یہ سب سرائیاز کا بڑھاپا سکھایا ہوا سبق تھا کہ صحافی کو کسی سے دب کر بات نہیں کرنی چاہئے۔

”وہی تو ہٹانے کی کوشش کر رہی ہوں اتنی دیر سے۔“ مگر تمہاری زبان تو اتنی پٹر پٹر چل رہی ہے کہ مجھے تو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دے رہی ہو تم۔ حالانکہ ہم تو

سوالات کر کے لوگوں پر اپنا آئی کیو کیوں ظاہر کر رہی ہوں۔“
 ”اس میں آئی کیو والی بات کہاں سے آگئی۔ میں تو
 لوگوں کو ریاضت کروا رہی تھی۔“ میں اپنی صفائی دیتے
 ہوئے کہا۔

”یہ جو تمہارے عوام ہیں نا۔ یہ مجھے اچھی طرح
 جانتے ہیں کہ میں کس قسم کی سیاستدان ہوں۔ اور جو
 نہیں جانتے وہ بھی جان لیں۔“ وہ پرفخر سے بولی۔
 ”آپ ایک صحافی کے سامنے بیٹھ کر عوام کو تڑی نہیں
 لگا سکتیں۔“ میں نے عوام کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔
 ”میں تو اسمبلی میں بیٹھ کر اپوزیشن کو بھی تڑیاں لگاتی
 ہوں۔ تمہاری اوقات ہی کیا ہے۔“ اس نے نہایت
 حقارت سے میری طرف دیکھا۔

”اچھا اب بات کوا گے بڑھاتے ہیں۔“
 ”میں خود بھی حد سے بڑھی ہوئی ہوں۔ اس لیے
 جو بات بھی کرنا۔ پہلے تو لہنا پھر بولنا۔“ وہ مجھے گھور کر
 دیکھتے ہوئے بولی۔

”تب تک تو انٹرویو کا وقت ہی ختم ہو جائے گا۔“
 میں نے جلدی سے کہا۔
 ”ہماری اسمبلیوں کا وقت بھی تو کسی بھی وقت ختم ہو
 سکتا ہے۔“

”میں بات شروع کرتی ہوں۔“
 ”تو کرتی رہو۔ مجھے کیا۔“ وہ بدتمیزی سے بولی۔
 ”عجیب بدتمیز عورت ہو تم۔“ مجھے غصہ آ گیا۔

”اے خبردار مجھے عورت مت کہنا۔ میں سیاستدان
 ہوں سمجھیں۔ تم ہم جنس ہونے کا فائدہ اٹھانے کی
 کوشش مت کرنا۔ اور رہ گئی تمیز تو تم جیسی غریب صحافی
 اس قابل ہی نہیں ہوتیں کہ ان سے تمیز سے بات کی
 جائے۔ میں بھی کبھی کبھی کوئی اخبار یا چینل دیکھ لیتی
 ہوں۔ اور ایک چینل والوں نے تو مجھ سے بھی بڑا بدتمیز
 لاناٹھا یا ہے۔ ہم سیاستدانوں سے ایسے اکھڑ لہجے میں
 بات کرتا ہے کہ اگر گمراہ سامنے نہ ہو تو اس کے دانت
 نکال کر اپنے کھیتوں میں گڑا دوں۔“ اس کا غصہ

”میں پرانی ہوں یا نہیں ہوں۔ لیکن اس کا ووٹ
 سے کیا تعلق۔“

”ارے بھئی یہ بہت پہلے ہوتا تھا کہ عوام ووٹ
 دیتے تھے اور سیاستدان ووٹ لیتا تھا۔“ انہوں نے
 میری ناقص معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”تو اب الیکشن میں کیا ہوتا ہے۔“
 ”بڑی بھولی بنتی ہو تم۔ بچپن کے الیکشن تو یاد ہیں
 تمہیں لیکن آج کل کے الیکشن کے بارے میں کچھ
 نہیں جانتیں۔“ وہ طنز کرتے ہوئے بولی۔

”آج کل جو سیاست چل رہی ہے۔ اسے دیکھتے
 ہوئے میں نے ووٹ دینا ہی چھوڑ دیا ہے۔“

”اور ہم نے تمہارے ووٹوں کو چھوڑ دیا ہے۔ اس
 طرح تم مان رہی ہو نا کہ آج کل تم یعنی عوام ووٹ
 دینے نہیں آتے۔“ ان کے لہجے میں عجیب سا طنز تھا۔
 ”لیکن جب نتیجہ آتا ہے تو ہزاروں ووٹ نکل آتے
 ہیں۔ یہ کیا جا دو گری ہے۔“

”یہ وہ جا دو گری ہے جو پہلے صرف۔ میں چلتی تھی۔
 اب پچھلے الیکشنوں میں ہم نے امریکہ بھی ایکسپورٹ
 کر دی ہے۔ بیچارہ الگور میا می میں اپنے ووٹ ہی
 ڈھونڈتا رہ گیا تھا۔“ وہ ایک بار پھر سامری کی طرح
 تہقہ بہ لگا کر بولی۔

”تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ بش نے بھی تمہارے نقش
 قدم پر چل کر کامیابی حاصل کی تھی۔“ میں نے پوچھا
 ”ارے کیوں نہ کرتا۔ آخر اسے ہماری حمایت
 چاہیے تھی یا نہیں۔“

”تو ثابت ہوا کہ آپ سیاست دان ہیں۔“
 ”نہیں میں گھروں میں کام کرنے والی ماسی ہوں۔
 “ وہ ایک بار پھر چڑ کر بولی۔

”مگر میں تو سیاست دان سمجھ کر تمہارا انٹرویو کر رہی
 ہوں۔“

”ارے تم کو صحافی کس گھماڑ نے بنایا ہے۔ جب
 جانتی ہو کہ میں سیاست دان ہوں تو ایسے بے وقوفانہ

”اس لیے کہ آپ اس حلقے کی نمائندہ ہیں۔“
 ”اول تو میں جن کی نمائندہ ہوں انہی کے لیے
 کام کرتی ہوں۔ ویسے تم کو ایک راز کی بات بتاؤں۔“
 وہ رازداری سے بولی۔

”سے کا نمبر تو نہیں ہے۔“
 ”ایک تو جس کو دیکھو سنے بازی کے پیچھے پڑا ہوا
 ہے۔ سب نے ہماری نقل کرنا ضروری سمجھ لیا ہے۔“ وہ
 منہ بسورتے ہوئے بولی۔

”آپ سنے کو بھی چھوڑیں اور بازی کو بھی۔ راز کی
 بات بتائیں۔ مجھے سسپنس ہونے لگا ہے۔“
 ”تو مجھے ان سے کیا کہ تمہیں کیا ہونے لگا ہے۔“
 وہ پھر بد تمیزی پر اتر آئی۔

”چلیں آپ وہ بات تو بتادیں جو بتانا چاہ رہی ہیں۔“
 ”راز کی بات یہ ہے کہ سیاست دان وہ واحد مخلوق
 ہوتی ہے جس کے پاس کوئی مصروفیت نہیں ہے آج کل
 کے دور میں۔“ وہ سرگوشیا نہ لہجے میں بولی۔
 ”نہیں۔ نہیں۔“

”ہاں۔ ہاں۔ تو کیا میں تم کو چھوٹی لگتی ہوں۔“
 ”میں نے کب کہا۔ آپ خود ہی خود کو سیاست دان
 بول رہی ہیں۔“ میں نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔
 ”میں سیاست دان ہوں کسی اور ناپ کی۔“

”یہ تو مجھے آج پتہ لگا ہے کہ سیاست دانوں کا بھی
 کوئی ناپ ہوتا ہے۔ ویسے تم کون سی کورٹ کے باہر
 ناپ کرتی تھیں۔“

”دیکھو کورٹ کی باتیں یہاں رہنے دو۔ ویسے بھی
 اب بڑی مشکلوں سے کالے کوٹ والی ریلیوں سے
 جان چھوٹی ہے۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

”پھر تو تم کو یہ بھی پتہ ہوگا کہ ملک کی اٹھانوے
 فیصد آبادی بھی تم سے تنگ ہے۔“ میں نے ایک اور وار
 کیا۔ اور یہ وار ادا کارشان کی فلم وار کے علاوہ تھا۔

وہ غصے سے تھملا اٹھی۔ ”میرے ساتھ مسخری کرتی
 ہے۔ تم کو پتہ ہے کہ ایک سیاست دان سے اور خاص

ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔
 میں ٹھنڈے پتے میں بولی۔ ”سمجھ گئی۔ تو تمہاری
 باتوں سے کم از کم یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہے کہ تم جدی
 پشتی سیاست دان ہو۔“

”صرف میں ہی کیا۔ اس ملک میں جتنے بھی ہیں
 سب ہی جدی پشتی ہیں۔ نئے نئے لوگ تو ہماری سہلی کے
 پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتے۔ بس اس بار پتہ نہیں چلے
 چوک ہو گئی کہ ایک نیا سیاست دان بھی اتر ہو گیا ہے۔ لیکن
 آہستہ آہستہ وہ بھی ہمارے رنگ میں رنگتا جا رہا ہے۔“

”اب ذرا تم اپنے خاندان کے بیک گراؤنڈ کے
 بارے میں کچھ بتاؤ۔“
 ”تم سے پہلے بھی کئی سہلیوں نے ہمارے خاندان
 کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں معلومات حاصل
 کرنے کی کوشش کی تھی۔“ وہ مجھے چھتتی ہوئی نظروں
 سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اور آج وہ سب انڈر گراؤنڈ
 ہو چکے ہیں۔“

”کہاں؟“
 ”یہ تو ان کی روجوں کو بھی پتہ نہیں ہوگا۔“ وہ ہنس کر
 بولی۔
 ”تم نے کتنی بار الیکشن میں حصہ لیا ہے۔“ میں نے
 سوال کیا۔

”جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے اور اب تک
 تو جتنی بھی بھول گئی ہوں۔“
 ”کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ آپ ہر بار جیتی
 ہی آ رہی ہیں۔“ مجھے واقعی حیرت ہو رہی تھی۔
 ”ابھی تک ہمارے حلقے کی کسی مائی نے وہ فعل ہی
 پیدا نہیں کیا جو مجھے ہراسکے۔“ وہ ٹرون اُترا کر بولی۔

”حالانکہ یہ بھی ایک ریکارڈ ہے کہ ہر بار جیتنے کے
 باوجود آپ نے اپنے حلقے میں ایک بھی ترقیاتی کام
 نہیں کروایا۔“ میں اپنی حاصل کردہ معلومات کے
 مطابق سوال کرتے ہوئے کہا۔

”تو کیوں کرواؤں۔“

”تو کیوں کرواؤں۔“

”تو کیوں کرواؤں۔“

دل سے نکلے ہیں لفظ

۴ رشتے کا تقاضہ اس بات میں نہیں کہ کوئی تمہیں مکمل کر دے لیکن کوئی تو ایسا ہونا چاہیے جس کے ساتھ تم اپنے ادھورے پن کو بانٹ سکو۔

۴ پریشانیوں چھوٹے پتھروں کی طرح ہوتی ہیں اگر تم اسے اپنی آنکھوں کے قریب رکھو گے تو یہ تمہاری بینائی کو چھپا دیں گی لیکن اگر تم اسے فاصلے پر رکھو گے تو تم دیکھ سکو گے کہ یہ کتنی چھوٹی ہیں۔

۴ کسی کے بُرا کہہ دینے سے نہ ہم مُدے ہو جاتے ہیں نہ وہ اچھے ہر شخص اپنی زبان سے اپنا ظرف دکھاتا ہے نہ کہ دوسرے کا عکس۔

۴ انسان تب سمجھ دار نہیں ہوتا جب وہ بڑی بڑی باتیں کرنے لگے بلکہ تب سمجھ دار ہوتا ہے جب وہ چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھنے لگے۔

حسن اختر اسلام آباد

طور سے اس سیاست دان سے جو چوہدرانی بھی ہو، مسخری کرنا کتنا بڑا گناہ ہو سکتا ہے۔“

”یہ تو میں نے بھی سنا ہے کہ آپ تاوان کے لیے بہت بھاری رقم وصول کرتی ہیں۔“ میں نے ایک اور چوٹ لگاتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا ادھر ادھر کی باتیں لے رہی ہو تم۔ جس مقصد کے لیے بلایا ہے وہ بات کیوں نہیں کرتیں۔“ اس سوال سے وہ کچھ بڑبڑاسی گئی تھی۔

”تم تو خواہ مخواہ تاراض ہو رہی ہو۔ اچھا تم یہ بتاؤ کہ تم کو یہ خیال کب آیا کہ تم بھی سیاست دان بن سکتی ہو۔“

”لگتا ہے تم کو ہمارے خاندان کی بسٹری کا پتہ نہیں ہے۔“ وہ پھر اُٹ کر بولی۔

”اللہ کا شکر ہے کہ میں کسی بسٹری کو نہیں جانتی۔“

”کتنی بار بول چکی ہوں اور تم خود بھی اعتراض کر چکی ہو کہ ہم لوگ جدی پشتی، خاندانی سیاست دان ہیں۔“ وہ میری طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے میں نے کوئی بہت ہی احمقانہ سوال کر دیا ہو۔

”آپ کا دادا تو ڈیرایا چوہدری تھا۔“

”بروڈیرا اور چوہدری سیاست دان بھی ہوتا ہے۔ اگر وہ سیاست سے کام نہیں لے تو پھر علاقے میں اپنا ٹہکا کیسے بٹھائے گا۔“ اس نے چوہدریہٹ کا ایک زریں اصول بتاتے ہوئے کہا۔

”تمہارے بارے میں مشہور ہے کہ تم ہر حکومت میں شامل رہتی ہو۔“ میں نے اگلا سوال دیکھ کر کیا۔

”تو اس میں کیا برائی ہے۔“ ظاہر ہے ان کو اس میں کیا برائی نظر آتی۔

”آخر انسان کا ضمیر بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔“ میں نے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی ناکام سی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ضمیر کو تو ہم نے کاروکاری کر کے بسھی کا دفن کر دیا

”اور یہ بھی ہے کہ تم نے تقریباً ہر وزارت کے دفتر کا مڑا پچکھا ہے۔“ میں نے سراقتیاز کی دی ہوئی معلومات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بس کیا کروں۔ تھوڑی چٹوری ٹائپ بھی ہوں نا۔“ وہ مسکرا کر بولی اور اس کی مسکراہٹ میں بھی بلا کا زہر بچھرا ہوا تھا۔

”تم وزیر تعلیم بنیں۔ لیکن تم نے اپنے علاقے میں ایک اسکول تک نہیں کھولا۔“ اور یہ بھی میرے لیے حیرت کی بات تھی کہ ایک وزیر تعلیم نے اپنے حلقے میں کوئی اسکول نہیں کھولا تھا۔ پھر ایسے انسان کو وزیر تعلیم ہونے کا کیا فائدہ۔

وہ تیز لہجے میں بولی۔ ”کون کہتا ہے کہ میں نے اسکول نہیں کھولا۔ ایک نہیں چار چار اسکول کھولے۔“

”اور اب ان چاروں اسکولوں میں آپ کی گائے

بات کرتی ہو۔“ میں اندر سے کھول رہی تھی لیکن مجھے اپنی کھولاہٹ پر قابو رکھنا تھا ورنہ اس بد نیز عورت سے کوئی بعید نہیں تھا کہ میرے بدن کے تمام اسپر پارلس کھلوا کر رکھ دیتی۔

”تو بات کرنا کوئی جرم ہے کیا۔ وہ ڈھٹائی کے ساتھ بولی۔

”میں بات کر رہی تھی غریبوں کی۔ ان غریبوں کو حقوق تو کبھی نہیں ملتے۔“

”ان کو حقوق ملیں نہ ملیں، ہم کو تو وزارت مل جاتی ہے نا۔“

”مطلب عوام کو صرف لارے لیے ملتے ہیں۔“

”ایک غریب کے لیے یہ اعزاز کیا کم ہے کہ ہم خود اس کے پاس ووٹ مانگنے جاتے ہیں۔“ وہ ایسے لہجے میں بولی جیسے اس کا پاؤں کسی گند پر پڑ گیا ہو۔

”بڑی بات ہے ورنہ تم تو اٹھ کر خود سے پانی بھی نہیں پیتیں۔“ میں نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تم نے ایسے ہی بات کی ہے یا مجھ پر طنز کیا ہے؟“

”میری کیا مجال جو آپ پر طنز کروں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ باہر تمہارے بیس گارڈ کھڑے ہیں۔ جن کے لیے میرے جیسا وزن اٹھانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔“

”بندی تم سیانی معلوم ہوتی ہو۔“ وہ مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”بندی اور سیانی سمجھنے کا شکر یہ۔ اچھا یہ کیوں مشہور ہے کہ بروڈیر اور چوہدری ظالم ہوتا ہے؟“

”یہ سب وڈیرا دشمن لابی کی پھیلائی ہوئی باتیں ہیں۔ ہم تو بابا ہر کسی کے ساتھ انصاف سے پیش آتے ہیں۔ اسی لیے لوگ دور دور سے ہمارے پاس جرگہ کرانے آتے ہیں۔“ یہ جرگہ اس جرگے کے علاوہ تھا جو ایک نیوز چینل پر ہفتے وار پیش کیا جاتا ہے۔

”کوئی ایسا انصاف جو تم کو آج تک یاد رہ گیا ہو۔“

”میں عجیب ضرور ہوں۔ لیکن غریب نہیں ہوں۔“

”لیکن ہر الیکشن میں تو تم غریبوں کے حقوق کی

بھینس بندھی ہوتی ہیں۔“

”بہت نا سمجھ ہو تم۔ اسی لیے تو صرف صحافی ہو۔ ورنہ ہماری طرح وہی آئی پی نہ ہوتیں۔“ وہ مجھے ہمدردانہ نظروں سے گھورتی ہوئی بولی۔

”تم اسکولوں کی بات کرو۔“

”سرکاری عمارتیں تمہیں۔ سرکار کا پیسہ خرچ ہوا تھا۔ اب کوئی پڑھنے ہی نہیں آتا تھا تو مجبوری میں عمارت کا کوئی تو استعمال کرنا تھا نا۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تم نے اس اسکول کو آباد ہی نہیں ہونے دیا۔“ یہ معلومات بھی مجھے سراہیاز نے فراہم کی تھی۔

”اے میرے ہے اس لہجے میں بات مت کرنا۔ ورنہ باہر میرے بیس گارڈ کھڑے ہیں۔ اور تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ تمہارا وزن تو ان کے لیے کچھ نہیں ہے اٹھانے کے لیے۔“

”پھر تم وزیر صحت بنیں۔ لیکن تم نے صحت کے لیے کچھ نہیں کیا۔“ میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں کیا۔ یہ دیکھو میری صحت تم کو کہاں سے خراب نظر آ رہی ہے۔“ وہ باقاعدہ اٹھ کر کیٹ واک کے انداز میں چلتے ہوئے بولی۔

”میں عوام کی بات کر رہی ہوں۔“

”دراصل مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں تھا کہ میں عوام کے لیے وزیر بنی ہوں۔“ اس کے لہجے میں معصومیت اتنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ دل چاہا کہ اسے بیس کوٹ کر رکھ دوں۔

”اور یہ بھی ہے کہ تم چند مخصوص اسپتالوں کا ہی دورہ کرتی تھیں۔“

”مخصوص ہی سہی۔ اسپتالوں کا دورہ تو کرتی تھی نا۔ تم عوام تو کسی حال میں خوش ہی نہیں رہتے ہو۔“

”تم بھی عجیب ہو۔۔۔۔۔۔“

”میں عجیب ضرور ہوں۔ لیکن غریب نہیں ہوں۔“

”لیکن ہر الیکشن میں تو تم غریبوں کے حقوق کی

کیوں؟“ میری حیرت حقیقی تھی۔
 ”بس چھوٹے بھائی کی ضد کے آگے مجبور
 ہو گئی۔ میں نے بھی کہا چلو بیچے اس دفعہ تم عیش کر لو۔“
 وہ بے پروائی سے بولی۔

”میں نے ایک چھینل پر تمہارا انٹرویو دیکھا تھا۔
 جس میں تم نے بڑی مزے مزے کی باتیں کی تھیں۔“
 حالانکہ حرام ہے جو میں نے وہ انٹرویو دیکھا ہو۔ بس سر
 امتیاز نے ہی بتایا تھا اس کے بارے میں۔

”چھٹا مار کے دانت باہر نکال دوں گی۔ میں تم کو
 جو کر گنتی ہوں کیا جو مزے مزے کا بات کرنی ہوں۔“ اسے
 پھر غصا گیا تھا۔ لگتا تھا کہ غصا اس کی ناک پر دھرا ہوا ہے۔
 ”مم میرا مطلب ہے بہت اچھی اچھی باتیں کی
 تھیں۔“

”حیرت ہے میں بھی اچھی بات کر لیتی ہوں۔ خیر
 ہے خیر ہے۔“ اس بار حیران ہونے کی باری اس کی تھی۔
 ”بچپن میں آپ کے کیا شوق تھے؟“

”کو دنا۔ چھلانگیں مارنا۔ اسے ننھی سے اسے ننھی پر۔
 سے ننھی سے اسے ننھی پر۔“ وہ بچپن کو یاد کر کے خوش
 ہوتے ہوئے بولی۔

”یعنی تم کو ننھے ننھے مینی تھیں۔“
 ”نہیں۔ اس وقت تک ہم کو ننھی میں آ گئے تھے۔“
 وہ رسانیٹ کے ساتھ بولی۔

”تو بڑے ہونے کے بعد تم نے یہ شوق چھوڑ دیا۔“
 ”لو بچپن کے شوق بھی ختم ہوتے ہیں کیا۔“
 ”یعنی یہ شغل آج تک چل رہا ہے۔“

”ہاں۔ لیکن تھوڑے فرق کے ساتھ۔ پہلے میں
 کو ننھیاں ناپا کرتی تھی۔ اب ہوائی جہاز سے ناپتی
 ہوں۔“ وہ ہوائی جہاز کا اشارہ کرتے ہوئے بولی تاکہ
 مجھے سمجھا جائے کہ ہوائی جہاز کسے کہتے ہیں۔
 ”بغیر پیراشوٹ کے؟“

”میں جانتی ہوں۔ میں خوب جانتی ہوں کہ تمہاری
 تو یہ دلی خواہش ہے کہ میں کسی دن پیراشوٹ پہنے بغیر

”ایسے تو بہت سے ہیں لیکن میں تم کو ایک واقعہ
 بتاتی ہوں۔ ایک بار ہمارا جرگے میں ایک کس آیا۔
 جس میں ایک گھیت کے دو دو عویدار تھے۔“ وہ یاد کرتے
 ہوئے بولی۔

”پھر تم نے کیا انصاف کیا؟“
 ”میں نے کہا بابا یہ تو خون خرابہ ہونے کا امکان
 ہے۔ اس کا ایک ہی حل ہے۔ یہ گھیت نہ تیرا نہ اس کا۔
 آگے تم خود سمجھدار ہو۔“

”واہ قربان جاؤں تمہارے انصاف پر۔“
 ”جاؤ۔ ضرور قربان جاؤ اور جو نہیں ہوتا اسے ہم خود
 قربان کر دیتے ہیں۔“
 ”اچھا یہ بتاؤ کہ تم کو سب سے زیادہ مزا کس
 وزارت میں آیا۔“

”وزارت اطلاعات و نشریات میں۔“
 ”مگر یہ تو شاید وہ واحد وزارت ہے جو تم کو آج تک
 نہیں ملی۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”اسی لیے تو مزا آیا۔ مجھے دوسرے کئی وزارت میں
 ناگ اڑانے میں بہت مزا آتا تھا۔ بہت مانی ہوں میں۔“
 ”وہ تو لگ ہی رہی ہیں۔“

”بہت مستیاں کرنی رہتی ہوں۔ وزیر اطلاعات
 ابھی اطلاع کو نشر بھی نہیں کرتا تھا اور میں سب کو بتا دیتی
 تھی۔“ وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔
 ”اور اس کا انجام کیا ہوا۔“

”سنا ہے کہ آج کل وہ بیچارہ ریلوے انجن کے
 ساتھ سرنگرانے کے بعد دیوار سے سرنگر رہا ہے۔“

”اچھا۔ تم مجھے کوئی ایک مثال دو کہ تم نے وزیر بننے
 کے بعد کیا بنایا۔“ مجھے اس کی باتیں سن کر بڑبڑھتی ہو
 رہی تھی۔
 ”کیوں نہیں بنایا۔ بہت مال بنایا۔ تم پہلے بتائیں تو
 بینک اسٹیٹمنٹ ساتھ لے آئی۔“

”آج کل تم اپنی عادت کے مطابق ایک بار پھر
 سرکاری پارٹی میں شامل ہو لیکن کوئی وزارت نہیں لی۔“

گندے کرنا نہیں چاہتی تھی۔
 ”ایک منٹ رکو“ اس نے پیچھے سے آواز دے کر
 مجھے روکتے ہوئے کہا۔

”اب کیا ہے۔ انٹرویو تو ختم ہو گیا۔“ میں بولی۔
 ”پتہ نہیں کیوں مجھے لگا کہ تمہیں ہمارے ساتھ ہونا
 چاہئے۔ کیونکہ ہمارے بڑے صاحب کہتے ہیں کہ
 ہماری کوتاہیوں اور جہالت کو چھپانے کے لیے ایک
 آدھ پڑھا لکھا بندہ بھی ساتھ ہونا چاہئے۔ میں نے تم
 سے شروع میں ہی کہا تھا کہ میں کسی کو کچھ نہیں دیتی۔
 لیکن تم کو ایک گولڈن مشورہ دے رہی ہوں۔“
 ”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ یہ صحافت و حافت چھوڑ دو۔“
 ”تو پھر کیا کروں؟“ میں نے تنک کر جواب دیا۔
 ”وہی جو میں کر رہی ہوں۔ سیاست میں آ جاؤ۔“
 میں نے تیرے نظروں سے اس کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔
 اور جس اخبار میں یہ انٹرویو چھپنا تھا اسی میں یہ خبر
 شائع ہوئی کہ ”حکومتی جماعت نے ضمنی انتخابات کے
 لیے ایم اے جرنلزم میں گولڈ میڈلسٹ ہما انصاری کو
 پارٹی ٹکٹ جاری کر دیا ہے۔“

۴

ہی کو جاؤں۔ لیکن میں تمہیں اور تمہارے عوام کو بتائے
 دیتی ہوں کہ جب تک میرے دم میں دم ہے تم لوگوں
 کے سینے پر مونگ دتی رہوں گی۔“ وہ باقاعدہ دلنے کا
 اسٹائل کرتے ہوئے بولی۔

”اب تو مونگ بھی بہت مہنگی ہو گئی ہے۔ غریب
 آدمی کی پہنچ سے دور۔“
 ”اچھا ہی ہوا۔“

”تم کیوں نہیں چاہتیں کہ غریب بھی سکھیں ہوں۔
 پیٹ بھر کر کھانا کھائے۔ زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت آرام کی
 زندگی گزارے۔“ میرے نیچے میں غریبوں کے
 ہمدردی ہی ہمدردی بھری ہوئی تھی۔

”ارے اگر ہم نے ان کے لیے یہ سب کر لیا تو یہ
 جو زبردستی کے ہمارے جلسوں میں آ جاتے ہیں۔ ہم اس
 سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ اس لیے جیسا چل رہا ہے
 چلنے دو۔“ اس نے پھر میری معلومات میں اضافہ کیا۔
 ”مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ غریبوں کی یہ حالت دیکھ
 کر۔“

”ظاہر ہے۔ ایک غریب کو ہی غریب کی حالت پر دکھ
 ہوتا ہے۔“ وہ مجھے اوپر سے نیچے تک گھورتے ہوئے بولی۔
 ”تم نے اب تک میری کسی ایک بات کا بھی
 ڈھنگ سے جواب نہیں دیا ہے۔“

”تو تمہیں ڈھنگ سے جواب دینے پر مجھے کون سا
 تمغہ مل جائے گا۔“
 ”چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتائیں اسمبلی کا ماحول کیسا
 ہے؟“

”بہت اچھا۔ بہت گھریلو۔ بالکل میرج بیورو
 جیسا۔“

”میرا خیال ہے اب انٹرویو کو یہیں ختم کر دیتے
 ہیں۔“ میں نے ٹیپ ریکارڈ رٹا ف کرتے ہوئے کہا۔
 ”بہت ہی ٹیک خیال ہے۔“

میں نے اپنا سامان بیگ میں رکھا اور اس سے ہاتھ
 ملاتے بغیر باہر جانے لگی۔ ظاہر ہے میں اپنے ہاتھ

بھینرٹ

علی اختر

سیاست ایک سسٹم کا نام ہے جس کے تحت عوام سے محبت کرنے والے ملک و قوم کی خدمت کے جذبے سے سرشار سماجی کارکن خود کو بطور عوامی نمائندہ کے طور پر پیش کرتے ہیں اور عوام اپنے حق رائے دہی کے ذریعے انہیں پارلیمنٹ میں پہنچاتے ہیں تاکہ وہ ان کے حقوق کے لیے قانون سازی کر سکیں۔ لیکن ہمارے ہاں سیاست ایک کاروبار کا درجہ اختیار کر چکی ہے جس کے تحت کرپٹ عناصر اپنے کرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے شرافت کا لبادہ اوڑھ کر عوام کے سامنے آتے ہیں۔

دو سیاست دانوں کا قصہ جسٹس نے اپنے مفادات کے تحت خون رشتوں کو سیاست کی بھیئت جڑھا دیا تھا

ہیں ناں..... میں آپ کے آبائی چک کرتار پور کے ساتھ والے گاؤں ڈھولے آل سے آیا ہوں اور چوہدری بلاول کا نوکر ہوں۔ انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے ان کی دشمنی پرانے وقتوں سے نوکراں قبضے کے زمیندار ہیبت خاں کے خاندان سے چلی آ رہی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہیبت خاں کا بھائی رشید خان لین دین کے جھگڑے میں قتل ہو گیا۔ انہوں نے یہ قتل چوہدری بلاول کے کارندوں پر ڈال دیا۔ کتنا عرصہ تک کیس چلتا رہا مگر شہوتوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہمارے بندے عدالت سے بری ہو گئے۔ انہوں نے یہ ضد دل میں پالے رکھی اور ایک روز موقع ملتے ہی چوہدری بلاول کے چھوٹے بھائی کو گولیوں سے بھون ڈالا اب ان کے آدمی قتل کی اس واردات کی وجہ سے جیل میں ہیں ان کی آج کل گواہیاں لگنے والی ہیں۔ وہ تھوڑی دیر سانس لینے کو رکا تو میں نے ہنکارا بھرا پھر..... سانس لینے کے بعد وہ پھر بولا۔

”ابھی چند روز پہلے کی بات ہے ہیبت خاں کی سوتیلی بہن قتل ہوئی قاتلوں نے اس کی عزت لوٹی

میں اپنے چیمبر میں ابھی آ کر بیٹھا ہی تھا چاچا عبدال میری میز صاف کر رہا تھا سائین کی فائلیں ادھر ادھر رکھی ہوئی تھیں ٹھک سے دروازہ کھلا۔ شیشے کا دروازہ تھا زور سے بجاتا تو مجھے لگا جیسے ٹوٹ گیا ہو میں نے بڑی عصبیلی نظروں سے آنے والے کو دیکھا چالیس پینتالیس سالہ شخص تھا جس نے سر پر میلا کچیا صاف باندھ رکھا تھا۔ اندر آتے ہی وہ یوں گرتی پر ڈھیر ہوا جیسے بڑی دور سے بھاگتا آ رہا ہو۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی میری عصبیلی نظریں دیکھ کر وہ پھولے سانس میں بولا۔

”معاف کرنا صاحب جی..... دے کا مریض ہوں تیز چلوں تو سانس پھولنے لگتا ہے۔“

”کوئی بات نہیں پانی پیئیں۔“ میں نے چاچا عبدال سے کہا۔

”چاچا! انہیں پانی پاؤ۔“ چاچا عبدال پہلے ہی صفائی چھوڑ چکا تھا فوراً قریب پڑے کولر سے پانی کا گلاس بھرنے لگا۔ اتنی دیر میں اس کا سانس بحال ہو چکا تھا گلاس پکڑتے ہوئے وہ بولا۔

”غالباً آپ نے مجھے پہچانا نہیں آپ قادر وکیل

رکھنے کے لیے مخالفوں کو جھوٹے کیسوں میں پھنسا کر مزہ لیتے ہیں جس گاؤں میں رہتا ہوں وہاں بھی ایسے کیس آئے دن بنتے رہتے ہیں اور آپس کی دشمنیاں نسلوں تک پالنے پر فخر کیا جاتا ہے۔ ایک تو ان کی جہالت اوپر سے ہمارا عدالتی نظام بھی اپنی پیچیدگیوں سے بندے کو نکلنے نہیں دیتا۔ میرے والد صاحب گورنمنٹ کی بنائی ایسی مصالحتی کمیٹی کے چیئرمین ہیں جو مقامی لوگوں کے جھگڑوں میں مصالحتی کردار ادا کر کے معاملات بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے علاوہ نمبرداری تو ہمارے خاندان میں ورثاتی چلی آ رہی ہے میں نے شہر کے کالج سے بی ایس سی بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا تو میرا ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا اور نمبروں کے لحاظ سے میرا میرٹ بھی بنتا تھا مگر جب والد صاحب نے گاؤں میں پلٹی دشمنیوں کا تناسب دیکھا اور عدالتی چکروں میں لوگوں کو پانی کی طرح روپیہ بہاتے دیکھا تو انہوں نے مجھ پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ میں ڈاکٹر بننے کی بجائے وکالت کا امتحان پاس کر کے وکیل بنوں۔

میں نے بہت شور مچایا مگر والد صاحب کی دلیلوں نے میری ایک نہ چلنے دی بلکہ آخر میں نے ایل ایل بی کا امتحان بھی اچھے نمبروں میں پاس کیا اور وکیل بن کر کچہری آ گیا۔ یہ چیمبر مجھے چند سال پہلے ہی الاٹ ہوا تھا۔ میرا کام گاؤں کے روایتی جھگڑوں اور کیسوں کی وجہ سے اچھی طرح چلنے لگا تھا ان کے علاوہ مجھے اور بھی کیسز ملنے لگے تھے۔ میں نے اپنے آفس میں ایک کمپیوٹر لکڑی اور ایک چپڑا سی رکھا ہوا ہے جو میرے عدالتی کام اور دفتری ضروریات پورا کرتے ہیں آج کے کیس کی روداد سننے کے بعد میں نے ایک بار پھر آنے والے کارندے سے پوچھا۔

اور پھر اسے اپنے ساتھ اغوا کر کے لے گئے جاتے جاتے ان کی چیتتی بھینس گوری کو بھی گولی مار کر ختم کر گئے۔ اگلے روز گاؤں سے ہٹ کر چری کے کھیت سے اس کی لاش ملی۔ لاش کا چہرہ مسخ کیا ہوا تھا انہوں نے اس قتل کا مدعا چوہدری بلاول پر ڈال دیا ہے۔ مسخ شدہ لاش کے پوسٹ مارٹم اور ڈاکٹری ملاحظہ سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ مڑموں نے گینگ ریپ کے بعد بڑی بے دردی سے پہلے گولیاں ماریں اور پھر چہرے کو تیز آلے سے مسخ کر ڈالا۔ پرچے کے ساتھ دونوں رپورٹیں بھی لگی ہیں۔“ وہ تھوڑی دیر کے لیے پھر رکا اس کی سانس اتنا بولنے سے درہم برہم ہو رہی تھیں کچھ دیر بعد وہ بولا۔

”وکیل صاحب یہ دمہ بھی بڑی موڈنی مرض ہے ہموار اور چلتی حیاتی کو کبھی چھدری چھدری کر دیتا ہے ابھی تک اس کا علاج ہی نہیں نکلا۔“

”ہاں تو میں بتا رہا تھا انہوں نے اس قتل کا مدعا چوہدری بلاول پر ڈال دیا ہے اور مقامی تھانے میں نامزد پرچہ درج کروا دیا ہے۔ آپ کو بتا ہے کہ آج کل ایکشنوں کا زور ہے اور چوہدری بلاول اپنے گاؤں سے ایکشن بھی لڑ رہا ہے پولیس والے پہلے تو ان کے دبدبے کی وجہ سے خاموش تھے مگر پرچہ درج ہونے کے بعد انہوں نے گرفتاری کے لیے زور مارنا شروع کر دیا ہے میں اس بارے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔“

میں اس کی کہانی سن کر سوچوں میں ڈوب گیا نہ جانے ہمارے معاشرے سے یہ لعنت کب ختم ہوگی مقامی لوگ اپنی اپنی دشمنیوں میں اس قدر پھنسے ہوئے ہیں کہ ان کی نسلیں ختم ہو جاتی ہیں دشمنیاں نہیں ختم ہوتیں۔ وہ اپنی چوہدراہٹ اور ناک اونچا

”چوہدری بلاول آج کل کدھر ہیں؟“

کیا۔

”جی جی..... چوہدری صاحب کا کارڈ ہے میرے پاس۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے کُرتے کی جیب سے کاغذوں کے مڑے تڑے جتھے سے وزینگ کارڈ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔

”ٹھیک ہے بات کر لوں گا“ جب تک چوہدری بلاول سے بات نہیں ہو جاتی کیس کو ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔“ میں نے اسے مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

”جی جی.....“ اس نے جیسے میری بات کی تصدیق کر ڈالی ہو تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولا۔
”آپ کی فیس.....؟“

”یہ تم طے کرو گے یا چوہدری بلاول..... پھر کیس کی نوعیت دیکھ کر کہوں گا۔“ میں نے بتایا۔

”ٹھیک ہے جی ٹھیک ہے..... پھر میں چوہدری صاحب کو بتا دیتا ہوں وہ خود آپ سے بات کر لیں یا آپ ان سے تفصیلات پوچھ لیں، میں چلتا ہوں۔ شہر میں دوسرے کام بھی ہیں گاؤں پہنچتے پہنچتے شام اتر آئے گی۔“ یہ کہہ کر وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

اگلے روز میں نے اپنا کلرک متعلقہ تھانے میں بھیجا اور وہاں سے ایف آئی آر کی نقل منگوائی ایف آئی آر ہیٹ خاں کے کارندے کے ذریعے درج کروائی گئی تھی میں نے اس کا مطالعہ کیا اس میں درج تھا۔

”میں جمیل عرف جیلا قوم موچی سنگھ قصبہ نوکھراں ہیٹ خاں کا عرصہ تیس سال سے ملازم ہوں اور میں ان کی بھینسوں کے علاوہ دوسرے جانوروں کا خیال رکھتا ہوں مورخہ ۲۱ جولائی ۸۴ء کو میں بھینسوں کا دودھ دھونے کے لیے جب حویلی گیا تو میں نے دیکھا چوہدری ہیٹ خاں کی سب سے چیتی بھینس گوری کو نامعلوم لوگوں نے گولی مار کر

رہتے ہیں اور رات والے دن بھی لاہور میں ہی تھے۔ گاؤں کبھی کبھار آتے ہیں آج کل ایکشنوں کی وجہ سے روزانہ رات گاؤں آ جاتے ہیں اور اپنے سپوٹروں کے ساتھ حویلی میں سیکورٹس کرتے رہتے ہیں اس کیس نے انہیں بے حد پریشان کر رکھا ہے۔“

”بڑے لوگوں کو ایسی کا ہے کی پریشانی..... پولیس سے مل کر سودا بازی کر لیتے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”ہوا تھا..... ایسا بھی کرنے کی کوشش کی گئی تھی پولیس کے بڑے افسروں کے ساتھ تو چوہدری بلاول کا ویسے ہی اٹھنا بیٹھنا ہے مگر تھانیدار کہتا ہے دوسرے فریق نے اوپر سے بڑا ڈانڈا باؤ ڈال رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں ایک بار چوہدری بلاول کو تھکڑیاں ضرور لگوانی ہیں۔“

”چوہدری بلاول بھی پارٹی کا دباؤ ڈلوادیتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ان کی پارٹی برسراقتدار نہیں ہے اس لیے ان کی سنی نہیں جانی اب تو پارٹی نے بھی کہنا شروع کر دیا ہے کہ پہلے چوہدری ماتھے پر لگی کالک دھوئے تو اسے ٹکٹ ملے گا ورنہ..... وکیل بابو! اس طرح ٹکٹ چھوڑ دینا مردوں کا کام تو نہیں اور پھر یہ ساری عمر کے لیے طعنہ بن جائے گا۔“

”تھانہ کون سا ہے؟“ میں نے اس کی بات ٹوکی۔

”وہ جی گردیال سنگھ کا تھانہ ہے۔“ اس نے بتایا۔
”تھانے کا کوئی ٹیلی فون نمبر یا چوہدری بلاول کا رابطہ نمبر..... کچھ ساتھ لائے ہو؟“ میں نے استفسار

فضل عرف پھنجی کے نوئے پھونے دستخط تھے اور محرر کے دستخطوں سے ایف آئی آر مکمل ہوئی تھی۔
ایف آئی آر پڑھنے کے بعد میں نے چوہدری بلاول کے موبائل پر کال کی تھوڑی دیر تک تیل جاتی رہی پھر دوسری طرف سے آن ہوا اور ایک بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔

”ہیلو..... کس سے ملنا ہے؟“
”اگر میں غلط نہیں تو یہ چوہدری بلاول کا سیل نمبر ہے آپ کون.....؟“ میں نے پوچھا۔
”آپ کون..... اور کس لیے ملنا ہے؟“
”انہیں کہیے یہ نمبر جو آپ کے موبائل پر آ گیا ہے عبد القادر ویل کا ہے فارغ ہوں تو مجھ سے بات کر لیں۔“ یہ کہہ کر میں نے موبائل بند کر دیا۔

یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک رواج ہے کہ بڑے لوگ خواہواہ اپنا رعب جمانے کے لیے دوسروں کو زچ کرتے ہیں۔ آپ کسی بھی سرکاری دفتر میں چلے جائیں آپ کو چہرہ ای اندر نہیں جانے دے گا کہ صاحب مصروف ہیں کسی اہم میٹنگ میں بات کر رہے ہیں۔ چاہے اندر صاحب نی وی پر کرکٹ میچ دیکھ رہے ہوں دوسروں کے وقت کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔ یہی حال تو دولتوں اور چوہدریوں کا ہوتا ہے صاحب کا نوکر مالک سے زیادہ صاحب ہوتا ہے۔ بہر حال میں نے غصے میں موبائل بند کر دیا تھا اور دوسرے کیسوں میں مصروف ہو گیا تھا۔

دفعتا میرے سیل پر چوہدری بلاول کا وہی نمبر جھنگایا گھنٹی ہوتی رہی میں نے بھی دانستہ موبائل آن نہیں کیا پوری گھنٹیاں ہونے کے بعد موبائل بند ہو گیا۔ مرد و بارہ نون آنے لگی آدھے سے زیادہ نون گزری تو میں نے موبائل آن کر لیا۔ دوسری طرف

بلاک کر دیا ہے۔ میں نے ہیبت خاں کو اطلاع دی تو وہ بھاگا بھاگا جانوروں کے بازے کی طرف آیا تو پیچھے سے دوسرے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ شور کی آواز سن کر ہیبت خاں کی کوٹھی سے سیکڑہ نوکرانی بدحواسی سے بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی کہ سچین اپنے کمرے میں نہیں ہے اس کا دوپٹہ بیڈ کے آدھا اوپر اور آدھا زمین پر پڑا ہے اور اس کی چوڑیاں ٹوٹی ہوئی ہیں ہم سب ادھر چلے گئے اور سچین کو ڈھونڈنے لگے وہ از خود کہیں نہیں جاسکتی تھی کیونکہ وہ آنکھوں سے اندھی تھی۔ لگتا تھا اس کو زبردستی اغوا کر لیا گیا ہے ابھی اسے تلاش کر رہے تھے۔ خان جی نے سب کامیوں کو کہہ دیا تھا کہ اگر اس بات کی اطلاع کسی نے گاؤں میں کی تو اس کی خیر نہیں۔ لگتا تھا کہ سچین کو زمین نکل گئی ہے وقت گزرتا جا رہا تھا مگر سچین کا کچھ پتا نہ تھا۔ اگلے روز صبح ہی گاؤں کا بندہ جس کا نام فضل عرف پھنجی ہے اس نے اطلاع دی کہ چری کے کھیتوں میں کسی جوان لڑکی کی لاش ملی پڑی ہے اس کا چہرہ سنا کیا گیا ہے۔ اس نے لاش پھینک کر جانے والے آدمیوں کو دیکھا ہے جن میں چوہدری بلاول بھی شامل تھا۔

ہیبت خاں خود ان کھیتوں میں گیا تو دیکھا کہ یہ لاش سچین کی ہے اس نے لاش کپڑوں اس کی چوڑیوں اور سب سے بڑھ کر ہاتھ کی انگلی میں پڑی سونے کی انگلی سے شناخت کی۔ لاش کا ڈاکٹر ملاحظہ کر دیا گیا تو انکشاف ہوا اس کے ساتھ گینگ ریپ ہوا ہے اور جسم سے چھ گولیوں کے نشان پوسٹ مارٹم میں آئے ہیں۔ دونوں رپورٹیں ایف آئی آر کے ساتھ ہیں۔“
بیان کے نیچے ایف آئی آر درج کروانے والے کا نام اور انکوٹھا شہت تھا ایک طرف دوسرے بندے

سے اسی بھاری بھر کم آواز میں ملائمت تھی۔

”قادر وکیل بات کر رہے ہیں؟“ پوچھا گیا۔

”جی فرمائیے۔“ میں نے بھی آواز میں نرمی

رکھتے ہوئے کہا۔

”چوہدری بلاول بول رہا ہوں ابھی ابھی آپ کا

فون آیا تھا۔“ دوسری طرف سے استفسار کیا گیا۔

”میں نے آپ کے کیس کے بارے میں کچھ

باتیں کرنا تھیں۔“ میں نے بات کا آغاز کیا۔

”میرے کارندے نے آپ کو بتایا تھا۔“ ادھر

سے جواب ملا۔

”آپ کے کیس کی ایف آئی آر میرے سامنے

پڑی ہے کچھ باتیں جو اب طلب ہیں اور پھر آپ

پسند فرمائیں تو اس کیس کی ذمہ داری اٹھالوں اگر

آپ کا ارادہ کسی اور وکیل کو رکھنے کا ہو تب بھی

بتادیں۔“ میں نے وضاحت کی۔

”ارے نہیں نہیں..... یہ آپ کو کس نے کہہ دیا“

میں نے ہی تو اپنے کارندے کو بھیجا تھا آپ اپنی

فیس کے بارے میں بتائیں اور یہ کیس آپ ہی

لڑیں گے۔“ میں نے اپنی فیس اور کاغذات کے

خرچہ وغیرہ کا بتایا تو دوسری طرف سے چوہدری

بلاول بولا۔

”وکیل صاحب! یہ تو محض ضد ہے مخالفوں کی

وگرتہ جس طرح کی مرضی قسم لے لیں حلف اٹھالیں

مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں اور نہ ہی میری

صلاح اور مشورہ اس میں شامل ہے۔ اب بتائیں

چوہدری بلاول اندھی لڑکیوں سے ایسا کام کرے گا

جس کا ذکر ایف آئی آر میں کیا گیا ہے اس کی نقل

میں نے بھی نکلوا رکھی تھی آپ کو بھجوانے کے لیے۔“

فیس طے ہونے کے بعد میں نے دوبارہ کہا۔

”آپ اپنے کسی کارندے ممکن ہو تو اسی بزرگ کو

بھجوا کر کاغذات منگوائیں اور ان پر اپنے دستخط کر کے

شناختی کارڈ کی کاپی بھجوادیں تاکہ میں آپ کی طرف

سے کیس لڑ سکوں اور کچھ رقم بھی بھجوادیں کم از کم فیس

کا آدھا حصہ.....“

”میں نے اس ملک میں رہنا ہے اور اسی جگہ

سے ایکشن لڑنا ہے۔“ دوسری طرف سے ہنس کر

کہا گیا۔

”اصول تو اصول ہی ہوتے ہیں چوہدری

صاحب!“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”اچھا بابا اچھا..... اب آپ کے بس میں جو

آگئے ہیں۔ میں آج ہی بھجوا دیتا ہوں بلکہ ابھی تیار

کر تا ہوں اسے آپ کے پاس بھجوانے کے لیے۔“

اس کے بعد فون بند ہو گیا۔

پکھری میں آہستہ آہستہ رش ہونے لگا مختلف

دیہاتوں، علاقوں اور شہر کے محلوں سے ساکھین اپنی

تاریخوں پر پہنچنے لگے تھے۔ دکلا اور ان کے کارندے

بغلوں میں نمٹائیں اور ان کی فائلیں لفافے اٹھائے

تیزی سے عدالتوں کی طرف آ جا رہے تھے۔ میں

نے بھی ڈائری دیکھی اور آج کے کیس دیکھ کر ان کی

فائلیں میز پر رکھیں جن عدالتوں کے مجسٹریٹ اور جج

صاحبان چھٹی پر تھے وہاں حاضری لگوانے کو چاچا

عبدال کو ضروری کاغذات کے ہمراہ روانہ کر دیا اور ابم

کیس خود دیکھ کر انہیں باری کے تحت رکھا۔ عام دنوں

میں نو بجے پکھری لگتی ہے اس وقت تک پکھری میں

تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی۔ دن بجے تک تو

معاملات پورے عروج پر ہوتے ہیں ابھی دن بجنے

میں پانچ دن منٹ باقی ہوں گے جب چاچا عبدال

بڑی تیزی کے ساتھ دفتر میں آیا۔

”وہ جی پتا چلا ہے شہر میں کسی بڑی سیاسی پارٹی

کا جلوس نکالا ہوا ہے اور شہر کا تمام کاروبار بند ہو چکا

فریق اپنے ترکش کا ہر تیرا زما کر فتح یاب ہو جاتا تو دوسرا اٹھ کر یا تو باہر نکل جاتا یا پھر کسی دوسری ٹکڑی میں جا بیٹھتا۔

ہیبت خاں سب سے الگ بیٹھا تھا اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہ تھے اس کی باؤی ننگلوتج بتا رہی تھی جیسے اس قتل کا اسے قطعاً کوئی افسوس نہیں مگر سب کے سامنے وہ اداکاری کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک کارندہ تیزی سے کوٹھی کا مین گیٹ عبور کر کے لان میں سے ہوتا ہوا ہیبت خاں کے قریب پہنچا۔ ہیبت خاں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو اس نے اپنا منہ ہیبت خاں کے قریب کر کے کچھ کہا تو ہیبت خاں اونچی آواز میں بولا۔

”ہاں ہاں تو آنے دو.....“ اس کے ساتھ بیٹھے یار غار کرار خاں نے پوچھا۔

”کون ہے.....؟“

”ڈی ایس پی طاہر ایوب ہے.....“ ہیبت خاں بولا۔

”بابا..... بتا تو اس طرح رہا ہے جیسے ملک کا سربراہ آ رہا ہو۔ ارے بھائی آنے دو.....“ کرار خاں ہنستے ہوئے بولا۔

”یہ میز سے بولیں، گلاس اٹھا لو اور میز صاف کر دو.....“ ہیبت خاں نے اپنے ملازم سے کہا اور اس سے پہلے کمانے والا ان تک پہنچتا ہیبت خاں کے سامنے رکھا ہوا میز صاف ہو چکا تھا۔

ڈی ایس پی طاہر ایوب اپنے دو سپاہیوں سمیت اس کے پاس پہنچا تو ہیبت خاں نے اس کا اٹھ کر استقبال کیا، طاہر ایوب نے آتے ہی کہا۔

”معاف کرنا خاں جی! میں آپ کو اس وقت زحمت دے رہا ہوں لیکن آپ کو پتا ہے قانونی تقاضے بھی پورے کرنا ہوتے ہیں۔“

”شہر ڈاؤن ہو رہے ہیں۔ مجسٹریٹ اور جج صاحبان بھی کام چھوڑ چکے ہیں اور پکھری بھی بند کی جا رہی ہے اوپر سے احکامات ہیں معاملہ زیادہ خراب نظر آ رہا ہے۔“ چاچا عبدال ایک سانس ہی میں سب کچھ کہہ گیا۔

میں چیپیر سے نکلا تو پکھری میں تقریباً افراتفری پھیلی ہوئی تھی اور لوگ جلدی جلدی پکھریوں سے باہر نکل رہے تھے پھر کچھ ہی دیر میں پکھری خالی ہو گئی۔ میں بھی چیپیر میں آ گیا تھا ابھی میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ چوہدری بلاول کا وہی نوکر آ گیا اور آتے ہی بولا۔

”توبہ ہے جی..... شہر میں تو آگ لگی ہوئی ہے۔“

”ہم لوگ اسے تفریح سمجھتے ہیں اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنا نقصان کر کے خوش ہوتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے فائلوں سے کچھ کاغذ نکالے وکالت نامہ تیار کیا اور جس جس جگہ دستخط مطلوب تھے نشان لگا کر دے دیئے اور کہا۔

”کل تک کاغذات مجھے پہنچا دیئے جائیں۔“

ہیبت خاں کی حویلی نما کوٹھی کے سیربزلان میں چھٹی کرسیوں پر ابھی بھی سچین کے قتل کا افسوس کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا اس کا ایک کارندہ افسوس کے لیے آنے والوں کو چائے پانی پیش کر رہا تھا۔ لوگ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بات ہیبت خاں کی بہن کے قتل سے شروع ہو کر نہ جانے کہاں تک پہنچ جاتی تھی اور جب وہ اپنی اپنی دلیلوں کی تلواروں سے دوسروں کی سوچوں کو زخمی نہ کر لیتے انہیں سکون نہ ملتا پھر ایک

”جی جی..... میرا مطلب ہے بیٹھے کچھ چائے پانی ہو جائے باقی کام تو ہوتا رہے گا۔“ بیبت خاں نے سنجیدگی طاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

”سب بعد کی باتیں ہیں خاں جی! پہلے ہم اپنا کام کر لیں۔“ پھر اس نے ایک سپاہی کی طرف دیکھا۔ ”کاپی پنسل ہے تمہارے پاس؟“

”وہ تو جی گاڑی میں رکھی ہے۔“ سپاہی نے سبے انداز میں جواب دیا۔

”کتنے ہو..... بالکل نکلتے..... جاؤ جا کر لے آؤ۔“ ڈی ایس پی طاہر ایوب نے ڈانسنے کے انداز میں کہا۔

”آپ ٹھہریں نہیں بندہ بھجواتا ہوں۔“ پھر بیبت خاں نے اپنے نوکر کو آواز دی۔ ”اوائے ایوبے..... جا بھاگ کر باہر سے صاحب کی گاڑی میں کانڈ پنسل لے آ۔“ تیرہ چودہ سالہ دبلالز کا بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور فوراً ہی پلٹ آیا۔

”میں مقتولہ کا کمرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ ڈی ایس پی طاہر ایوب نے کہا۔

”ضرور ضرور..... اب وہاں کیا رہ گیا ہے صرف یادیں ہی باقی ہیں۔ بہت پیار کرتی تھی مجھ سے یقین کریں ابھی تک میرے کانوں میں اس کی جی لالہ..... جی لالہ کہنے کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ لگتا ہے ابھی اندر سے نکل آئے گی۔“ بیبت خاں نے اداس لہجے میں کہا۔

”خان صاحب! مجھے بھی اس بارے میں بڑا دکھ ہو رہا ہے آپ جیسی شخصیت کے ساتھ یہ ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔“ ڈی ایس پی نے جواب دیا۔

دونوں چلتے ہوئے ایک کمرے میں آ گئے، کمرہ عام سا تھا کوئی غیر معمولی سجاوٹ بھی نہ تھی۔ ڈی ایس پی نے طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ذرا دیرہ نظروں سے

بیبت خاں کی طرف دیکھا تو بیبت خاں فوراً بولا۔

”بڑی سادگی پسند تھی میری بہن حالانکہ گھر میں سب کچھ تھا مگر اپنے کمرے میں وہ کسی قسم کی سجاوٹ نہیں چاہتی تھی اور پھر کون سا اسے نظر آتا تھا۔“

”کیا وہ بچپن سے ہی ناپسند تھی؟“ ڈی ایس پی نے سوال کیا۔

”جی نہیں..... پہلے اچھی خاصی دیکھ لیتی تھی 18 سال یا میرے خیال میں بیس سال کی ہوگی جب اچانک اس کی نظر ختم ہو گئی۔“

”کیا کوئی حادثہ ہوا تھا یا.....“

”بس یہ بھی ایک کہانی ہے وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیتوں میں گئی تھی کہ اچانک ہی اس کی آنکھوں میں شدید قسم کا درد اٹھا تھا تو وہ چیختی ہوئی گھر آ گئی اس کی سہیلیاں بھی ساتھ تھیں انہوں نے بتایا تھا کہ کھیتوں میں ایک درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے اسے اچانک چکر سا آ گیا، وہ گرنے لگی تو اس کی سہیلیوں نے اسے سنبھال لیا پھر وہ ان سے کہنے لگی۔

”مجھے جلدی سے گھر لے چلو، لگتا ہے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا ہے میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے۔“ جلدی سے وہ گھر پہنچیں تو میں نے فوراً جیپ نکالی اور نزدیکی قصبہ میں اسے لے گیا، اس وقت تک اس کی آنکھوں کے آگے پوری طرح اندھیرا چھا چکا تھا اور وہ بے تحاشہ رونے کے ساتھ چیخ رہی تھی۔

”جی لالہ..... مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا..... جی لالہ کیا میں اندھی ہو گئی ہوں..... میری آنکھوں کے آگے یہ اندھیرا کیوں چھا رہا ہے.....“ میں اسے تسلی دے رہا تھا جب ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچے اس نے اس کی آنکھوں کو چیک کیا اور کچھ دوایاں لکھ دیں

”اوہ معاف کرنا صاحب! میں واقعی سٹھیا گیا ہوں، پتا نہیں جذبات میں کیا اول فولبک رہا ہوں۔ دراصل یہ صدمہ ہی ایسا پتھر اوپر سے پولیس کیس اور میری بنی بنائی ساکھ..... سب نے مجھے پاگل کر ڈالا ہے معاف کرنا جی!“ بیبت خاں نے بوکھلائے انداز میں کہا۔

”ہاں تو بہت پیار تھا آپ کو اپنی بہن سے.....“ طاہر ایوب نے ٹھہرے انداز میں پوچھا۔
 ”سر! اس وقت میرے حواس ٹھیک نہیں ہیں میں آپ سے خود مل لوں گا، معذرت خواہ ہوں جناب میں آپ کو پورا وقت نہیں دے سکا۔“
 ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے..... تم نے ہماری گفتگو نوٹ کر لی ہے۔“ طاہر ایوب نے بیک وقت بیبت خاں اور اپنے سپاہی کو کہا۔

”جی سر!“ سپاہی نے جواب دیا۔
 ”میں مل لوں گا جی آپ سے بے فکر رہیں۔“ بیبت خاں نے اسی انداز میں کہا اور پتھر جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر طاہر ایوب کی طرف بڑھائی۔
 ”معاف کرنا خاں صاحب! ہر آدمی کو ایک ہی ترازو میں نہ تو لا کریں۔“ طاہر ایوب نے نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا اور پتھر اپنے سپاہی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یہ بھی نوٹ کر لیا ہے کہ نہیں.....؟“
 ”جی سر..... کر لیا ہے۔“ سپاہی نے موڈ بانہ انداز میں کہا۔

”گڈ.....“ طاہر ایوب نے کہا اور اپنی پتلون کی جیب سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال کر اس کا مین بند کرتے ہوئے بیبت خاں کو کہا۔

”معاف کرنا خاں صاحب کاغذات کی گواہی

آنکھوں میں ڈالنے کے لیے ڈراپس دیئے ہم واپس آ گئے۔ بس اسی روز سے میری بہن اندھے پن کا شکار ہو گئی، میں نے شہر کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو دکھایا سب نے مایوسی کا اظہار کیا۔“
 ”تجبین..... یہی نام تھا نا مقتول کا.....؟“ ڈی ایس پی نے پوچھا۔

”جی جی.....“ بیبت خاں بولا۔
 ”آپ کی یہ سگی بہن تھی؟“ ڈی ایس پی نے دوسرا سوال کیا۔
 ”نہیں جی، سوتیلی تھی لیکن مجھے سگی بہن کی طرح عزیز تھی۔“

ڈی ایس پی طاہر ایوب نے بڑی عمیق نظروں سے ایک بار پتھر کمرے کا جائزہ لیا تو بینہ کے قریب سے اسے چوڑی کا کمر اٹلا اس نے جھک کر اسے اٹھایا اور سپاہی کو سنبھالنے کے لیے کہا۔

”ہوں تو کیا کبہ رہے تھے آپ؟“ طاہر ایوب ڈی ایس پی نے دوبارہ بیبت خاں نے پوچھا۔
 ”جی میں بتا رہا تھا وہ مجھے بہت عزیز تھی۔“ بیبت خاں نے رو ہانسی آواز میں جواب دیا۔ ابھی وہ بائیں کمرے سے تھے کہ ایک ملازم بھاگتا ہوا اندر آیا۔
 ”خان جی..... خان جی..... ایک بری خبر؟“
 ”کیا ہوا؟ کیوں اس قدر بولا یا ہوا ہے۔“ بیبت خاں اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

”وہ جی..... قبرستان میں کتوں نے بی بی صاحبہ کی قبر کو کھول دیا ہے اور اس میں سے بی بی صاحبہ کا کفن نظر آ رہا ہے۔“

”کیا بکواس کرتے ہو..... اس عورت نے مر کر بھی میرے لیے مصیبت کھڑی کر رکھی ہے۔“ بیبت خاں کے منہ سے بے ساختہ نکلا پتھر فوراً ہی اسے جیسے اسے ہوش آ گیا۔

سنہری باتیں

● محبتوں میں شدت اس وقت تک رہتی ہے جب تک وصال نہ ہو، جب ہجر محبت میں سے تفریق ہو جاتا ہے تو محبت میں کشش ختم تو نہیں البتہ بہت قلیل رہ جاتی ہے۔

● جب عورت والدین کے گھر سے رخصت ہو رہی ہوتی ہے تو دوسری طرف عورت کی "میں" ختم ہو رہی ہوتی ہے۔

● زندگی ایک عجیب سفر ہے جس کے کسی اسٹیشن کا پتا نہیں چلتا کہ کہاں پر گاڑی رکے گی۔

● عورت کی سادہ آنکھیں جھکی پلکیں اس کی حیا کی دلیل ہیں۔

● جب تم برابر وقت آئے تو اچھے وقت کو یاد کرو۔
● دلوں کو فتح کرنے کے لیے تلوار کی نہیں قلم کی ضرورت ہوتی ہے (ٹیکسیپیٹر)

● ہم اندھیرے سے ڈرنے والے بچے کو باسانی درزر کر سکتے ہیں لیکن زندگی کا حقیقی المیہ یہ ہے کہ لوگ روشنی سے ڈرتے ہیں (مبمل کریم)۔

● اپنی خوشی کے لیے دوسروں کی مسرت کو خاک میں نہ ملاؤ (برنرینڈرسل)

محمد ارسلان... اسلام آباد

دوسرے لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے چوہدری بلاول کے گن مین ہاتھوں میں جدید اسلحہ پلڑے ادھر ادھر گھوم رہے تھے عجیب تناؤ زدہ ماحول تھا۔ کھانا کھانے کے بعد پولیس والے اٹھے ان میں سے ایک بڑے نے چوہدری بلاول کے کارندے سے کہا۔

"چوہدری صاحب کو بولنا ہم آئے تھے انہیں اپنی ضمانت کروالینی چاہیے ہماری اوپر بڑا دباؤ پڑ رہا ہے

اگر چہ سچی ہوتی ہے لیکن کایاں آدی جب مکر جائیں تو یہ گواہی بھی گونگی ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں نے یہ جرات کرنی زریکارڈ ہو گئی ہے ہماری گفتگو تا کہ سندھ رہے امید ہے آپ براندہ مانیں گے۔ یہ کہتے ہوئے طاہر ایوب اپنے سپاہی کو لے کر تیزی سے باہر نکل گیا اس کے جاتے ہی ہیبت خاں کی حویلی میں گویا زلزلہ سا آ گیا۔

"اوئے فیضو کدھر ہے.....؟ بلاؤ اس ماں کے.....؟" غصے میں ہیبت خاں دباڑا۔ اتنے میں فیضو ڈرتا اور کانپتا ہوا قریب آ گیا۔

"اوئے تمہیں اتنا نہیں پتا جب دو بڑے باتوں میں مصروف ہوں تو ان کی باتوں میں دخل نہیں دیا کرتے۔" ہیبت خاں نے غصے میں پوچھا۔

"پتا تھا خاں جی لیکن بات ہی ایسی تھی کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔" فیضو نے ڈرتے ہوئے رک رک کر جواب دیا۔

"جاو بلا بختوانائی کو..... اور اس کا سر موچھیں" واڑھی اور ابرو سب مونڈھو اور تمہاری غلطی کی یہ سب سے چھوٹی سزا ہے ورنہ تو جانتا سے ہیبت خاں بندہ مروادے تو اس کی کھوج بھی نہیں نکلتی وہ تو..... جو کندھوں پر پھول لگا کر اڑتا پھرتا ہے اس کو تو میں بعد میں دیکھوں گا۔ سالا جیب میں ٹیپ لیے پھرتا ہے اور اکھاڑو یہ سب شامیانے کرسیاں اٹھوادو..... بہت ہو چکا سوگ حرام خور مرتے مر گئی لیکن ہمیں مصیبت میں ڈال گئی ہے اور تم..... بندے ساتھ لے جاؤ قبرستان اچھی طرح سے دوبارہ قبر بنا دو ایک دو دن تک اس کا بھی کچھ کرتا ہوں۔"



چوہدری بلاول کی حویلی کے ان میں گئے شامیانوں کے نیچے چند پولیس والے اور کچھ

سوال ہے۔“چوہدری دوبارہ بولا۔
”ٹھیک ہے چوہدری جی آپ ان کے لوازمات
منگوا دیں۔“

”میں ڈرائیور کو بھیجتا ہوں چاہو تو خود ساتھ چلے
جاؤ اور پسند کی چیزیں لے آؤ یا اسے لکھ دو یہ لے
آئے گا۔ دیکھ فرید..... اوئے فرید.....“

”جی چوہدری صاحب!“ فرید بھاگا بھاگا آیا۔
”تم بابا کو ساتھ لے جاؤ بازار سے کچھ چیزیں
لانا ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے کچھ پیسے نکال کر بابا کو
بکڑائے اور خود دوسری طرف چلا گیا۔ حویلی میں چند
ایک لوگ بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے جب
انہوں نے چوہدری بلاول کو دیکھا تو جلدی سے اٹھ
کر کھڑے ہو گئے۔

”اوئے نصیرے..... کارکون لے کر گیا ہے۔“
”جی وہ اشارت نہیں ہو رہی تھی دھکا لگا کر
مکینک کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔“ نصیرے نے
جواب دیا۔

”اس سالی کو بھی آج ہی خراب ہونا تھا کب تک
ٹھیک ہوگی؟“ چوہدری بلاول نے پوچھا۔
”میں فون کرتا ہوں ابھی پوچھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر

اس نے اپنے کرتے کی جیب سے پرانے ماڈل کا
موبائل نکالا اور مکینک کو فون کرنے لگا۔ فون ہونے
میں کچھ دیر لگی تو چوہدری بلاول نے ہنس کر کہا۔

”اوئے سالے..... بابا آدم کے وقت کا
موبائل رکھا ہوا ہے وہ جو تم روزانہ لوگوں سے چھینتے
ہو ان میں سے کوئی ایک رکھ لو۔“

”آپ چاہتے ہیں کہ مدعا سمیت پکڑا جاؤں وہ
تو ادھر چھینا ادھر بیچنے والا معاملہ ہوتا ہے۔“ اس نے
دوبارہ فون ملاتے ہوئے جواب دیا کچھ دیر کے
بعد فون کر کے اس نے بتایا کہ کارٹھیک ہو چکی ہے اور

ہم آپ کا نمک کھاتے ہیں ہمارا کام تو آپ کو بتانے
کا ہے ویسے آج کل لاہور ہوتے ہیں یا کبھی گاؤں
بھی آتے ہیں۔“

”ادھر لاہور ہی ہوتے ہیں گاؤں کم ہی
آتے ہیں میں بتا دوں گا انہیں۔“ کارندے نے
جواب دیا۔

”کب تک میں کاغذوں کا پیٹ یہ لکھ کر بھرتا
رہوں گا کہ وہ گاؤں میں نہیں ہیں ہم بھی مجبور ہیں۔
کیا کریں ان کا خیال کریں یا قانون کو دیکھیں۔“
جاتے جاتے پولیس والے کہہ گئے۔

پولیس والوں کو گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی جب
حویلی میں چوہدری بلاول کی پجارو آ کر رکی۔ کلف
لگے کپڑوں میں ملبوس ہاتھ میں نئے ماڈل کا مہنگا
موبائل پکڑے پجارو سے نیچے اترتا وہ کارندہ بھاگا
بھاگا اس کے پاس گیا اور پولیس کا پیغام اسے
پہنچا دیا۔

”اچھا اچھا..... ان سے بھی نمٹ لیں گے وہ
بادرچی کدھر ہے اسے بلاؤ۔“ ملازم نے وہیں
کھڑے کھڑے بادرچی کو آواز دی تو ایک ادھیڑ عمر کا
آدمی آ گیا۔

”جی چوہدری صاحب!“ وہ آتے ہی بولا۔
”بابا! دیکھو میرے چند خاص مہمان دوپہر کو
آنے والے ہیں ان کے کھانے کا بندوبست کرنا
ہے۔ پھلی کے کنٹینر بن جائیں گے۔ میں پھلی
منگوا دیتا ہوں ساتھ چکن کڑی بنا لینا بیٹھے میں اگر
کسٹرو بن جائے تو ٹھیک ہے وگرنہ فرنی بنا لینا لیکن
شکایت نہیں ہونی چاہیے۔“

”پہلے کبھی شکایت ہوئی ہے چوہدری صاحب!“
وہ منمنایا۔

”میں آج کی بات کر رہا ہوں میری عزت کا

ذرا نیوراسے لے کر آ رہا ہے۔ ”کچھ بھی کہہ لو لیکن چوہدری نہیں.....“ چوہدری

بلاول نے دوبارہ اسی لہجے میں کہا۔ ”اچھا نصیرے اور تھو یہ حویلی کو صاف ستھرا کر لو“

شہر سے بڑے بڑے لوگ آ رہے ہیں میں کوٹھی میں

انہیں کھانا کھلا کر حویلی میں لے آؤں گا۔ ٹھیک ہے

یہ اب تمہاری ذمہ داری ہے یہ جتنا فالتو سامان اور

ٹوٹی ہوئی چیزیں ہیں یہاں نظر نہیں آنی چاہئیں۔“

ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ کار حویلی کے اندر آ گئی

کارتے دیکھ کر چوہدری بلاول ادھر جانے لگا جاتے

جاتے اس نے ایک بار پھر نصیرے کی طرف دیکھا۔

”سمجھ گئے ہونا۔“

”جی جی، چوہدری صاحب! آپ فکر ہی نہ

کریں۔“ چوہدری بلاول کار میں بیٹھا اور کوٹھی چلا گیا

کوٹھی میں داخل ہوتے ہیں وہ دہانڈا۔

”جینی..... او جینی.....“ اس کی آواز سنتے ہی دس

بارہ سال کی ایک کالی کلوٹی لڑکی اپنے گیلے ہاتھوں کو

دوپٹے سے پونچھتی ہوئی آ گئی۔

”وہ اندر دیکھو نوشین آئی ہے۔“

”جی اچھا.....“ وہ یہ سنتے ہی اپنے قدموں واپس

چلی گئی چند لمحوں کے بعد اس کے ساتھ اٹھارہ بیس

سالہ تیکھے نقوش اور ہنستی بڑی آنکھوں والی گوری چٹی

لڑکی باہر آ گئی۔

یہ نوشین تھی اسے آپ صبح کی چٹکی اور کچھ کچھ

سانولی روشنی کہہ لیں یا کڑیل دوپہر کی دھوپ۔ وہ

آتے ہی چوہدری بلاول کے نزدیک آ کر بولی۔

”جی چوہدری جی.....“

”ہزار بار کہا ہے تمہارے منہ سے چوہدری کا

لفظ جتنا نہیں ہے۔“ چوہدری بلاول نے ملائم لہجے

میں کہا۔

”تو اور کیا کہوں..... جان..... جانو.....

جانی.....“ اس کے لہجے کی گھنٹیاں اک دم بج اٹھیں۔

”ان کے سامنے چند ٹاپے کے لیے.....“

چوہدری بلاول نے مسکراتے ہوئے کہا، ”کچھ اس

طرح کا انداز اختیار کرنا ہے کہ وہ لوگ مجھے پارٹی

ٹکٹ دے کر ہی جائیں۔ ان میں ایک آدمی

بااختیار ہوگا، میں تمہیں اشارہ کر دوں گا بس تم نے

اس کے ارد گرد ہی رہنا ہے یہ کام تو بڑی آسانی سے

کر سکتی ہو۔“

”صرف آپ کے لیے.....“ دوبارہ مسکرا کر اس

نے جواب دیا۔

”ہاں ہاں، اگر مجھے ٹکٹ مل گیا تو پتا ہے.....“

”آپ کو اور کئی نوشین مل جائیں گی اور یہ نوشین

اپنی حسرتیں سمیٹتی رہ جائے گی ایسے ہی ہو گانا۔“

نوشین نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”بہت تیز ہو اور نشلی بھی.....“ چوہدری بلاول

بولتا۔

پھر اس بات پر دونوں ہنس پڑے، نوشین کو

چوہدری بلاول ہمیشہ نشلی کہہ کر پکارتا تھا، گاؤں میں

ایک ہی تو لڑکیوں کا ٹڈل درجے کا اسکول تھا۔ جس

میں اس سمیت دو اور نیچر تھیں مگر نوشین ان سے

خوب صورت، تیز طرار اور بھر پور جوان تھی۔ اسے

نظر ڈالی۔

”اوہ..... وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے، میں چلتا ہوں مجھے اور بھی کام دیکھنے ہیں۔“



دو پہر ڈھلنے سے پہلے پہلے دو تین کاریں اور ایک نئے ماڈل کی چھماتی پجاری چوہدری بلاول کی حویلی میں آ کر رکیں، چوہدری بلاول کا کارندہ گاڑیوں کو ترتیب سے حویلی میں لگوار ہا تھا اور چوہدری بلاول خود آنے والے مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ انہیں ترتیب سے لگوانے کے بعد چوہدری بلاول نے اپنی پجاری اور کار میں مہمانوں کو بٹھایا اور ان کے ساتھ خود بھی کوٹھی میں آ گیا۔ کوٹھی کے لان میں کچھی ہوئی کرسیوں پر مہمانوں کو بٹھا کر وہ اندر چلا گیا، جہاں نوشین بڑا خوب صورت لباس اور میک اپ میں ملازموں کو ہدایات دے رہی تھی۔

”مہمان آچکے ہیں.....“ اس نے نوشین کے قریب آ کر سرگوشی کی۔

”پھر ڈرکا ہے کا۔“ نوشین نے آنکھیں مڑکا لیں۔ ”کھانا تیار ہے، ایک بار مہمان خانے پر نظر ڈال لیں، کوئی کمی بیشی ہو تو بتادیں۔ میٹنگ ادھر ہی ہوگی نا۔“ نوشین نے دریافت کیا تو وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا مہمان خانے میں آ گیا۔ ایک بڑے لیکن درمیانی میز کے ارد گرد بڑی ترتیب سے کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور چوہدری بلاول کو لگا جیسے اس کی ترتیب پہلے سے بہتر اور خوب صورت انداز میں کر دی گئی ہو اس نے داوی دی۔

”شکریہ۔“ نوشین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

مہمانوں کو بوتلیں سرو کر دی گئی تھیں اور پھر جب وہ ہر طرح سے مطمئن ہو گیا تو لان میں آ کر اس نے

بات کرنا اور کسی بھی راہی کو اپنے رستے سے چلتے ہوئے بھٹکا دینے کا انداز آتا تھا۔ چوہدری بلاول کا اس سے تعارف ایک اسکول فنکشن میں ہوا تھا جس کی وہ صدارت کر رہا تھا اور نوشین میزبان تھی۔ اسکول کی ہیڈ مسٹریس ادھیڑ عمر اور ڈھیلی ڈھالی سی خاتون تھی، وہ اگر شام تھی تو یہ ایک کڑکتی اور کوکتی ہوئی دو پہر تھی۔ فنکشن میں نوشین نے کچھ اس طرح سے چوہدری بلاول کی پذیرائی کی تھی کہ فنکشن ختم ہوتے ہی چوہدری بلاول اپنا آپ وہاں ہارٹا یا تھا۔

اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً نوشین سے وہ ملتا رہا اور پھر آج کل کے دور میں سب سے بڑا رابطہ موبائل سے جو سب سے بڑا زور ہے۔ نوشین سے رابطے بڑھے تو چوہدری بلاول کی تمام عنایتیں نوشین پر برتے لگیں اور آج اس کا سب سے بڑا امتحان تھا۔

وہ کچھ دیر اس کے قریب کھڑی اپنے ایک ناخن سے دوسرے ہاتھ کی انگلی کے ناخن سے نیل پالش اکھاڑتی رہی، جب وہ خاموشی کی پاتال میں کہیں گم تھی تو چوہدری بلاول نے اس کا سکوت توڑا۔

”آج کا سارا فنکشن تمہارے نام اور تمہاری کامیابی میری کامیابی سے میں چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مز تو نوشین فوراً بول اٹھی۔

”مگر وہ آپ کی بیگم نہیں.....“

”ایک بات ذہن میں رکھو ہم زمیندار و ذریعوں کی گھریلو عورتیں کبھی کسی کے سامنے نہیں آتیں، اسے کوئی غرض نہیں کوٹھی میں کیا ہو رہا ہے اور کون کیا کر رہا ہے۔ وہ ہمارے حکم کی پابند ہوتی ہیں، ہمارے حکم کے بغیر یہاں پتہ بھی نہیں مل سکتا۔ وہ تو پھر ایک کمزور اور نمائی سی عورت ہے، تم بے فکر ہو کر کام کرو، پاور چمی بابا تمہاری مدد کرے گا۔ باقی سامان کچن میں موجود ہے، اوکے۔“ پھر اس نے کمرے میں لگے ہوئے کلاک

”میری سیکرٹری نوشین.....“ چوہدری بلاول نے تعارف کرایا۔ اس نے ہلکی سی جھبش سے داد دیتی نظروں کا جواب دیا اور چوہدری بلاول کی قمری کرسی پر بیٹھ گئی۔

”یہ نئی تبدیلی ہے، لگتا ہے ابھی سے لیڈر ہو گئے ہو۔“ ایک آواز آئی۔

”سمجھ دار اور عقل مند دوستوں کی سنگت میں کیا پلٹ ہو ہی جاتی ہے۔“ دوسری آواز ابھری۔

”بالکل درست کہا.....“ چوہدری بلاول نے جواب دیا۔

”میں پارٹی کے مخصوص اور بڑے عہدہ داروں کے ساتھ اس لیے ادھر آیا ہوں کہ پارٹی کچھ وضاحتیں آپ کی طرف سے چاہتی ہے اگر ان پر پورا اترے تو آپ کو اس حلقے سے پارٹی ٹکٹ دے دیا جائے گا ورنہ آپ کو پتا ہے کہ پارٹی میں اس حلقے کے لیے اور بھی کئی لوگوں کی درخواستیں موجود ہیں لیکن آپ کو اس لیے اہمیت دی جا رہی ہے کہ آپ پارٹی کے پرانے ممبر ہیں اور آپ کی پارٹی کے لیے خدمات بھی دوسروں سے زیادہ ہیں وہ آپ کے کیس کا کیا ہوا؟“ اس بڑے نے پوچھا۔

”ابھی کچھ نہیں ہوا دراصل میں نے ابھی سنجیدگی سے اس بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں۔“

”کیا آپ کی سیکرٹری ہماری گفتگو کے دوران ادھر بیٹھیں گی؟“ اس نے پوچھا۔

”اگر آپ کو اعتراض نہ ہو.....؟“ چوہدری بلاول نے جواب دیا۔

”رہنے دیں جی، ہوا کا تروتازہ جھونکا آتا رہے تو ذہن کی بالیدگی برقرار رہتی ہے۔“ دوسرے نے جواب دیا تو اس پر ایک بھرپور تہنیت ابھرا۔

”لگتا ہے لوڈھی صاحب کی حس مزاح اور مزاج نے جواب دیا۔“

مہمانوں کو کھانے کے لیے مدعو کیا انہوں نے اپنے ایک سینئر کو آگے ہونے کی دعوت دی۔ وہ اونچے لمبے قد اور بڑی بڑی خوب صورت انداز میں تراشی موٹھوں والا ایک پچاس پچپن سال کا مضبوط جسم کا مالک تھا جس نے بڑی ٹیس کمائی کی ٹینک لگا رکھی تھی اور کلف لگے شلوار قمیص کے اوپر اسی کھر کی واسکت پہن رکھی تھی۔

وہ آگے بڑھا تو دوسرے بھی اس کے پیچھے ہال نما کمرے میں آگئے وہاں بڑی نفاست کے ساتھ کھانا پہلے سے چنا ہوا تھا وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے دوران ہلکی پھلکی باتیں اور قہقہے لگتے رہے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد چوہدری بلاول انہیں مہمان خانے میں لے آیا۔

”چائے ادھر چل کر پیتے ہیں۔“ چوہدری بلاول نے کہا تو وہ سارے اس بات پر راضی ہو گئے مہمان خانے میں بھی بڑی سادگی لیکن نفاست سے آرائش کی گئی تھی۔

”لگتا ہے بھابی آپ سے زیادہ نفاست پسند ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بس گزارا ہے ہم غریبوں کے ڈیرے ہوتے ہیں کوھیاں تو شہر والوں کے نصیبوں میں ہوتی ہیں۔ یہ تو بیگم کو پڑھانی لکھانی نے شدید دے رکھی ہے اس لیے وہ ایسے کام کرتی رہتی ہے وگرنہ ہم تو دیہاتی ہیں سدا کے دیہاتی۔“ چوہدری بلاول نے ہنستے ہوئے دیہل دی۔

وہ سارے جب بیٹھ گئے تو کچھ وقفے کے بعد ایک تازہ اور ایلیمی خوشبو کا بیولہ تیرتا ہوا مہمان خانے میں داخل ہوا وہ اس قدر اچانک اور اتنی تیزی سے اندر آئی کہ سب کی نظریں یکدم اس کی طرف اٹھیں اور پھر جیسے جم کر رہ گئی ہوں۔

صاحب! اسد نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔
 ”میں نے بتایا کہ ابھی میں نے اس کیس کو
 سنجیدگی سے نہیں لیا، میں اندر سے مطمئن ہوں
 کیونکہ میں بے گناہ ہوں اور محض دشمنی کی بنا پر مجھے
 اس میں الجھایا گیا ہے۔ میں نے پہلے مینٹگ میں
 واضح کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے لیکن آج کل ماحول بدل گیا ہے
 آج لوگ بہت تیز اور آگے چل چکے ہیں۔ کسی زمانے
 میں پولیس ہماری عزت کرتی تھی ہمارے پوچھے بغیر
 کوئی کیس تھانے میں رجسٹرڈ نہیں ہوتا تھا لیکن اب
 وہ بھی ہمیں آنکھیں دکھاتے ہیں اگر آپ کو پارٹی
 ٹکٹ دے دیتی ہے اور مخالف اپنا داؤ استعمال کرنے
 میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور کسی مرحلے میں آپ کی
 گرفتاری ہو جاتی ہے تو پارٹی بدنام ہو جائے گی اس
 لیے ہم نے کہا تھا.....“

”مگر اس سلسلے میں پارٹی نے بھی میرا ساتھ نہیں
 دیا حالانکہ متحارب فریق اپنی پارٹی سے ہر قسم کی
 سہولتیں اور مراعات لے رہا ہے اس کیس کو رجسٹر
 کروانے میں بھی اس کی پارٹی کا بڑا ہاتھ ہے۔“
 چوہدری بلاول نے گلہ کیا۔

”سب ٹھیک ہے پارٹی پوزیشن کو بھی تم جانتے
 ہو، برسر اقتدار پارٹی اور اپوزیشن میں بہر حال فرق تو
 ہوتا ہے۔“

”اگر پارٹی اپنے ممبر کا تحفظ نہیں کرتی تو اور
 کون کرے گا؟ میں پارٹی معاملات پر معذرت
 خواہ ہوں۔“ ایک کھلتی ہوئی زباناہ آواز ابھری تو
 سب کی نظریں اس آواز کی طرف اٹھیں۔ یہ
 نوشین کی آواز تھی۔

”بات تو غور طلب ہے۔“ ایک مردانہ آواز

کی زنجینی میں فرق نہیں آیا۔ ”کسی دوسرے نے کہا۔
 ”ہاں اگر چوہدری بلاول بر محسوس نہ کریں تو ہم
 ان کا یہ شو پیس اسد صاحب کی بغل میں دیکھنا چاہیں
 گئے وہاں کیسا لگتا ہے۔“ لودھی نے دوبارہ ہنس کر
 تجویز پیش کی۔
 ”انہیں پارٹی میں کیوں نہیں لاتے۔“ اسد نے

چوہدری بلاول سے پوچھا۔

”میں پارٹی میں ہوں تو یہ بھی پارٹی میں ہے۔“
 چوہدری بلاول نے جواب گول کیا۔

”نہیں ایسے نہیں، ہم انہیں پارٹی کی لیڈرز ونگ
 میں کوئی عہدہ دیں گے۔“ اسد نے دوبارہ کہا۔

”بات کسی اور طرف جانکی میری تجویز کا کیا
 بنا۔“ لودھی نے دوبارہ آواز اٹھائی۔

اس بات پر اسد کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک شخص
 نے اپنی کرسی پیش کی اور اٹھ کر دوسری نشست پر بیٹھ
 گیا۔ چوہدری بلاول نے نوشین کی طرف دیکھا تو وہ
 اپنی جگہ سے اٹھی اور کیٹ واک کرتے ہوئے اسد
 کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب بھی سب کی
 نظریں اسی کی طرف لگی ہوئی تھیں اور نوشین کو بھی اس
 بات کا پوری طرح احساس تھا جی تو اس کی ہر ہر ادا کا
 فراندہ ہو رہی تھی۔

”گلد..... اب ہوئی ناں بات، خوب گزرے گی
 جوئل بیٹھیں دیوانے دو۔“ دیر سے خاموش بیٹھی ہوئی
 نوشین سے نہ رہا گیا اور کھل کر ہنس دی، جلت رنگ سی بج
 اٹھی۔

”اوہ گڑیا..... ہنستی ہے تو بولتی بھی ہوگی۔“ لودھی
 نے چمکتے ہوئے کہا۔

”بس بھئی بہت ہو چکا، اب اصل بات کی طرف
 آتے ہیں۔“

”ہاں تو آپ کچھ بتا رہے تھے چوہدری ابھری۔“

پارٹی کو ہمیشہ سے ضرورت رہی ہے۔“ لودھی نے بات آگے بڑھائی۔

”جیسے چوہدری بلاول چاہیں گے میں فیصلہ کر لوں گی۔“ نوشین نے جواب دیا۔

”گویا آپ کی ڈور چوہدری بلاول کے ہاتھ میں ہے۔“ ایک بولا۔

”یونہی سمجھ لیں۔“ نوشین مسکرا کر بولی۔

”میں آپ کے فیصلے کا منتظر رہوں گا یہ رہا میرا وزیٹنگ کارڈ۔ آپ براہ راست بھی مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر سکتی ہیں۔“ نوشین کی نظریں چوہدری بلاول سے ملیں تو چوہدری نے آنکھ کے اشارے سے اسے کارڈ لینے کا کہا۔ نوشین نے کارڈ پکڑ لیا اس کے بعد وہ سارے اٹھ گئے سب نے فرداً فرداً چوہدری بلاول سے ہاتھ ملایا اور اس کے بعد نوشین سے بھی ہاتھ ملایا سب سے آخر میں اس نے نوشین سے ہاتھ ملایا اور مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

کچھ دیر اپنے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھامے رکھا اور ایک بار پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں ذاتی طور پر آپ کی آمد کا منتظر رہوں گا“ آپ جیسی خوب صورت اور باصلاحیت خواتین کی پارٹی میں شمولیت سے پارٹی مضبوط ہوگی۔“

”میں کوشش کروں گی۔“ نوشین نے مسکرا کر اپنا ہاتھ چھڑایا۔

”اوکے ایک بار پھر پارٹی نمک کی پیشگی مبارک۔“ سب نے یک زبان ہو کر کہا اور کوچی کے لان میں آگئے چوہدری بلاول کے ڈرائیور فوراً انہیں لے کر حویلی آگئے۔

”میرے آنے تک رکنا۔“ چوہدری بلاول نے نوشین کو کہا اور ان کے ساتھ حویلی آ گیا۔ چوہدری اپنے گاڑن سمیت اپنی پکارو میں بیٹھا اور گاڑن کی

”مگر پارٹی کے معاملات میں آپ کس حساب سے دخل اندازی کر رہی ہیں؟“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”میں پہلے معذرت کر چکی ہوں اگر آپ کو بُرا لگا ہے تو ایک بار پھر میں معذرت خواہ ہوں۔ مگر ایک بات کہے بغیر نہ رہ سکوں گی کہ اس حلقے سے چوہدری بلاول سے زیادہ اچھا امیدوار آپ کو نہیں ملے گا جو ہر لحاظ سے جیتنے کی پوزیشن میں ہے۔“ نوشین نے ایک بار پھر دلیل دی ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ چوہدری بلاول کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

چوہدری بلاول نے موبائل کو دیکھا اور آن کرتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس مہمان خانے میں آیا تو پارٹی کے بڑے عہدیدار اس کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

”میرے وکیل عبدالقادر کا فون تھا اس نے بتایا کہ میری ضمانت قبل از گرفتاری عدالت نے منظور کر لی ہے۔“

”گڈ۔۔۔۔۔“ ایک طرف سے آواز آئی۔

”پھر میں ایگزیکٹو باڈی کے چیئرمین کی حیثیت سے اس حلقے سے آپ کو نمک کی یقین دہانی کراتا ہوں“ آپ کو اس کی پیشگی مبارک باد ہو۔ پارٹی چیئرمین کے دستخطوں کے بعد آپ کو باقاعدہ اس کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا جائے گا۔“ اسد نے آہستہ آہستہ اپنی رائے دیتے ہوئے کہا تو تمام دوستوں نے اس بات کی نہ صرف بھرپور تائید کی بلکہ تالیاں بجا کر اس فیصلے کا خیر مقدم کیا۔

”تو پھر آپ نے پارٹی کی رکنیت لینے کے بارے میں کیا سوچا؟“ اسد نے اب نوشین کو مخاطب کیا۔

”آپ جیسی ذہین اور باصلاحیت خواتین کی

”تم ہمیشہ سے میرا مان رہی ہو۔“ چوہدری بلاول نے ہنس کر کہا تو نشلی نے اپنا سر اس کے چوڑے چکلے سینے پر رکھ دیا۔



شہر میں ہونے والے ہنگامے اور توڑ پھوڑ کے بعد ذرا سکون ہوا تو لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ کاروبار کھلے تو بازاروں میں خریداروں کا رش جاگ اٹھا۔ پکھریاں بھی کھل چکی تھیں، قادر وکیل اپنے چیمبر میں بیٹھا آج کی تاریخ والے کیسوں کی فائلیں دیکھ رہا تھا۔

”دیکھو یہ دو تین کیسز ہیں میرے خیال میں ان کی صرف تاریخیں ملنی ہیں۔ تم ان عدالتوں کا چکر لگا آنا۔“ قادر نے اپنے ٹائپسٹ کو فائلیں دیتے ہوئے کہا۔

”میں دوسرے جج کی عدالت میں ہوں گا“ چوہدری بلاول کا کیس آج لگا ہے پہلی تاریخ ہے پھر مجھے اپنا وکالت نامہ بھی داخل کرانا ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو مجھے ادھر سے بلا لینا۔“ میں نے بتایا اور کیس کی فائل اٹھا کر اس متعلقہ عدالت کی طرف جانے لگا۔ میرا ایک قدم ابھی چیمبر اور دوسرا باہر تھا کہ وہ بدحواس ہو کر بھاگتا ہوا چیمبر میں داخل ہوا۔

”تیس پینتیس سالہ گھنے جسم کا اونچے قد کا ٹھکانا دیربائی سانو جوان تھا جو بہت گھبرایا ہوا تھا اندر آتے ہی وہ ڈر سے انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے جی..... قادر وکیل سے ملنا ہے۔“

”میں ہی قادر ہوں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے آپ سے ایک بہت ہی ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے ڈر سے انداز میں کہا۔

”تم بیٹھو میں عدالت سے ہو کر آتا ہوں۔“

صدور سے انہیں باہر تک چھوڑ کر واپس آ گیا وہ سیدھا کونھی میں آیا تھا جہاں نوشین ابھی تک اس کی منتظر تھی۔

”یہ سب تمہاری منتوں کا ثمر ہے۔“ چوہدری بلاول نے نوشین کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ نوشین بار بار دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو صاف کر رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ چوہدری بلاول نے نوشین سے پوچھا۔

”کوئی برا بلغم..... نشلی..... وہ دوبارہ بولا۔

”کچھ نہیں اپنے چہرے پر جمی ان شہدوں کی تہمتی نظریں صاف کر رہی ہوں۔“ نوشین مسکراتے ہوئے بولی۔

”نھک سے کالے بادلوں میں چھپی ہوئی سفید دودھیاری روشنی اچھی نہیں لگتی اور گنہگار ہوئی چاندنی چوہدری بلاول ویسے ہی پسند نہیں کرتا۔“ چوہدری بلاول نے اس کے سفید گلابی گال تھپتھپاتے ہوئے جواب دیا تو ہنسی کا جلت رنگ ایک بار پھر نچ اٹھا۔

”اب میں جاؤں۔“ نشلی نے پوچھا۔

”شکریہ..... ایک بار پھر شکریہ یہ کام تم ہی کر سکتی تھیں تمہارے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ میں اب آزادی سے اس کیس کے بارے میں سوچتا ہوں اس کم بخت نے ایک نئے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے اگر تم مناسب سمجھو تو پارٹی سے میرے لیے کوئی مدد بھی لے سکتی ہو۔“ چھ سوچتے ہوئے چوہدری بلاول نے نشلی سے کہا۔

”میرے اچانک بولنے سے وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہوئے تھے ضرورت پڑی تو ہندی پھر بھی آپ کے لیے حاضر ہے۔“ نشلی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا سر کو جھکاتے ہوئے کہا۔

”میں ہی قادر ہوں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے آپ سے ایک بہت ہی ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے ڈر سے انداز میں کہا۔

”تم بیٹھو میں عدالت سے ہو کر آتا ہوں۔“

”کتنی دیر لگے گی؟“ اس نے استفسار کیا۔

”کچھ دیر تو لگے گی ہی میں نے بتایا تم چیمبر میں بیٹھو عبدال چاچا! مہمان کو چائے وائے پلاؤ۔“ میں نے عبدال چاچا سے کہا اور دوبارہ باہر نکل آیا۔

”ذرا جلدی آنے کی کوشش کیجیے گا صاحب! مجھے جانے کی جلدی ہے۔“ اس کی فضا میں تیرتی آواز آئی۔

میں عدالت میں پہنچا ابھی میرے کمرے میں دیر تھی میں عدالت کے کمرے میں داخل ہوا اور جج کے ریڈر سے مخاطب ہو کر میں نے اپنی فائل اس کے حوالے کرتے ہوئے بتایا کہ چوہدری بلاول کیس میں تاریخ دے دی جائے ابھی تک عدالت میں جج نہیں آیا تھا۔ ریڈر سے میری شناسائی تھی اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور فائل لے کر رکھی۔

”میں دوبارہ چکر لگا لوں گا یا اپنے آدمی کو بھیج کر تاریخ کے بارے میں پوچھ لوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ریڈر نے جواب دیا۔

اور میں عدالت کے کمرے سے باہر نکل آیا تیزی سے چلتا ہوا اپنے چیمبر میں داخل ہوا تو مجھے وہ آدمی کہیں نظر نہیں آیا۔ چاچا عبدال دوسرے چیمبر میں بیٹھا تھا مجھے دیکھ کر وہ بھی آ گیا اور آتے ہی بولا۔

”عجیب ہونق شخص تھا میں نے اسے پانی پلایا اور چائے کا کہنے چلا گیا واپس آیا تو وہ یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا“ میں دوبارہ آتا ہوں“ میں نے کہا کہ میں اس کے لیے چائے کا کہہ کر آیا ہوں تو وہ بولا ”پتا نہیں وکیل صاحب کو کتنی دیر لگ جائے میں اتنے میں شہر دوسرا کام کر کے آتا ہوں ان سے کہیے گا میرا انتظار کریں کہیں اور نہ جائیں مجھے ان سے ضروری بات کرنا ہے چوہدری بلاول کیس سے متعلق۔“

میں نے آج کا اخبار ٹھالیا اور اس کا مطالعہ کرنے لگا میرا سینوا ابھی تاریں لے کر واپس نہیں آیا تھا میں کتنی دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آیا تو میں اگلے روز نکلنے والے کیسوں کی فائلیں دیکھنے لگا۔ میں اس وقت تقریباً یوں ہو چکا تھا کہ وہ دوبارہ آ گیا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔

”آپ ہی قادر وکیل ہیں ناں؟“ اس نے اپنے آپ کو ایک بار پھر یقین دہانی کروانے کی خاطر پوچھا۔

”ہاں..... ہاں بھئی تمہیں کوئی شک ہے۔“

”نہیں..... نہیں.....“ وہ خوف زدہ انداز میں مسکرایا۔

”میرا نام سلیم عرف چھندا ہے میں بیت خاں کے گاؤں سے آیا ہوں اور خان کا بڑا خاص ملازم ہوں یوں کہہ لیں اس کی مونچھ کا بال ہوں۔“

”ہوں..... میں نے دلچسپی ظاہر کی۔“

”میں آپ کو اس کیس کے بارے میں خاص معلومات دینے آیا ہوں۔“ اس نے اپنے ارد گرد دیکھ کر کہا۔

”یہ میرا چہرہ چاچا عبدال سے اور دوسرا میرا سینوا ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تک چیمبر میں کوئی دوسرا نہیں ہے تم بلا خوف بتاؤ کیا پتا چاہتے ہو؟“

”اگر میں کہوں کہ بیت خاں نے چوہدری بلاول کو محض پھانسنے کے لیے نکل کا یہ کیس ان پر ڈالا ہے تو.....؟“

”تم کیسے یہ کہہ سکتے ہو جبکہ چوہدری بلاول کے کیس میں ان کی معاونت کرنے والے دوسرے لوگوں نے اپنی گرفتاری دے دی ہے اور وہ کیس کے مندرجات جان چکے ہیں۔“ میں نے اس کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

”اچھا تھوڑی دیر ٹھہرو۔“ میں نے اسے تسلی دی اور پھر چاچا عبدال سے کہا۔

”چاچا عبدال ذرا جلدی سے جاؤ اور کچھریوں میں موجود ایس ایس پی کے آفس میں دیکھ کر آؤ وہ تشریف رکھتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ چاچا عبدال بولا اور چیمبر سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گیا اور بتایا کہ وہ اپنے دفتر میں موجود ہیں، میں نے اسے ساتھ لیا اور ایس ایس پی کے آفس میں آ گیا باہر کھڑے اردلی سے ملاقات کے لیے کہا۔

اردلی کچھ دیر بعد اندر سے نکلا اور ہمیں اندر لے گیا، ہم دونوں دفتر میں چلے گئے۔

اس کے حلیہ بیان نے کیس کی تمام مضبوطی ختم کر کے رکھ دی تھی اور کیس کا پانسہ بدل کر رہ گیا تھا اب میری درخواست پر ایس ایس پی نے اس بیان کو تا وقت ضرورت محفوظ رکھ لیا تھا۔ میں خوش تھا کہ اس اچانک خدائی امداد نے وقت سے بہت پہلے مجھے سرخرو کر ڈالا تھا۔

وہ اپنا پتا نشان اور موبائل نمبر مجھے فراہم کر کے جا چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ایسے بھی کیس ہوتے ہیں جو بیٹھے بٹھائے مجھ جیسے بے ہنر وکیل جیت جاتے ہیں۔ اس کے بیان سے لگتا تھا کہ چین کا قتل عداوت نہیں، اک بھینٹ تھا۔



”درست کہا آپ نے ایسے کئی کیس ہیٹ خاں کے کہنے پر میں بھی قبول کر چکا ہوں، آپ بھی گاؤں کے رہنے والے ہیں اور ان باتوں کو بخوبی جانتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ اور خاص طور پر ایسے وڈیروں، چوہدریوں اور خانوں کے ملازم اپنی بھوک منانے کے لیے ان کے آگے پیچھے ڈم ہلانا اپنی ایمانداری اور جاٹاری جانتے ہیں اور ان کے کہنے پر بعض کیس اپنے اوپر ڈالوا لیتے ہیں جو ہم نے نہیں کیے ہوتے۔“

کچ پوچھیں کہ وفا داری ثابت کرتے ہوئے اس کی طرف دھیان بھی نہیں جاتا، پتا نہیں ہمارا یہ فعل کس کھاتے میں لکھا جاتا ہوگا۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ ہیٹ خاں کی سوتیلی بہن چین کا قتل چوہدری بلاول یا اس کے کسی کارندے نہیں کیا بلکہ اس قتل میں خود ہیٹ خاں کا ہاتھ ہے، اسی نے اپنی بہن کو قتل کرایا ہے۔“

”اس کا ثبوت..... عدالت مفروضوں کی بجائے ثبوت مانگتی ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

”سب کچھ موجود ہے اور میں سب باتیں اور ثبوت آپ کو فراہم کرنے کو تیار ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہیں تفتیشی افسر کو بھی بیان دینا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”اس کے لیے بھی میں تیار ہوں۔“ وہ بولا۔

”اچھا اپنا موبائل نمبر مجھے دے دو میں بات کر کے آپ کو بلواؤں گا۔“ میں نے بتایا۔

”ہیٹ خاں بہت سفاک اور عیاش آدمی ہے اس کے کانوں میں بھٹک پڑ گئی تو وہ میرے ساتھ کچھ بھی کروا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اگلی بار میں آپ کو نظری نہ آؤں اگر آپ آج یہ تکلف کر لیں تو.....“

”ہیٹ خاں بہت سفاک اور عیاش آدمی ہے اس کے کانوں میں بھٹک پڑ گئی تو وہ میرے ساتھ کچھ بھی کروا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اگلی بار میں آپ کو نظری نہ آؤں اگر آپ آج یہ تکلف کر لیں تو.....“

کالے چہرے

انجم فاروق ساحلی

ملک میں تعلیم کس قدر مہنگی ہے، کتابیں اسٹیشنری دیگر اخراجات جو تعلیم پر اتنے بے وقوفانہ ہیں وہ رزق حلال سے ہرگز نہیں کیے جاسکتے۔ کرپشن ایسی ہے کہ انسان اپنا جائز کام بھی نہیں کروا سکتا۔ یہ سب سیاستدانوں کا کہا دھرا ہے، ملکی و قومی جرائم نے اس ملک کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس پر مستزاد قرضوں پر فرضے لیے جا رہے ہیں اور ملکی دولت لوٹ کر باہر کے ملکوں میں جمع کروادی گئی ہے۔ ملکی و قومی مفاد کی بجائے اپنے ذاتی کمیشنوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔

ایک اہم این اے کے بیٹے کا احوال جس نے شراب کے نشے میں نہت لپٹائی رش ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایک معصوم بچے کو کچل دیا تھا۔

سیاسی کرنامہ نمبر کے لیے بطور خاص ان کالے چہرے والے سیاست دانوں کا احوال جو ملک کی دولت دونوں ہاتھ سے لوٹ کر باہر بھیج رہے تھے۔

برسر اقتدار پارٹی کے رکن قومی اسمبلی وجاہت علی خان ناشتے کی میز پر اپنے دونوں بیٹوں عمران اور کامران کے ساتھ موجود تھے۔ جیسے ہی وہ ناشتے سے فارغ ہوئے عمران نے اخبار انقلاب کی خبر ان کے سامنے کر دی۔ وجاہت علی خان نے بڑبڑاتے ہوئے خبر کو پڑھا، نوکری نہ ملنے کی وجہ سے چاروں نوجوان خودکشی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ سرکاری حکومت نوکریوں پر بین لگا کر بیٹھ گئی ہے، نوجوانوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ حکومت ووٹ لے کر بے حس ہو گئی ہے اور کچھ نہیں کر رہی۔

”بیٹے عمران! مجھے ان واقعات پر افسوس ہے لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا۔ وزیراعظم کی کابینہ فیصلہ کرتی ہے یا اسمبلی میں بل پیش ہوتا ہے پھر رائے شماری کے بعد اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔“ وجاہت علی خان نے غیر جذباتی لہجے میں اخبار میز پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”ڈیڑی کیا یہ ایک سیاسی جرم ہے۔“

”وہ کس طرح؟“ وجاہت علی خان نے قدرے

ترش لہجے میں کہا۔

”جس آپ کی پارٹی انتخابی مہم کے دوران بار بار یہ دعویٰ کرتی رہی ہے کہ ہم برسر اقتدار آ کر نوجوانوں کو ملازمتیں دیں گے، انہیں ملک کی ترقی و خوشحالی کی راہ پر ڈالیں گے تو پھر ان وعدوں سے پھر جانا سیاسی جرم ہی ہوا۔“ عمران نے لہجے کو جارحانہ بناتے ہوئے کہا۔

”بیٹے عمران اس سلسلے میں اقدامات کیے جا رہے ہیں، ملازمتوں کے مواقع محدود ہیں اور آبادی بہت بڑھ گئی ہے لہذا مسائل پر قابو پانے میں وقت لگتا ہے۔ اگر کسی کو سرکاری ملازمت نہ ملے تو وہ کوئی دوسرا کام بھی کر سکتا ہے، کسی کی خودکشی کو حکومت سے منسوب کرنا درست نہیں۔“ وجاہت علی خان نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

”لیکن ڈیڑی آخر میرٹ کو کیوں نہیں اپنایا جاتا، میرے پاس اس وقت کئی سیاسی ورکروں کے لڑکے کے متعلق رپورٹ موجود ہے، جنہیں نالائق ہونے کے باوجود ملازمتیں دی گئی ہیں۔ صرف اس لیے کہ ان کے

انجوائے کرنا سیکھو جو نعمتیں تمہیں میسر ہیں تم بھی اپنے بڑے بھائی کا مران کی طرح ان سے محفوظ ہونا سیکھو کھاؤ پیو پیش کرو نو جوانی میں اپنے آپ کو روگ لگا لینا اچھا نہیں ہوتا آخر میں تمہارا باپ ہوں تمہارا دشمن نہیں اور جہاں تک جھوٹ سچ کا تعلق ہے تو حکومت کے انتخابی جھوٹ یا وعدہ خلافی کے علاوہ کیا سارا معاشرہ سچ بولتا ہے۔ دکاندار تا جزا کسرا تذا مذہبی اسکالر و محلہ کے مولوی بھی سچ بولتے ہیں۔ ان سب کی زندگی بھی جھوٹ سے ہی عبارت ہے مولوی قرآن کے واضح احکامات کے باوجود تفرقہ بازی پھیلاتے ہیں لوگوں کو لڑا کر اپنی دکانداری چمکاتے ہیں۔ ڈاکٹر اپنی کوتاہیوں سے میرے والوں کی ذمہ داری بھی اپنے سر نہیں لیتے تا جرنافص مال بیچ کر بھی اعتراف نہیں کرتے۔ عورت عورت کو تباہ کر کے بھی اس کا اعتراف نہیں کرتی۔ اس دنیا میں کون ہے جو آلودہ نہیں۔“ وجاہت علی خان نے عمران کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ان سب طبقتوں کی اصلاح کی ذمہ داری حکومت پر ہی تو عائد ہوتی ہے ترقی یافتہ ممالک میں چونکہ قانون پر پورا عملدرآمد ہوتا ہے قانون بکتا نہیں اس لیے ان سب طبقتوں کو بھی بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے لیکن جس ملک میں وزیر کا لڑکا بڑے سے بڑا جرم کر کے چھوٹ جائے اور غریب کو بلاوجہ تشدد کا نشانہ بنایا جائے اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔“ عمران نے سچ لہجے میں کہا۔

”کیا میں ان تمام برائیوں کا اکیلا ذمہ دار ہوں۔“ وجاہت علی خان غصے سے دباڑے اس بار عمران خاموش رہا۔ وجاہت علی خان چند لمحے عمران کو گھورتے رہے پھر کامران کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ان کا غصہ زائل ہو گیا۔

”ہاں تو بیٹا تمہیں کتنے روپے چاہئیں؟“

والدین برسر اقتدار پارٹی کے سیاسی گماشتے ہیں۔“ عمران نے ناگواری کا اظہار کیا۔ وجاہت علی خان کے چہرے پر غصے سے ٹٹلیں پڑ گئیں پھر وہ گویا ہوئے۔

”بیٹے انتخابی وعدے کوئی پارٹی بھی پورے نہیں کرتی ہم سے پہلی حکومت پانچ سال برسر اقتدار رہی لیکن صوبے بھر کی حالت کا کسے علم نہیں۔ ہماری حکومت کئی ترقیاتی منصوبوں پر کام کر رہی ہے سڑکیں پل انڈر پاس پارک ڈیولپمنٹ بہت کچھ ہو رہا ہے۔“

رہے اخبار نویس تو وہ ہر وقت صرف منفی باتیں ہی اچھالتے ہیں میں نے زندگی کی بہت بڑی غلطی کی تمہیں صحافی بننے دیا اب تم میرا ہی احتساب کرنا چاہتے ہو۔“

”ذیذی ترقیاتی منصوبے سڑکیں پل اپنی جگہ مگر مہنگائی کی آگ غریب کی زندگی کو جلا رہی ہے۔ اس سلسلے میں حکومت نے کیا کیا؟ بجلی پانی سونے گیس کے بل کس قدر زیادہ بھیجے جا رہے ہیں عوام چیخ رہے ہیں پرائم منسٹر صاحب مینڈیٹ کو رو رہے ہیں کیا مینڈیٹ اس لیے دیا جاتا ہے کہ غریب عوام کا جینا حرام کر کے رکھ دیا جائے۔“ عمران نے تنقید کا نشانہ بنایا۔

ذیذی تعلیم کس قدر مہنگی ہے کتابیں اسٹیشنری دیگر اخراجات جو تعلیم پر اٹھتے ہیں وہ رزق حلال سے پورے نہیں کیے جاسکتے۔ کرپشن ایسی ہے کہ انسان اپنا جائز کام بھی نہیں کروا سکتا۔ یہ سب سیاستدانوں کا کیا دھرا ہے ملکی وقومی جرائم نے اس ملک کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس پر مستزاد قرضوں پر قرضے لیے جارہے ہیں اور ملکی دولت لوٹ لوٹ کر باہر کے ملکوں میں جمع کروادی گئی ہے۔ ملکی وقومی مفاد کی بجائے اپنے ذاتی کمیشنوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔“ عمران نے اپنی بھڑاس نکالی۔

”بیٹا عمران! تم عوام کی فکر کی بجائے اپنی زندگی کو

چہرے کے خوب صورت نقش و نگار دل میں اتر جانے والے تھے اس کے جسمی نشیب و فراز میں ایک خاص کشش تھی وہ ایک ایسا بہیرا تھی جو کھنڈر میں بھٹک رہا تھا۔

وہ تاریک کھنڈر کیا تھا وہ تاریک کھنڈر غربت کا اندھیرا تھا جس میں وہ خوشنما کرن اپنا ذرا سا اجالا کیے ہوئے تھی۔ کامران زرب لب مسکرایا۔

”ابھی تک نالتی چلی آ رہی ہے اور خرچے پر خرچہ کمرہ رہی ہے لیکن کب تک آخرا سے میرے بندر روم میں آنا ہی پڑے گا پھر وہ میرے جال میں پھنس جائے گی اور اپنی زبان بند رکھنے پر مجبور ہوگی۔ میں اس کی حالت جذبات میں تصاویر اتر والوں کا جس کے لیے میرے پاس جدید ترین ریموٹ کنٹرول کیمرے ہیں جو میرے فارم ریسٹ روم میں اور ہوٹل دکش کے کمرہ نمبر 42 میں بھی نصب ہیں۔ میری اسپورٹڈ گھڑی کے ڈائل پر ان کیمروں کو آن کرنے والے بٹن موجود ہیں۔“

ابھی تک کتنی ہی حسین تتلیاں ہیں جو میرے دام ہوس کا شکار ہو کر بے بسی سے میرے تلوے چاٹ رہی ہیں۔ ڈیڈی سچ کہتے ہیں دماغ اور سیاست بڑی چیز ہے ان کا صحیح استعمال ہی انسان کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اخلاقیات کے بندھے نکلے اصولوں پر چل کر تو انسان کے لیے پیٹ بھرنا تن ڈھانچنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ کامران پانچ لاکھ کی مسرت سے مسکراتا ہوا بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی نگاہ سڑک سے ہٹ کر ایل سی ڈی اسکرین پر قفس کرنی نیم عریاں لڑکیوں پر بھی چلی جاتی تھی جو شہر پر اور بے باک تھیں۔

تیم خانے کی ایک بوسیدہ گلی کے باہر مین روڈ پر گاڑی روک کر اس نے کرن کومس کال دی تھوڑی دیر بعد کرن اپنے حسن جاں سوز کے ساتھ اس کی گاڑی کی

”ڈیڈی بس پانچ لاکھ روپیہ دے دیں مجھے اپنی حسین محبوبہ کی فرمائش پوری کرنا پڑتی ہیں اس کے علاوہ باقی دنیا داری بھی ہے۔“ کامران سے معصوم صورت بنا کر اپنا مطالبہ سنایا۔

”ٹھیک ہے مینا دے رہا ہوں بس یہ خیال رکھنا کہ تم سے کوئی ایسی حرکت نہ سرزد ہو جائے مجھے اخبار یا میڈیا والے پکڑ لیں۔“ سینٹھ و جاہت علی خان نے اب کی بار مسکراتے ہوئے عمران کی طرف دیکھا پھر بریف کیس سے چیک بک نکال کر پانچ لاکھ روپے کا چیک کاٹ کر کامران کو تھما دیا اس کے بعد اپنی بیٹی فرزانہ جو رات دیر سے گھر لوٹی تھی اور اس وقت سو رہی تھی اس کے لیے ایک لاکھ روپے کا چیک کاٹ کر الگ سے کامران کو دے دیا۔

”اور تم بھی لے لو کچھ۔“ و جاہت علی خان نے چیک بک عمران کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”شکریہ ڈیڈی! میرے اخراجات اب اخبار کی ملازمت سے پورے ہو جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے تمہاری مرضی میں تمہاری بحث و مخالفت کے باوجود کسی امتیاز یا تفریق کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا۔ میرا سب کچھ تم لوگوں کے لیے ہی ہے۔“

و جاہت علی خان نے پُر شفقت لہجے میں کہا اور پھر موبائل کی بیل بجنے پر فون سنتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں ایک بنگامی میننگ پر اسلام آباد بلا گیا تھا وہ بریف کیس لے کر جلدی سے پور نیو میں گاڑی کی طرف نکلے عمران اپنے اخبار انقلاب کی چھوٹی گاڑی میں آفس روانہ ہو گیا۔ کامران نے اپنی نئی لمبی کراؤن کروا باہر نکالی اور گاڑی کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی سے اس کا ذہن اپنی نئی محبوبہ کے گرد گھومنے لگا جو واقعی سورج کی شعاع کی مانند روشن تر و تازہ اور نکھری ہوئی تھی۔ اس کا حسین سراپا دکش چال اور

نہیں چڑھنے دیا۔ میٹرک کے بعد کسی کالج میں داخل نہ کروایا اگر زیادہ پڑھ لکھ جاتی تو کوئی اچھی ملازمت مل جاتی مگر میرے نصیب کہاں ایسے تھے۔ آئینہ دیکھ دیکھ کر خوش ہونے سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔“

کرن نے اپنے جلمے دل کی بھڑاس نکالی۔
”گھبراتی کیوں ہو جان من! ابھی کچھ دیر بعد ہمارے پاس نوٹ ہی نوٹ ہوں گے ڈیڑی نے چیک دے دیا ہے تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے میرے ہوتے ہوئے صرف میرے جذبات کی قدر کرنی چاہیے۔“ کرن نے اپنا بوجھ کامران کے کندھے پر ڈال دیا۔

”لیکن کامران ڈیر! تمہیں مجھ سے شادی کا اعلان کرنا ہوگا آج ورنہ اس کے بغیر میں آگے نہیں جا سکتی۔“ کرن نے کامران کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں..... کیوں نہیں میں بالکل تیار ہوں۔ صرف ایم بی اے کا رزلٹ آنے دو اس کے بعد بارات تمہارے ہی گھر جائے گی۔“ کامران کے چہرے پر مسکراہٹ اور یہ وعدہ کتنی لڑکیوں کی زندگی تباہ کر چکا ہے۔

”کیا تمہارے سیاستدان اور امیر ڈیڑی مجھے اپنی بہو بنائیں گے۔“ کرن نے پچھ سوچتے ہوئے کامران سے پوچھا۔

”ہاں ہاں..... کیوں نہیں میں انہیں تمہاری تصویر دکھا کر رضامند کر چکا ہوں تمہاری تصویر دیکھ کر ڈیڑی نے کہا تھا کہ ہم اپنے بیٹے کی خاطر اس ہیرے کو غربت کی کان سے نکالیں گے۔“ کرن مطمئن ہو کر پھر کامران کے کندھے سے لگ گئی۔ اس وقت سامنے نیشنل بینک دکھائی دینے لگا کامران نے پارکنگ پر گاڑی کھڑی کی اور کرن کو ساتھ لے کر

اگلی نشست پر موجود تھی۔ کرن نرم گداز سیٹ پر ٹیک لگا کر کھل کھلا اٹھی۔ گرمی کے موسم میں اسے سی کی بدولت سب سے ٹھنڈی فضا کتنی خوشگوار معلوم ہو رہی تھی وہ سوچنے لگی کہ دولت وہ چاہی ہے جس سے دنیا کے ہر عیش و آرام کا دروازہ کھولا جا سکتا ہے اسے جادو کی چابی بھی کہا جا سکتا ہے۔ دولت کے آنے سے رشتہ دار پڑوسی ملنے جلنے والے کتے قریب ہونے لگتے ہیں اور دوسری طرف غربت کے بھیانک سائے میں والدین کی سب سے بڑی نوبت ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانا بچوں کی کثرت مسائل گھر کے کرائے کا خوف ہر وقت انسان اپنا ہی خون پیتا رہتا ہے۔ یہ آوازیں کرن کے اندر سے اٹھ رہی تھیں اور وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس بھنور سے باہر ضرور نکلے گی۔

”کن خیالوں میں گم ہو؟“ کامران نے اس کے کندھے پر بازو پھیلا دیا۔

”بس کامران صاحب! مکان کے کرائے کا مسئلہ جب سے ابا کی کریانے کی دکان کی قریب دوسری بڑی دکان کھل گئی ہے ہمارا تو ناٹھ ہی بند ہو گیا ہے۔ مکان اور دکان کا کرایہ دینا ہی مشکل ہو گیا ہے ابادے کے مریض ہیں۔ کل تو ان کا سانس رک ہی گیا تھا اپنی سبکی شگفتہ کوفون کیا وہ گاڑی لے کر آئی پھر انہیں اسپتال پہنچایا جہاں ایمر جنسی میں دیکھ بھال کے بعد ان کی حالت بہتر ہوئی تو رات دو بجے گھر لے کر آئی۔ ڈاکٹروں نے بھی ادھر بھگایا کبھی ادھر یہ دوالاؤ پھر یہ بھی لے آؤ وہ بھی لاؤ۔ اگر شگفتہ ساتھ نہ ہوتی تو ابا کی سانس شاید ہی بحال ہوگی۔ امیر لوگ ہی کام آتے ہیں غریب کیا کسی کا ساتھ دے سکتا ہے۔ وہ تو خود بے حال ہوتا ہے وہ کسی کی آگ کیا بجھائے گا۔ بقرعید آنے والی ہے بچوں کے کپڑوں اور جوتوں کا مسئلہ ہے ابا نے بچوں کی لائن لگا کر مجھے کسی لائن پر

سے ایک پر کامران کی پسندیدہ سرخ شراب سجادہ گئی جسے وہ لالہ پری کہتا تھا باقی شراب کی بوتلیں ڈنگی میں رکھنے کے لیے ملازم کامران سے چانی لے کر باہر روانہ ہو گیا۔ کرن تھوڑی سی شراب تو پینے لگی تھی لیکن آج کامران نے ضد کر کے اسے تیز سرخ شراب پلا دی پھر دونوں ڈانسنگ فلور پر چلے گئے جہاں دوسرے سیاستدانوں ایم این اے ایم پی ایے وغیرہ کے مختلف پارٹیوں کے ممبرز کے لڑکے لڑکیاں رقص و سرور کی محفل جمائے ہوئے تھے۔ ماحول نیم تاریک تھا اور چھت سے پڑتی روشنیوں کی ریلین چمک اچانک ہی لڑکیوں کے جسموں کے نشیب و فراز نمایاں کر دیتی تھی۔ ماحول سحر انگیز تھا۔

کامران اور کرن نے خوب اچھل کود کا مظاہرہ کیا، جب دونوں ہال سے باہر نکلے تو دونوں پر ہلکا ہلکا سا نشہ چھایا ہوا تھا، کامران کی کار تیزی سے رائے ونڈ روڈ پر اپنے زرعی فارم کی طرف سفر کرنے لگی۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل پھیلنے لگے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ راستہ دھندلا دھندلا دکھائی دینے لگا کیونکہ ہوا کے شدید جھکڑ شروع ہو گئے تھے۔ شراب کی بو کامران کے منہ سے اٹھ رہی تھی آج وہ موجِ مستی میں آکر زیادہ پی چکا تھا، ابھی بھی کار ڈمگنے لگتی کرن کچھ فکر مند ہوئی موسم بے بے حد خراب تھا۔

جیسے ہی کار رائے ونڈ روڈ پر آ کر کچی کوئی اسٹاپ سے اچھا گئے ننگی دونوں جانب تھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، نشے اور بارش کی شدت کی وجہ سے کامران بروقت بریک نہ لگا سکا اور اس کی لمبی کروڑن کروڑا لٹری سڑک پر بھینٹ بکریوں کا رپوز گزارنی لڑکی کو کچل کر آگے بڑھ گئی۔ اس کی چیخ سے ماحول کانپ اٹھا، کامران نے تیزی سے سڑک کا جائزہ لیا تیز بارش زدہ

بنک کے صدر دروازے کی طرف چلنے لگا، بریف کیس اس کے ہاتھ میں تھا۔ نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر کرن کے منہ میں پانی آ گیا اسے اپنے گھر کے سامنے عالی شان مکان میں رہنے والی ملک صاحب کی بیٹیاں یاد آنے لگیں جو کتنی شان سے نئے فیشن کے بھڑکیلے خوش مالہاس پہن کر باہر نکلتی تھیں اور اس کے پاس چند پرانے سوٹ ہی تھے جنہیں پہن پہن کر وہ بور ہو چکی تھی، جوتے بھی سستے اور غیر معیاری سے تھے۔ میک اپ کا سامان بھی ختم ہو چکا تھا اور جیولری تو اس کے مقدر میں ہی نہیں تھی۔ کامران نے مسائل کے حل کے لیے کئی نوٹوں کی گڈیاں کرن کو تھما دیں، کرن نے جلدی جلدی انہیں پرس میں ڈال کر اٹک لگا دیا کہ کہیں وہ اڑ کر دور نہ چلی جائیں۔

اب اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون دکھائی دے رہا تھا، فکر کے بادل چھٹ گئے تھے اور جوانی کا موسم اٹھا یا تھا۔ اس نے شوخ نگاہوں سے کامران کی طرف دیکھا، کامران کا ہاتھ مائل بہ شرارت تھا، دوسرا ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھا۔ دہنی چوک سے آگے نکل کر ایک مغربی طرز کے ہوٹل کے عقبی حصے میں پارکنگ پر اسپیشل ٹوکن لے کر کامران نے گاڑی کھڑی کر دی۔ دونوں گاڑی سے نیچے اترے اور ہوٹل کے عقبی دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ شیٹے کے دروازے سے گزر کر وہ ایک خوشنما ہال میں سامنے نصف دائرے کی شکل کے سیاہ کاؤنٹر پر بیٹھی نیم عریاں لڑکی نے مسکرا کر انہیں خوش آمدید کہا۔

کامران کے علاوہ یہاں اور بھی سیاستدان اور امرا کی ناز سے پالی ہوئی اولادیں موجود تھیں۔ کامران نے لڑکی کو اپنی شراب کی ڈیمانڈ سے آگاہ کیا باوردی ملازم تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آرڈر کی تکمیل کے لیے متحرک ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہال میں لگی خوشنما میزوں میں

ماحول میں سڑک اور ماحول سنسان تھا۔

کرگڑی کی طرف بھاگا، کرن اس کے ساتھ تھی۔
کامران نے گاڑی میں بیٹھ کر کار کو ایک ذیلی سڑک پر
ڈال دیا تاکہ کسی کو ان پر شک و شبہ نہ ہو۔ وہ اس بات
سے بے خبر تھا کہ زخمی بوڑھے نے اچانک بجلی چمکنے
سے روشنی میں اس کی گاڑی کا نمبر ذہن نشین کر کے
انگلی سے اپنے چہرے سے بہتے لہو کے ساتھ اپنی
سگریٹ کی ڈبچہ پر ایک شیڈ کے نیچے جا کر لکھ لیا تھا۔

اس وقت زخمی بوڑھے کے پاس روزنامہ انقلاب
کے رپورٹر انور کی گاڑی آ کر رکی انور نے سڑک کا
منظر بھی دیکھ لیا تھا۔ بوڑھا سڑک کے کنارے دہائی
دے کر گاڑیاں روکنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن
بہت سی کاریں نکلتی چلی گئیں وہ اس حادثے کے چکر
میں نہیں الجھنا چاہتے تھے لیکن رپورٹر انور نرم دل اور
بہمردانہ مزاج کا انسان تھا، ظلم اور زیادتی تو وہ دیکھ ہی
نہیں سکتا تھا۔



آج کرن بھی نشے میں تھی کامران نے اسے کچھ
زیادہ پیادہ تھی وہ اب بے خود ہونی چاہتی تھی۔
کامران کی گاڑی بارش میں نہائی ہوئی اپنے زرعی فارم
میں داخل ہو چکی تھی۔ کامران اور کرن ایک دوسرے
سے لپٹے ہوئے فارم ہاؤس کے بیڈروم میں پڑے
تھے۔ دونوں جذبات کی آخری حد سے گزر رہے
تھے۔ کامران نے نشے میں ہونے کے باوجود اپنی
اسکیم کے مطابق چہرے پر کپڑے کی پٹی لپیٹ لی تھی
تاکہ کیمرا اس کا چہرہ نہ عکس بند کر سکے۔ کرن کا چہرہ
اور جسم کیمرے میں محفوظ ہوتا جا رہا تھا۔

اب کرن اس کی منہی میں آ چکی تھی جب کرن کا
شادی کا مطالبہ ایک دن زور پکڑ گیا تو کامران نے اس
کی اپنے ساتھ اترنے والی نئی تصاویر اس کے سامنے
ڈال دیں کرن شرم و حیا سے کانپ اٹھی۔

”یہ کیا ہو گیا... اب کیا ہوگا؟“ کرن خوف زدہ
لہجے میں بڑبڑائی۔

”جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“ کامران نے رکی ہوئی
گاڑی کو پھر اشارت کرتے ہوئے کہا لیکن کرن نے
چابی کھینچ کر گاڑی روک دی۔

”کامران اتنے بے حس نہ بنو اسے جا کر دیکھتے
ہیں اگر زندہ ہے تو کسی قریبی اسپتال لے چلتے ہیں۔“
کامران تذبذب کا شکار تھا پھر باہر نکلا اور کرن کے
ساتھ تڑپتی لڑکی کے پاس آیا، کار کے ٹائر اس کے
سنے سے گزر گئے وہ ٹھنڈی ہو چکی تھی بے حس و حرکت
آج تک نہیں۔

”ختم ہو گئی اب بھاگنا ہوگا۔“ کامران بڑبڑایا
اسی وقت ایک تندرست سے بوڑھے نے چیخ مار کر
سڑک پر آ کے اسے پکڑ لیا۔ کامران کسرتی جسم کا مالک
تھا اس نے بوڑھے کو جھٹک کر دو گھونٹے اس کے منہ
پر مارے بوڑھے کا منہ خون سے سرخ ہو گیا لیکن وہ
اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا بلکہ غضب ناک
انداز سے گرج کر بولا۔

”حرام زادے تُو نے تو شراب پی رکھی ہے تُو نے
میری بیٹی کو شراب کے نشے میں چل دیا ہے۔ میں
تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔“ بوڑھے کے بازوؤں میں
پرانی خوراک کی طاقت موجود تھی وہ زخمی چہرے کے
باوجود اسے دبوچے ہوئے تھے کرن کانپ گئی۔
کامران نے اپنا ریوالور نکال لیا لیکن اس وقت سڑک
پر دور کچھ گاڑیاں تیزی سے ادھر آئی ہوئی نظر آنے
لگیں جن میں ایک پولیس کار بھی شامل تھی۔ اب
کامران نے کچھ سوچ کر بوڑھے کے نازک مقام پر
ات ماری جس سے ایک کراہ کے ساتھ بوڑھے کی
چیخ نکل گئی اور رفت کمزور پڑ گئی۔ کامران اسے جھٹک

امید

○ امید ایک ایسا لفظ ہے جو دل کو تسلی دیتا ہے

○ امید ایک ایسا جگمگاتا جگنو ہے جو بھٹکنے ہوئے انسان کو حوصلہ دیتا ہے

○ امید انسان کی رگ رگ میں اس طرح دوڑتی ہے جس طرح زندہ انسان کے جسم میں خون دوڑتا ہے۔

○ امید ایک ایسی رہ گزر ہے جو انسان کو اس کی منزل کے قریب لے جاتی ہے۔

○ امید کے بل بوتے پر دنیا کا نظام چل رہا ہے

محمد اکرام..... وہاڑی

وجاہت علی خان کے صاحبزادے کی کار ہے وہ تو بہت محتاط اور شریف لوگ ہیں اور ان کے صاحبزادے نے شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا تم کیوں مجھے مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتے ہو۔“

”صاحب جرم تو جرم ہی ہے چاہے کوئی چھوٹا آدمی کرے یا بڑا آدمی“ قانون کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ میں نے گاڑی کا نمبر دیکھنے میں کوئی غلطی نہیں کی اگر آپ مجھے اس پاپی کے سامنے لے چلیں تو میں فوراً اسے پہچان لوں گا۔“

”ٹھیک ہے بڑے میاں آپ جاپے میں وجاہت علی خان کے لڑکے کو چیک کرنے کے بعد آپ کو بلواؤں گا۔“

”جناب تھانیدار صاحب! گاڑی کے مالک کی تصدیق کے بعد تو آپ کو یہ پرچہ کرنا چاہیے میں تب ہی یہاں سے اٹھوں گا۔“ بوڑھے نے کرسی سے ٹیک لگا کر پاؤں پھیلا دیئے پھر اپنے موبائل سے اپنی اس پارٹی کے مقامی لیڈر سے رابطہ قائم کرنے لگا جن کے

”بے غیرت! کم ظرف! کہیں..... تو نے مجھے برباد کر دیا میں نادان تھی جو تجھ پر مرمی۔“ کرن غصے سے کامران کو کوسنے لگی۔ ”کچھ تو خیال کرو میں حاملہ ہو چکی ہوں اپنے ہونے والے بچے کا ہی خیال کرو۔“

کرن نے کچھ نرم رویہ اختیار کیا لیکن کامران نے چند نوٹ اس کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔

”کبھی بھی اچھے کیلنگ سے اپارش کروالو یہ اب ایک عام سی بات ہو گئی ہے۔“ یہ کہہ کر کامران ہونل کے کمرے سے نکل گیا اور کرن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اس کی جوانی کی دھوپ کو سیاہناگ ڈس چکا تھا۔



انور بوڑھے شیردل کے ساتھ خود تھانے جا کر رپورٹ درج کروانا چاہتا تھا لیکن اسے گھر سے بیوی کا فون آ گیا کہ اگلوتے بیٹے راجہ کو النیاں آرہی ہیں طبیعت ٹھیک نہیں فوراً گھر آ کے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ انور اپنے ایک دوست سے رائے وند کے ایک ہونل میں ملنا چاہتا تھا جو اسے مشکوک مقامات کی اطلاعات دیا کرتا تھا لیکن اب ملاقات ملتوی ہو گئی تھی۔

شیردل جس کی بیٹی کو سفید کراؤن کروانے کچل ڈالا تھا اس کا نمبر سگریٹ کی ذبیہ پر اپنے خون سے لکھا ہوا دیکھا کر تھانیدار شجاعت علی جو ٹھوکر نیاز بیگ پولیس اسٹیشن میں تعینات تھا متاثر تو ہوا لیکن جب گاڑیوں کے رجسٹریشن آفس سے کار کے نمبر کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں تو تھانیدار بے زار اور اعلق دکھائی دینے لگا۔

”بڑے میاں آپ سے نمبر دیکھنے میں ضرور کوئی غلطی ہو گئی ہے موسم بے حد خراب تھا پھر غصہ کی حالت میں آپ صحیح طور پر نمبر نہیں پڑھ سکے۔

یہ گاڑی کا نمبر برسر اقتدار پارٹی کے ایم این اے

تھے وہاں سب میرے وفادار ہیں اور میری سرپرستی میں ہی وہاں جو غیر قانونی کام و بغیر پرمٹ کے شراب فروخت کی جاتی ہے۔ ہوٹل کا مالک ہماری پارٹی کا زبردست سپورٹر ہے اس لیے ہم اسے قانون سے بچائے رکھتے ہیں۔ میں ابھی فون کر کے تمہارا حادثے کے مقام سے عدم موجودگی کا ثبوت تیار کرتا ہوں۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی وجاہت علی خان نے موہل فون پر ہوٹل راج محل کے مالک و منیجر اسحاق خان سے گفتگو کی پھر وہاں تاش کھیلنے والے چند افراد کو لالچ دے کر خرید لیا اب کامران کو گرفتار کرنا آسان نہیں تھا۔



بوڑھے نے عدالت میں رٹ دائر کر دی جس کی سماعت کے وقت جھوٹے گواہوں نے بیانات دے دیئے کہ جس وقت حادثہ پیش آیا تو کامران صاحب ان کے ساتھ ہوٹل راج محل میں تاش کھیل رہا تھا۔ بیروں کو بھی خرید کر بیان رٹا دیا گیا بوڑھا انور اور سیاسی پارٹی کا نمائندہ انصاف کے اس خون پر دم بخود رہ گئے۔ عدالت نے وکیل صفائی کے کہنے پر بوڑھے شیردل کی نظر نمیسٹ کروائی تو اس کی دور کی نظر کمزور ثابت ہوئی چنانچہ یہ سمجھ لیا گیا کہ اسے نمبر پڑھنے میں مغالطہ ہو گیا ہے۔

کامران کو جرم کے باوجود رہا کر دیا گیا بوڑھا شیردل اسے گالیاں دینے لگا۔ وجاہت علی خان نے پریس کانفرنس کرتے ہوئے اخباری وئی کے نمائندوں کو یہ بیان دیا کہ بوڑھا شیردل چونکہ حکومت مخالف پارٹی سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ اس نے نمبر بدل کر میرے بیٹے پر الزام عائد کر دیا حادثہ ہوا ضرور ہے لیکن میرا بیٹا تو ہوٹل راج محل میں اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا۔

کامران کا بھائی عمران بھی اس مقدمے کا فیصلہ

وہ پوسٹر اور بیسنرز وغیرہ لگایا کرتا تھا جو اس وقت پر سر اقتدار پارٹی کے لیے ایک خطرہ بن کر ابھری تھی۔ غریب عوام کو انصاف دلوانا اس کی پہلی ترجیح تھی کچھ دیر میں ہی انقلابی پارٹی کا نمائندہ تھانہ ٹھوکر نیاز بیگ پہنچ گیا اور پھر بوڑھے نے اخباری رپورٹر انور کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا انور نے کہا۔

”فون تھانیدار کو دو۔“ بوڑھے نے فون تھانیدار کی طرف بڑھایا تھانیدار اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا جیسے کچا پی چبا جائے گا۔ انور کرائم رپورٹر تھا اس سے بھی پولیس والوں کی جان جاتی ہے۔

دو طرفہ دباؤ کے نتیجے میں مجبوراً تھانیدار نے وجاہت علی خان کے بیٹے کے خلاف پرچہ کاٹ دیا۔ وجاہت علی خان کی کوٹھی ٹھوکر نیاز بیگ کے بڑے چوک سے شروع ہو کر شیخ زید ہسپتال کی طرف جانے والے روڈ پر ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھی۔

وجاہت علی خان کا بے بگا ہے تھانیدار محمد علی کی مالی امداد کیا کرتا تھا اور تھانیدار بھی وجاہت علی خان کی پارٹی کے افراد کی غنڈہ گردی اور قانون شکنی وغیرہ اندوزی وغیرہ سے آنکھیں بند کیے رکھتا تھا لیکن اس بار دو طرفہ دباؤ سے وہ مجبور تھا وہ وجاہت علی خان کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔



کامران نے گردن جھکائے وجاہت علی خان کے سامنے حادثے کا سارا واقعہ بیان کر دیا تھا۔

”برخوردار! شراب اتنی پیو کہ جو اس کنٹرول میں رہ سکیں میں بھی پیتا ہوں لیکن بھی آپ سے باہر نہیں ہوا خیر اب اس کا ایک ہی حل ہے تم گھبراؤ مت ہم اس بوڑھے کے بیان کو جھٹلا دیں گے رپورٹر انور کے ساتھ ہونے کے باوجود۔ بس تم یہ بیان یاد کرو کہ تم ہوٹل راج محل میں فلاں فلاں افراد کے ساتھ تاش کھیل رہے

میں کرن نے ایک اداس نگاہ پھولوں پر اڑتی تتلیوں پر ڈالی جنہیں اس کی زندگی کی مانند منزل کا کچھ پتا نہیں تھا پھر عمران کی طرف گلا کھنکھار کر متوجہ ہوئی۔

”جی فرمائیے چھوٹے سرکار۔“

”مس کرن صاحب! جس محل کے مقدمے میں کامران صاحب ملوث ہیں اور انہوں نے راج محل ہوٹل میں اپنی موجودگی کا ثبوت دیا اس دن تو میرے قریبی دوست ڈاکٹر حسین نے آپ کو کامران کے ساتھ رائے ونڈ روڈ پر طوفانی موسم میں سفر کرتے دیکھا تھا۔ وہ آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہے ہمارے فیملی ممبر کی مانند ہے لیکن آپ نے قانونی رابطہ کے باوجود اس کا اعتراف نہیں کیا کیوں؟“ عمران نے سخت نگاہوں سے کرن کو گھورتے ہوئے کہا۔ کرن چند لمحے خلا میں گھورتی رہی پھر گویا ہوئی۔

”عمران صاحب! کامران صاحب نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا لیکن میں اس دن ان کے ساتھ موجود نہیں تھی آپ کے دوست کو غلطی لگی ہوگی دیکھنے میں دھوکا ہو سکتا ہے۔“ کرن نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں۔“ عمران نے ہر زور لہجے میں کہا۔ ”کیوں کہ میں نے بھی کامران بھائی کی کار کو سڑک پر ایک جگہ سفر کرتے دیکھا تھا اور اس کا رخ راج محل سے بالکل مخالف سمت میں تھا۔“

”عمران صاحب کیا وہ کسی اور طرف جا کر واپس راج محل ہوٹل نہیں جاسکتے اور کیا میں ان کے ساتھ تھی اس وقت۔“ کرن نے بھی اپنی تیز نظریں عمران کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

”نہیں اس وقت آپ ان کے ساتھ نہیں تھیں مگر ان کی گاڑی کا رخ اس وقت یتیم خانہ چوک کی طرف تھا۔“ عمران نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

سننے کے لیے آیا تھا اور اس کے بری ہونے پر اسے مسلسل گھور رہا تھا کیونکہ اس کے ایک دوست نے اسے اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ دن کے دو بجے رائے ونڈ روڈ پر گزرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن گولہ بان نے بیان دیا کہ وہ اس وقت ان کے پاس ہوٹل راج محل میں تھا۔ عمران کو بھی اس حقیقت کا احساس ہو چکا تھا کہ انصاف کا خون ہو چکا ہے اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اصل صورت حال سے پردہ اٹھانے کی پوری کوشش کرے گا۔



کرن یتیم خانے کی تنگ گلی سے باہر نکل کر سڑک پر آئی تو سامنے کھڑی ایک چھوٹی سی خوب صورت گاڑی کا اگلا دروازہ اچانک اس کے سامنے کھل گیا۔ کرن نے چونک کر ڈرامائیگ سیٹ پر نگا ڈالی تو کامران کے بھائی عمران کو دیکھ کر حیران ہو کر ٹھنک گئی عمران نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے پر نظر جمائی پھر گویا ہوا۔

”مس کرن صاحب! کامران صاحب تو آج کل ایک اور حسینہ کی زلفوں میں الجھے ہوئے ہیں رنگین مزاج ہیں۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے کیا آپ میرے ساتھ مون مارکیٹ والے پارک میں چل کر گفتگو کر سکتی ہیں۔“

”لیکن کس سلسلے میں؟“ کرن نے چونک کر سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ گفتگو کامران اور ایک جرم کے سلسلے میں ہے۔“ عمران نے لہجے کو سرد بناتے ہوئے نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔ کرن کامران سے سخت ناراض تھی پھر اسے عمران اس سے مختلف انسان معلوم ہوا وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اس نے ہاں کر دی اور اندر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔

مون مارکیٹ علامہ اقبال ٹاؤن کے ماڈل پارک

وجاہت علی خان کا پارہ چڑھ گیا اور عمران نے کھسک جانے میں عافیت تھی۔



عمران تھانہ ٹھوکر نیاز بیگ میں اپنے والد کے پسندیدہ تھانیدار شجاعت علی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اس کے ساتھ ایک بوزھا تھا جس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے شیو بڑھا ہوا اور کپڑے میلے خیلے تھے۔ اس کی آنکھوں میں گفتگو سے قبل آنسو رزر ہے تھے۔ تھانیدار کی سوالیہ نگاہیں بوزھے کے ہاتھ میں موجود شراب کی ایک سبز رنگ کی بوتل پر جمی ہوئی تھیں جسے بوزھے نے گردن سے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

تھانیدار نے پہلے عمران پھر بوزھے کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

”اس بوزھے کے پاس اپنے بیٹے کی چھوٹی سی کہانی ہے وہ سنئے۔“ عمران نے تمہیدی طور پر آغاز کیا اب تھانیدار نے اپنی سرخ آنکھیں بوزھے پر مرکوز کر دیں۔

”فرمائیے بزرگو!“ بوزھا اپنے آنسو پونچھتا ہوا اندرونی کرب سے کانپ کر ہوا۔

”تھانیدار صاحب! ہوٹل راج محل میں اعلیٰ شراب کے ساتھ ساتھ سستی یعنی شراب بھی بکتی ہے غریب لوگ اس سستی شراب کا شکار ہو کر بعض اوقات اپنی زندگی کی بازی ہار بیٹھتے ہیں۔ میرے بیٹے کو راج محل ہوٹل کے ایک بیرے نے شراب کی عادت ڈال دی یہ سستی زہریلی شراب ہوٹل کے بجائے ٹھوکر نیاز بیگ کے پرانے آسیب زدہ باغ میں واقع حویلی کے عقیبی دروازے سے فراہم کی جاتی ہے جو بدروحوں کا مسکن مشہور ہے۔ شراب کے دیوانے وہاں پہنچ جاتے ہیں نشہ بدروحوں کے قصوں سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے شراب کی چٹ ہوٹل کے بیرے دیتے ہیں اس ہوٹل کو

”میتیم خانے کی طرف اور بھی بہت سے کام انہیں ہو سکتے ہیں وہ شہر کا ایک اہم مرکز ہے۔“ کرن نے اعتراض مسترد کر دیا۔

”کرن صاحب آپ کی آواز آپ کے چہرے کے تاثرات کا ساتھ نہیں دے رہی آپ کسی مجبوری کی وجہ سے خاموش تھیں لیکن آپ کو آخری پیمانہ ایک دن دینا ہی پڑے گا مجبوری کی وہ زنجیر ہم کاٹ ڈالیں گے۔“ عمران نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دو قدم چل کر مڑا اور مخاطب ہوا۔

”آپ کو کس جگہ ڈراپ کر دوں؟“
”نہیں شکریہ میں رکشہ میں چلی جاؤں گی۔“
کرن نے بیچ سے اٹھتے ہوئے کہا۔



میں نے آخری تاریخ تھی اور وجاہت علی خان کی کوٹھی کا عقیبی گیٹ مختاجوں، ضرورت مندوں اور بھکاریوں وغیرہ سے بھرا ہوا تھا۔ حکومتی پارٹی کے ممبر قومی اسمبلی ہونے کی حیثیت سے عوام میں مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے وجاہت علی خان سخاوت اور دریا دلی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ آنا بھی چینی وغیرہ غریب لوگوں میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔ عمران کا قریب سے نر ہوا تو وہ بولے بغیر نہ رہ سکا۔

”ڈیڈی اگر منگائی کم کر دی جائے روزگار کے مواقع زیادہ میسر ہوں تو لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں بجائے اس کے کہ حکم پیل میں خوار ہو کر کچھ لیں۔“

”تم تو ہر اچھے کام میں منفی پہلو ہی تلاش کرتے ہو حالانکہ ہماری پارٹی غریبوں کی سب سے بڑی ہمدرد ہے۔“

”ہاں اس لیے خودکشی کی شرح بڑھتی جا رہی ہے۔“
”تم اخبار کے کیزے اور کیا کہہ سکتے ہو۔“

مظاہرہ کریں اور میرے سامنے اس بیرے کو چیک کریں میں اس معاملے کی رپورٹنگ کر رہا ہوں چلئے اس وقت۔“ تھانیدار پرس و پیش کے بعد تیار ہو گیا جب وہ لوگ پولیس کار میں ہوئے راج محل کے پارکنگ پر اندر داخل ہو گئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھی خوب صورت لڑکی جو نیم عریاں تھی اس گولڈن ٹرل سے بیر نمبر 24 کے متعلق استفسار کیا تو لڑکی کو کوششوں کے بیرے کا کچھ سراغ نہ ملا۔ بوڑھا نیپ میں ریکارڈ شدہ گفتگو ساتھ لیے ہوئے تھا۔ ہوٹل کا کونا کونا چھان مارنے کے بعد بھی اس بیرے جابر خان کا کوئی سراغ نہ ملا تو ہوٹل کے منیجر اور مالک نے تھانیدار اور عمران سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”ہمیں بیرے جابر کے ناجائز اور ملاوٹ شدہ شراب کے کاروبار کا کچھ علم نہیں اگر ملے تو بے شک کھال اتار دیں حرام زادے نے ہوٹل کی بدنامی کرائی ہے۔“

”کھال تو اب کسی نہ کسی کی اتر کر رہے گی۔“ عمران نے معنی خیز لہجے میں کہا اور ہوٹل کے مالک کے علاوہ انسپٹر بھی عمران کو گھور کر دیکھنے لگا۔ ہوٹل سے نکل کر بوڑھا قلندر ہی تو سمور سائیکل رکشہ میں کہیں نکل گیا اور عمران انسپٹر شجاعت کے ساتھ واپس آئے لگا۔

وہ کسی سوچ میں گم تھا کار میں تین سپاہی بھی سوار تھے جن میں محمد رفیق گجر بھی تھا۔ سوچتے سوچتے عمران کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اس کی طبیعت سراغ رسانی کے موافق تھی۔ اسے وہ جملہ یاد آ گیا تھا جو اس کا باپ اپنے ایک دوست سے کہتے ہوئے اسے دیکھ کر رک گیا تھا۔ وہ جملہ یہ تھا۔

”تھانیدار اپنا خاص آدمی سے وہ ملے کسی اور پر ڈال دے گا۔“ اس جملے سے عمران سمجھ گیا کہ وال میں کچھ کاا ہے تھانیدار ہوٹل جانے سے پہلے ہاتھ روم میں

سیاستدانوں کی سرپرستی حاصل ہے۔ میرا بیٹا یہ ہینرنگ کی شراب کی بوتل اپنی سالگرہ پر لایا تھا اس سالگرہ کی میز پر موسم بتیاں روشن ہو چکی تھیں اس نے شراب دوسری منزل کے بیڈ روم میں جڑھائی تو نیچے آتے آتے اس کی زندگی کی شمع بجھ گئی۔ میری دنیا اندھیر ہو گئی میرا ایک ہی بیٹا تھا میں نے اسے اس کی ماں اور باپ دونوں بن کے پالا تھا میں سالگرہ کی تقریب میں اس کی شادی کا اعلان کرنے والا تھا مگر میری خوشیاں چھین لی گئیں مجھے دیوانہ بنا دیا گیا میرے خواب ٹھہر گئے گھر اجڑ گیا۔ جوان بیٹے کی موت مجھے پاگلوں کی طرح گھمائی سے میں نشہ فروخت کرنے والوں کی تلاش میں نکلتا ہوں بھٹکتا ہوں لیکن میں ناکام رہتا ہوں۔ وہ لوگ بڑے منظم ہیں طاقتور ہیں میں ایک بوڑھا کمزور اور غریب انسان ہوں میں ان سیاستدانوں کے کالے چہرے کیسے بے نقاب کر سکتا ہوں۔ البتہ میں ایک بیرے کو جانتا ہوں جو شراب کے نوکن لوگوں کو فراہم کرتا ہے میں اس کی آواز نوکن لیتے وقت ریکارڈ کر چکا ہوں۔ تھانیدار صاحب اگر آپ نے اپنا فرض نہ پورا کیا آپ بک گئے جھک گئے ذرا دیئے گئے تو اس معاشرے کے بہت سارے باپ ہاتھوں میں شراب کی خالی بوتلیں لیے پھریں گے اور ان کے گھر کے آنگن میں ایک قبرستان بھی ہوگا۔“ بوڑھا سسک کر خاموش ہو گیا تھانیدار عمران کو دیکھ کر مودب تھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں جناب بزرگو! ہم منشیات فروشوں، شراب فروشوں، فروخت کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کریں گے۔ آپ اس بیرے کا نام بتادیں میں اسے جا کر چیک کروں گا آپ اب دو دن بعد آئیے گا۔“ بوڑھا کچھ مطمئن سا ہو گیا لیکن عمران ابھن محسوس کر رہا تھا پھر وہ تھانیدار سے مخاطب ہوا۔

”جناب شجاعت صاحب آپ ذرا شجاعت کا

گیا تھا۔ وہاں جا کر اگر وہ بک چکا ہے تو کسی کو اطلاع دے دینا موبائل پر اب بڑا آسان کام ہے اور اخبار انقلاب کی رپورٹس کے مطابق یہ تھانیدار جرائم پیشہ عناصر کا آلہ کار بنا ہوا ہے۔

”انسپیکٹر شجاعت صاحب! کیا میں آپ کے موبائل کی آخری کال چیک کر سکتا ہوں۔“ عمران نے تھانیدار کو گھورتے ہوئے کہا۔

”وہ کس لیے اور کس قانون کے تحت۔“ تھانیدار نے ناگواری سے عمران پر جلتی نگاہ ڈالی۔

”بس دوستانہ طور پر آپ میری کالز بھی دیکھ سکتے ہیں۔“ عمران نے پیٹریا بولا۔

”لیکن اس غیر اخلاقی اور غیر قانونی حرکت کا کوئی جواز بھی تو ہو۔“ تھانیدار نے پھر ناگواری سے جواب دیا۔

”کیا اس ملک کا ہر ادارہ اپنے فرائض کو ایمانداری سے سرانجام دے رہا ہے۔“ عمران نے ترش لہجے میں کہا۔

”عمران صاحب! آپ انقلاب کے کرائم رپورٹر ہیں اور وجاہت علی خان کے چھوٹے صاحبزادے ہیں، ہم ان کی بہت عزت کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ہمارے کام میں بے جا مداخلت کریں۔“ تھانیدار نے تلخ لہجے میں کہا۔

”خیر آپ اس پیرے کو تلاش کیجیے میں بھی کرتا ہوں، موت کے سوداگروں کو آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا۔ فرض کیجیے اگر آپ کا بیٹا یا بیٹی.....؟“ عمران نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”بس کیجیے چھوٹے سرکار۔“ تھانیدار چلا اٹھا۔
 ”گاڑی روک دو۔“ عمران نے مون مارکیت کتے ہی تھانیدار سے بارعب لہجے میں کہا۔



ٹھوکر نیاز بیگ سے چند فرلانگ کے فاصلے پر نیچر وال گاؤں کا ایک حصہ جنگل کی شکل اختیار کر گیا تھا اس جنگل کے دو اونچے اور گھنے درختوں پر دو بڑے سائز کے بندر پھدکتے پھر رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی بے چین نظروں سے موڑوے سے اس طرف آنے والی ذیلی سڑک کو دیکھنے لگتے پھر ان کی نگاہ گھوم کر درختوں کے درمیان گھری ایک سیاہ تاریخی آسیب زدہ عمارت پر جم کر رہ جاتی۔ رات کا وقت تھا اور عمارت سے ابھرنے والی پراسرار خوفناک آوازیں ارد گرد دور دور تک پڑھوں سنا نا طاری کیے ہوئے تھیں۔ ارد گرد کی آبادی پر اس عمارت کی دہشت پوری طرح چھا چکی تھی لوگ بستروں میں دبکے تھر تھر کاپٹنے لگتے وہ دروازے اور کھڑکیاں بند کیے سونے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ایک بہادر مہمان نے اپنے میزبان کے گھر میں قیام کرنے والے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر اندھیرے میں نیلے پر بنی سیاہ تاریخی عمارت پر نگاہ ڈالی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ عمارت کی چھت سے ایک سفید روح اڑتی ہوئی بلند ہوئی جا رہی تھی اس کا چہرہ سفید وجود کے اوپر چمکیلا اور خوفناک تھا آنکھوں کی جگہ دو سرخ انگارے دبک رہے تھے۔ مہمان نے جھبر جھری لے کر کھڑکی بند کر دی اور بستر پر گر پڑا۔

اس وقت دونوں بڑے بندروں کی چمکدار آنکھیں ایک سیاہ ٹرک پر مرکوز تھیں جو مین روڈ سے اندر آنے والی ذیلی سڑک پر سفر ختم کر کے اب پکی سڑک پر سیاہ عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک بندر نے فضا میں اپنے رپو اور سے فلیش لائٹ سنکٹل داغ دیا جس کے نتیجے میں ٹھنی جھاڑیوں کے درمیان سے آنے والی گولیوں نے ٹرک کے نائز دھماکوں کے ساتھ برست کر دیئے۔ ٹرک سے تین چار سیاہ سائے چوت

محبت قلب

کچھ لمحے بڑے فیصلہ کن ہوتے ہیں اس وقت یہ طے ہوتا ہے کہ کون شخص کس کا بنایا جائے گا جس طرح کس خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر ٹھوس اور مائع گیس میں بدل جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی خاص گھڑی بڑی نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ اس وقت ایک قلب کی سوئیاں کسی دوسرے قلب کے تابع کر دی جاتی ہیں پھر جو وقت پہلے کا رہتا ہے وہی وقت دوسرے قلب کی گھڑی بتاتی ہے جو موسم جوڑت جو دن پہلے قلب میں طلوع ہوتا ہے وہی دوسرے آئینے میں منعکس ہو جاتا ہے۔ دوسرے قلب کی اپنی زندگی ساکت ہو جاتی ہے اس کے بعد اس میں صرف بازگشت کی آواز آتی ہے۔

اقتباس: راجہ گدھ

مونا شاہ قریشی..... کبیر والہ

عمارت کے کھلے عقبی گیٹ سے ہی برآمد ہوئی تھی۔ پولیس اہلکار اور وہ دونوں بھی حیران تھے کہ چھ فٹ قد کا لمبا چوڑا سرغندہ جو اس عمارت میں منشیات کے کاروبار کا انچارج تھا کہاں غائب ہو گیا ہے۔ وہ ساری بلڈنگ چھان مارنے پر بھی نہیں ملا تھا، موٹر سائیکل پر وہی لمبا چوڑا سرغندہ سوار تھا۔

عمران نے جلد از جلد پیشاب سے فراغت حاصل کی اور وسل بجا کر پولیس اہلکاروں کو بلا کر انہیں صورت حال سے آگاہ کیا پھر خود بھی جوش کے عالم میں اپنی اسپورٹس موٹر سائیکل پر بیٹھ کر نندی کے پل کی طرف نکل گیا کیونکہ پل کی چوڑائی تین فٹ تھی پولیس کی کاریں اس پر نہیں چل سکتی تھیں۔ سرغندہ کافی دور سڑک پر دکھائی دے رہا تھا، عمران موٹر سائیکل تیز سے تیز بھگانے لگا نئے افق ڈائجسٹ کی جاسوسی کہانیاں

کر پستول اور ریوالور ہاتھوں میں لیے اونچے ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔

اس وقت ٹرک گولیوں کے نرغے میں آ گیا اور جھاڑیوں سے نکل کر آگے بڑھتے خفیہ پولیس نے ٹرک کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے ٹرک سے فائر کرنے کی کوشش کرنے والوں کو زخمی کر دیا۔ کچھ دیر بعد پولیس کا ٹرک پر قبضہ ہو چکا تھا، گھنٹی لمبی جھاڑیوں کے سلسلے سے کافی تعداد میں سپاہی نکل کر عمارت کی عقبی جانب بڑھنے لگے۔ اس وقت عمارت سے روشنی کی لائیں باہر پڑنے لگیں اور پھر فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اندر سے دتی بم بھی پھینکے جانے لگے بیچ بچا کر پولیس نے پیش قدمی جاری رکھی اور بلا خربیس منٹ کی فائرنگ اور تصادم کے بعد پولیس نے عمارت پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت دونوں بندروں نے درختوں سے چھٹائیں لگا میں اور پھر اپنا اوپری لباس اتار ڈالا اب بندروں کی جگہ کرائم رپورٹر عمران اور انور موجود تھے جن کے منبروں کی رپورٹوں کی روشنی میں اس جگہ چھاپہ مارا گیا تھا۔ جہاں پشاور کی طرف سے منشیات اور جعلی ادویات ایک ٹرک میں ڈال کر پولیس ناکوں وغیرہ پر پیرہ استعمال کر کے اسے آسپی عمارت میں لایا جاتا تھا پھر عمارت کے تہہ خانے سے نکلنے والی سرنگ کے راستے ٹھوکر نیاز بیگ کے بڑے پلازہ کے تہہ خانے میں منشیات پہنچا کر اوپر موجود میڈیکل اسٹور پر مال پہنچا کر لوگوں کی رگوں میں نشہ اتارا جاتا تھا۔

اچانک عمران کو رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ انور کو بتا کر نندی کی طرف نکل آیا جو عمارت کے عقبی حصے میں بہہ کر دور نکل گئی تھی اس وقت وہ چونک کر رک گیا۔ نندی کے پل سے ایک سیاہ موٹر سائیکل تیزی سے گزرتی ہوئی آگے نکلتی جا رہی تھی جو

کوٹھی کے سامنے والے حصے میں آتے ہی وہ شخص دوبارہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا ہو۔“ وجاہت نے چونکتے ہوئے کہا۔

”نہیں ڈیڈی وہ شخص کوٹھی سے باہر نہیں نکلا۔“

”کیا مطلب؟“ وجاہت خان اچھل ہی پڑے۔

”ڈیڈی میں نے کوٹھی کے عقبی گیٹ کے سامنے

سڑک کے پار گھنے برگد کے درخت کے نیچے بیٹھنے

والے منگ سے اس زخمی کے متعلق دریافت کیا ہے

اس کا کہنا ہے کہ اس نے زخمی آدمی کو اندر جاتے دیکھا

ہے لیکن پھر وہ بارہ بار نکلتے ہوئے نظر نہیں آیا۔“

”بیٹا عمران ہو سکتا ہے وہ شخص دیوار پھیلا تک کر باہر

چلا گیا ہو پھر اس نشئی منگ کی بات پر اتنا اعتماد نہیں کیا

جا سکتا اسے تو بعض اوقات اپنی خبر بھی نہیں ہوتی۔“

”ڈیڈی زخمی کا دیوار پھیلا منگ قیاس نہیں اور منگ

سے جس وقت میں نے گفتگو کی وہ نشے میں ہرگز نہیں

تھا اور پوری طرح چاق و چوبند تھا۔“ عمران نے نفی

میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”پھر بیٹا اور کیا ہو سکتا ہے ایک دفعہ پھر کوٹھی کی

اچھی طرح تلاشی لی جا سکتی ہے۔“ وجاہت علی خان

نے کہا اور پھر ہاتھ بڑھا کر بستر کے کنارے لگی گھنٹی

مسلسل بجانے لگے۔ جلد ہی ان کے سامنے ان کے

ملازم اور حفاظتی گارڈ باادب کھڑے ہو گئے وجاہت

نے انہیں لمبے چوڑے زخمی سرغنہ کے متعلق بتا کر حکم

دیا کہ ساری کوٹھی اور باغ میں اسے تلاش کیا جائے اگر

مل جائے تو اس کے ہاتھ باندھ کر پیش کرو۔ ملازم اور

گارڈ ”جی اچھا حضور“ کہہ کر کمرے سے نکلنے لگے۔

عمران چھ سوچتا ہوا کمرے میں ٹہلنے لگا وجاہت

بستر پر لیٹ گئے وہ تھکے ہوئے اور بوڑھے دکھائی

دے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد عمران نے ٹہلنا بند کر دیا

اور وجاہت کے قریب بیٹھ کر ان کا سرد ہانے لگا

پڑھ پڑھ کر اس کے اندر ایک عدد جاسوس تیار ہو چکا

تھا۔ کچھ دیر بعد وہ محتاط انداز سے سیاہ پوش کے پیچھے

از جا رہا تھا اب اس نے دیکھا کہ سرغنہ زخمی تھا اور اس

کی دائیں ٹانگ سے خون بہ رہا تھا کافی دیر تک

تعاقب جاری رہا پھر عمران بڑے زور سے چونکا سرغنہ

کارخان کی کوٹھی کی طرف تھا۔ وہ عقبی دروازے سے

موٹر سائیکل پھینک کر اندر داخل ہو گیا عمران عقبی

دروازے پر پہنچا تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ گھوم کر

اپنی کوٹھی کے سامنے والے حصے سے گیٹ کھلوا کر اندر

داخل ہوا اور باغ کی طرف بھاگنے لگا لیکن باغ اور

ساری عمارت چھانسنے کے بعد بھی اس زخمی سرغنہ کا

کوئی سراغ نہ ملا۔ وجاہت گھروٹ کر اپنے کپڑے

بدلنے کے بعد اپنے بیدروم میں چائے پی رہے تھے

ان کے سر میں درد تھا وہ ایسنا چاہتے تھے۔ اس وقت

عمران ان کی گاڑی پر نگاہ ڈال کر ڈرائنگ روم ڈائننگ

ہال اور دوسرے مختلف مقامات دیکھتا ہوا بیدروم میں

ان کے سامنے پہنچا کب کی پرچ و جاہت علی خان

کے سامنے بیڈ سائز میبل پر رکھی ہوئی تھی۔

جب عمران نے انہیں زخمی آدمی کے اندر گھس کر

غائب ہونے کی خبر دی تو وجاہت علی خان چونک کر

اچھل ہی پڑے چائے نیچے گرتے گرتے نیکی۔

”اگر کوئی زخمی مجرم وغیرہ پھینکا دروازہ کھلا پا کر اندر

گھس بھی آیا ہے تو اسے باغ یا عقبی برآمدے وغیرہ

میں یا مالیوں کی کونھریوں کی طرف ہونا چاہیے۔“

وجاہت علی خان نے متشکرانہ لہجے میں عمران پر نظریں

جماتے ہوئے کہا۔

”ڈیڈی سب جگہ دیکھ چکا ہوں لیکن وہ آدمی نہیں

بھی نظر نہیں آیا۔“ عمران نے فکر مند لہجے میں سوچتے

ہوئے کہا۔

”عمران بیٹے یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمہارے گھوم کر

جھنجھلائے ہوئے تھے۔ مکان کا کرایہ واجب الادا تھا پھر ادھار والے بھی جان کھارے تھے ایسے میں مختار نے ان کے کان بھر کر میٹرنی ہوم سے نکلنے وقت لی گئی تصویر اپنے ابا کو دکھادی اس کے ابا کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا پہلے تو غصہ سے بُرا بھلا کہتے رہے پھر مارنے لگے۔

”کس کے ساتھ منہ کالا کرتی رہی ہو۔“

”غریب کا تو نصیب ہی کالا ہوتا ہے ابا! وہ کیا منہ کالا کرے گا۔“ کرن نے غصے سے سلکتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ نے ہمیں کیا دیا ہے ہم نے زندگی میں دکھ ہی دکھا اٹھائے ہیں۔“ کرن نے رک کر پھر زبانی وار کیا۔

”نکل جا میرے گھر سے بے شرم بے حیا تیرا تو سایہ بھی دوسری بچیوں پر نہیں پڑنا چاہیے۔“ کرن کی ماں سوئی ہوئی تھی وہ شور سن کر اٹھی اور صورت حال جان کر فکر مند ہو گئی۔ کرن کے ابا کرم دین نے اسے دھکے مارتے ہوئے گھر سے باہر نکال دیا۔ کرن سڑک پر گری اور اپنے نصیب کو رو کر اٹھ کھڑی ہوئی وہ اپنی زندگی ختم کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی مین روڈ پر نکل آئی۔

”کاش ایسے امیر زادوں کو موت آ جائے جو معصوم لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کرتے ہیں۔“ اس کے ہونٹوں پر یہی مصرع تھا۔ مین روڈ پر گاڑیوں کا کافی رش تھا شام کا وقت تھا اور اسٹریٹ اس کے علاوہ گاڑیوں کی روشنیاں بھی جگمگا رہی تھیں مگر اس کے ذہن میں مجروح خیالات کا اندھیرا تھا اس نے ایک بار مڑ کر اپنے گھر کی طرف نگاہ ڈالی۔ میٹھی وٹھ یادیں اس کے ارد گرد منڈلانے لگیں لیکن پھر اس نے یادوں سے چھپچھا چھڑایا اور دو قدم سڑک پر آگے بڑھ گئی۔ اب اس کی زندگی کا فائدہ بھی کیا تھا وہ اپنی عصمت اچھی

تقریباً آدھا گھنٹے بعد ملازم اور گاڑی سر جھکائے اندر داخل ہوئے اور اپنی ناکامی کا اعلان کیا عمران ان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر کمرے سے نکل گیا۔



کرن ایک میڈیکل سینٹر سے باہر نکلی اور موٹر سائیکل رکشہ کی طرف بڑھنے لگی اس کے چہرے پر اضمحلال اور کرب کے آثار تھے۔ اس نے محبت کا جو شیش محل تصورات میں بنایا تھا اس کی کرچیاں اس کے دل میں اتر گئی تھیں۔ وہ کامران کی ہوس کا شکار ہو کر برباد ہو چکی تھی اسے اب معلوم ہو گیا تھا کہ اجلے تن والوں کے من اجلے نہیں ہوتے اور سیاستدان سانپ ہیں تو ان کے بچے بھی سانپ ہی ہوں گے۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہوئی مایوسانہ نقل و حرکت کے ساتھ رشتے میں بیٹھ گئی وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کے بڑے بھائی مختار نے اسے میٹرنی ہوم سے نکلنے دیکھ لیا ہے اس کا بھائی اتفاق سے ادھر سے گزر رہا تھا اور موٹر سائیکل کا نائز برسٹ ہونے کی وجہ سے اب پیدل گھر کی طرف جا رہا تھا۔ کرن کا رکشہ بھی گھر کی طرف جانے والی سڑک کی طرف رواں دواں تھا۔ کرن کا بھائی موبائل میں اس کی تصویر بھی میٹرنی سے نکلنے وقت لے چکا تھا اس نے لمبی کار والے امیر لڑکے کے ساتھ بھی اسے دو مرتباً آتے جاتے دیکھا تھا لیکن زبان بند ہی رکھی تھی لیکن اب وہ اپنے باپ کو صورت حال سے آگاہ کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

کرن چونکہ سر جھکا کر مایوس اور افسردہ چل رہی تھی اس لیے وہ مختار کو سامنے نہیں دیکھ سکی تھی۔



دونوں ایک دوسرے کے بعد گھر میں داخل ہوئی کرن کے ابا مالی حالات نہ ہونے کی وجہ سے پہلے ہی

عمران نے تیزی سے کرن کو کندھے پر ڈالا اس وقت
دوسپا ہی اس طرف آنکے لیکن عمران کا کرائم رپورٹر کا
کارڈ دیکھ کر کھسک گئے۔

”دوست ذرا جلدی چلو میں جس کیس پر کام
کر رہا ہوں یہ اس کا ایک گواہ ثابت ہو سکتی ہے۔“
عمران نے کرن کو پچھلی سیٹ پر لٹاتے ہوئے اپنے
دوست سے کہا۔

شوکت تیزی سے گاڑی چلانے لگا وہ خاندانی
رئیس تھا عمران نے ایک بار اسے غنڈوں سے بھی بچایا
تھا ویسے وہ بچپن کے جگہری پار تھے۔

کچھ ہی دیر بعد اسے تیج زید اسپتال کے ایمر جنسی
وارڈ میں داخل کروا دیا گیا۔ زخم معمولی تھے اس لیے
جلدی کرن کو مرہم پٹی کر کے فارغ کر دیا گیا وہ
اندرونی اور جذباتی صدمے سے نڈھال سی ہوئی تھی۔

لیڈی ڈاکٹر نے اسے نارمل ذہنی کیفیت میں رہنے کا
مشورہ دیا چھوٹی ڈرپ لگنے کے بعد اب کرن اپنے
پیروں پر چل رہی تھی اور نقاہت بھی کم ہو گئی تھی۔

شوکت پچارو چلا رہا تھا اور عمران کرن کے ساتھ
عقبی نشست پر موجود تھا کرن نے دکھی دل کے
ساتھ عمران کو صورت حال سے آگاہ کر دیا اور وہ ننگی
تصویریں بھی اپنے سینڈ بیگ کے خفیہ خانے سے
نکال کر دکھادیں۔ عمران تم وغصے کی کیفیت میں اپنے
بھائی کے کالے چہرے پر تھوک رہا تھا چونہ جانے کتنی
لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کر چکا تھا دو اور لڑکیاں اسے
حقیقت سے آگاہ کر چکی تھیں۔

”کرن جو ہونا تھا ہو چکا بہر حال تم حوصلہ رکھو
کا مران کو اس کے انجام سے میں دوچار کروں گا۔ اس
کے علاوہ نشا اور جمعی اور دیات برداشت کرنے والے اور
تھی میں تلاش میں ہوں اور اس سے جس کا میا بیوں
کئی ہوتی ہیں۔“

زندگی کے حصول کی کوشش میں لٹا چکی تھی گھر میں
سب کو پتا چل گیا تھا عزت مٹی میں مل گئی تھی اگر وہ
زندہ رہی تو ضمیر کا جبر اسے لہو لہان کرتا رہے گا چنانچہ
اس نے مرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک پچارو تیزی سے اس کی طرف آ رہی تھی ”بس
یہ ٹھیک ہے“ کرن بڑبڑائی اور اس کے آگے کود گئی۔

ڈرائیور ماہر ہوشیار تھا رش کے باوجود اس نے بریک
لگاتے ہوئے گاڑی ایک طرف کر دی۔ کرن کو صرف
معمولی چوٹیں آئیں خراشوں سے خون بہنے لگا اس
وقت وہ تکلیف بھول گئی جب اس نے ڈرائیونگ
سیٹ پر بیٹھے نوجوان کے ساتھ بیٹھے کرائم رپورٹر عمران
کو اچھل کر باہر نکلتے دیکھا جواب تک گردن جھکائے
اخبار پڑھ رہا تھا اخبار کی وجہ سے وہ عمران کا چہرہ نہیں
دیکھ سکی تھی۔

”آپ زخمی ہو گئیں۔“ عمران نے قریب آ کر
کرن کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ ڈرائیونگ سیٹ والا
نوجوان جو عمران کا بچپن کا دوست تھا اور وہ ایک
تیسرے دوست کی سالگرہ میں جا رہے تھے۔

”کیا حادثہ اتفاقہ ہوا ہے۔“ عمران نے اپنے
دوست شوکت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو کچھ غصے اور
ناراضگی کے عالم میں کرن کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

”نہیں عمران! یہ حادثہ نہیں اس لڑکی نے جان بوجھ
کر اچانک میری گاڑی کے سامنے چھلانگ لگا دی تھی
یہ اپنی زندگی ختم کرنا چاہتی ہے۔ وہ تو میں نے مہارت
سے بچا لیا ورنہ کوئی اناڑی ہوتا تو اس وقت یہ لڑکی شاید
ہی زندہ ہوتی۔“ شوکت نے غصیلے لہجے میں کہا۔

عمران کرن کی طرف دیکھنے لگا ”ایسی کیو بات
رتی جو ہے۔“ عمران نے انہیں کہا۔

”کرن عمران صاحبہ عمران صاحبہ“
اسے سنائی کہ چہرہ وہ صاحبہ اور خاتون تھی۔

سے کھول ڈالے وہ بالکل ایک جاسوس بن گیا تھا اس نے الماری کا جائزہ لیا یہاں بھی قابل اعتراض مواد نہیں تھا صاف ستھری تصاویر تھیں قدرتی مناظر وغیرہ کی عمران چند لمحے کھڑا ریوالور کو دیکھتا کچھ سوچتا رہا پھر اس نے سامنے الماری کی موٹی چادر پر بے درپے کئی بے آواز فائر کیے۔ الماری کی چادر پھٹ گئی جگہ جگہ سے اور اس کے اندر کے لفافے اور تصویریں دینے لگیں۔ عمران نے دو اور فائر کر کے چادر کو کمزور کر کے کچھ حصہ کھینچ کر بڑا کر دیا اب خلا دکھائی دے رہا تھا جسے کھولنے کا طریقہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ عمران نے ہاتھ بڑھا کر لڑکیوں کی تنگی تصاویر اٹھائیں کچھ لفافوں میں بند تھیں کچھ ویسے ہی پڑی تھیں۔ عمران نے بڑی مشکل سے انہیں دیکھا مرد کے چہرے پر نقاب پٹی تھی لیکن عمران نے جسمانی ساخت اور کپڑوں سے کامران کو شناخت کر لیا اس کے سامنے اس کے گھر کا ایک کالا چہرہ بے نقاب ہو چکا تھا۔



رات کے وقت جب عمران گھر کی جانب جا رہا تھا یکا یک اس کے اٹھے قدم منجمد ہو کر رہ گئے۔ اس کے ڈیڑی پور نیو میں اپنی بجا رو کھڑی کر کے سامان سے بھرا ہوا ایک شاپر بیگ نکال کر وقت کے ساتھ سنبھالتے ہوئے داخلی دروازے کی طرف قدم اٹھا رہے تھے۔ عمران حن کی طرف آنے والی گلی سے باہر نکل کر آگے بڑھا تھا وہ کچھ سوچ کر قریبی ستون کی آڑ میں چھپ گیا۔ اس کے والد دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئے عمران سوچنے لگا اس بڑے سے شاپر بیگ میں کیا ہو سکتا ہے حالانکہ پرسوں صبح ہی وجاہت علی خان نے ملازموں کو بھیج کر کچن اور دوسری ضروریات زندگی کی کافی اشیاء منگوائی تھی۔ عمران متحرک ہوا اور گلی سے گزرتا ہوا کچن میں

”آپ بہت اچھے ہیں کاش میں کامران کی بجائے آپ سے ملی ہوتی۔“ کرن نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”آپ ابھی مجھ سے مل سکتی ہیں آپ کا کوئی قصور نہیں۔“ عمران نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے حوصلہ دیا کرن کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خوشی کی کرن بھسلانے لگی۔



عمران دوست کی سالگرہ میں تھوڑی سی شرکت کرنے کے بعد واپس پلٹ آیا ویسے بھی اب وہاں شراب کا دور چلنے والا تھا اور شراب بالکل پسند نہیں کرتا تھا البتہ شوکت وہیں تھا وہ امیر زادہ تھا اور اکثر امیر زادے شراب کوک کی طرح پیتے ہیں۔

عمران تیار کی جانے والی ”ماسٹر کی“ ہاتھ میں لے کر باغ کے قریب واقع کامران کی چھوٹی سی کھلیب کے دروازے پر پہنچا کامران اس وقت کی لڑکی کے ساتھ باہر گیا ہوا تھا۔ عمران سوچ رہا تھا ہونہ ہوا اسی جگہ کامران بلیک میٹنگ کا سامان تیار کرتا ہے آج کرن کی تصویریں دیکھ کر کامران کی کھلیب اسے بُری طرح کھٹک رہی تھی۔ ماسٹر کی سے تالا جلد ہی کھل گیا سامنے چھوٹی سی راہ داری تھی جس سے گزر کر وہ ایک بڑے کمرے میں داخل ہوا جس کے ایک جانب کھلیب تھی۔

عمران نے کیبنوں میں گھس کر سامان کا جائزہ لیا سامان استعمال شدہ تھا پھر عمران نے مختلف مقامات کی تلاشی لی لیکن کوئی قابل اعتراض مواد برآمد نہ ہوا اب عمران سیاہ رنگ کی ایک الماری کے سامنے آ کھڑا ہوا جو لیب کے ساتھ ہی منسلک تھی۔ عمران نے اس کا قفل بے آواز پستول سے اڑا دیا یہاں ماسٹر کی کام نہیں آ سکتی تھی الماری کے پٹ عمران نے ایک جھٹکے

فارغ کر دیئے تھے اور نئے رکھنے کے لیے اشتہار دے دیا تھا۔ پرانے ملازموں سے انہیں کچھ شکایتیں لاحق ہو گئی تھیں چنانچہ ان دنوں تہہ خانے کا جدید ریموٹ کنٹرول دروازہ فرش میں نصب کر دیا گیا اور تہہ خانہ اس پرانی بلڈنگ کا حصہ ہو گا جو ان کے والد نے خرید کر نئے سرے سے تعمیر کروائی تھی۔

یہ باتیں سوچتے ہوئے عمران کی نگاہ کمرے کے اندر مسلسل فرش کے اس حصے پر جمی ہوئی تھی جو ایک شق ہو کر پھر برابر ہو چکا تھا اور کمرے سے اس کے والد و جاہت علی خان غائب تھے ایک ترکیب ذہن میں آئے ہی وہ مسکرایا۔



وجاہت علی خان اگلے روز رات کے وقت بستر پر بے خبر سو رہے تھے لمبل کندھوں تک ان کے شانوں پر موجود تھا۔ اس وقت ان کے بیدروم کا بیرونی دروازہ ماسٹر کی کے گھومنے سے کھل گیا اور ایک سیاہ پوش اندر داخل ہوا اس کا چہرہ سیاہ نقاب سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک وائر پستول تھا سیاہ پوش محتاط انداز سے چلتا ہوا و جاہت علی خان کے بستر کے قریب آ کر رک گیا اس نے جیب سے رومال نکال کر اس پر کھور فارم ملے پانی والی پھوار ماری اور پھر رومال و جاہت کی ناک پر رکھ دیا۔ و جاہت بالکل بے سدھ ہو گئے ورنہ وہ کھانستے ہوئے اب اٹھنے ہی والے تھے۔ سیاہ پوش بے فکر ہو کر ان کے اتارے ہوئے کپڑوں کی تلاشی لینے لگا جو بستر کی چھپلی دیوار پر موجود راڈ پر لٹکے ہوئے تھے لیکن سیاہ پوش کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اس کی مطلوبہ شے اس لباس کی جیبوں میں موجود نہیں تھی۔ اب سیاہ پوش نے کچھ سوچ کر و جاہت کے سلپنگ سوٹ اور پھر جب ان کے نیچے کے نیچے ہاتھ مارا تو اس کی انگلیاں کسی ٹھوس شے سے

کھلنے والے دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو کر اندرونی حصے کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ کامران اس وقت گھر سے باہر تھا وہ اپنی راتیں باہر ہی رہیں بناتا تھا ان کی والدہ فوت ہو چکی تھیں اور اس کی بہن فرزانہ بھی رات کو دیر سے گھر لوٹ گئی اور آج تو وہ اپنی ایک سہیلی کی سالگرہ میں شرکت کے لیے خوب تیار ہو کر گھر سے باہر نکلی تھی اور عمران جانتا تھا کہ فرزانہ کی سہیلی ریحانہ کس قدر عیاش طبع لڑکی ہے اور اس کی سالگرہ پارٹی میں ڈانس کے علاوہ شراب کا دور تو لازمی ہی چلا کرتا تھا۔ چھپلی مرتبہ جب فرزانہ سالگرہ پارٹی سے واپس لوٹی تو اس کے منہ سے شراب کی بو اٹھتی محسوس کر کے عمران اسے صورتاً بوا دور چلا گیا تھا۔

عمران و جاہت علی خان کو رات کے بارہ بجے بڑا شاپر گھسیٹ کر اپنے بیدروم میں جاتا دیکھ کر باہر ہی رک گیا پھر دبے پاؤں آگے بڑھا اور بڑے بیدروم کی لائٹ آن ہوتے ہی دروازے میں نصب تالے کے سوراخ سے اندر جھانکنے لگا دوسرے ہی لمحے وہ چونک اٹھا جیب سے ایک ریموٹ کنٹرول نکال کر اس کے بہن دبا کر فرش کو غور سے دیکھ رہے تھے مخصوص بنوں کے پریس ہوتے ہی ان کے سامنے کا فرش گڑگڑاہٹ کے ساتھ دونوں جانب سمٹ گیا اور نیچے سر ہٹا دیکھائی دینے لگیں۔ سر و جاہت علی خان شاپر بیگ تھپتھپتے ہوئے نیچے اترنے لگے عمران کا دل دھک دھک کرنے لگا کہ یہ کیا امر ہے اس کے والد نیچے تہہ خانے میں کیا کرنے گئے ہیں۔ یہ تہہ خانہ کب تیار ہوا اس کا ریموٹ کنٹرول ڈور سسٹم کب فٹ کیا گیا سوچ سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک مرتبہ کچھ عرصہ قبل جب وہ تینوں بہن بھائی اپنے چچا کے ساتھ جولڈن سے آئے تھے سیر کرنے مری گئے تھے اور ان دنوں و جاہت نے کوٹھی کے پرانے ملازم

لشتیں موجود تھیں اور چھت پر خوب صورت قمقمے بھی نصب دکھائی دے رہے تھے ایک بڑی ایل سی ڈی اسکرین، کیسبئر سسٹم انٹرنیٹ وغیرہ کا کیسبن بھی موجود تھا۔ اس علاوہ فیکس مشینیں بھی موجود تھیں، عمران نے کانفرنس روم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوتے ہوئے ماحول کا جائزہ لے لیا۔ ایک دیوار پر مخصوص پوائنٹس کا نقشہ بھی موجود تھا۔

عمران نے تہہ خانے کی تیز روشنیاں آن کر کے موبائل کیس سے ماحول کی تصویریں اتار کر محفوظ کر لیں پھر جیب سے ریشم کی ڈوری نکال کر تخت پر لیٹے سرغندہ کی طرف بڑھنے لگا اور اس کے قریب جا کر پھرتی سے اس کے ہاتھ پاؤں چھیچھ کر جکڑ دیئے سرغندہ کسمسائے لگا پھر اسے چھینک آگئی وہ بیدار ہونے لگا اس وقت عمران نے زور سے ایک پھنر سرغندہ کے منہ پر مارا سرغندہ کی آنکھ کھل گئی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے عمران کو دیکھنے لگا وہ جانتا تھا کہ وجاہت کا بڑا لڑکا عمران جو کرائم رپورٹر ہے کس قدر خطرناک آدمی ہے۔ عمران نے اس کے منہ پر پانی کی پھوار پھینکی جب وہ بے ہوش ہو گیا تو اس کی رسیاں کاٹ دیں۔

عمران تہہ خانے کے وسط میں کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور اسی ترتیب سے مین دبا دیئے فوراً ہی اوپر کمرے کا فرش سرک گیا اور وجاہت کا بیڈ روم دکھائی دینے لگا۔ عمران اوپر آ کر اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا اس نے فیصلہ کیا کہ اب اگلی رات تہہ خانے میں جا کر سامان کو پریس اور میڈیا کی موجودگی میں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔



وجاہت علی خان کانفرنس روم میں غصے سے ٹہکتے ہوئے اپنی پارٹی کے سیاستدانوں پر نظریں جمائے

لکرائیں اس نے فوراً اس شے کو کھینچ کر باہر نکالا یہ ریموٹ کنٹرول تھا۔ سیاہ پوش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کنٹرول کے مین اندازے سے دبانے شروع کر دیئے کچھ دیر کی کوشش کے بعد اس کے ہاتھ سچ پڑنے لگے اور فرش کا ایک شق ہو گیا۔ سیاہ پوش نے نیچے جاتی سیڑھیوں کی طرف جھانکا زینہ صاف ستھرا اور خوب صورت تھا۔ بلب کی روشنی ایک ٹیوب سے پھوٹ کر اجالا کیے ہوئے تھی۔

سیاہ پوش پستول ہاتھ میں لیے نیچے اترنے لگا ریموٹ کنٹرول اس نے جیب میں ڈال لیا اس کے آخری سیڑھی پر آتے ہی فرش کا خلا سرک کر برابر ہو گیا۔ سیاہ پوش سامنے موجود دروازے کو آہستہ سے دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ ایک بڑا ہال کمرہ تھا جس میں چھوٹے چھوٹے زیرو کے بلب اس وقت روشن تھے سامنے کی سمت ایک تخت پر نیچے گدے پر وہ زخمی سرغندہ موجود تھا جس کا عمران نے تعاقب کیا تھا عمران قدم بدم آگے بڑھنے لگا۔ تخت کے قریب ہی ایک ٹرائی پر کھانے پینے کی اشیاء موجود تھیں کچھ اس بڑے شاپر میں تھیں جسے گھسیٹ کر وجاہت پورٹیکو سے بیڈ روم میں لائے تھے۔ پانی کی بوتلیں بھی موجود تھیں اب عمران نے کمرے کی دیواروں کے ساتھ موجود سامان کا جائزہ لیا وہاں ڈبوں اور بکسوں میں منشیات اور جعلی ادویات موجود تھیں۔ وہ مغرب کی سمت سے تہہ خانے میں داخل ہوا تھا دراز قد زخمی سرغندہ جنوب کی جانب تخت پر پڑا تھا سامان دیواروں کی ساتھ سیڑھیوں کے ساتھ مشرقی سمت اور شمال کی جانب دکھائی دے رہا تھا۔

شمالی کی جانب آگے جا کر ایک چھوٹا سا خوب صورت کانفرنس روم تھا جو شیشے کی دیوار سے ڈھکا ہوا تھا اس کے اندر گول دائرے کی صورت میں خوشنما

ہوئے تھے۔

بڑے نیک نام خدمت گار مشہور تھے۔

ایک سیاستدان نے پھل کاٹنے والا چاقو پھینک مارا عمران جھک گیا اور وار خالی گیا واٹر پستول کا پانی ختم ہو چکا تھا عمران نے دوسرے ہاتھ میں موجود پستول سے کار کی بیڑی کے تیزاب سے پھوار پھینکی وہ سیاستدان مسلسل چیخنے کی مشین بن گیا اس کا جسم جل گیا۔ باقی بچنے والوں کو قریب جا کر عمران نے ریوالور کے بٹ کپٹی پر مار کر بے ہوش کر دیا۔

آدھے گھنٹے بعد اس تہ خانے میں پولیس کے بڑے آفیسرز میڈیا اور پریس کے نمائندے موجود تھے۔ وجاہت کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور کامران کو بھی لڑکیوں کی ننھی فلمیں بنانے بلیک میل کرنے کے جرم میں ہتھکڑیاں لگا دی گئی تھیں۔ حکومتی پارٹی کے دوسرے کئی سیاستدان بھی گرفتار کر لیے گئے جب وجاہت کو ہوش آیا تو عمران کی آنکھوں نے اپنے والد کی تمام تر مہربانیوں پرورش کی ذمہ داریوں حسن سلوک کے باوجود قانون کا بول بالا کر دیا تھا۔ کمرے کی الماری سے ایسے شواہد مل گئے تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ یہ کالے چہرے والے سیاستدان ملک کی دولت باہر بھیج رہے تھے۔ یہ لوگ منشیات اور جعلی ادویات، جعلی شراب کی فروخت سے دولت کما رہے تھے یہ سیاست کو جرائم کے لیے استعمال کرتے تھے۔ عمران نے کرن کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔



”یہ تو اتنی بڑی پریشان کن صورت حال ہے آپ کے کمرے سے ریموٹ کنٹرول کس نے چرایا؟ اور سرغندہ کو کس نے بے ہوش کیا ہم خطرے میں ہیں۔ صبح آپ کا بیڈروم کا دروازہ کبھی اندر سے کھلا تھا۔“ ایم این اے شوکت پرویز نے نہ تشویش لہجے میں کہا۔

”میں نے پورے گھر کی تلاشی لے ڈالی ہے بچوں سے ملازموں سے سب سے پوچھا ہے لیکن سب لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ آج مجھے بھی سرنگ کے ذریعے ہی آنا پڑا ہے پہلے گھر سے نکالا ہنجر وال گاؤں کے ایم پی اے کے ویران مینٹگ روم میں داخل ہوا پھر اس کے تہ خانے میں موجود سرنگ کے ذریعے یہاں اپنے گھر کے تہ خانے میں آیا۔ آپ لوگ تو خیر اسی طرف سے آتے ہیں لیکن میں.....“ وجاہت غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ”پوری طرح چوکنے رہو۔“ اس نے گفتگو روک کر اسٹین گنیں ہاتھوں میں لیے محافظوں سے کہا زخمی سرغندہ ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔

اس وقت اچانک کمرے میں دیوار کے پاس رکھے سامان کے ذخیرے کے پیچھے سے عمران کسی جاسوس کی مانند دونوں ہاتھوں میں پستول لیے باہر نکلا اور اس نے تیزی سے بے ہوشی کی دوائے پانی کی پوار مسلسل اسٹین گن بردار کے چہروں پر پھینکی دونوں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ سرغندہ کو وہ دوبارہ بے ہوش کر چکا تھا وجاہت علی اور دو سیاستدانوں نے ریوالور نکال لیے لیکن پانی کی پھوار برس چکی تھی وہ بھی بے ہوش ہو کر گرتے چلے گئے۔ دو گولیاں چلیں لیکن عمران پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اس کے سامنے اس کے گھر کا دوسرا کالا چہرہ بھی بے نقاب ہو چکا تھا اس کے ہمراہ کچھ اور کالے چہرے بھی جو معاشرے میں

رومانہ مسائل

حافظ شہیر احمد

سید اعجاز علی لاہور
جواب: یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔

ذاکر علی پتوکی

جواب: ”یا علیم“ اللہ کا اسم ہے 11 مرتبہ پڑھا کریں پڑھنے سے پہلے۔ ”یا قوی“ اللہ کا اسم ہے 11 مرتبہ پڑھا کریں سر پر ہاتھ رکھ کر نماز کے بعد۔

محمد ابراہیم نواب شاہ

جواب: ”یا لطیف یا ودود“ 11 مرتبہ ہر نماز کے بعد پڑھ کر تصور میں لے کر گھر کے تمام افراد پر دم کیا کریں۔

کاظم رضا گجرات

جواب: فجر کی نماز کے بعد سورۃ فرقان آیت 70، 74 مرتبہ اول و آخر 11/11 مرتبہ درود شریف جلد اور اچھے رشتہ کے لیے دعا کریں۔

محمد سلمان میرپور خاص

جواب: عشاء کی نماز کے بعد سورۃ قریش 111 مرتبہ اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف جاب اور معاشی حالات اچھے ہونے کی دعا کریں۔ آپ بھی پڑھیں اور شوہر بھی صدقہ بھی دیں۔

ارشاد احمد کراچی

جواب: سورۃ الفلق اور سورۃ الناس یہ دونوں بھی پڑھیں اور اللہ کے حمد و ثناء سے دعا کریں۔

محمد شہیر احمد

جواب: عشاء کی نماز کے بعد سورۃ القریش 111 مرتبہ اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف جاب کے لیے دعا کریں۔

نوشاد احمد اسلام آباد

جواب: عشاء کی نماز کے بعد سورۃ القریش 111 مرتبہ اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف آسانی اور جلد رہائی کے لیے صدقہ لازمی دیں۔

امامت علی منڈی بہاؤ الدین

جواب: سورۃ شمس اور سورۃ العصر 11-11 مرتبہ (اول و آخر 3-3 مرتبہ درود شریف) صبح شام پڑھ کر شوہر پر دم کیا کریں ہو سکے تو پانی پر دم کر کے بھی پلایا کریں۔ نیت ہو کہ میری طرف اور میری طرف توجہ دیں۔

زین کرامت لاہور

جواب: آپ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھا کریں فجر اور عشاء کی نماز کے بعد 21-21 مرتبہ اول و آخر 3-3 مرتبہ درود شریف پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا کریں۔

سورۃ یسین 1 مرتبہ فجر کی نماز کے بعد تمام معاملات ٹھیک ہونے کے لیے دعا کیا کریں صدقہ بھی دیں۔

ایس خان سوات

جواب: بعد نماز فجر، سورۃ یسین ایک مرتبہ۔

سورۃ فرقان آیت نمبر 70، 74 مرتبہ اول

و آخر 11، 11 مرتبہ درود شریف۔ (جلد اور اچھے رشتہ کے لیے دعا کریں)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم اللہم انزل علیہ العذاب

اللہم انزل علیہ العذاب اللہم انزل علیہ العذاب

میں آئے۔
علی ارشد.....ساھیوال
 جواب:- (۱) سورۃ اخلاص 11 مرتبہ
 پڑھ کر دم کر لیا کریں۔ اول و آخر 3,3 مرتبہ درود شریف۔
 (۲) سورۃ عبس روزانہ ایک مرتبہ پڑھ کر دم کریں پانی پر بھی دم کر کے پی لیا کریں آپ دونوں۔

سورۃ قریش 111 مرتبہ اول و آخر
 11,11 مرتبہ درود شریف۔ بعد نماز عشاء دعا بھی کریں۔ (والدہ بھی پڑھ سکتی ہیں)
نور الدین.....نیو کراچی
 جواب:- سورۃ عصر روزانہ 21 مرتبہ پانی پر دم کر کے پلا میں اول و آخر 3,3 مرتبہ درود شریف۔
 (۳) قرآن کریم کی آیات ثواب کی نیت سے پڑھنا اور کسی دنیاوی مقصد سے پڑھنا دونوں میں فرق ہے۔

سورۃ قریش 111 مرتبہ اول و آخر
 11,11 مرتبہ درود شریف۔ بعد نماز عشاء دعا بھی کریں۔ (والدہ بھی پڑھ سکتی ہیں)
سمیرا نورین.....سرگودھا
 جواب:- بعد نماز فجر سورۃ رحمن کی تلاوت کیا کریں اور دعا کیا کریں۔



نوٹ
 جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔
 ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔
 rohanimasail @ gmail.com

استخارہ کر لیں۔ سورۃ فرقان آیت نمبر 70،74 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف، (جلد اور اچھے رشتے لیے دعا کریں)
اقبال احمد.....سرگودھا
 جواب:- امتحان شروع ہونے سے نتیجہ آنے تک روزانہ 3 مرتبہ سورۃ عبس بعد نماز عشاء پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں اور پانی پر دم کر کے بھی چھینیں۔

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے اپریل 2015ء

نام والدہ کا نام گھر کا مکمل پتا

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں

منو آگھہ

عرفان احمد

مظصر مگر پراش

امام ابن رہب دوسری صدی ہجری کے مشہور عالم اور فقیہ ہیں فرماتے ہیں میں نے غیبت سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جس دن کسی کی غیبت کرتا اگلے دن اپنے نفس کو سزا دینے کے لیے روزہ رکھ لیتا لیکن بات نہیں بنی اور روزہ رکھنا ایک عادت سی ہو گئی اور سزا میں کمی کی بجائے اس میں لطف محسوس ہونے لگا۔ ظاہر ہے جس چیز میں لطف محسوس ہو وہ سزا کیسے ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں نے غیبت کے عوض ایک درہم صدقہ دینا شروع کر دیا اور یہ سزا نفس کو شاک گزری اور یوں غیبت کے روک سے نجات مل گئی۔

اقبال احمد..... قصور

پیر کے دن چہ خصوصیتیں

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ پیر کے دن کو آقائے نامدار تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ساتھ ایک خاص مناسبت اور خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ:-

۱۔ پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔

۲۔ پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی۔

۳۔ پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچے۔

۴۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیر کے دن حجر اسود کو اپنی جگہ رکھا۔

۵۔ پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے لیے غار ثور سے سفر کی ابتدا فرمائی۔

۶۔ پیر ہی کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحہ پیش آیا۔

(مسند احمد: 1/ 677، رقم حدیث: 256)

انتخاب: عرفان اسلم..... کراچی

انتظار

ایک پاگل دوسرے سے ”یارا کر کوئی ہاتھی درخت پر چڑھ جائے تو اترے گا کیسے؟“

دوسرا پاگل ”یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے، کسی پتے پر بیٹھ کر خزاں کا انتظار کرے گا۔“

.....

شروعات

ایک شخص نے اپنے پڑوسی سے کہا کہ ”بھائی صاحب! کل تمام دن آپ کا کتا بھونکتا رہا جس کی وجہ سے میری بیوی گانے کی پریکٹس نہ کر سکی۔ عجیب کتا ہے آپ کا؟“

”دیکھئے بھائی صاحب!“ پڑوسی نے جواب دیا۔

”شروعات آپ کی بیوی ہی کرتی ہے۔“

مقبول جاوید احمد صدیقی..... راولپنڈی

حسن اور دوستی

فن کا منبع، فن کی روح سے جب روئی اور فن مل جاتے ہیں تو انسان تاج محل تعمیر کرتا ہے، ہرام مصر بناتا ہے، کھرا کے طلسماتی محلات کی بنیاد ڈالتا ہے۔

کالی داس ”شکلنتا“، ملٹن ”گم شدہ جنت“ اور اقبال ”جاوید نامہ“ لکھتا ہے لیکن جب فن سے روئی پھٹ کر جاتی ہے تو شکلنتا مر جاتی ہے اور جاوید نامہ رڈی میں

بکنے لگتا ہے پھر حسن مر جاتا ہے، ندب مر جاتا ہے، بھوک سب کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

کمال بھئی..... گھونکی، سندھ

خوب صورت باتیں

☞ جب آدم کی اولاد سے حیا مروت و خلوص اور پاکي اٹھ جائے تو وہ انسان کے بجائے صرف مٹی ہی رہ جاتے ہیں اور بھلا مٹی سے امیدیں کیسی؟

☞ رشتے اور سودے میں بہت فرق ہے رشتے قائم کیے جاتے ہیں اور سودے طے کیے جاتے ہیں۔

جاوید یوسف..... راولپنڈی

کیا آپ جانتے ہیں؟

☞ سلطان ابراہیم غزنوی ہر سال اپنے ہاتھ سے قرآن مجید لکھتا تھا۔

☞ سونے کے تاروں سے قرآن مجید لاہور میں لکھا گیا ہے۔

☞ پنجابی زبان میں سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ حافظ محمد لکھوی نے کیا تھا۔

☞ حرم شریف کے اندر دنیا کے چھ زبانوں کی گھڑیاں لگی ہوئی ہیں۔

☞ دنیا کا سب سے بڑا الپ پچاس کلو واٹ ہے اور یہ جاپان نے تیار کیا تھا۔

☞ دنیا میں سب سے زیادہ سگریٹ نوشی امریکہ میں ہوتی ہے۔

☞ درختوں میں سب سے پہلا کھجور کا درخت پیدا ہوا تھا۔

☞ انارکلی کا اصلی نام نارہ بیگم تھا۔

☞ رکشا جاپان نے ایجاد کیا تھا۔

☞ دنیا کا پہلا پاکٹ ٹیلی فون 28 اگست 1980ء میں بنا گیا۔

☞ اٹلی نے ٹیلی ویژن کی ایجاد کی۔

☞ کتب خانہ کے ناموں میں سے ایک ہے۔

پینے کی چھ سنتیں ہیں۔

پانی ہمیشہ پیئہ کر بسم اللہ پڑھ کر سپدھے ہاتھ سے دیکھ کر تین سانس میں پینا چاہیے۔ پانی پینے کے بعد

الحمد لله کہنا چاہیے اس لیے ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق پانی پینا چاہیے آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کے طریقے کے مطابق پانی نہ پینے کے بہت سے نقصانات ہیں جو درج ذیل ہیں۔

☞ کھڑے ہو کر پانی پینے والا انسان شیطان کا ساتھی بن جاتا ہے۔

☞ کھڑے ہو کر پانی پینے سے پیاس نہیں بھجتی۔

☞ کھڑے ہو کر پانی پینے سے انسان کا پیٹ بڑھتا ہے۔

☞ کھڑے ہو کر پانی پینے سے مٹانہ میں پتھری پیدا ہوتی ہے۔

☞ کھڑے ہو کر پانی پینے سے شوگر کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔

☞ کھڑے ہو کر پانی پینے سے انسان کا نظام انہضام خراب ہو جاتا ہے۔

☞ ان تمام بیماریوں سے بچنے کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق پانی پینا چاہیے۔

محمد حنیف..... منڈی بہاؤ الدین

☞

http://www.pdfbooksfree.pk

نوشبوسن

عمر احمد

شہر تمنا

اک شہر تمنا ہو

جہاں پھولوں کا بیسرا ہو

کانٹوں کی چھین زخموں کی رفوگر ہو

سورج کی تپش ہر گھر کے لئے شبنم ہو

جہاں چاند کی کرنیں

ہردل کے لئے روشن ہوں

اک ایسا شہر تمنا ہو

سب موسم اللہ کی عنایت ہوں

جہاں مقدر کا ستارہ

ہر اک کے لیے چمکتا ہو

اک ایسا شہر تمنا ہو

اک ایسا شہر تمنا ہو

ریحانہ سعیدہ..... لاہور

غزل

میں ظلمتوں کے دیے اس طرح بجھاؤں گی

کہ اپنے خوں سے اندھیروں کو پھر مٹاؤں گی

کبھی نہ شکوہ شکایت زبان پر آئے گا

ہزار ظلم بھی سہہ کر میں مسکراؤں گی

میرے وجود سے عالم میں روشنی ہوگی

میں بوئے گل کی طرح جگ میں پھیل جاؤں گی

ہر ایک دل میں میرے عشق کے تذکرے ہوں گے

میں جان دے کر تیری انجمن سجاؤں گی

جو اپنے غم کو دلوں میں چھپا نہیں سکتے

میں کیسے دکھ کی کہانی انہیں سناؤں گی

بھٹک نہ جائے اندھیرے میں راہبر کوئی

میں آنسوؤں کے دیے راہ میں جلاؤں گی
کبھی تو میری صدا عرش کو ہلائے گی
کبھی تو حال میں اپنا انہیں سناؤں گی
نجانے کس نے بچھائے ہیں خار راہوں میں
میں پھول بن کے تیری راہ پھر سجاؤں گی
میرے وطن کی فضا میں ہیں سوگوار غزل
میں جان دے کر انہیں پھر سے جگمگاؤں گی
سکھنی غزل..... گلشن، کراچی

غزل

وہ حسن جمال رکھتا ہے

غم سے رشتہ بحال رکھتا ہے

مجھ کو اس نے اداسیاں بخشیں

کتنا میرا خیال رکھتا ہے

رونے دیتا نہیں جو روؤں تو

وہ ہنر باکمال رکھتا ہے

گرنا چاہوں تو گرنے نہیں دیتا

کون مجھ کو سنبھال رکھتا ہے

مجھ کو اس کی تلاش ہے رانا

چہرہ جو بے مثال رکھتا ہے

قدریرانا..... راولپنڈی

غزل

دلوں میں رہتے زمانے میں نام بھی کرتے

جو اور روز جہاں بھی قیام بھی کرتے

ہمارے حق میں بھی کچھ فیصلے ہوتے

جو ہم سخن کے سوا اور کام بھی کرتے

کہاں نصیب تھی خوش قسمتی نصیبوں سے

ہمارے گھر بھی وہ آتے قیام بھی کرتے

ہمیں بھی کرتے زمانے میں رشک کے قابل

ہمارے نام کوئی اپنی شام بھی کرتے

خبر جو ہوتی کہ تم لوٹ آؤ گے اک دن

ہم اپنے جینے کا کچھ انتظام بھی کرتے
کہاں نصیب تھیں آزادیاں کہ ہم تیری
سفر بھی ساتھ میں کرتے قیام بھی کرتے
نیر رضوی..... کراچی

جب میرے دل کے سمندر میں
مدوجزر پیدا کرتی ہیں
تو کتنے ہی ارماں
لاوارث لاشوں کی طرح
اس میں بہہ جاتے ہیں

مہر پرویز احمد دلو..... چک 123 میاں چنوں

یادیں
میں نے اپنے رخ روشن کو بہت یاد کیا
آج ٹوٹے ہوئے در پن کو بہت یاد کیا
ایک دوشیزہ گلشن کو بہت یاد کیا
میں نے جب اپنے شمیم کو بہت یاد کیا
آئینہ جب کبھی حالات کا دیکھا میں نے
اپنے بیٹے ہوئے جیون کو بہت یاد کیا
پھر لگا تار برستے رہے آنسو میرے
جب بھی میں نے تیرے دامن کو بہت یاد کیا
جس سے رہتی تھیں درخشاں میری راتیں اکثر
میں نے اس چاندی دہن کو بہت یاد کیا
دیکھ کے روتی ہوئی اپنی جوانی میں نے
اپنے بنتے ہوئے بچپن کو بہت یاد کیا
جب بھی تنہائی میں چھینرا عم جاناں نے مجھے
میں نے خوشیوں بھرے آنکھن کو بہت یاد کیا
محفل دوست سے اک زخم تمنا کھا کر
آج دل نے میرے دشمن کو بہت یاد کیا
جس نے بخشش تھی میرے جسم کو خوشبوئے چمن
اس مہکتے ہوئے ساون کو بہت یاد کیا
ادیب سمیع چمن..... حیدرآباد



گر میری امانت ہے وجود تیرا
تو پھر یہ دوری نصیب کیوں ہے
میں ماننا ہوں حیا ہے تیری
جو تجھ کو مجھ سے ہے دور رہتی
دکھ مہراں بات کا ہے
کوئی غیر تیرے قریب کیوں ہے
وہ جو کل کھڑا تھا تیرے در پر
وہ جس سے مل کے تو گل اٹھی تھی
کیا لگاڑا ہے میں نے اس کا
وہ شخص میرا قریب کیوں ہے
جب پوچھے اس نے میرے اثاثے
دکھا دیئے میں نے دل کے جذبے
مسکرا کر پھر کہا اٹھی
تو سب سے اتنا عجیب کیوں ہے
لوگو! ذرا انصاف کرنا
خدا را یہ انصاف صاف کرنا
وہ اس بات سے ہیں مجھ پر برہم
کہ میرا عشق حد سے شدید کیوں ہے
بن گیا ہوں سرعام مجرم
پھر وضاحتوں کی اب کیا ضرورت
جرم تیرا فروق یہ ہے
کہ آخر تو غریب کیوں ہے

عمر فاروق ارشد..... فورٹ عباس

یادیں

یادوں کی لہریں

جگت سنگھ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی بلنگاز داستان جو کلاسک داستانوں میں شمار ہوتی ہے..... جو روجہ کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھیوں کا احوال جو حاکمانہ غرور کے کوساروں کے ساتھ پورے جاہ و جلال سے نکر جاتی ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانہ عبرت ہے جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور نشیمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان "جگت سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار "جگت سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہانوں کا پتہ ہانی ہو جاتا تھا۔ تراصل فطری طور پر امن و آسائش کا پیامبر ہے۔ "جگت سنگھ" کے کردار کا روحانی پہلو جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "ویرو" کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جنابت رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے۔ "جگت سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا آئیے قارئین یہ جانتے کے لیے ہم بھی زیر نظر کہانی میں "جگت سنگھ" کے ساتھ ساتھ گانوں کے سرسبز کھلیانوں اونچے نیچے ٹیلوں اور پر خطر کھنڈرات کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں۔

بمشکل پندرہ دن گزرے ہوں گے کہ اتنا تک ایک مصیبت کھڑی ہوگئی اس پاس کے رہنے والوں کو پتہ چل گیا کہ نیا کرائے دار اپنے وقت کا خطرناک ڈاکو ہے جو پیرول پر چھوٹ کر آیا ہے۔ ڈر کے مارے وہ گھر میں رہنے لگے۔ چالی میں سونے والے اندر سونے لگے۔ چندن کو رہنا ہوئی تو عورتیں کراسے کہتیں۔

"ہن! تم لوگ مکان نہیں چھوڑ سکتے؟ ہم رات کو سو نہیں سکتے کیونکہ اعصاب پر تمہارے شوہر کا خوف مسلط رہتا ہے۔"

چندن گڑ گڑاتی۔ "اب صرف ڈیڑھ ماہ رہ گیا ہے۔ میں اپنے بچے کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تم لوگوں کو ہم سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔" پھر حلق صاف کر کے کہتی۔ "وہ ڈاکو تھے مگر انہوں نے دشمن کے علاوہ کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔" مگر یہ بات کسی کے دل میں نہ اتری۔ تب چندن کو رکاوٹ گھبرانے لگا۔ نہ تو وہ کسی کو اپنی بات پر مجبور کر سکتی تھی اور نہ ہی جگت سے کچھ کہہ سکتی تھی۔

"تم او اس کیوں رہتی ہو؟ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟"

جگت نے کئی بار اس سے پوچھا۔

آخر چندن اس کا سوال برداشت نہ کر سکی۔ وہ رو دی۔

"تم سے کہتے ہوئے زبان نہیں کھلتی۔"

"چندن! جو کچھ ہے بتاؤ میں تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کروں گا۔"

چندن اسے دیکھتی رہی۔ جگت کے لہجے میں اسے سچائی نظر آئی۔ اس نے دل مضبوط کر کے کہا۔ "یہاں کے لوگ مکان خالی کرنے کا کہہ رہے ہیں۔ ان کو تم سے ڈر لگتا ہے۔"

یہ سن کر جگت کو بڑا تعجب ہوا۔ وہ صبح سے شام تک باہر رہتا تھا کسی سے نظر تک نہ ملاتا تھا بلند آواز سے بات نہ کرتا تھا پھر بھی لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ ڈاکو کا مافیہ پر چھائیں کی طرح اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ سماج کیا پھر اسے اس راہ پر ڈال دینا چاہتا ہے؟ وہ سوچتا۔ اچھا آدمی بننے کے لیے مزدوری کی بے عزتی برداشت کی۔ نصف روٹی

ہے جہاں ہوں گے اپنا ماضی چھپا کر جی رہے ہوں گے۔
بھگوان کرے ان کی زندگی پر پولیس کا سایہ نہ پڑے۔ اسی
لمحے راستے سے ایک سایہ بلندنگ میں داخل ہوا۔ جگت نے
آنکھیں تیز کر کے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی مگر سفید
داڑھی کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔ تب اس نے آواز دی۔

”کون ہے.....؟“

وہ شخص لرز گیا۔ ”میں ہوں۔“ جواب ملا۔ ”کون ہے
کونھری والا سردار جی۔“

”اوہ!“ جگت جھینپ گیا۔ ”ست سری اکال۔“ کہہ کر
خاموش ہو گیا۔ اس نے سوچا جس مکان کے کرائے داروں
کو اس کا بڑا وی اچھا نہیں لگتا اس کی چوکیداری کرنے کی
کیا ضرورت تھی؟ پھر رانت پس کر بڑ بڑایا۔

”کونھری خالی کرنے کی فکر میں کیوں اپنی نیند حرام
کر رہا ہوں؟ ایک بار فیصلہ کر لیا کہ نہیں جانا تو بس اب ات ختم
ہوئی۔ کرایہ داروں کی ایسی تھی۔ جگا زیادہ بھلائی دکھاؤ گے
تو بزدل بن جاؤ گے۔ سائے میرے سامنے آنکھیں نہیں
اٹھاتے اور میری بیوی کو مکان خالی کرنے کے لیے پریشان
کرتے ہیں۔ بس اب ادھر یا ادھر.....!“

خیالات کو ذہن سے جھٹک کر جگا سونے کی تیاری
کرنے لگا۔ وہ برابر سوئی ہوئی چندن کور کو چادر اوڑھانا
چاہتا تھا کہ اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ اس کے ٹوٹے
پھوٹے الفاظ جگا کے کانوں سے نکلے۔

”نہیں نہیں..... وہ ایسے نہیں ہیں۔“ چندن نیند میں
بڑبڑائی۔ پھر چار چھ الفاظ سمجھ میں نہ آئے۔ البتہ خری جملہ
یہ سنائی دیا۔ ”وہ خاندانی ہیں۔ تم سے بڑھ کر ہیں۔“

جگت نے سردا ہ بھری۔ نیند میں بھی وہ میری فکر کرتی
سے اس نے سوچا پھر اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا کہیں
یہ فکر سے پاگل نہ کر دے۔ میرا ایک غلط قدم اس کی زندگی
برباد کر دے گا۔ سے سو پر مہتا پر غصہ آیا۔ مجھے انہوں نے
اتنے سخت امتحان میں کیوں ڈال دیا؟ اسی طرح جگت نے
ساری رات گزار دی۔

صبح چندن نے اٹھ کر دیکھا تو چونک پڑی۔ جگت گھر کا

پر گزارا کیا پھر بھی سب لوگ اسے اچھا آدمی بننے سے روک
رہے ہیں۔ وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ چندن کور نے اسے
خاموش دیکھ کر سوال کیا۔

”اب کیا کریں گے؟“

”اس کا جواب کل صبح دوں گا۔“ یہ کہہ کر جگت پھر سوچ
میں ڈوب گیا۔



وہ رات جگت نے بڑی بے چینی میں گزاری۔ صبح تک
اسے فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔ جیل میں لوٹ جانا یا چالی کے
کرائے داروں سے کہہ دینا کہ ہم نہیں رہیں گے۔ تم کو اگر
ڈر لگتا ہے تو تم لوگ چلے جاؤ۔ دیکھتا ہوں کون مجھے نکالتا
ہے؟ مجھے سیدھی طرح جینے دوور نہ رو نہ کیا.....؟ جگت کے
دل نے آواز دی۔ سوال پوچھا گیا جو سامنا کرے گا اس کا
گلا دبا دوں گا ابھی کھائیں۔ میں اتنی طاقت ہے میں بغیر
اسلحہ کے بھی دوچار لاشیں گرا دوں گا۔

”لاشیں گرا کر کیا کرو گے؟ کہاں جاؤ گے؟“

”بدلوں گا..... جیسا تھا ویسا ہو جاؤں گا۔“

”بدلہ..... اب کون ہے جس سے تم بدلہ لو گے؟“

”ساج سے بدلہ لوں گا جو مجھے جین سے جینے نہیں
دیتا۔ یہ مطلبی دنیا میری دشمن ہے مرتے وقت تک کسی کو
جین سے نہیں جینے دوں گا۔“

”پھر دوست کی ضمانت مہتا کا اعتماد؟ اور چندن کور کی
حسرتوں کا کیا بنے گا؟“ اس کا جواب نہیں مل سکا تو وہ رضائی
ہٹا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر کھلی کھڑکی سے سنسان محلے کو دیکھنے
لگا۔ وہ اپنے ماضی میں ڈوبا ہوا تھا جیسے سب کچھ کل کی بات
ہو۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ختم ہونے والے دشمن پھر نظر
میں آ گئے ہیں۔ جدا ہونے والے ساتھی یاد آئے۔ بغیر کسی
دوست یا دشمن کے زندگی کیسی بھکی ہے؟ اس نے سوچا بچپن
اور اچلا کہاں ہوں گے؟ ہوشیار کیا کرتا ہوگا؟ کیا وہ لوگ
مجھے بھول گئے ہوں گے؟ وہ اپنی زندگی کے جھمیلوں میں
اتنے اٹھ گئے ہوں گے کہ میری کچھ خبر ہی نہیں لیتے؟ مگر
اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے خود ان کو جدا کیا

سامان تھیلوں میں بھر رہا تھا۔

جگت نے شانے پر تھیلا اٹھایا اور چندن کو رنے ست پال کو ساتھ لیا۔ ان کو سامان کے ساتھ باہر نکلنے دیکھ کر پڑوسیوں کو تعجب ہوا اور ساتھ ہی سکون بھی ہوا۔ جگت ساتھ تھا اس لیے کوئی عورت چندن سے پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی کہ کہاں جاؤ گے؟ کیا دوسری جگہ مل گئی ہے؟ تینوں چپ چاپ سیزھیاں اترنے لگے۔ جگت نے سب کی طرف ناراضگی کی نظروں سے دیکھا اور آنکھوں میں ڈانٹا سالے بزدل۔ اس نے سوچا اگر کسی سے کچھ نہ کہنے کی چندن کو یقین دہانی نہ کرانی ہوتی تو وہ سب کو کھری کھری سنا دیتا۔ وہ چھوٹا سا میدان عبور کر کے بڑے دروازے کے قریب رک گیا۔ گھوم کر اس نے کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانکتے ہوئے لوگوں کو تیز نظروں سے گھورا۔ وہ بے چارے مارے ڈر کے گھروں میں چھپ گئے۔ ان کی حالت پر جگت ہنس دیا۔ ”چلو!“ کچھ گائے نئی ہوئی چندن نے آواز دی اور جگت نے قدم بڑھائے۔

”ارے..... تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟“ سامنے سے آنے والے سردار جی نے حیرت سے پوچھا۔ ”میں نے تو سنا تھا کہ تم لوگ ابھی یہیں رہو گے۔“ اس کی سفید داڑھی اور آواز سے جگت پہچان گیا کہ رات جسے آواز دی تھی وہی سردار جی ہیں۔

”ہم تو رہنا چاہتے تھے مگر تم لوگوں کو ہمارا پڑوس کھٹکتا ہے۔ اس لیے جا رہے ہیں۔“ جگت نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔

چندن کو روڈ لگا کہ کہیں جاتے وقت وہ لڑنے پڑے اس لیے فوراً بول پڑی۔ ”یہ ڈاکو تھے جنیل سے آئے ہیں لہذا بے چارے پڑوسی گھبرارے ہیں۔“

سردار جی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ”اب کہاں جاؤ گے؟“

”یہ تو ہمیں بھی پتہ نہیں ہے۔“ چندن کو رکی آواز میں

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ چندن نے حیرت سے پوچھا جیسے اپنی آنکھوں پر اعتماد نہ ہو۔ ”تم کب بیدار ہوئے؟“

”سو یا ہی کون ہے؟“ جگت نے نصف بھرے تھیلے کو بلا کر کہا۔ ”دن طلوع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔“

چندن کو ر جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ وہ جگت کا ارادہ سمجھ گئی تھی۔ ”دوسرا سہارا تلاش کیے بغیر ہمیں کہاں لے جاؤ گے؟“ چندن محبت بھرے لہجے میں بولی۔

”یہ تو پتہ نہیں۔“ جگت سنجیدہ ہو گیا۔ ”اب یہاں سے دل اٹھ گیا ہے۔“

سوا ڈیڑھ ماہ دکھ سکھ کی طرح کاٹ ہی دیں گے۔“ چندن کو ر کے چہرے پر صبح کی دھوپ کا سا اجالا پھیل گیا۔ چھپٹی رات اس نے بھیا نک خواب دیکھا تھا۔ جگت پڑوسیوں سے مار دھاڑ کر چکا تھا۔ دو چار رزئی کر دیئے تھے۔ پولیس آئی اور اسے ہتھکڑی پہنا کر لے گئی۔ وہ اور ست پال روتے رہ گئے تھے۔ وہ بند آنگوں سے دیکھے ہوئے خواب کی کھلی آنکھوں سے اتنی تعبیر دیکھ رہی تھی۔

”تمہیں اٹھتے ہی چل پڑنے کے لیے کس نے کہا تھا؟“ پھر ہاتھ سے سامان چھین کر بولی۔ ”آج تمہاری چھٹی ہے اس لیے آرام سے جاؤ گے۔“

جگت اس کے مسکراتے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے کھڑے ہو کر چندن کو ر کو اپنے قریب کھینچ لیا اور بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ ”غلام تمہارا حکم ماننے کے لیے آمادہ ہے۔“

”ارے چھوڑو! کھڑکی کھلی ہے۔“ چندن نے مصنوعی غصے سے کہا تو جگت نے اور زور ڈال دیا۔

”کھلی رہنے دو پڑوسیوں کو بھی تو پتہ چلے کہ ڈاکو بھی پیار بھرا دل رکھتا ہے۔“ یہ سن کر چندن نے اپنے بازوؤں کی پشت کے کنارے لیے۔

”ارے کھلی رہنے دو پڑوسیوں کو بھی تو پتہ چلے کہ ڈاکو بھی پیار بھرا دل رکھتا ہے۔“ یہ سن کر چندن نے اپنے بازوؤں کی پشت کے کنارے لیے۔

”ارے کھلی رہنے دو پڑوسیوں کو بھی تو پتہ چلے کہ ڈاکو بھی پیار بھرا دل رکھتا ہے۔“ یہ سن کر چندن نے اپنے بازوؤں کی پشت کے کنارے لیے۔

وغیرہ کا ڈرنہیں رہتا۔ پھر وہ بلند آواز میں بولے۔ ”کل رات میں مکان میں داخل ہوا تو انہوں نے ایسی آواز دی کہ میں نے گھر میں آنے کے باوجود ڈر گیا۔“

جگت کو فخر سا ہوا یہ آدھی ایسے پوری طرف پہچان گیا ہے۔ پھر بھی اونٹنا چھوٹی بات تھی۔

”سر دار جی! تمہاری بھاری بھاری کاشمیری۔ مگر دوسرے لوگ تمہارے جیسے سمجھدار نہیں ہیں۔“ مگر سر دار جی نے جگت کے شانے سے تھمیلاتا رہا اور اندر جانے لگے۔ ”تم لوگ اس طرف گھر چھوڑ کر جاؤ اس میں ہماری عزت جانے کی ہے۔“

پھر بھی جگت اور چند دن دروازے پر کھڑے رہے۔ سر دار جی ان کی انجھن سمجھ گئے۔ وہ زور سے بولے۔ ”ارے کرائے دارو! اپنے چہرے تو دیکھو! ایسے مرد کو یہاں سے نکالنے کی تمہاری کیا حیثیت ہے؟“ مگر کون جواب دیتا؟ سر دار جی کا جوش بڑھا۔ انہوں نے پھر بات لگائی۔

”یہ جگا اب یہیں رہے گا۔ جسے اختلاف ہو باہر آئے۔“ جگت کو لطف آ گیا۔ اس نے چند دن کوئی جانب دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں سوچتے کہ کیا سر دار جی میرے بھیاں چڑھنے لگے۔ وہ کوٹھری کھول کر سامان اندر ڈالتے ہوئے بولے۔ ”اب وہاں کیا کھڑے ہو؟ اوپر آ جاؤ۔“ پھر نرم کچھ میں کہا۔ ”اس بڑے کے سفید ہاتھوں کی عزت رکھ لو۔“

چند دن کو آگے بڑھی۔ پھر جگت بھی اس کے پیچھے چلنے لگا۔ جس کوٹھری کو پانچ منٹ قبل وہ خالی کر گئے تھے اسی کوٹھری میں داخل ہوتے ہوئے دونوں کو عجیب سا لگا۔ سر دار جی خوش ہوتے ہوئے بولے ”اس خوشی میں جگا! آج رات گانے بجانے کا پروگرام کریں گے۔ مالک مکان موبین لعل کو بلا میں گے۔ سارے گاؤں کو پتہ چلے گا جیسے کہ جگا ہمارا پڑوسی ہے۔“

ان کی مسرت دیکھ کر چند دن کو کابل بھرا آیا۔



بعض اوقات آفت بھی رحمت بن جاتی ہے جگت کو اس

کا تجربہ ہونے لگا۔ جو پڑوسی چند دن کو کوٹھری خالی کرنے کے لیے آ رہے تھے وہی اب اسے سنبھال کر رکھنے گئے۔

”بہن! آج مسخائی بنائی ہے اصلی گھی کی اپنے شوہر کو پکھانا۔“ پڑوسیوں کی محبت نے چند دن کو بڑی انجھن سے آزا کر دیا۔ مالک مکان کی دو جوان لڑکیاں چند دن اور ست پال کو اپنے گھر لے جاتیں۔

”ہمیں جگا کی باتیں سناؤ۔“ ویرو کی بات آتی تو دونوں بہنیں تعجب سے پوچھتیں اپنے شوہر کی محبوبہ کی اس طرح کھلے دل سے بات کر رہی ہو جیسے تم کو ویرو سے ڈرا بھی چلن نہ ہوتا۔“

چند دن مسخرائی۔ ”مجھ میں یہ بات نہیں ہے اور مجھے سیکھنی بھی نہیں ہے۔“



پیرول کے پونے تین ماہ جگت نے بحفاظت گزار دیئے تو پولیس والوں کو فکر ہوئی۔ جگا ذرا بھی گڑبڑ کیے بغیر پیرول کے تین ماہ گزار دے گا۔ اس ڈاکو کو ایک بار بھی جوش میں نہیں لایا جاسکا؟ پولیس افسر سوچتے۔

جگت پر گہری نظر رکھی جانی۔ کوئی نئی آفت کھڑی ہوتی تو پولیس ڈیپارٹمنٹ اس کی بدنامی کے لیے شکاری کی طرح تیار ہو جاتا مگر آخری لمحے آفت کے بادل چھٹ جاتے اور وہ مایوس ہو جاتے۔

اس آدمی کو کسی نہیں قوت کا سہارا ہے۔ ورنہ سارے داوا لئے نہ ہو جاتے۔ پولیس چیف کے کان میں یہ بات بھی آئی تھی کہ وزیر اعلیٰ نے جگا پر نظر رکھنے کے لیے اپنا خاص آدمی بھیجا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پولیس ڈر کے مارے جگا کو کسی جھوٹے کیس میں پھانسنے کی ہمت نہیں کر رہی تھی مگر پیرول کا ایک ہفتہ باقی رہ گیا تو ان کا ضبط جواب دے گیا۔ ان کو جگا کو جذبات میں لانے کا کھلا تجربہ کرنا پڑا۔!

چھٹی کا دن تھا جگت کی انگلی تھامے ست پال جگت

کے ساتھ حاضری لگوانے جا رہا تھا۔ پیرول کے دن کم

نے گالی دی۔

”سارے! اندھوں کی طرح چلاتے ہیں..... ان سے کون پوچھنے والا ہے؟ کون پوچھنے والا ہے؟“ یہ الفاظ جگت کو کھٹکے۔ وہ آستین چڑھا کر لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھا مگر جیب دوڑنے لگی۔ جگت کو شرمندگی ہوئی۔ حالانکہ اسے خبر نہیں تھی کہ امتحان کی گھڑی گزار کر قدرت نے دوسروں کو شرمندہ کیا تھا۔



”اب دو دن باقی رہ گئے ہیں۔“ چندن کو رنے مسرت اور دکھ کے ملے جلے جذبات سے کہا۔ ”پھر وہی جدائی۔“ ”دو نہیں صرف ایک دن چندن!“ جگت نے مسکرا کر کہا۔ ”کل صبح کی گاڑی میں تمہیں بھیج کر شام کو میں جیل چلا جاؤں گا۔“ ”نہیں..... میں تمہیں جیل روانہ کر کے پھر گاڑی پکڑوں گی۔“ چندن کو مضبوط لہجے میں بولی۔ ”تمہیں مہتا کے سپرد کر کے جاؤں گی۔“

”سچ کہنا چندن! تمہیں ڈر ہے کہ میں بارہ گھنٹے تنہا رہا تو کوئی طوفان اٹھا دوں گا؟“ جگت نے پر مذاق انداز میں پوچھا پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”ابھی تم کو مجھ پر اعتماد نہیں ہوا۔“

چندن نے محبت بھرے انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم پر تو پورا اعتماد ہے مگر تقدیراً خری لمحے میں دغا نہ دے جائے یہ ڈر لگتا ہے۔ میرے نصیب میں یہی چکر رہا ہے۔“ جگت سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ جدا ہوتے ہوئے

چندن کو رنا راض نہیں کرنا چاہتا تھا اور اپنی بیوی بیٹے کو گاڑی میں بٹھا کر رخصت کرنے کا زندگی میں ایک موقع مل رہا تھا وہ اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ رشتے دار گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہوں انجن کی سیٹی بجے اور گاڑی حرکت میں آئے وہ گھڑی عجیب ہی پر لطف ہوتی ہے۔ آج تک ہمیشہ چندن سے چھپ چھپا کر ملنا اور جدا ہونا یہی ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں کے سامنے اسے ”پھر ملیں گے“ کہنے کی خواہش وہ دبانہ سا۔ اس نے درمیان کار راستہ

ہوتے جا رہے تھے۔ بردن اسے سزا میں سے کم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ کیونکہ جیل میں رہنے سے باہر کا ماحول اسے سزا جیسا معلوم ہوتا تھا۔ قیدم قدم پر اسے احتیاط رکھنا تھی۔ بے عزتی برداشت کرنی تھی۔ کوئی نا انصافی ہو رہی ہو تو درمیان میں نہیں پڑنا تھا۔ یہ سب اصول قید کی زنجیروں سے زیادہ وزن دار تھے۔

”باپو! تم روز روز جیل کیوں جاتے ہو؟“ راستہ چلتے ہوئے ست پال نے پوچھا۔ ”وہ ہمارے گھر کے پاس جوڑ کار ہتا ہے کہہ رہا تھا کہ خراب آ دی جیل جاتے ہیں۔ تم تو خراب آ دی نہیں ہو پھر بھی.....!“ اس کی بات ختم ہو اس سے پہلے عقوبت آتی ہوئی تیز رفتار پولیس جیب نے جگت کو ہوشیار کر دیا۔ پہلے تو گھوم کر دیکھنے کا ارادہ کیا مگر پھر جیسے جگا کے اندر سے کسی نے کہا ہٹ جاؤ! جلدی سے ہٹ جاؤ اور پھر جگت نے جلدی سے لڑکے کو راستے سے دور دھکیل دیا اور جسم کو سمیٹ لیا۔ اسی لمحے جیب سرسراتی ہوئی قریب سے گزر گئی مگر کہنی کے قریب کرتے ہی آستین پھٹ گئی۔ کئی لوگ چیخے بھی۔ ”ارے کیا ہوا؟ بے چارہ ذرا سا بچ گیا۔“ پھر کچھ دور بیک کی آواز کے ساتھ جیب رکنی پھٹی ہوئی آستین پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جگا کا دماغ قابو سے باہر ہو گیا۔ اس نے پولیس جیب کو گھورا اور دانت چرس لیے۔ گالی دینے کے لیے زبان میں پلچل سی ہونے لگی مگر ست پال اس سے چمٹ گیا۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”باپو! تمہیں چوٹ تو نہیں لگی؟“

منے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جگت کے دوسرے ہاتھ کی تھکی ڈھیلی پڑ گئی۔ ست پال ساتھ نہ ہوتا تو وہ اس طرح کھڑا نہ رہتا بلکہ جیب کے ذرا نیور کی گردن پکڑ کر دو تین پھینر ضرور لگا دیتا۔ ابھی ارادہ ملتوی نہیں ہوا تھا کہ گھڑی ہوئی جیب سے افسر نائپ کا ایک آ دی دکھائی دیا۔ وہ آ دی قریب آتا ہوا تھا زماؤں گا۔ جگا سوچ رہا تھا مگر وہ بیٹھا بیٹھا ہونٹ چپا رہا تھا۔ شاید جگا کے مزاج کا اندازہ کر رہا تھا۔ آٹھ دس آ دی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ دھیسے لہجے میں ایک

ہوئی گاڑی کے ساتھ پلیٹ فارم پر چلتے ہوئے اس نے پیار بھری نکتی سے پوچھا۔ ”بتاؤ! اس بار لڑکا ہوگا یا لڑکی؟“ وہ دوسروں کی موجودگی بھول کر پوچھنے لگا۔ گاڑی تیز ہو رہی تھی۔

”جو بھی ہو.....“ چندن کو نے کھڑکی سے جھانک کر کہا۔ ”تمہیں تمہارے آنے والے بچے کی قسم دے کر کہتی ہوں کہ سیدھے جیل پہنچ جانا۔“ چندن گوری آواز دور ہوتی گئی اور گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ گئی۔ جگت کافی دیر تک نظروں سے اوجھل ہوئی گاڑی کو دیکھتا رہا۔



”جگا آیا..... جگا آیا.....“ جگت جیل کے دروازے میں داخل ہوا اور قیدیوں نے شور مچا دیا۔ وہ مسرت سے چیخ رہے تھے۔ سلامت واپس آ گیا۔ جگا روز جیل میں حاضری دینے آتا تھا اس کے باوجود آج وہ پیرول سے لوٹا تھا اس کی خوشی سب سے اٹھتی تھی۔ کبھی قیدیوں نے سوچا کہ بھگوان نے ان کی دعا سن لی ہے۔ جگت کے نقش قدم پر چل کر کبھی ہمارے قدم بھی جیل سے باہر جائیں گے۔

”باہر کس بات کا شور ہے؟“ مہبتا نے سر اٹھا کر پوچھا۔ ”صاحب! جگا آ گیا ہے۔“ ابھی میٹ نے اپنے الفاظ مکمل ہی کیے تھے کہ جگت نے آفس میں قدم رکھا۔ سو پر مہبتا کے چہرے پر حیرت ابھرائی۔

”جگا.....!“ ان کی آواز پیار سے بھیک گئی۔ وہ کچھ رکے پھر بولے۔ ”تم آگئے؟ شام کی بجائے صبح ہی آگئے؟“ سو پر کھڑے ہو کر میڈ کی دوسری جانب آگئے۔ جگت مسرت بھرے انداز میں اندر آ کر جھکے جا رہا تھا مگر مہبتا نے اس کے بازو تھام کر کہا۔

”نہیں جگا! آج تو تم سے بغل گیر ہونا ہے۔“ ایک دبلا پتلا اور دوسرا کیم کیم۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ یہ دیکھ کر دوسروں کے دل بھر آئے۔ ”تین ماہ مختصر رہے کیوں؟“ سو پر نے مزاج پر سی میں پوچھا۔

”نہیں صاحب! بھاری پڑ گئے۔“ جگت سنجیدہ ہو گیا۔ ”یہی وجہ ہے کہ بارہ گھنٹے پہلے ہی آ گیا۔ باہر کی دنیا

”ہم ایسا کریں گے شام کی بجائے صبح جیل لوٹ جاؤں گا۔ تمہاری گاڑی روانہ ہو اس کے بعد اسٹیشن سے سیدھا مہبتا کے پاس چلا جاؤں گا۔ اب تو مطمئن ہو؟“ جواب میں چندن صرف مسکرا دی۔ اسٹیشن سے جیل تک کا راستہ بھی اسے لمبا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے سارے راستے فکر رہے گی۔ اس نے یہ بات جگت کو نہ بتائی۔

زندگی میں پہلی بار تین ماہ تک کھلے عام ساتھ رہنے کے بعد دونوں جدا ہو رہے تھے۔ گاڑی کی روانگی میں چندرہ منٹ کی دیر تھی۔ ست پال کو اب باپو سے محبت ہو گئی تھی۔

”باپو! تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“ وہ کئی بار کہہ چکا تھا۔ چندن خاموش رہی تھی پھر بھی اس کی آنکھیں جگت کو مشورہ دے رہی تھیں۔ ”سنجیدگی سے جیل پہنچ جانا! آخری ڈیڑھ ماہ سے ایک خاص بات اس کی زبان پر آ کر لوٹ جاتی تھی۔ ابھی کہے یا نہیں؟ اس الجھن میں تھی۔

”پہنچ کر فوراً خط تحریر کرنا۔“ جگت نے اسے پانچویں بار کہا تب چندن بولی۔

”اس سے پہلے آپ جیل پہنچنے کا تاہر دیں گے۔ مگر جاتے ہی مجھے خوشخبری سننی ہے۔“

دونوں کی نظریں بار بار ٹکرا کر لوٹ جاتی تھیں۔ سیٹی بجی تو جگت نے چندن کو رکھا ہاتھ دبا کر کہا۔

”ست پال کا خیال رکھنا۔“ چندن کی آنکھیں بھیک گئیں۔ وہ جی بھر کر جگت کو دیکھ لینا چاہتی تھی۔ کہیں آنسو درمیان میں نہ آ جائیں اس لیے اس نے جلدی سے آنکھیں خشک کر دیں پھر اس نے بمشکل کہا۔

”اب اکیلے ست پال کا نہیں تمہارے دوسرے بچے کا بھی خیال رکھنا ہے.....“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ شرم سے نیچے دیکھنے لگی۔

”اچھا.....؟“ جگت چونک پڑا۔ جوش سے اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ پلیٹ فارم سے بوٹی میں جا کر چندن کو پیار کرے۔

”تم نے آج تک مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ حرکت کرتی

”یار! مجھے کہاں گھر جانے کی جلدی ہے؟“ جیسا میری سمجھ میں آتا کہہ دیتا۔ ”یہاں مزے ہیں۔ تم سب کو چھوڑنے کے خیال سے دل گھبراتا ہے۔“ مگر سچا سٹکھ میرا دل سمجھ گیا۔ کبھی میں تنہائی میں بیٹھا خیالوں کی وادی میں گھوم رہا ہوتا تو وہ مجھے ٹوکتا۔

”جگا! گھر یا نا رہا ہے؟ سچ کہنا! بھابھی سے جدا ہوتے وقت تمہیں دکھ ہوا تھا؟“

”گھر کسے یاد آئے گا؟“ میں نے ٹالنے والا جواب دیا۔ ”جدا ہوتے وقت مجھ سے زیادہ چندن کو دکھ ہوا تھا۔“

”سچ بات تو یہ تھی کہ میں زیادہ تر ویرو کے خیال میں گم رہتا تھا۔ بیروں کے تین ماہ میں ایک بار بھی اسے ملنے کی سوچ دھوکا ثابت ہوئی اس کا بہت صدمہ تھا۔ چندن کو فیروز پور رخصت کرنے کے بعد پہلا خیال میرے ذہن میں

بہی آیا تھا کہ میں چپ چاپ لدھیانہ چکر لگاؤں۔ ویرو کو تلاش کروں۔ تب یہ سوال نہیں تھا کہ ویرو کا میرے پاس پتہ نہیں ہے۔ پورے بارہ گھنٹے ہاتھ میں تھے پھر ملنے کی

ترپ کیسی ہے؟ محبوب سے ملاپ کے لیے دل ترستا تو دل میں انگارے سے بھر جاتے ہیں اور مصیبتوں سے انسان

جان بچانے لگتا ہے مگر چندن کو نے اسٹیشن سے سیدھے جیل جانے کی قسم دے کر میرے بیروں کا ہاتھ دیئے تھے۔

لدھیانہ جا کر ویرو کو پتہ نہیں؟ ملاپ ہوتا تو خون خرابہ کیے بغیر لوٹا یا نہیں؟ ارے پھر واپس ہی کیوں آتا؟ ممکن ہے کہ

چندن کو اس خطرے کو پہچان لیں ہو۔ میرے ساتھ کم رہنے کے باوجود وہ میری رگ رگ سے واقف تھی۔ سو پر مہتا سے

ملنے جاتا مگر کبھی یہ معلوم نہیں کیا کہ میری رہائی کا کیا ہوا؟“

پھر بھی وہ خود کہتے۔ ”جگا! بات آگے بڑھ رہی ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

”صاحب! آپ دل پر زیادہ بوجھ نہ رکھیں۔“ میں ان کا اور اپنا دل سمجھانے کے لیے کہتا۔ ”آپ کی مہربانی سے مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔ باہر تین ماہ میں پریشان ہو گیا تھا۔“

”سکھ دکھ کی بات نہیں ہے جگا!“ وہ جوش میں کہتے۔

مجھے بڑی جیل دکھائی دی۔ وہاں مجھ سے جیسا کوئی سو پر نظر نہ آیا اس لیے میں بور ہو گیا تھا۔ آج ایسا لگ رہا ہے جیسے چھٹکارا ملا ہو۔

”ایسا نہ کہو جگا؟“ سو پر نے پیٹھ تھپک کر کہا۔ ”تمہیں ہمیشہ کے لیے جیل سے رخصت کروں گا تو صحیح آزادی سمجھوں گا۔“

جگت ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس انسان کو کہی گئی ہے؟ مگر ہمیشہ کی رہائی کی بات اسے خواب ہی نظر آتی۔ جس کا ماشی خون سے رنگا ہوا ایسے قیدی کو حکومت کیسے رہا کر دے گی؟

”جگا! ایک چیز بھول گیا۔“ یہ کہہ کر مہتا نے الماری کھولی۔ جگت تجسس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مہتا نے

الماری میں سے بڑا سا رکالہ لیا۔ ”تم امتحان میں کامیاب ہو گئے ہو اس کی خوشی میں تم کو یہ ساڑھے رہے ہوں۔“ جگت نے ساڑھے ہاتھ میں اٹھالیا۔ اس پر جگت کی اٹلی پڑتی ہی اس کے تاروں سے ایک بیٹھا سا سر نکلا۔ جگا کو ایسا محسوس

ہوا جیسے وہ مہتا کے نرم دل کی آواز ہو۔

”تمہاری رہائی کا حکم آئے تب تک اس پر ہاتھ بھانڈو قدرت نے تم کو پیاری آواز دی ہے۔ یہ آواز سارے ملک اور پوری دنیا میں پھیلے یہی میری خواہش ہے۔ یہ خواہش پوری کرنی ہے یا نہیں؟ تمہارے اختیار میں ہے۔“

جگت کے پاس ان کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ان اس نے اپنی ذات سے سوال کیا۔

”جس ہاتھ نے آج تک رائفل اٹھائی ہے اس ہاتھ میں ساڑھے کر باہر نکلا تو میں کیسا دکھائی دوں گا۔“

اب کچھ واقعات خود جگا کی رہائی سے!

”بیروں کی میعاد پوری کر کے جیل میں آنے کے چار پانچ ماہ تک میں نے ایسی الجھن میں گزارے کہ آج ان کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی آتی ہے۔“

”کیوں جگا۔۔۔ کب گھر جاؤ گے؟“ تقریباً دو چار قیدی ہر روز یہ سوال کرتے۔



زندگی پر بھی ایک گیت گایا۔ جب قیدیوں کو سنایا تو وہ سب حیران رہ گئے۔ کسی نے ٹوکا بھی کہ ایسے جوش والا باہر نکل کر سکون سے نہیں رہ سکتے گا۔ جیل واپس آئے گا۔



دن گزرتے رہے۔ ”بس اب تھوڑے دن باقی ہیں۔“ بار بار یہی سننے کو ملتا۔ سو پر مہتا اپنی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی حالت سے پتہ چلتا کہ میری رہائی کرائے بغیر انہیں چین نہیں آئے گا۔ زندگی میں قدرت کی بڑی مہربانی رہی ہے کہ جو بھی ملا اسے میں نے بھرپور پیار دیا۔ نہیں تو یہ مہتا کو مجھ سے کیا لینا دینا ہے؟ نہ کوئی رشتے داری نہ کوئی قربت رہی ہے پھر بھی میرے جیسے بدنام آدمی کے لیے اتنی جدوجہد کیوں کر رہے ہیں؟

ایک دن گیت گارہا تھا۔ ساز کے تار پر انگلیاں گھوم رہی تھیں۔ آواز بلند کرتا گیا اسی لمحے کسی کی کھٹکتی ہوئی بیڑی کی آواز کان سے نکلئی۔ گیت پورا ہونے تک خاموش کھڑا رہا۔ اچانک نظر اٹھی تو چونک پڑا۔

”کون چتا..... کب آیا؟“ میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ اتنا زور ہو گیا کہ بہت دیر تک بول نہ سکا۔ اس کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔

”باباجی!“ اتنا کہہ کر وہ سسکیوں کے ساتھ رونے لگا۔ میں سمجھ گیا نیل کی تنہائی نے اس کی جوانی کے جوش کو ختم کر دیا ہے۔

”اچھا ہوا تم آ گئے۔ یہاں سو پر مہتا تمہیں سنبھال لیں گے۔“

”افسوس! کہ میں دیر سے آیا۔ تم تو اب رہا ہو جاؤ گے۔“ اس نے جلدی سے آنسو صاف کر لیے۔ تمہاری زندگی بدل گئی ہے۔“

”تمہاری زندگی بھی بدل جائے گی۔“ میں نے اسے اطمینان دلایا۔ ”یہی وجہ ہے کہ میں نے تمہاری بدلی یہاں کرائی ہے۔“ پھر بات بدلنے کے لیے پوچھا۔ ”تمہاری ماں کیسی ہے؟“

”پتہ نہیں..... وہ نیچے دیکھ کر بولا۔“

”جیل آ خر جیل ہے۔ ذمہ داریوں سے آدمی بے فکر ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی سچا سچ نہیں ہے اس لیے کہتا ہوں کہ میں تم کو گھر رخصت کرنا چاہتا ہوں۔“

”گھر..... صاحب میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“ میری اس بات پر وہ ناراض ہو جاتے۔

”جگا! ابھی تمہارے دل میں ماں باپ کی طرف سے ناراضگی کم نہیں ہوئی ہے؟ کیوں جھوٹی ضد پڑا ہے ہوئے ہو؟ تمہارا گھر ہے ماں باپ ہیں کھیتی باڑی ہے بیوی بچہ ہے سب کچھ ہے تم پرانے کو اپنا کر لیتے ہو اپنوں کو کیوں پرانے کہتے ہو؟“

”یہ ضد نہیں! آن کی بات ہے۔ ویرو کی بات پر میں نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ اب ویرو کو لیے بغیر گھر نہیں جاؤں گا۔ اگر جاؤں گا پھر بھی گھر کے فرد کی طرح نہیں مہمان کی طرح رہوں گا۔“

مہتا ٹھنڈی سانس بھرتے۔ جب بھی ویرو کی بات چھیڑتا وہ پراسرار طور پر خاموش ہو جاتے مگر ان کی آنکھیں جیسے کسی سوچ میں ڈوب جاتیں۔ میں سوچتا کہ وہ ضرور ویرو کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔

”جدائی میں بھی ایک طاقت ہے جگا۔ وہ سنجیدہ ہو کر کہتے۔“ پیار میں مایوس ہونے والا فنکار اپنے فن کے ذریعے اپنے درد کا اظہار کرتا ہے۔ خون خرابے سے نہیں۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دوں وہ فوراً بول اٹھتے۔ ”تم یہاں ہو اس دوران کچھ گیت کہہ لو! تمہاری آواز میں تمہارے گیت میں لوگوں کو سناؤں گا۔“

”لوگوں کو یا قیدیوں کو؟“ میں شک ظاہر کرتا۔ وہ پر یقین لہجے میں جواب دیتے۔ ”پہلے قیدیوں کو اور پھر لوگوں کو سناؤں گا۔ اتنا یاد رکھنا کہ وقت بڑا منصف ہے۔“

میں ان کا مطلب نہیں سمجھ سکا اور ویرو کی یاد میں پیار کے گیت کہنے لگا۔ بیٹھا ہوا ساز بجایا کرتا اور گاتا رہتا۔ سچا سنگھ کی صحبت میں کتاب پڑھتا بھی ہوتا۔ گرونا تک کی سوانح عمری نے مجھ میں ایسا جوش پیدا کیا کہ میں نے ان کی

”تم سے ملنے نہیں آتی؟“

”میں نے ملنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ اپنے ساتھ پنا سنگھ کالز کا لے کر آئی ہے جو مجھے کھٹکتا ہے۔“ چنا کے چہرے پر نفرت پھیل گئی۔ میں نے بات سمیٹ لی۔

”آخروہ تمہاری ماں ہے۔ جب تک میں ہوں تب تک ایک بار اسے ملنے کے لیے بلاؤ! تمہاری بجائے میں بات کروں گا۔“ اس نے اختلاف نہیں کیا۔ چنانچہ ایک ایسا تھا جس نے آخر دم تک میرا ساتھ دیا تھا۔ میری خاطر وہ اپنی زندگی برباد کرتے ہوئے بھی نہیں ہچکچایا۔ ابھی اسے دس سال گزارنے تھے۔ دس سال میں اس کی جوانی دم توڑ دے گی مگر میں لاچار تھا پھر بھی دل میں خیال آیا کہ باہر نکل کر اس کے لیے کچھ کروں گا۔

”جگا! تمہاری رہائی کا حکم آ گیا ہے۔“ سو رہتا نے اپنے آفس میں بلا کر خبر دی تو جیسے زمین کی گردش ٹھم گئی۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔

مہتا نے میری پٹہ تھپک کر کہا۔ ”میں نہ بہتا تھا کہ تم کو رہا کرائے بغیر نہیں رہوں گا۔ نو بہ خط پڑھ لو۔“ کرز تے ہاتھوں سے میں نے خط لیا۔ مگر لکھائی سمجھ میں نہیں آئی مگر میں نے ان کے چہرے سے پڑھ لیا کہ وہ جیت گئے ہیں۔

”آج تک میں نے کسی کا احسان نہیں لیا تھا۔۔۔۔۔ مگر آپ کے احسان کا بدلہ چکانے کے لیے مجھے دوسرا جہنم لینا پڑے گا“ میں اتنا ہی کہہ سکا۔

”ارے پاگل! تمہارا دوسرا جہنم بہت پہلے ہو چکا ہے۔“ مہتا نے ہنس کر میرا ہاتھ تھاما۔ ”جب سے تمہارے ہاتھ میں رائفل کی جگہ ساز دیا ہے اس وقت سے۔“ میں نے پیار بھرے انداز میں ان کا ہاتھ دبایا۔ آئیوؤں پر بمشکل قابو کیا۔ مہتا کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔

”جگا! ابھی تم کو ایک جمیل اور جھیلنی ہے۔“ میں چونک پڑا۔ وہ ہنس دیئے۔ ”صرف ایک یا دو دن کے لیے وزیر اعلیٰ پنجاب پھر صاحب جاندھر جانے والے ہیں۔ وہاں سے تمہاری رہائی ہوگی۔“

”اور آپ؟“

”ہم تو کل صبح ہی جدا ہو جائیں گے۔ میں جاندھر نہیں آسکوں گا۔“ ان کی آواز بھاری ہو گئی۔ ”جاؤ تم تیاری کرو۔ آج رات تمہارے گیت جی بھر کر سننے ہیں۔ پھر کسے پڑے تم کب ملو گے اور ملو گے تو۔۔۔۔۔“

”تو مجھے بھول نہیں گئے ہو گے۔“ میں درمیان میں بول اٹھا۔ ”میں بدنام ضرور ہوں بے ایمان نہیں۔“

”ارے پھر غصے ہو گئے؟“ مہتا نے مذاق کیا۔ ”جاؤ تیاری کرو۔“

چند لمحے ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے پھر میں جوش میں دوڑا۔ میں اس طرح دوڑ رہا تھا جیسے جیل کے دروازے کھل گئے ہوں اور میں ابھی باہر نکل جاؤں گا۔ جیل سے رخصت کرنے والی آنکھیں آج بھی میری نظروں میں گھومتی ہیں۔۔۔۔۔ سچا سنگھ کی بھوری آنکھیں چنا کی آنسو بھری آنکھیں مہتا کی رحمہ آمیز آنکھیں قیدیوں کی تجسس بھری آنکھیں اور کچھ کینہ توڑ آنکھیں۔ اس طرح میں جیل سے باہر نکلا تو حیرت سے شکوک سے احترام سے خوف سے یا زنی سے دیکھتی ہوئی ہزاروں آنکھوں کا مجھے سامنا کرنا پڑا۔ وزیر اعلیٰ نے مجھے باجے گاجے سے جاندھر شہر میں بلایا۔ باروں کے وزن سے میری گردن جھک گئی تھی۔ میری سماعت سے کتنے الفاظ ٹکرائے۔

”دیکھو۔۔۔۔۔ یہ ہے جگا! کوئی قتل کئے کئی ڈاکے ڈالے اب سدھر گیا ہے۔ جیل سے رہا ہو گیا ہے جیسے جنگ فتح کر کے آیا ہو اس طرح اسے ہار پہنائے جا رہے ہیں۔ کسے پتہ کل کیا کر بیٹھے گا؟ ڈاکو! خرو! کو ہوتا ہے۔“ پھر سارا شور ختم ہو گیا۔ میں تنہا ہو گیا جو کچھ ہو گیا ایک خواب معلوم ہوتا تھا۔ کچھ دیر تو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ میں ایک بے آسرا چھوٹا سا بچہ تھا جس کے ہاتھ میں ایک ساز دے کروٹیا میں دھکیل دیا گیا ہے۔ جاؤ! اس کے بل پر زندگی گزارو۔ جاندھر جیل کے دروازے کھلے تو وزیر اعلیٰ پھر نے کہا تھا۔

”تم کو حکومت کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنا ہے۔ کرو گے؟“ میں نے اقرار کر لیا۔ سو پر مہتانے رخصت کرتے وقت مشورہ دیا تھا۔

”جگا جیل سے باہر بھی اگر کوئی زنجیر پہننی پڑے تو اس کے لیے تیار رہنا اسی لیے شاید جیل سے باہر آنے سے پہلے ہی ملازمت کی زنجیر میں جکڑ لیا گیا تھا۔

گھر سونچا اس قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہ گھر جہاں ست پال کا بچپن گزرا ماں اور باپ کا بڑھاپا کتنا چندن کی جدائی نے آہیں بھریں۔ وہ گھر دور سے دکھائی دیا اور حیرت زدہ کرنے لگے۔ دل وہاں پہنچنے کی جلدی کر رہا تھا مگر ذہن روکنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ”مگر کیوں؟ میرے باپ میرے دشمن نہیں تھے۔ ہمیشہ میری بھلائی چاہتے پھر بھی دل سے کدورت کیوں نہیں جانی؟ جانندھریل میں جانے سے بلے فیروز پور سے مہتانے گھر چھ لکھ کر بتا دیا تھا کہ تمہارا بیٹا ہمیشہ کے لیے جیل سے رہا ہو کر گھر آ رہا ہے۔ کھویا ہوا بیٹا دو دن میں تمہیں واپس مل جائے گا پھر خط میں آخری جملہ لکھا تھا۔ مجھے لینے کوئی نئے میں سب سے

ملنے خود آ جاؤں گا۔ میں ایک دم پہنچ کر سب کو چونکا دینا چاہتا تھا۔ سورج ڈھل رہا تھا۔ چمچی گھونسوں کی جانب بڑھ رہے تھے۔ درخت پر چڑیاں چیمیں چیمیں کر کے ان کا استقبال کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر مست پال مسرت سے چیخ اٹھے گا۔

میں چپ چاپ گھر میں داخل ہوا مگر اسی لمحے چیخ سنائی دی۔

”آگئے... آگئے... آگئے...“ ایک ساتھ مختلف آوازوں کا شور مچ گیا۔ میں بھینپ گیا۔ چوری چھپے جانا تھا اس کی بجائے کھل کر آ گیا پھر دوڑا ہاتھ پھیلا کر بڑی بڑی جست بھرنا ہوا سامنے کھڑے ہوئے سب کو ایک ساتھ ہانہوں میں بھر لینے کے لیے۔

سامنے سے چھوٹا ست پال۔ ”باپو... باپو“ کی چیخ مارتا ہوا منھیاں کس کس کا کھین بند کیے دوڑا آ رہا تھا۔ اس کو میں نے اٹھالیا ماں باپ اور چندن کور کی مسرت کا اظہار ان

کے چہروں سے ہو رہا تھا۔

”آپا میرا بیٹا۔“ ماں پاگل کی طرح لپٹ گئی۔ بہت دیر تک روٹی رہی۔ سینے اور پشت پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ ”بھگوان نے آخر ہماری جانب دیکھ لیا۔“ پھر آنسو خشک کرتے ہوئے چندن کو کہنے لگی۔ ”کھڑی کیا ہو بہو؟ میرے بیٹے کے سر پر سے لیموں اتار۔ اب کسی کی نظر نہ لگے۔“

میں اپنے باپ کے قدموں میں گر گیا۔ انہوں نے پیار سے مجھے سینے سے لگا یا پھر چندن کی طرف دیکھا۔ شرماس نے سر جھکا لیا۔ اس کے رخساروں پر ہستے ہوئے آنسو اس کی مسرت کا اعلان کر رہے تھے۔

”ماں... اب کیوں رو رہی ہو؟ باپ تو آ گئے۔ اب ہمیں چھوڑ کر تیس تیس جا میں گئے۔“ میری بجائے ست پال نے چندن کو کہے رخسار پر ہاتھ پھیر کر لاد سے کہا۔ اس کی پتلی انگلیوں پر لگے ہوئے چندن کتا آنسو چومنے کے لیے میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔



”میں کل شام کی گاڑی سے چلا جاؤں گا۔“ رات کو سونے سے پہلے میں نے دھماکا کیا۔ ماں اور باپ سنانے میں آ گئے۔ ”چندن اور ست پال کو بھی ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

”کہاں لے جاؤ گے؟“ باپو نے پتکچاتے ہوئے پوچھا۔ ماں کی آنکھوں سے روشنی اُڑنی۔ چندن کا چہرہ دھبکا پڑ گیا۔

”میں تم سب سے ملنے آیا ہوں۔“ میں کسی جانب دیکھے بغیر بولا۔ ”اب کام دھندے سے لگ جانا پڑے گا۔“ ”کام دھندہ؟“ باپو نے بھاری لہجے میں پوچھا۔ ”یہ کھیتی باڑی تمہاری ہے۔ کہاں تک بوزھے سے محنت کراؤ گے؟“

”میرا کچھ نہیں ہے باپو؟“ میں غصے اور چاہت سے بولا۔ ”میں اس گھر کا ایک مہمان ہوں۔“

”پھر زمین جائیداد کو میں گئے سے لگا کر پھروں گا؟“

”دونوں کی۔“ جگانے جواب دیا۔ چندن کو سوچنے لگی کہ جگت کو اس طرح تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر وہ پھر پڑی سے اتر گیا تو چندن کے ہاتھ سے چلا جائے گا۔ اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا پھر جگانے سے مخاطب ہوئی۔

”پھر تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ لدھیانہ میں میری خالہ کی لڑکی رہتی ہے اسے زچگی کے وقت بلاؤں گی۔ مگر تم نے کوٹھری لے لی ہے یا اسی طرح چل پڑے ہو؟“

”نہیں چندن! میں بے منزل مسافر ہوں۔ جہاں راستہ لے جائے گا چلا جاؤں گا۔ جہاں گھر مل جائے گا رہ لوں گا۔“ پھر اس نے جیب سے پیسے نکال کر دکھائے۔ ”دیکھو! یہ ساٹھ روپے جیل کی کمائی پر گزارہ کرتا ہے۔“ چندن نے روپے گن کر دیکھے۔ ”انٹھ ہیں۔“ کہہ کر مچی ہوئی آنکھوں سے پوچھا۔ ”تج کہنا کتنے خرچ کر دیئے؟“ جگت مسکرایا۔ اس نے سوچا چندن گھر بسانے سے پہلے ہی حساب کتاب پوچھنے لگی۔

”سنو! جب جیل سے رہا ہوا تھا تو اکاؤنٹ نے پچاس روپے اور کچھ کھلے پیسے دیئے تھے۔ پندرہ روپے کی ٹی پانچ دس روپے کا کھانا کھایا۔ دو دن لیٹ آتا تو سب خرچ ہو جاتے۔“ چندن نے دوپے کے آنچل میں روپے باندھ لیے۔

”اب تمہیں کمانا اور مجھے خرچ کرنا ہے۔ بتاؤ کب سے ملازمت پر لگ رہے ہو؟“

”پہلے لدھیانہ پہنچنے دو۔ گھر تلاش کر کے۔“ منہیں گئے تو پھر ملازمت کے لیے سوچا جائے گا۔“ چندن حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ساٹھ روپے کی رقم میں یہ شخص آرام سے رہنے کی بات کر رہا ہے؟ گھر کس طرح چلتا ہے اسے کیا خبر؟

”گھر چلانے کی فکر مجھ پر چھوڑ دو۔“ چندن نے کہا۔ ”چھ دن بہن کے ہاں رہیں گے۔ اس وقت تک ملازمت پتی کرو۔ تنخواہ مٹی ملے گی؟“ چندن نے ادا سے پوچھا۔

باپو کچھ سخت ہوئے۔ ”جانے سے پہلے اپنے ہاتھوں فروخت کر دو! پیسے آئیں وہ لے کر ہم سب ساتھ چل دیتے ہیں۔“

”یہ بھی نہ ہو سکے گا باپو۔“ ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میں رک گیا۔ ”میرا کوئی بھروسہ نہیں۔ ملازمت صرف نام کی ملی ہے۔ ورنہ مجھے باہر رز پادہ جھٹکنے پڑے گا۔“ ”ملازمت.....!“ ماں اب چیخ پڑی۔ ”تمہیں ملازمت کرنی ہے؟ ہمارا بڑھاپا شرماتا ہے۔ جگت! تم کس جرم کی نہیں سزا دے رہے ہو؟“ پھر وہ بول نہیں سکیں۔ رونے سے ان کا گھارندھ گیا۔

”مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے دو۔“ میں نے فیصلہ ظاہر کر دیا۔ ”تمہارا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے حق بھی نہیں ہے۔ ویسے تمہارا بیٹا ہوں یہ بھولا نہیں جاسکتا۔ اب میں اپنا گھر بساؤں گا۔ زمین جائیدادوں کا تب تم لوگوں کو ساتھ بلاؤں گا۔“

کوئی کچھ نہیں بولا۔ رات کو کوئی سو نہیں سکا۔ دوسرا سارا دن بھی سب نے اوپری دل سے گزارا۔ شام ہوتے وقت میں نے صرف اتنا کہا۔ ”یہاں سے لدھیانہ جا رہا ہوں۔ وہاں سے خط لکھوں گا۔“ ماں اور باپ نے چپ چاپ سن لیا۔ تب کہاں خبر تھی کہ ان کی آہوں سے بدلتی ہوئی زندگی میں کیسے سخت موڑ آئیں گے.....!



بسم پر موجود لباس میں گھر سے تو نکل گئے مگر جگت اور چندن نے یہ نہیں سوچا تھا کہ لدھیانہ جا کر کہاں رہیں گے؟ چندن کوئی یہ خواہش تھی کہ جگت تین چار ماہ باپ کے ساتھ رہے تو بہتر ہے۔ اس وقت تک وہ زچگی سے فارغ ہو جائے گی۔

”تم یہاں رہ جاؤ۔ مجھے تو جلدی ملازمت پر پہنچنا ہے۔“ جگانے بولا۔

”ملازمت کی یاد دہانی کی تلاش کرنے کی جلدی ہے؟“ چندن نے اس کے رخسار پر ہنسی دے کر کہا۔ جگت اس کا کان پز کر ہنسنے لگا۔

”یہ تو پوچھنا بھول گیا۔“ جگت اسحق کی طرح سر ہلا کر بولا۔ ”ہم ڈھائی آدمیوں کا گزارہ ہو جائے اتنی تنخواہ تو دے گا۔“

”جتنی بھی تنخواہ ملے اسی کے مطابق خرچ کریں گے۔“ چندن کور نے اطمینان دلایا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر دنیا داری بالکل نہیں جانتا۔ زیادہ تنخواہ کی بات کروں گی تو ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ ”مجھے کم پیسوں سے گھر چلانا آتا ہے۔“ چندن نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

”ارے..... آپ لوگ؟“ جگت اور ست پال کو دیکھ کر خالہ کی لڑکی سناٹے میں آ گئی۔ ”جی جی جیل سے رہا ہو گئے یہ خیر تو اخبارات میں پڑھی تھی لہذا مبارکباد دینے تمہارے گھر آنے والے تھے۔“ بچے کو گود سے اتار کر ساونت کور چندن سے گلے ملی پھر بہنوئی کے لیے فخر کا اظہار کیا۔

”اخبار میں تمہاری تصویر دیکھ کر تمہارے بھائی کی مسرت کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ جب میری بہن چندن کور کو بیانے آئے تھے اس وقت بھی تمہارا ایسا رعب نہیں تھا۔“ ساونت کور نے آخری الفاظ جگا کی طرف دیکھ کر کہے۔

”تب تو ڈاکو تھا..... خاموشی سے بیانے آیا تھا۔“ جگت نے لاشمی کو نے میں رکھ کر کہا۔ ”ملکہ کھان سنگھ گھر میں نہیں ہیں؟“

”نہیں..... گاڑی لے کر جانے ہو گئے ہیں۔“ ساونت کور کا شوہر انجن کا فائر مین تھا۔ چھوٹی لائن پر کام کر رہا تھا۔ صبح جاتا تو دوسرے دن واپس ہوتا تھا۔ ساونت کور کو پتہ نہیں تھا کہ یہ لوگ اس کے گھر مہمان بن کر آئے ہیں۔ ”ان سے خاص کام تھا؟“ ساونت کور نے پوچھا۔

جگت نے اس دوران دو چھوٹی کونٹریوں والے مکان میں نظر گھمائی۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہاں ان کا گزارہ ہو گا یا نہیں؟

”بہن! ہم تمہارے گھر مہمان ہو کر آئے ہیں۔ جب تک لدھیانہ میں کوئی مکان کرائے پر ملے اس وقت تک کے لیے ہم تمہارے مہمان ہیں۔“ چندن نے ساونت

سے کہا۔ ”ایسا؟“ ساونت کور کی آواز میں حیرت تھی۔ ”لدھیانہ میں رہو گے۔ میں کبھی جی جی جی ہم سے ملنے آئے ہیں۔ اچھا ہوا تم لوگ آ گئے۔ ہماری جھونپڑی تمہیں موافق نہیں آئے گی۔ ملازمت پیشہ آدمی کے گھر آرام کہاں؟“

”ہم بھی ملازم پیشہ ہیں۔“ چندن خفت سے بولی۔ ”ہماری ملازمت دو ایک دن میں پکی ہو جائے گی۔ اس وقت تک ارد گرد مکان مل جائے گا۔“ ساونت کور کو یقین نہیں آ رہا تھا عیش قارام سے بسر کرنے والے زمین جائیداد والے لوگ ملازمت کی بات کر رہے ہیں۔ مگر جگت کی موجودگی میں وہ کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی۔

جگا روپہر حکومت کے پبلک ڈیپارٹمنٹ کے دفتر پہنچا۔ وہ پبلک ریلیشن آفس کے کیمپ کے قریب رعب سے کھڑا ہو گیا۔ ”صاحب سے ملنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ دروازہ کھولنے جا رہا تھا اسی لمحے آفس بوائے نے اسے روک دیا۔

”اے ٹھہرو! تمہیں کس سے ملنا ہے؟ کیا نام ہے؟“ جگت نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ اس کی بات نے اسے غصہ دلایا۔ دوسرے سوالوں کا جواب دینے کی بجائے اس نے صرف نام بتانے پر اکتفا کیا۔

”جگت سنگھ جگا۔“ پھر پھر اس پر اثر نہیں ہوا تو بلندا واز میں بولا۔ ”جگا ڈاکو۔“ آفس بوائے سہمے ہوئے انداز میں غور سے دیکھنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ وہی جگا ہے جس کی تصویر اس نے اخبار میں دیکھی تھی۔ اسی لیے وہ نرم پڑ گیا تھا۔ اب وہ مودب نظر آنے لگا تھا۔

”ذرا ٹھہرو! میں صاحب کو بتاتا ہوں۔“ پھر اس نے ایک کانغہ جگا کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”اپنا نام صاحب کا نام اور کام لکھ دو۔“ جگت نے کانغہ لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تو وہ بولا۔ ”یہاں کا یہی اصول ہے جگا جی۔“

جگت ہنس دیا۔ اس نے سوچا مہتا سو پرچ کہتے تھے کہ باہر بھی بیڑیاں پہننی پڑتی ہیں۔ اصول کی بات جگت کو بیڑیوں کی زنجیر نظر آئی۔ مگر وہ ملازمت کرنے آیا تھا اس لیے رعب سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس نے نام پتہ اور

کام کاغذ پر لکھ دیا۔ آفس بوائے اندر چلا گیا۔ جگت سمجھا تھا کہ اسے بھی اندر بلا لیا جائے گا۔ مگر آفس بوائے نے آکر کہا۔

”بیٹھو! تھوڑی دیر کے بعد صاحب بلائیں گے۔“
جگت نے آس پاس دیکھا مگر بیٹھنے کے لیے جوتی تھی۔ وہ خالی نہیں تھی۔ اسے کھڑا رہنا پڑا۔ پون گھنٹہ بیت گیا پھر بھی باری نہ آئی۔ پیر تھکنے لگے۔ ایک دو بار خیال گزرا واپس چلا جائے۔ جنم میں جائے ملازمت، مگر چند دن کور کو کیا جواب دیتا؟ بڑے رعب سے باپ کا گھر چھوڑ کر چل پڑا تھا۔ ملازمت ملنے کا رعب بھی جمایا تھا۔ اب اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔
نقر یہاں سوا گھنٹے بعد آفس بوائے نے کہا۔ ”اب تمہاری باری ہے۔“

جگا موٹھپوں کو بل دیتا ہوا اندر گیا۔ اس نے جیب سے سفارشی خط نکال کر صاحب کی میز پر رکھا۔ پرکاش دیو نے اس کی جانب دیکھا پھر خط پڑھنے لگا۔ جگت کو اس وقت تک کھڑا رہنا پڑا۔ بیٹھنے کو کہنے کے لیے صاحب نے سات منٹ ضائع کیے۔
”ابھی میرے پاس آئیٹیل لیٹر نہیں آیا۔“ صاحب نے کسی قسم کے تاثر کا اظہار کیے بغیر کہا۔ ”دو دن کے بعد آنا۔“ جگت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کوئی کلرک فائل پر صاحب کے دستخط لینے آیا۔ صاحب مصروف ہو گیا اور جگا کو باہر آجانا پڑا۔

جگا بمشکل دو دن گزار کر پھر دفتر پہنچ گیا۔ اس بار ملاقات کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ صاحب نے فوراً بیٹھنے کو کہا مگر جواب اندازے سے مختلف تھا۔

”ابھی آؤ رٹرنس آیا۔ ایسے کام میں دیر لگتی ہے۔“ جگت ڈھیلا پڑ گیا۔ صاحب ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ ڈاکوؤں اور جیل کی زندگی کے لیے پوچھ گچھ گھر بار کے متعلق معلوم کیا پھر آہستہ سے بولے۔ ”تمہارے جیسے خاندانی شخص کے لیے گانے بجانے کی ملازمت اچھی نہیں۔ یہ تو چھوٹے لوگوں کا کام ہے۔“ جگت نے جواب

سجھ لو

۱۔ نہ اتنا بیٹھا بنوں کہ لوگ تمہیں نگل لیں، نہ اتنا کڑوا بنوں کہ لوگ تمہیں تھوک دیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی اتنی عبادت کرو جتنا تم اس کے محتاج ہو۔

۳۔ آخرت کی اتنی ہی تیاری کرنا جتنا تم نے وہاں جا کر رہنا ہے۔

۴۔ گناہوں پر اتنی جرأت کرنا جتنا جہنم کی آگ میں جلنے کا حوصلہ ہو۔

۵۔ جب کوئی گناہ کرنے کا ارادہ کرو تو پھر ایسی جگہ تلاش کرنا جہاں پر اللہ تعالیٰ نہ دیکھ سکے۔

یوسف رضا پرویز..... ذریعہ غازی خان

نہیں دیا تو صاحب نے دوسرا عذر پیش کیا۔ ”تجوواہ معمولی ہوتی ہے۔ ساتھ روپے میں گھر کا پورا بھی نہیں ہوتا۔“

ساتھ کا ہنڈ۔ جگت کو کھٹک گیا۔ پھر سوچنے لگا صاحب اس کی اتنی فکر کیوں کر رہا ہے؟ وزیر اعلیٰ جیسے بڑے آدمی نے اس سے ملازمت کی درخواست کی تھی اور وہ افسر اسے اتنی بات سمجھا رہا ہے۔ اس نے سنا تھا کہ رشوت دیئے بغیر سرکاری محکموں میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ اسے یہ صاحب ایسا دکھائی نہ دیا مگر پھر بھی اسے اس کی بات میں ایسی جھٹک محسوس ہوئی۔

”میں سمجھتا ہوں مجھے آؤ لینے کے لیے چند ہی گڑھ جانا پڑے گا۔“ جگت نے کھڑے ہو کر کہا۔ افسر سمجھا جگا اسے رعب میں لینا چاہتا ہے اس لیے صاف الفاظ میں بولا۔

”چند ہی گڑھ کیوں؟ دہلی جاؤ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔“ پھر ذرا نرم آواز میں بولا۔ ”وزیر صاحبان بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ بات کر کے بھول جاتے ہیں۔ ممکن ہے تمہیں اپنی پہچان کرانی پڑے تب انہیں یاد آئے کہ تم کون ہو؟“

اتارنے کی کوشش کر رہی ہو۔ جگت نے محسوس کیا وہ حلق پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

”ملازمت مل گئی ہے۔“ جگت نے ماحول کی اداسی دور کرنے کے لیے بات کی۔ ”دو دن بعد کام پر لگ جانا پڑے گا۔ پہلے مکان کرائے پر لیس گے۔“ چندن کے چہرے سے خوشی کا اظہار ہونے لگا۔ مگر آنکھیں گھومتی ہوئی گھر کے سامان کے تھیلوں پر جا کر رک گئیں۔ جگت کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

”ہمیں اسی وقت یہاں سے چلنا ہے۔“ مدھم مگر مضبوط آواز میں چندن بولی۔ ”تم آ جاؤ میں اسی کا انتظار کر رہی تھی۔“ سخت سے سخت باتیں برداشت کرنے والی چندن کو یہ کہہ رہی تھی۔ اس لیے جگت سمجھ گیا کہ بات حد سے بڑھ گئی ہے۔

”تم لوگوں نے کچھ کھلایا پیا یا نہیں؟“ جگت نے پوچھا۔

”کھانے پینے کو آگ لگ گئی۔“ چندن بمشکل آنسوؤں پر قابو پا کر بولی۔ ”یہ نادان بچہ دو گھنٹہ دودھ زیادہ پی گیا اس میں اس کی خالہ وہ باتیں تک کہہ گئی جو کہنے کی نہیں ہوتیں۔“ وہ کچھ دیر رکی۔ جگت کے چہرے پر جوش جھلکنے لگا۔ ”اس بار وہ کہہ چکی ہے کہ مہمان ہو کر پڑے ہیں تو کیا ہماری عزت لو گے؟“

جگت کا غصہ چڑھ گیا۔ ملکہان سنگھ گھر نہیں تھا۔ عورت سے لڑنا اچھی بات نہیں تھی۔ چندن کو رچا پائی سے اٹھ گئی۔ اس نے سوئے ہوئے ست پال کو گود میں اٹھایا۔ ”تم سامان کا تھیلا اٹھا لو آج کی رات کسی دھرم شالا میں گزار دیں گے۔“

جگت ابھمن میں پڑ گیا۔ اس طرف رات کے وقت گھر سے باہر نکلنے کا چندن کو فیصلہ کرنا پڑا اس کی وجہ سے اسے ساونت کور پر غصہ آیا۔ وہ اندر بیٹھ کر سب کچھ سننے کے باوجود بھی صرف رات بھر ٹھہرنے کے لیے نہیں کہہ رہی تھی۔ یہ بے عزتی جگت سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس نے جھٹکنے سے تھیلا اٹھایا اور دروازے کی جانب بڑھ کر

”اچھا.....“ جگت نے ہونٹ چبائے۔ ”میں چندنی گڑھ ہواؤں پھر پتہ چلے گا تمہیں آؤر لا کر ہی دکھاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ جوش میں باہر نکل گیا۔ جگا کو اپنے پیچھے صاحب کی ہنسی سنائی دی۔ جگت کو محسوس ہوا جیسے یہ ہنسی اس سے کہہ رہی ہو کہ بیڈا کا ڈالنے سے سامان کام نہیں ہے۔

چندنی گڑھ جا کر پنجاب کے وزیر اعلیٰ نسیم حسین لچر سے ملازمت کا آؤر لے کر جگت لوٹ رہا تھا تو بہت خوش تھا جیسے کوئی بہت بڑا ڈاکا ڈال کر آ رہا ہو۔ دنیا داری میں پڑنے کے بعد انسان معاشرتی پابندیاں بہر حال قبول کر لیتا ہے۔ اُریسا نہ ہوتا تو جگا ساٹھ روپے تنخواہ کس طرح قبول کر لیتا؟ جگت کو اپنی لیاقت ثابت کرنے کا پروانہ مل گیا تھا۔ جگت کو صرف آمدنی ہی کا خیال نہیں تھا بلکہ ویرو کا خیال بھی اب اسے پریشان کرنے لگا۔ کسے پتہ کہ اب تک ویرو لدھیانہ میں ہی ہوئی یا کسی اور گاؤں میں رہنے لگی ہوگی؟ پوچھ گچھ کرنے سے ویرو کا پتہ ملنا مشکل تھا۔ وہ سرکار کی پبلسٹی کے لیے گاؤں گاؤں گیت گاتا پھرے گا تو کبھی نہ کبھی ویرو سے بھی ٹکراؤ ہو جائے گا۔ وہ جیل سے باعزت طور پر رہا ہوا تھا اس کا پتہ ویرو کو چل گیا ہوگا۔ وہ سوچتا کہ اگر ایک بار ویرو مجھے مل گئی تو پھر میں اسے کبھی نظر سے دور نہیں ہونے دوں گا۔ اس کے لیے مجھے چاہے کچھ بھی قربانی دینی پڑے۔ ایسے ہی خواب دیکھتا ہوا ملازمت کی زنجیر پہن کر جگت لدھیانہ پہنچا۔

ملازمت پکلی ہو گئی۔ یہ جان کر چندن کو رکتی خوش ہوئی؟ مگر گھر میں قدم رکھتے ہی اسے لائین کے اجالے میں چندن کا اداس چہرہ نظر آیا تو جگت کی مسرت غائب ہو گئی۔ ساونت کور منہ بنائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ناراضگی تھی۔ چندن کے رخسار پر سوکھے ہوئے آنسوؤں کی لکیریں چغلی کھا رہی تھیں کہ دونوں بہنیں جھگڑا کر بیچی ہیں۔ اچھی طرح جھگڑا ہوا تھا۔ ست پال نیچے زمین پر سو گیا تھا۔ نیند میں بھی اس کی سسکیاں بند نہیں ہوتی تھیں۔ ساونت کور کھڑی ہو کر اندر چلی گئی۔ جگت نے چندن کی جانب دیکھا جیسے چندن حلق میں پھنسی ہوئی کسی چیز کو اندر

چندن سے بولا۔

کے شانے پر تھیلے کا بوجھ تھا پھر بھی اس نے کہا۔
”لاؤ چندن! میں دوسرے شانے پر ست پال
کو اٹھائے لیتا ہوں۔“ اسی لمحے سامنے سے ایک سائیکل
رکشا تا نظر آیا۔ جگت نے ہاتھ اٹھایا۔ جوش میں پیڈل
گھماتا ہوا رکشے والا آہستہ ہوا مگر اس نے دور ہی سے کہہ
دیا۔

”ابھی سواری نہیں لوں گا۔ میرے گھر کی طرف چلنا
ہے تو چلو۔“

”نہیں..... سرائے جانا ہے۔“ جگت نے نرم آواز میں
کہا۔ ”ساتھ میں چھوٹا بچہ اور سامان ہے۔ نہیں تو پیدل بھی
چلا جاتا۔“ رکشے والا اچھٹن میں پڑ گیا۔ پر نور سے
اندھیرے میں جگت کا چہرہ دیکھنے لگا۔ پچھہ دیر بعد وہ رکشے
سے اترتا ہوا چلیا۔

”ارے..... جگت سنگھ جگا۔“ جگت کو یہ آواز جانی پہچانی
لگی۔ وہ قریب گیا۔

”کون..... تاک سنگھ؟“ جگت بھی پر مسرت انداز
میں چینچا۔ منسبت کے وقت آکر کوئی جاننے والا مل جائے تو
خوش ہوتی ہے۔

”ارے یار یقین نہیں آ رہا۔ جیل کو لڑا دینے والا جگا
اس طرح مزدور بن کر تھملا اٹھائے نظر آئے۔ تھوڑے دن
پہلے ہی تو تمہاری تصویر اخبار میں شائع ہوئی تھی جس میں تم
ٹھاٹھ ہاتھ سے بار پٹنے نظر آ رہے تھے۔“ جگت جھینپ
گیا۔ تاک سنگھ نے شانے پر سے بوجھ اٹھایا۔ ”چلو
بھائی ارکشے میں بیٹھ جاؤ۔ بندہ نہیں جنت تک پہنچا دے
گا۔“ تاک فخریہ سٹیج میں بولا۔

”یار جنت تک نہیں! ہمیں سرائے تک جانا ہے۔“
جگت مذاق کے رنگ میں بولا۔ ”تمہاری بھانجی کے ایک
رشتے دار کے مہمان بنے تھے مگر بھی نہیں اس لیے کھڑے
کھڑے چل دیئے۔“ تاک سنگھ سوچ میں ڈوب گیا۔
جگت کو رکشے میں بٹھا کر اس نے پیڈل پر زور دیا۔

”ارے یار! تم بہت وزنی آدمی ہو۔“ تاک سنگھ کی
بات سن کر جگت اور چندن کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ اداسی

”چلو۔“ چندن کو رنے نکلنے میں دو منٹ دیر کر دی۔
دوپے کے نچل میں بندھی ہوئی رقم میں سے پانچ کانوٹ
نکال کر پالنے میں سوئی ہوئی ساونت کو رک کی لڑکی کی مٹھی میں
رکھ دیا۔ اب تک بمشکل بیگی ہوئی دس روپے کی رقم کے بل
پر وہ ڈھائی افراد گھر کی چوکھٹ سے نکل کھڑے ہوئے۔
ابھی چند قدم بڑھے ہوں گے کہ ساونت کو رنے پوری قوت
سے دروازے بند کر لیے۔ اس وقت جگت کا جی چاہا کہ

جا کر بند دروازے پر زور دارلات مار کر اسے اکھاڑ دے۔
مگر چندن ساتھ تھی جو بے عزت ہو کر بھی جاتے ہوئے
بہن کے بیچے کے ہاتھ میں پانچ روپے دینا نہیں بھولی
تھی۔ اس چندن کے ملامت کو صدمہ پہنچانے والا کام وہ
نہیں کر سکتا تھا۔ شدید سردی میں ایسا لگ رہا تھا جیسے اندھیرا
جم گیا ہو۔ لوگ سو رہے تھے۔ گھیاں سنسان تھیں۔ جگت اور
چندن محلے سے باہر آئے۔ بڑے راستے پر آ کر وہ لوگ
رک گئے۔ کہاں جانا ہے؟ اس سے وہ لاعلم تھے۔ سرائے کا
پتہ انہیں معلوم نہیں تھا۔ دونوں لاچار نظروں سے ایک
دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اب چندن کو محسوس کر رہی تھی
رات ساونت کو ر کے گھر میں گزارتے تو بہتر تھا۔ راستے
سے گزرتے ہوئے ایک شخص سے جگت نے پوچھا۔

”سردار جی! مزدور کون سا سرائے ہے؟“ وہ سکھانجانے
مسافروں کو دیکھنے لگا۔

”مزدور کون نہیں البتہ اسٹیشن پر ملے گی۔ اسٹیشن کی
جانب دو میل کے فاصلے پر۔“

دونوں نے قدم بڑھائے۔ ”ماں! مجھے سردی لگ رہی
ہے بھوک بھی لگی ہے۔“ بھوکا سویا ہوا ست پال خیند میں
بڑبڑایا۔ چندن اسے تھپکیاں دینے لگی۔

”بیٹا! کچھ دیر رک جاؤ۔“ جگت کے دل پر چوٹ سی
لگی۔ اس نے سوچا راستے میں کوئی ہوٹل ہو تو لڑکے کو کھانا
کھلا دیا جائے۔ دو فرلانگ مزید چل کر چندن ہانپنے
لگی۔ پیٹ میں بھی بچہ تھا اور گود میں بھی۔ اس طرح دو
بچوں کا بوجھ ایک ساتھ اٹھا کر چلنا بہت مشکل تھا۔ جگت

غائب ہوگئی۔ جگت کو اچانک خیال آیا کہ رکشا سٹیشن سے اتنی سمت جا رہا ہے۔

”ارے نائک! کدھر لے جا رہا ہے؟ سرائے تو اسٹیشن کے قریب ہے۔“ جگت اور چند دن نیچے اتر کر آس پاس دیکھنے لگے۔ انہیں سرائے کی عمارت نہیں نظر نہ آئی۔ وہاں ارد گرد کوئی ایسی بڑی عمارت نہیں تھی جس پر سرائے ہونے کا قیاس کیا جاسکتا۔ اتنی دیر میں نائک تھیرا اٹھا کر پہنچا۔

”میرے پیچھے چلے آؤ۔“ اس نے ایک کوٹھری کا دروازہ کھول کر تھیرا اندر رکھا اور چراغ جلایا۔ پھر جگت کی جانب مڑ کر بولا۔ ”یہ ہے بندے کی سرائے۔“ جگت سمجھ گیا نائک نے انہیں اپنا مہمان بنالیا ہے۔ وہ جیل کی دوستی بھولا نہیں تھا۔ چند دن کور نے ست پال کو چار پائی پر سلایا۔ اتنی مختصر کوٹھری تھی کہ اس میں دو آدمی بمشکل سو سکتے تھے۔ جگت نے سوچا کہ وہاں سب کس طرح سما سکیں گے؟

”کھڑے کیا ہو؟ چلو ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھالیں۔“ نائک سنگھ نے کھانے کا ڈبہ کھولا۔ چار پرانے اچار اور آدھا دھا گلاس دودھ تھا۔

”یار! تم کھاؤ۔ ہمیں بھوک نہیں ہے۔“ جگت نے تکلف کیا۔ مگر ست پال آنکھیں ملتا ہوا بولا۔

”پاپو مجھے بھوک لگی ہے۔“ دونوں شرمندہ ہو گئے۔ نائک غصے ہو گیا۔

”یار! دوست سے جھوٹا تکلف نہیں کرنا چاہیے۔ پیسے سے غریب ہوں مگر دل بڑا ہے۔ جو کچھ ہے بانٹ کر کھالیں گے۔“ ایک ایک پرانٹھائیں تین پیالے پانی سے سب نے پیٹ کی آگ بجھائی۔ اس رات جگت سوچ رہا تھا وہ اس کٹھن دنیا داری سے کب تک مقابلہ کر سکے گا؟

پانچ روپے مہینے کے سرائے والی کوٹھری مل گئی تو گھر چلانے کا بوجھ چند دن پر ڈال کر جگت ملازمت سے لگ گیا۔ مگر پہلے ہی دن کام پر جاتے ہوئے وہ چند دن سے کہنا نہیں بھولا۔

”تم باہر جاتے ہوئے ویرو کی تلاش نہ بھولنا۔ گردوارے بھی جاتی رہنا۔ وہاں ملاپ ہونے کی

امید ہے۔“

”ملے گی تو اس کوٹھری میں بند کروں گی۔ تم لوگوں سے تب تک جانے نہیں دوں گی۔“ چند دن کور نے مذاق میں جواب دیا۔ ”اپنی زچگی کا کام بھی اسی کے ہاتھ سے کرائیں گے۔“

جگت آہ بھر کر چلا گیا۔ اسے اندر ہی اندر ڈر تھا کہ ویرو اب کبھی نہیں ملے گی۔

جگانے گاؤں گاؤں بھٹکتا شروع کر دیا۔ سرکاری منصوبوں کی تعریفیں کرنا لوگوں کو جمع کرنا اور تماشے کر کے دوسرے گاؤں بھاگنا۔ پہلے لوگ پہلنی کے گانوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے مگر جگانے کو گیت گانے آیا ہے یہ سن کر دوڑ کر آئے۔ پہلے تماشے میں شور مچاتے جھگڑے کرتے مذاق اڑاتے مگر جگت کا رعب تھا یا اس کے ڈاکو ہونے کی دھاک کہ لوگ اب چپ چاپ سنتے تھے۔ آہستہ آہستہ جگت اپنے گیت شامل کرنے لگا۔ وہ ہر پروگرام کے آخر میں ویرو کے فراق میں گیت گانا نہیں بھولتا تھا۔ وہ عورتوں کی جانب نظر کر کے درد بھری آواز میں گاتا۔

میرے گیتوں میں تم ہو خیالوں میں تم میرے دل میں بھی تم ہو جوابوں میں تم

میری سانسوں میں تم میری آہوں میں تم چاہے مجھ سے دور ہو تم مگر ہونگا ہوں میں تم

گیت پورا ہونے کے بعد ہاتھ میں ساز تھام کر بہت دیر تک وہ انتظار میں کھڑا رہتا کہ عورتوں کی بھیڑ میں سے وہ دوڑی دوڑی آئے گی اور جواب دے گی۔ ”نہیں جگت سنگھ! میں دور نہیں واقعی تمہاری نگاہوں کے سامنے کھڑی ہوں۔ میں ہی تمہاری ویرو ہوں۔“ مگر اس کی بجائے ہمیشہ ایک بھاری آواز سنائی دیتی۔

”جگانے کھڑے ہوئے کیوں ہو؟ لوگ چلے گئے۔ اب کس کا دھیان کر رہے ہو؟“ تب اس کے دل کو دھکا سا لگتا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر گلے میں پہنے ہوئے تعویذ پر ہاتھ پھیر لیتا۔ تنخواہ کے ساتھ روپے میں سے تیس روپے جیب خرچ میں ضائع ہو جاتے باقی تیس وہ گھر بھیجتا جن

ملک کے مشہور لیڈروں کے سامنے ایک کے بعد ایک آئٹم پیش ہونے لگا۔ جگت کا نمبر بار ہواں تھا۔ فکر اور جوش میں وہ پردے کے پیچھے ٹبل رہا تھا۔ ساتھ ہی ہاتھ میں تھامی ہوئی لائٹی سے کھیل رہا تھا۔ گیارہواں آئٹم شروع ہوا تب جگت نے آنکھیں بند کر لیں۔ حلق میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ دو گھنٹ پانی پیا۔ اب اس کا نام لیا جائے گا۔ اس کے کان کھڑے ہوئے گھر دوسرے کا نام پکارا گیا۔ اس کا دماغ گرم ہو گیا۔ اس نے پروگرام کے منتظم سے فریاد کی۔ ”دوسرے جانے پہچانے آرٹسٹوں کو پہلا چانس دینا پڑا۔ دو چار آئٹم کے بعد تمہارا نام بھی پکارا جائے گا۔“ اس نے جواب دیا جگت نے ہونٹ چبائے۔ اس لا چاری کے لیے وہ کیوں یہاں آیا؟ اسے اپنی ذات پر غصا آیا۔ سب جگہ سفارش چلتی ہے۔ خوشامد سے کام ہوتا ہے۔ یہاں کچھ نہیں ہوگا۔ آخر سب لوہیں آئٹم میں اس کا نام پکارا گیا۔ صاف کے سرے کو بلند کرنا ہوا جگت سب کے سامنے پیش ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لائٹی تھی۔ اس نے دوسرا ہاتھ بلند کر کے اونچی آواز میں کسی پنوں کا فراقیہ گیت چھیڑا۔ اس کی آواز میں ویرو کا درد شامل تھا اور ساتھ ہی بے درد دنیا کے خلاف غصہ بھی۔

”یہ کون ہے؟“ ایک آواز سنائی دی۔ گیت پورا ہونے کے بعد خاموشی میں یہ بھاری آواز بھی۔ یہ پنجاب کا گٹر لیس کے صدر پر تاب سنگھ کیروں کی آواز تھی۔ ”اس کا ایک اور آئٹم ہونا چاہیے۔“

جگت گیت ختم کر کے ڈاکس کے پیچھے چلا گیا۔ منتظم نے آ کر اس کی پینہ ٹھونکی۔ ”پاپا جی! تم چھا گئے۔“ پھر آہستگی سے بولا۔ ”کیروں صاحب نے تمہارے دوسرے آئٹم کا مطالبہ کیا ہے۔“ جگت کن آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اب قیمتی بننے کا موقع تھا۔

”مجھے کچھ دیر آرام کرنا پڑے گا۔ پندرہ بیس منٹ جانے دو۔“

”بالکل..... آرام کر لو۔“ وہ اب ادب سے پیش آ رہا تھا۔ تمہارے لیے کچھ منگواؤں؟“

میں سے چند دن پچیس روپے گھر میں خرچ کر کے پانچ روپے بچائی۔ اس طرح دو مہینے گزر گئے۔ پھر چند دن نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ پڑوس میں رہنے والی عورت کو اس کی غریبی پر رحم آیا۔ لڑکی تیس دن کی ہوئی تو اس نے چند دن سے کہا۔

”بہن! تمہیں دودھ نہیں آتا اور بچی کو پالنے کی ہمت نہیں ہے۔ اسے مجھ سے دو کھانے پینے سے سکھی رہے گی۔“ چند دن سنانے میں آ گئی۔ بائے رے غریبی۔ پیٹ کا جنا دوسرے کو دینا پڑتا ہے۔ بھگوان نے ایسا دن دکھایا مگر پڑوس کا دل نہ دکھانے کی خاطر کہنے لگی۔

”بہن! بی اپنا نصیب ساتھ لاتی ہے کسے پتہ اس کے جنم سے ہماری غریبی دور ہو جائے۔“

سال بیت گیا۔ مگر غریبی نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ چند دن کو لیریا ہو گیا۔ پانچ پانچ کر کے بچائی ہوئی سو پچاس کی رقم بیماری کھا گئی۔ جگت ادا اس رہتا تھا۔ اسے چاروں جانب مایوسی اور ادا سی نظر آتی تھی۔ ماضی کی یاد اسے ستانی تب رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی۔ ویرو کی یاد میں دل بے چین ہو جاتا۔ ملازمت سے نفرت ہونے لگی۔ تنخواہ بڑھ کر بمشکل پچھتر تک پہنچی تھی۔ دوسرے سال جانندھر رہنے جانا پڑا۔ سو پر ہتار بنا کر ہو کر جانندھر میں ہی رہتے تھے۔ ان سے ملنے جاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ دو سال میں اس نے نہ تو نام ہی کمایا نہ ہی خوشحال ہوا۔ پھر بھی منہ دکھانے کے لیے ہوا آیا۔

”جگا اچھا ہوا تم ملنے آ گئے۔ امرتسر میں کانگریس کا کنونشن ہونے والا ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں آئیں گے۔ میں تمہیں سفارشی خط لکھ دیتا ہوں۔ گیتوں کے پروگرام میں تمہیں بھی موقع ملے گا۔“ جگت کو مسرت نہیں ہوئی۔ پھر بھی پچاس روپے ملنے کا سہارا تھا۔ اس کے پاس پہننے کے لیے صرف ایک جوڑی لباس تھا۔ لیڈروں کے سامنے جانے کے لیے اس نے ایک جوڑ اور سلوانے کے بارے نے گز کا کپڑا خریدا۔



”مشکوٰۃ ہے تو شراب منگوا دو! آواز اور کھل اٹھے گی۔“
 جگت کو میدان ملا۔ اس لیے دوسرے گیت میں اس نے
 دیس کے لیڈروں کو بھڑکا۔ اس کا رچا ہوا گیت ”جاگتے
 رہنا“ سن کر کانگریس کے لیڈر یہ سوچ کر خوش ہوئے گیت
 میں اکالی لیڈروں پر چوٹ ہے۔ جگت کا یہ گیت فائدہ مند
 ثابت ہوا۔ لیڈروں نے پانچ سو روپے انعام دیئے۔
 دوسرے لوگوں نے دس دس پندرہ پندرہ کر کے دو سو روپے
 دیئے اور فنکار کی قدر کی۔ ہر زبان پر جگا کا نام چڑھ گیا۔
 وقت پلٹ گیا۔ ملازمت کی بیڑیاں ٹوٹ گئیں اور وہ گاؤں
 گاؤں خود پودہ مرام کرنے لگا۔

تین سال بیت گئے۔ جالنڈھر کی ماڈل ہاؤس کالونی
 میں چھوٹا سا ایک مکان بنا جس کے دروازے پر تختی لگ
 گئی۔ ”جگت سنگھ جگا ریڈیو آرٹسٹ اور سنگر“ چندن کے
 چہرے پر عیب سی چمک آگئی۔ ایک وقت کے ڈاکو شوہر
 نے ساری دنیا کے سکھ اس کے قدموں میں رکھ دیئے۔ وہ
 فخر کے ساتھ جگت کو دیکھتی۔

”چندن! اب ماں اور باپ کو بلا لیں۔ لانے کے لیے
 کوئی اچھا دن منتخب کر لیں۔ کیوں؟“ دونوں طویل عرصے
 سے ماں جی اور باپو سے نہیں ملے تھے۔ صرف خط سے
 نیریت معلوم کر لیتے تھے۔ انہیں بلانے کو جگانے خط لکھا
 کہ وہ انہیں لیٹھانے والا ہے تو اس کے جواب میں تارا آیا۔
 تار پڑھ کر دونوں کے دل ٹوٹ گئے۔

”تمہارے باپو بارت ٹریل سے گزر گئے۔“
 جگت نے ماں کے پاس پہنچنے تک آنسو روکے رکھے۔
 مگر ماں نے جب کہا۔

”بیٹا! تمہارا خط پڑھ کر ان کی خوشی دل میں نہیں سمائی
 تھی۔ میرے بدنام بیٹے نے نام پیدا کیا وہ فخر سے تاج
 اٹھتے تے۔“ تو جگت کے آنسو بہنے لگے۔ اس نے ماں کی
 گود میں سر رکھ کر دل ملا کیا لیکن اس سے بڑا صدمہ اسے
 اس وقت ہوا جب ماں کو ساتھ لے جانے کی بات کی۔

”نہیں جگت! میں یہ گھر چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ تم
 جس طرف میرے گھر مہمان آتے ہو اسی طرف مجھی بھی

میں بھی آتی رہوں گی۔“ ماں کے چہرے کی سرنخی دیکھ کر
 جگت کے دل میں کانٹا چبھ گیا۔
 ”ماں جی! تم کبھی مجھے خدمت کرنے کا موقع دو۔“
 چندن گڑ گڑائی۔ ”بیٹے کی طرح ضد کرو گی یہ کیسے چلے گا؟“
 ”ہو بیٹی! تم عورت ہو۔ ماں کا دکھ جانتی ہو۔ انکار
 کرتے وقت خود میرا دل بھی دکھا ہے مگر اس سے زیادہ اس
 وقت دکھا تھا جب جگت نے یہاں رہنے سے انکار کیا تھا۔
 وہ گھاؤ ابھی مندرل نہیں ہوا۔ وہ بلند آواز میں بول گئیں۔
 پھر ہانپنے لگیں۔ سانس لینے کے لیے سچھ رکنے کے بعد
 مزید بولیں۔ ”اس کی طرح میری رگوں میں بھی ایک
 جاٹ کا خون دوڑ رہا ہے۔“

ماں نے یہ کہہ دیا۔ جگت بچھ گیا۔ باپو کی موت اور ماں
 جی کی ضد کا اسے گہرا صدمہ ہوا۔ بوجھل دل سے وہ جالنڈھر
 لوٹ گیا۔



”جگا جی! ایک کام کے لیے آئے ہیں۔“ محلے کے
 دو چار بڑے تادی جگا سے مخاطب ہوئے۔
 ”اپنے علاقے میں ایک رفاع عامہ اسکول قائم کرنا
 ہے۔ اس سلسلے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“
 ”فکر اگھا کرنے کے لیے؟“ جگت نے ہنس کر
 پوچھا۔

”نہیں..... زمین دلانے میں مدد کرنی ہے۔“ ایک
 شخص نے کہا۔ ”راستے کی اس جانب لالہ جی کا پلاٹ خالی
 پڑا ہوا ہے۔ وہاں اسکول بنایا جا سکتا ہے مگر.....!“
 ”مگر کیا؟“

”لالہ جی زمین فروخت کرنے سے انکار کر رہے
 ہیں۔“

”پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟“ جگت ابھمن میں
 پڑ گیا۔ وہ لوگ پچھدیر خاموش رہے پھر ایک نے ہمت کی۔
 ”تھوڑا رعب دو! وہ ڈھیلا پڑ جائے گا۔“ جگت سمجھ گیا۔
 دل میں ہنسا۔ ”یہ لوگ میرے رعب کو استعمال کرتا چاہتے
 ہیں مگر اچھے کام میں ساتھ دینا چاہیے۔ ہستی کے بچوں کا

ہوگی۔“ چندن کور نے مذاق میں کہا مگر جگت کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اسے دیرو شدت سے یاد آنے لگی۔ چندن سمجھ گئی۔ جگت کو جیل سے رہا ہونے سات آنٹھ سال ہو گئے اور دیرو اب تک نہیں ملی تھی۔ پھر اس کی یاد تازہ کرنے سے فائدہ کیا؟ جگت آنگن میں بیٹھی ہوئی چار پائی پر لیٹ گیا۔ سردی کی دوپہر تھی اس لیے دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ وہ آسمان پر تیرتے بادلوں کے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن کو دیرو کی یاد تھپکیاں دے رہی تھی۔ چندن کور نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اچانک جگت اٹھ کر صافہ باندھنے لگا تو چندن ڈر گئی۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”اس لالہ جی کے پاس اسکول کا سودا کرنے۔“

”سودا کرنے یا چھین لینے؟“ چندن نے کہا چاہا مگر ارادہ بدل دیا اور بولی۔ ”سمجھانے سے کام نکل جائے تو بہتر ہے۔ ہو سکے تو محلے والوں میں سے ایک آدھ کو ساتھ رکھ لینا۔“

”دوسرا کوئی مشورہ دینا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر چلا گیا۔

”وہ زمین مجھے فروخت نہیں کرنی۔ سودا کرنے کی بات کہاں ہوئی ہے؟“ لالہ جی نے کہا۔

”تم نے پانی کے مول خریدی تھی۔ سونے کے دام لینے میں کیا اعتراض ہے؟“ لالہ جی میں جگا سے زبان چلانے کی ہمت نہیں تھی۔ ان لوگوں نے یہ کام جگا جیسے سر پھرے پر ڈال دیا تھا اس سے لالہ جی دل میں ناراض تھے۔ انہوں نے جلدی سے بات مختصر کی۔

”ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں میں وہ زمین فروخت نہیں کروں گا۔“

جگت کچھ دیر تک لالہ جی کو گھورتا رہا۔ لالہ جی نے سر جھکا لیا جیسے وہ جگا کی نظریں برداشت نہ کر سکتے ہوں۔ جگت سمجھ گیا کہ اس شخص کو لالہ جی نے گھیر لیا ہے۔ زمین کے بڑھتے ہوئے دام دیکھ کر یہ مزید لالہ جی نہیں چھوڑے گا۔ ”جیسی تمہاری مرضی.....“ یہ کہہ کر وہ سر سر اتا ہوا باہر نکل

بھلا ہوتا وہ چاہے برا بن جائے کوئی بات نہیں۔ اس نے کہہ دیا۔

”تم لوگ جاؤ امارت ہوتے ہی راج اور مزدوروں کو اس جگہ پر بھیج دینا۔ اسکول بن جائے گا۔“

”مگر خریدے بغیر چننا؟“ سب کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”جگا سے کام کرانا ہے تو اسی طرح ہوگا۔“ جگت جوش میں آ گیا۔ ”تم لوگ آرام سے سوتے رہنا چنگلی بجاتے میں کا ہنشا دوں گا۔“

”بہتر ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لوگ چلے گئے اور جگا سوچنے لگا کہ رائفل کس سے لی جائے؟ وہ چودہ سال بعد پہلی بار رائفل اٹھانے والا تھا مگر ایک نیک کام کے لیے۔



خیراتی اسکول کی عمارت بنانے کے لیے زمین دلانے کا فرض جگت نے اپنے سر لیا تو چندن نے جگت کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”یہ سب تمہیں ہوئی کا ناریل بنا رہے ہیں۔“

”چندن! تم مجھے اتنا متق بھتی ہو؟“

”بیوقوف تو تم کو تمہارے دشمن نے بھی نہیں سمجھا ہوگا۔“ چندن جلدی سے بولی۔ ”مگر یہ سچ ہے کہ میں تمہیں جھگڑاوضرور مانتی ہوں۔ زبان چلاتے چلاتے نہ جانے تم کب ہاتھ اٹھا دو۔“ جگت ہتھیلیاں مسلنے لگا تو چندن نے طنز کیا۔ ”کیوں..... ابھی سے ہاتھ میں کھجلی ہو رہی ہے؟“

جگت کے ہاتھ رک گئے پھر اس نے پیار بھرے انداز میں ہنس کر اپنی سرخ ہتھیلیوں کے بالے میں چندن کا چہرہ سما لیا۔

”تمہارے رخسار مسلنے کے لیے کھجلی ہوتی ہے۔“

”ارے ذرا شرم کرو! چار بچوں کے باپ ہو گئے ہو پھر بھی ابھی دل نہیں بھرا؟“

جگت نے دونوں رخساروں پر چنگلیاں بھر لیں۔ ”بچوں سے بھر پایا مگر تم سے نہیں۔“

چندن رخسار سہلانے لگی۔ ”کیسے جنگلی ہو؟ اگر مجھ سے دل نہیں بھرا تو دوسری لے آؤ اور ابھی بوڑھی نہیں ہوئی

گیا۔ اس کی چال میں جوش تھا جو لالہ جی کی نظر میں نہیں آیا ہوگا۔

اندھیرا پھیلنے لگا۔ جگت جسم پر کھیل اوزھ کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اس سے پہلے چند دن پچھ پوچھے جگت نے کہا۔ ”پینے کے لیے دوست کے گھر جا رہا ہوں۔“ پھر مزید بولا۔ ”اگر زیادہ پی گیا تو رات وہیں رہ جاؤں گا۔ انتظار نہ کرنا۔“ پھر بھی چند دن رات بھر انتظار کرتی رہی۔ دوست کی رائفل لے کر وہ لالہ جی کی زمین پر پہنچ گیا۔ شام ان لوگوں سے کہا یا تھا۔

”میں لالہ جی سے مل آیا ہوں۔ کام شروع کر دیں۔ پھر مصالحت ہو جائے گی۔“ لہذا کارمگنر مزدور اور سامان وغیرہ جگت سے پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔

”چلو! کام شروع کر دو۔“ جگت نے شانے پر رائفل رکھ کر کہا۔ ”پہلے بنیاد ڈالو! رات بھر میں چار دیواری کھڑی کر دو۔“ سب کو جوش میں لانے کی غرض سے جگت لوگ گیت گانے لگا۔ پیٹرو میکس کے اجالے میں بنیاد بھر دی گئی۔ نصف شب کے بعد چٹائی شروع ہو گئی اور صبح تک چار دیواری کھڑی ہو گئی۔ ”ماڈل اسکول“ کا عارضی بورڈ لگا کر جگت روانہ ہو گیا۔ راستے میں دوست کو رائفل لوٹا کر گھر جا کر سو گیا۔ محلے کے لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کل تک تو میدان تھا اور آج رات بھر میں اسکول کی عمارت کیسے کھڑی ہو گئی؟ یہ چادو کس نے کیا؟ یقیناً یہ تو جگا کا کام ہے۔ گاؤں کے قریب بچے چار میل پیدل چل کر پڑھنے جاتے۔ یہ دکھابٹل گیا۔

دھوپ سر پڑ گئی تب چند دن نے جگت کے سر پر سے چادر ہٹائی۔ ”اٹھو! پولیس چیف آئے ہیں۔“ سورج کی کرنیں پلکوں میں چبھنے لگیں۔

”اسے کیا کام پڑ گیا؟“

”پھر انجام بنتے ہو؟“ چند دن بڑبڑائی۔ ”تمہارے کارنامے کا ڈھنڈورا سارے گاؤں میں بج گیا ہے۔“ یہ سن کر جگت چونک کر اٹھ بیٹھا۔ وہ چند دن سے نظر نہیں ملا۔ کا ہاتھ منہ دھو کر ڈرائنگ روم میں گیا۔

”آئیے صاحب! اچانک اس طرف؟“ اپنے چہرے کے تاثرات ظاہر نہ ہو جا میں اس کے لیے تو لہ سے مسلسل چہرہ صاف کر رہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر صاحب نے نوکا۔

”آنکھوں میں ساری رات جاگنے کا خمیر معلوم ہوتا ہے جگا۔“

”ہاں صاحب! ڈاکو تھا تو بیداریاں کھٹکتی نہیں تھیں۔“ پھر ہلکی سی آواز میں بولا۔ ”اب گھر والی نے بارہ بجے کے بعد باہر رہنے کی ممانعت کر دی ہے۔“

”پھر بھی رات تم نے ممانعت ٹھکرادی۔“ چیف نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔ ”تمہیں تھا نے بلانے کی بجائے دوستی کا لحاظ کر کے گھر آیا ہوں۔“

”اوہ..... یہ بات ہے؟“ جگت منس دیا۔

”لالہ جی نے فریاد کی ہے کہ کسی نے ان کی زمین پر رات بھر میں غیر قانونی چٹائی کر لی ہے۔“ پھر مسکرا کر بولا۔ ”مگر لالہ جی نے تمہارا نام نہیں لیا۔ کل شام تم ان سے ملنے گئے تھے؟“

”تب تم کو سب کچھ معلوم ہے کھنڈ صاحب!“ پھر اقرار کے انداز میں بولا۔ ”میرے سب بچے انگریزی اسکول میں پڑھتے ہیں اس میں میرا مفاد نہیں۔ میں نے یہ سب گاؤں کے غریب بچوں کے لیے کیا ہے۔ تمہارا قانون اعتراض کرتا ہے تو گرا دو اور کیا؟“ آخری الفاظ جوش کی بجائے پیار میں کہے گئے تھے۔ چیف کو حیرت ہوئی جگا نے غلط رویہ نہیں رکھا۔ رعب نہیں دکھایا۔ اسنے ذہن میں سوچا ہوا کام کما آیا ہے پھر بھی کہتا ہے کہ دیواریں گرانی ہیں تو گرا دو! ایک اچھے کام کے لیے غلط قدم اٹھایا ہے۔ چیف کے دل میں ہمدردی جاگی۔ اسے لالہ جی پر غصہ آیا۔ زمین فروخت کرنے میں اس کے باپ کا کیا جاتا تھا؟ وہ چائے پی کر کھڑا ہو گیا۔

”لالہ جی کو جو کچھ کرنا ہو کر گزرے۔ مگر تمہیں ایک بات کہے دیتا ہوں جگا! بغیر لائسنس رائفل رکھنا جرم ہوتا ہے۔“



حکومت ملک گیر بنیاد پر نو جوانوں کو فوجی تربیت دے رہی تھی اور رضا کار دستے منظم کیے جا رہے تھے۔ جالندھر رضا کار دستوں کی ذمہ داری جگت کے سپرد کی گئی۔ جوان لڑکے اور لڑکیوں کو رائفل ٹریننگ دینے میں اسے لطف آتا تھا۔

ایک شام کی بات ہے رضا کار دستے کی چھاؤنی سے گھر جانے کے لیے وہ صاف ٹھیک کر رہا تھا کہ کسی نے آ کر کہا۔ ”جگا جی! وہ لڑکی آپ کو بلارہی ہے۔“ اس نے دور کھڑی ہوئی لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔

جگت نے اس جانب دیکھا۔ صاف پر اس کے ہاتھ جم گئے۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ کچھ فاصلے پر لڑکی خاموش کھڑی ہوئی تھی۔ جگت چونکا وہ بیس سال پہلے کی وپو دکھائی دے رہی تھی۔ لڑکی رائفل کی نال پر انگلیاں پھیرنی ہوئی دوپٹے کا پلو دانتوں تلے دبائے سر جھکائے کھڑی تھی۔ جگت کا دوز کراس کے قریب جانے کو دل چاہا مگر خود پر قابو پایا۔ دوز نے کی بجائے وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا چلنے لگا۔ ایک جذبہ ایک سنسنی اور دھڑکتا دل..... پانچ چھ قدم کا فاصلہ گھبرا گیا تو اس کے پاؤں رک گئے۔ جوش میں وہ بھول گیا کہ بیس سال کے بعد وپو اس طرح جوان کیسے دکھائی دے سکتی ہے؟ اسی لمحے لڑکی نے گردن گھمائی قدرت کی کاریگری نے جگت کے دل پر اثر کیا۔ چہرہ مہرہ وہی ہونے کے باوجود وہ وپو نہیں تھی! سنسنی ہو سکتی تھی۔ پھر بھی بیس اکیس سالہ لڑکی میں اسے وپو نظر آئی۔ جیسے رائفل لے کر کہنا چاہتی ہو جگت سنگھ! تمہیں میری ادھوری آس پوری کرنے کے لیے اس سماج سے انتقام لینا ہے۔ کیا سوچ رہے ہو؟ مجھے بھول گئے؟ پہچان نہیں سکتے؟ جگت اب بھن میں پڑ گیا۔

”تم نے مجھے بلایا ہے؟ مگر میں تو تمہیں نہیں جانتا۔“ لڑکی کے نازک ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ رائفل کے سہارے دو قدم آگے بڑھی۔

”میں آپ کو جانتی ہوں۔ میں رضا کار دستے کی

”تمہیں اس کا بھی پتہ چل گیا؟ میں سمجھتا تھا کہ بغیر لائسنس رائفل رکھنا جرم نہیں استعمال کرنا جرم ہے۔“ جگت نے ہنس کر کہا پھر مذاق میں بولا۔ ”وہ تو کبھی کبھی شانے پر رائفل رکھنے کو دل ہو جاتا ہے۔ برسوں پر اپنی عادت ہے۔“

”پھر کبھی رائفل چلانے کو بھی دل چاہے گا۔ خیال رکھنا۔“ یہ کہہ کر پولیس چیف چلا گیا۔

جگا دروازے تک اسے چھوڑنے گیا۔ نونا تو چندن راستہ روکے کھڑی تھی۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ ”اب تمہیں بھی کچھ فریاد کرنی ہے؟“ جگت نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھ کر سوال کیا۔ چندن نے ہٹ کر اندر جانے کا راستہ دیا۔

”دوست کے ہاں رہنے کا کہہ کر یہ کارنامہ کرنے گئے تھے؟“

”چندن! تم ہی کہو۔ لالہ جی کے پاس کافی زمین ہے۔ اس میں سے ایک ٹکڑا ایسے نیک کام کے لیے دینے میں ان کے باپ کا کیا جاتا ہے؟“

”اور تم ہی کہو کہ اس طرح رائفل لے کر دادا گیری کرنے نہ گئے ہوتے تو تمہارے بیٹے کا کیا جاتا؟“

”اب تمہاری اجازت لے کر جاؤں گا۔ بس؟“ جگت نے بات نالنے کے لیے محبت سے کہا۔

”یعنی آپ پھر رائفل اٹھائیں گے؟“ چندن نے آنکھیں دکھا کر پوچھا تو جگت ہنس دیا۔

”یار! یہ قدرت کی بھی کیسی بلہاری ہے۔ پولیس والے سب دوست بن گئے لیکن گھر کی بیوی پولیس کی طرح پوچھ گچھ کر کے پریشان کرتی ہے۔“ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”ایک جرم معاف کر دو بادشاہ! پھر یہ غلام کبھی گستاخی نہیں کرے گا۔“ تب چاروں بچے مسرت سے تالیاں پینے لگے۔

”شاپاٹس باپو! گھر میں ڈرامہ کرنے لگے۔“ یہ سن کر چندن شرمائی۔ جگت دونوں بچوں کو ہاتھوں پر اٹھا کر کھمانے لگا۔

”ڈرامہ پورا ہوا۔ اب تماشہ دیکھو۔“ گھر کی فضا خوشگوار ہوئی۔

کہ بیٹی کو عنایت سکھانے کے لیے کہے گی۔ ”اس کو بھی کانسف حصہ ہم نے کرائے پر دیا تھا۔ کرایہ دار ایسے ہنس آئے ہیں کہ خالی نہیں کرتے۔“ ماں نے عاجزی سے کہا۔ ”تم انہیں سمجھا کر خاموش کرا دو۔“

جگت کو یہ عجیب سا لگا۔ اس نے دیکھا ماں نے جو کام بتایا گرود یوکور کو اچھا نہیں لگا۔ لڑکی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی جگت بولا۔ ”ماں جی! سمجھا کر کام نکالنا مجھے کم آتا ہے۔ میرا ماضی چھپا ہوا نہیں ہے۔“

”اسی وجہ سے تمہیں یہ کام بتایا ہے۔“ ماں جی نے سچ بول دیا۔ ”انہیں سمجھانے میں ہم نے کمی نہیں رکھی۔“

”پھر ٹھیک ہے۔ آپ کا کام ہو جائے گا یہ سمجھ لیں۔“ یہ کہتے ہوئے گرود یوکور پر نظر ڈال کر جگت رخصت ہو گیا۔ راستے کے موز پر آیا تو ویسے ہی گردن گھما کر دیکھا۔ گرود یوکور کھمبے کے سہارے کھڑی تھی۔ جگت نے شرما کر قدم تیز اٹھانا شروع کر دیے۔



گرود یوکور ایک دن خوش ہو کر جگت کے گھر آئی۔ ”جگا جی! خوشخبری دینے آئی ہوں۔ وہ کرائے دار مکان خالی کر گئے۔“ پھر چند نکتوں سے کہا۔ ”بہن جی! انہوں نے ہماری مشکل حل کر دی۔ تین سال سے ہم تنگ آ گئے تھے۔“ جگت اس کی حسین مسکراہٹ پر خوش ہو رہا تھا۔ گرود یوکور شرما گئی۔ پھر جگت نے تیزی سے نظر گھمائی۔ ”تم نے انہیں تین ہی دن میں کس طرح تنگ کر دیا؟ یہ تو بتاؤ۔“ لڑکی سوال کر بیٹھی۔ چند نکتوں کے مذاق سوچ گیا۔

”تنگ کرنے کے لیے انہیں تین دن تو کیا تین گھنٹے کافی ہیں۔“

”نہیں چند دن! اس میں واقعی تین دن لگے تھے۔“

جگت نے خلوص سے کہا۔ ”تم ناراض نہ ہو تو بتاؤ؟“

”یہ ناراض نہیں ہوں گی اس کا میں یقین دلاتی ہوں۔“ گرود یوکور جوش میں بولی۔ چند نکتوں کو اس لڑکی سے محبت سی محسوس ہوئی۔ اسی لیے وہ اسے خوش دیکھنا

راغفل فورس میں ہوں۔ بہت دن سے آپ سے ملنا چاہتی تھی۔“ جگت کو اب خیال آیا کہ اس نے لڑکی کو پہلے بھی دیکھا تھا مگر نام سے واقف نہیں تھا۔ یہ ویرو نہیں ہے؟ پھر بھی اس کا نام ویرو ہو تو...؟ جگت نے سوچا۔

”میرا نام گرود یوکور ہے۔“ لڑکی کے ہونٹوں سے پھول جھڑے۔ ”مجھے عنایت کا شوق ہے۔ کچھ گانا بھی آتا ہے۔“

آپ ایک بار ہمارے گھر آئیں چائے وغیرہ پیئے۔“

”تمہارے گھر؟“ جگت ابھی تک ویرو کے خیال میں تھا۔ ”میں نے تمہارا گھر نہیں دیکھا۔“

”یہاں سے آپ کے گھر جاتے ہوئے راستے میں ہماری کوٹھی پڑتی ہے۔“ پھر جلدی سے بولی۔ ”ابھی چلیں۔“

ویرو اسی طرح بولتی تھی۔ بولتے وقت وہ آنکھوں کی پتلیوں کو اسی طرح گردش دیتی تھی۔ انجانی ہونے کے باوجود یہ لڑکی اسے جانی پہچانی نظر آئی۔ ”چل رہے ہیں؟“ اس نے

شیریں لہجے میں پوچھا تو جگت انکار نہ کر سکا۔ وہ لڑکی کے ہمراہ اس کے گھر پہنچ گیا۔

”آپ بیٹھیں! میں ماں کو بلاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر لڑکی کمرے میں چلی گئی۔ جگت کو یہ سب عجیب سا لگ رہا تھا۔

دل کے طوفان کو چھپانے کے لیے اس نے میز پر پڑی ہوئی نوٹ بک اٹھائی۔ گھول کر دیکھی جو گیت وہ اکثر گاتا تھا

پہلے صحنے پر تھا۔ ”میرے گیت میں تم ہو خیا لوں میں تم“

ویرو کی یاد میں لکھا ہوا گیت یہاں؟ جگت کے ذہن میں سنسنی ہونے لگی۔ دوسرے گیت بھی اسی کے تھے۔

”آپ نے میری نوٹ بک دیکھی؟“ لڑکی کے سوال نے اسے چونکا دیا۔ ”میں نے آپ کے سارے گیت

اتار لیے ہیں۔“ پھر عقب میں آتی ہوئی ماں سے بولی۔ ”یہ جگت سنگھ ہیں ماں جی! اس دن ہم پروگرام دیکھنے گئے تھے

دی۔“ جگت نے ہاتھ جوڑ کر مسرت کا اظہار کیا۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ چائے پینے کے دوران گرود یوکور

پیار بھری نظروں سے جگت کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ جگت چپنے کے لیے کھڑا ہوا تو لڑکی کی ماں نے کہا۔

”بھائی! تم سے ایک کام کرانا ہے۔“ جگت نے سوچا

چاہتی تھی۔ پھر بھی اسے چڑانے کے لیے چند من نے اس کے بازو پر چٹائی جبر کر کہا۔

”اری میری بجائے یقین دلانے کا حق تم نے کب سے لے لیا؟“

گرود پوکور ہنس پڑی۔ ”ہاں بتائیں انہیں کس طرف تنگ کیا تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”ایک دن ہم اس کی دکان پر گئے۔“ جگت کہنے لگا۔

”میرے ساتھ تین چار دوست تھے۔ میں اپنے ہمراہ ایسے لوگوں کو لے کر گیا تھا جو صورت سے ہی غنڈے دکھائی دیں۔ ہم ناز خریدنے کے بہانے گئے تھے۔ ہم لوگ آپس میں اس طرح سرگوشیاں کرنے لگے کہ سینٹھ اور لڑکوں کا دھیان ادھر جائے۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک آدھ ہتھیار تھا۔ جیسے میں ناز دیکھنے نہیں بلکہ باپ بیٹوں کی پہچان کرانے دوستوں کو ساتھ لایا ہوں۔ میں نے ایسا ظاہر کیا۔“

”اور وہ ڈر گئے؟“ گرود پوکور درمیان میں بولی۔

”سنو تو سہمی۔“ جگت نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”اس طرح ڈر کر وہ اتنا خوبصورت مکان خالی کرنے والے نہیں تھے۔ میں نے دوسرا طریقہ آزمایا۔ میں رہا بدنام آدمی لہذا فریاد کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے ایک کرائے کے جوتی کو میں نے اس کی دکان پر بھیجا۔ اس نے سینٹھ کو بھڑکا دیا۔ فلاں ستارہ ٹکرا رہا ہے۔ کوئی اچانک آفت آنے والی ہے۔ موت کا سایہ نظر آ رہا ہے۔“ اور بے چارے کے پیر غنڈے ہو گئے۔

”جگت کچھ رکا پھر آگے کہنے لگا۔“

”آخری جھٹکا دو دن پہلے دیا۔ تم لوگوں کو ایک رات دوسری جگہ گزارنے کی کہہ کر چار پانچ آدمیوں نے گھر میں ایسا شور مچا دیا جیسے نشے میں چور ہوں۔ کچھ اندر اندر بھگڑے جیسے چھریاں چلنے والی ہوں ایسا خطرناک ماحول پیدا کر دیا۔ باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ گئے کہ اب روز رات کو ہم یہاں محفل جمائیں گے۔“ پھر جگت اس طرح بولا جیسے ان لوگوں پر رحم کھا رہا ہو۔ ”بے چارے بری طرح پریشان ہو گئے۔“

”ہاں! وہ جاتے جاتے بڑبڑا رہے تھے کہ جو بد معاشوں کو گھر میں لا کر تماشہ کریں ان کے پڑوس میں رہنا اچھا آدمیوں کا کام نہیں۔“ گرود پوکور ہنس کر بولی۔

”بے چارے شریف آدمی۔“ جگت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”عارضی طور پر رہنے والے اور بنگلہ ہتھیایا۔“

”جیسے آپ نے بھی کسی کا کچھ نہیں ہتھیایا ہو۔“ چند من نے منہ بنا کر کہا۔ گرود پوکور کی موجودگی میں اسے جگت کو چڑانے کا لطف آتا۔

”تم میاں بیوی لڑ پڑو گے بھی۔“ گرود پوکور جلدی سے بولی۔ ”جگاتی! مجھے آپ کو گرو بنانا ہے۔“

”گرو...؟“ جگت چونکا۔ ”اور میرے جیسے بدنام شخص کو؟“

”بدنام نہیں بلکہ ایک اچھے فنکار کو۔“ گرود پوکور آزادی سے بول رہی تھی۔ ”کل سے میں سنگیت سیکھنے آنے والی ہوں۔“ جگت سوچ میں ڈوب گیا۔ گرود پوکور کا شوخ مزاج اسے پسند تھا۔ مگر اسے دیکھتے ہی ویرو کی یاد آ جاتی اور وہ بے چین ہو جاتا۔

”بڑے آدمی کی طرح کس سوچ میں ڈوب گئے؟“

”بمشکل تمہیں ایک چیلی گرو بنانے کے لیے تیار ہونی ہے۔“

”ہاں بہو۔“ چند من نے جلدی سے کہا۔ جگت ہنس دیا۔

”تمہارے ماں باپ کی اجازت لی ہے؟“

”بالکل! وہ ہاں کر خوش ہوئے۔“ گرود پوکور نے جواب دیا۔

”اس طرح نہیں تمہارے باپو مجھ سے کہیں تو میں مانوں گا۔“ جگت نے صاف لہجے میں کہا۔ ”مجھ سے سیکھنے کے لیے تمہیں یہاں رہنا پڑے گا۔“

”اس کی اجازت بھی میں نے لے لی ہے۔“ گرود پوکور پر جوش انداز میں بولی۔

”پھر بھی اپنے باپو کو لے آؤ تو بات کریں گے۔“ چند من نے جگت کی بات منسوب کی۔

”ہاں! یہ ٹھیک کہتے ہیں۔“ چند من نے جگت کی تائید کی۔



گرود یوکورا پنے باپ کی طرف دیکھ کر اشارہ کر رہی تھی۔
 ”کہئے! اب کس بات کا انتظار کر رہے ہیں؟“
 اس کے باپو خاموش بیٹھے رہے۔ جگت نے خاموشی
 توڑنے کی غرض سے چندن کو مخاطب کیا۔ ”بزرگ کے
 لیے کچھ بنا کر لاؤ۔“ پھر مہمان سے ہی پوچھا۔ ”کیا پیسے
 گئے چائے یا لسی؟“

چندن کو راضی چاہتی تھی کہ اسے گرود یوکور نے روک
 لیا۔ ”بہن! میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ باپو کم چینی والی
 چائے پیتے ہیں۔“ گرود یوکور کے اندر جانے کے بعد اس
 کے باپو نے بات شروع کی۔
 ”جگت سنو! گرود یوکور کی مرضی تم سے گانا سیکھنے کی
 ہے۔“ جگت نے یہ الفاظ غور سے سنے۔
 ”آپ کی کیا مرضی ہے؟“

”صحیح بات کہوں؟“ پھر رک کر آگے بولے۔ ”پہلے تو
 انکار کیا جو ان بچی ہے اگر عام جگہوں پر گائے گی تو شادی
 کے سلسلے میں مشکل ہوگی مگر اس کی آواز اچھی ہے۔ پہلے
 کچھ لوگوں نے کہا بھی تھا کہ اسے سنگیت کی تعلیم دلاؤ! لڑکی
 نام پیدا کرے گی۔ یہی سب سوچ کر ہم راضی ہوئے
 ہیں۔“

”مگر میرے پاس بھیجنے میں ایک خطرہ ہے۔ یہ شاید
 آپ نے نہیں سوچا ہوگا۔“
 گرود یوکور کے باپو چونکے۔ ”خطرہ.....؟“

”میں رہا بدنام آدی۔“ جگت کہنے لگا۔ ”میرے ساتھ
 بہت سی لڑکیاں اکثر پروگرام دینے آتی ہیں۔ ان سے بھی
 کہتا ہوں کہ لوگوں کی باتوں کی پروا ہے تو میرے ساتھ نہ
 آؤ۔“ جگت رک گیا۔

گرود یوکور کے باپو سن رہے تھے۔ وہ کچھ سوچ میں
 ڈوبے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ”گرود یوکور جب یہاں سے
 جائدھر شہر تک رکشہ میں بیٹھ کر جائے گی تو لوگ انگلیاں
 اٹھائیں گے۔ میرے گھر میں رہے گی تو لوگوں میں مختلف
 افواہیں بھی گرم ہوں گی۔ ان سب باتوں کے متعلق آپ

نے سوچا۔
 اسی لمحے گرود یوکور اندر آئی۔ وہ چائے لے کر آئی تھی۔
 اس نے جگت کے آخری الفاظ سنے۔ اس نے باپو کی
 جانب تیز نظروں سے دیکھا۔ اپنے ارادے کی مضبوطی
 دکھانے کے لیے باپو نے آنکھوں کے ذریعے بیٹی کو جواب
 دیا۔

”تمہاری خواہش میں سمجھتا ہوں۔ میں تمہاری خوشی
 میں خوش ہوں۔“

”جگت سیکھ! انہوں نے کھنکھ کر کہا۔“ تمہارے
 متعلق مجھے اب تک بہت سی باتیں سننے کو ملی ہیں مگر لوگوں
 کی باتوں کی مجھے پروا نہیں۔ یہ یہاں رہ کر سنگیت میں
 ترقی کرے گی تو مجھے سکون ہے۔“ چندن کو گرود یوکور کی
 طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ”گرود یوکور کے ہونٹوں پر بھی
 مسکراہٹ نظر آئی مگر جگت ابھی سنجیدہ تھا۔

”بزرگ! میری جانب سے بے فکر رہنا۔ میں اسے
 تمہاری امانت کی طرح حفاظت سے رکھوں گا۔ مگر.....!“
 ”رک کیوں گئے جگا؟“ انہوں نے فوراً پوچھا۔

”ایک بات آپ کو بتا دوں۔ انسان کا کسی چیز کی لگن
 ہونے کے بعد واپس ہونا مشکل ہوتا ہے۔ دو چار ماہ بعد
 آپ اس کا ارادہ بدلنا چاہیں گے تو لڑکی شاید آپ کی بات نہ
 مانے۔“ جگت نے یہ الفاظ محفوظ کر کے کہے تھے۔ چندن
 کو محسوس کر رہی تھی کہ اسے یہ بات نہیں کہنی چاہئے تھی۔
 اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا ڈر تھا مگر گرود یوکور درمیان میں
 بول اٹھی۔

”ہاں باپو جی! میں تعلیم شروع کرنے کے بعد مکمل
 کر کے رہوں گی۔“

”بیٹی! میں تمہاری عادت سے واقف ہوں۔“ چائے کا
 گھونٹ پیتے ہوئے وہ بولے۔ ”تم اپنی ضد پوری کئے بغیر
 نہیں مانو گی۔“

اگر یہ بات انہوں نے ہنستے ہوئے نہ کہی ہوتی تو اس
 کا مطلب بدل جاتا۔ گرود یوکور نے خوش ہو کر پہلے ہٹا کے
 چمن چھوئے پھر جگت کے چمن چھونے لگی۔ ”آج سے

میں تمہاری شاعر اور تم میرے گرو۔“ وہ چندن کی جانب بڑھی مگر چندن نے اسے جھٹکنے نہیں دیا۔

”تم تو میری چھوٹی بہن کے برابر ہو۔“ یہ کہہ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ مسرت کے دو آنسو گروڈ یو کور کی پلکوں پر چمکنے لگے۔

”گروڈ یو کور!“ جگت نے انہیں جدا کرنے کے لیے کہا۔ ”باپو کی موجودگی میں تمہاری تعلیم کی ابتدا ہوگی۔ جاؤ اندر سے ہارمونیم لے آؤ۔“ گروڈ یو کور ہرنی کی طرح دوڑتی ہوئی گئی اور ہارمونیم اٹھالی۔ سر ملانے اور گلا صاف کر کے آواز اٹھائی۔

”میرے گیت میں تم بو خیا لوں میں تم ہو.....“ جگت چونک اٹھا۔ گروڈ یو کور کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی اور جگت کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ بے چین ہو رہا تھا۔ سر بلند ہوتے گئے اور درد کی گہرائی بڑھتی گئی۔ تب مجبور ہو کر اس نے بھیگی پلکوں کو زور سے دبا دیا اور آنسوؤں کا ریلا رخساروں پر بہہ کر عجب سا گرم لمس پہنچانے لگا لیکن دل میں ٹھنڈک ہونے لگی۔ ہارمونیم پر گھومتی گروڈ یو کی انگلیاں رک گئیں۔ آواز بھی رک گئی۔ گروڈ یو کور کی پلکیں بھی جو جھل تھیں۔ کمرے میں ٹھنڈی خاموشی چھا گئی۔

تھوڑے دنوں میں گروڈ یو کور نے گھر کے سب افراد کو اپنی محبت سے متاثر کر دیا۔ سب کام اس نے اپنے ذمے لے لیا۔ بچوں کو وقت پر سکون بھیجتی ان کے کپڑے سنجاتی اور سکی ماں کی طرح ان سے پیار کرتی۔ چندن کو کسی کام میں ہاتھ نہ لگانے دیتی۔

”تم نے بہت سال کام کیا اب آرام کرو۔“ یہ کہہ کر وہ شونہ سے ہنس دیتی۔

”گھر کی ذمہ داریاں تم نے اس طرح سنبھال لی ہیں کہ جیسے ہمیشہ رہنے والی ہو۔“ چندن کہتی۔

”ہمیشہ کے لیے ہی رہنے آئی ہوں۔“ گروڈ یو کور رخسار پر بہتا ہوا پسینہ کرتے کی آستین سے پونچھ کر پراٹھا مینکتی ہوئی بولی۔ ”مجھے دھکے دو گے تب بھی نہیں جاؤں گی۔“

”ارے باپ رے.....“ باورچی خانے کے سامنے چار پائی پر بیٹھی ہوئی چندن ہاتھ کا اشارہ کر کے بولی۔ ”کوئی اچھا لڑکا ملتا تو تمہیں فوراً نکال باہر کروں گی۔ سمجھیں؟“

مذاق کے باوجود گروڈ یو کور کا چہرہ بچھ گیا جیسے پراٹھا اٹارتے ہوئے انگلیاں جل گئی ہوں اسی طرح اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ کچھ دیر تک چندن کو رک کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ ”میں نہ جانا چاہوں پھر بھی رخصت کر دوں گی سچ اپنے من کی بات کہنا بہن! میں تمہارا کچھ نہیں لوں گی۔ تم نے ایسا محسوس تو نہیں کیا؟“

چندن جھٹکنے سے کھڑی ہو گئی۔ ایک باورچی نے بھی اسی طرح کی بات پوچھی تھی۔ ”تم نے یہ کیا کہہ دیا؟“ چندن بولی۔ پھر یہاں بھرے لہجے میں کہا۔ ”سچ جانا چاہتی ہوں کہہ دوں میرا مطلبی دل چاہتا ہے کہ تم ہمیشہ یہاں رہو۔ چاروں پہلے ڈاکٹر سے ایکسرے کرانے گئی تھی تو میں نے ڈاکٹر سے صاف کہہ دیا تھا کہ صاحب! جو بیماری ہو کہہ دینا۔ مجھ صاحب سردارچی یا بچوں کی فکر نہیں ہے۔“

”تم نے ڈاکٹر سے ایسا کہا؟“ گروڈ یو کور چونک پڑی۔ ”وہ اپنے ہی آدمی ہیں۔“ چندن کو ہنس دی۔ ”انہیں کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ کہات ہے کہ ماں مرے مگر خالہ جے۔“

”کیا مرنے جینے کی بات چل رہی ہے؟“ جگت نے قریب آ کر پوچھا۔ گروڈ یو کور چوہے کو پھونک مارنے لگی۔ ”اس طرح چور کی طرح اندر آ کر تم نے ہماری باتیں کیوں سنیں؟“ چندن نے جگت کا کھینک دکھائیں۔

جگت اپنا صاف کھونٹی پرنا لگتا ہوا بولا۔ ”چندن! اس سے پہلے کہ میں بھول جاؤں تم سے کہے دیتا ہوں کہ ہمارا چنا پانچویں کور ہونے والا ہے۔ اگلے دن مجھے یاد دلانا۔ میں اسے لینے فیروز پور جاؤں گا۔ اب وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔“

”چنا بھائی رہا ہونے والے ہیں؟“ چندن خوش ہو گئی پھر اسے کچھ یاد آیا۔ ”مگر تم ماں بیٹے کو جدا کیوں کر رہے ہو؟“

ہو گیا۔ ”پھر تو مجھے یہ نام بھی منظور ہے۔“ اس کا مزاج بھی بنو مان جیسا تھا۔ کار چلانے پر اکثر جگت کو ڈو کنا پڑتا۔

”بھائی صاحب! ذرا اسپینڈم کرو۔ ورنہ اختیارات میں پھر خبر آئے گی کہ جگا ڈاکو کے ہاتھوں ایک اور قتل۔“ مگر جگت نے اب جس وقت رفتار بڑھانے کی بات کی تو وہ ہنس دیا۔

”کتنے لوگوں کو لپیٹ میں لینا ہے یہ بھی کہہ دینا چنا کو جیل سے لینے جارہے ہو اس کے ساتھ کیا مجھے جیل چھوڑ آنے کا خیال ہے؟“ مگر جگت چنا کے خیال میں کم تھا۔ جیل سے رہا ہوئے اسے دس سال ہوئے مگر وہ بمشکل سات آٹھ مرتبہ اس سے ملنے جا سکا تھا۔ اب چنا اپنی ماں سے جیل میں ملاقات کر لیتا تھا۔ ماں اس سے کہتی تھی۔

”گھر آؤ تو تمہاری شادی کر دوں گی۔“ چنا زیادہ خوش کا اظہار نہ کرتا۔

”جیل کاٹ کر آئے ہوئے شخص سے کون شادی کرنے کو تیار ہوگی ماں! اس کی بجائے اپنے اجیت کا گھر بساؤ۔“

”نہیں بیٹا! پہلے بڑا بھائی بیاہا جائے گا پھر چھوٹے کی باری پھر وہ ابھی بمشکل پندرہ سولہ برس کا ہے۔ ابھی تو اسے پڑھانا ہے۔“ پر ہم جیت جب یہ بات کہتی تو چنا اپنے سوتیلے بھائی سے نفرت کا اظہار چہرے سے نہ کرتا۔ آخری بار جگت جیل میں پروگرام کرنے گیا تھا تو چنا نے تمام قیدیوں سے کہہ رکھا تھا۔

”جگا باہر پروگرام دینے جاتے ہیں تو پانچ سو یا ہزار روپے لیتے ہیں ہم بھی انہیں خالی ہاتھ نہیں جانے دیں گے۔“ پروگرام پورا ہونے کے بعد قیدیوں کی جانب سے اکٹھی کی ہوئی رقم جگت کو دینے کا کام بھی چنا کے سپرد کر دیا گیا۔

”یہ کیا ہے؟“ چنا نے پیسے دیئے تو جگت غصے میں آ گیا۔ ”تم لوگ مجھے پیسے دے رہے ہو؟“ پھر اس کی جانب نظر سے گھا کر بلند آواز میں بولا۔ ”جیل کے برے ذہنوں میں تم لوگوں نے ساتھ دیا۔ مجھے اپنا سمجھ کر پیار دیا اور

اتنے سال بعد وہ جیل سے رہا ہے اسے گھر جانے دو! پر ہم جیت کے ساتھ بچھدن رہنے دو پھر لے آنا۔“

”چندن! تم جانتی ہو ماں بیٹے کے درمیان زہر گھل گیا ہے۔ چنا جیل سے سیدھا اپنے گھر جائے گا تو اپنے سوتیلے بھائی سے جھگڑا کر بیٹھے گا۔ ہم اسے یہاں رکھ کر اس کی ماں کی طرف سے خفگی کم کر سکیں گے۔“

”پھر تو یہ عمدہ بات ہے۔“ چندن کو روٹھینا ہوا۔ اپنے دل سے انتقام کی آگ بجھا کر دوسرے کو بھی اسی راستے پر چلانے کی جگت کی دلچسپی دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ پھر اسے مذاق سوجھ گیا۔ ”اے گروڈیو کور! سردار جی کا ایک ساتھی ہمارے ہاں آئے گا۔ وہ بہت اچھا ہے اسی سے تمہارا معاملہ فٹ کر دیں گے۔“

”تم ڈاکو سے بیانی ہو اس لیے مجھے بھی ڈاکو سے چپکانا چاہتی ہو؟ مجھے گھر سے نکالنے کی اتنی جلدی ہے؟“ گروڈیو کور نے کہا۔ دونوں کے درمیان کھرام میں حصہ لینے کے لیے جگت کو پڑا۔

”تم فکر نہ کرنا تم کو یہاں سے کوئی نہیں نکالے گا۔ جانا ہو تو چندن جا سکتی ہے۔“ چندن نے آنکھیں نکالیں تو جگت نے جلدی سے کہا۔ ”کیوں! ڈاکو نے تم کو ہسپتال میں داخل ہونے کو نہیں کہا؟ میں اس کی بات کر رہا ہوں۔“ جواب میں چندن جگت کے سینے پر گھونٹے برسائی ہوئی بولی۔

”سردار جی کی نیت خراب ہو رہی ہے۔ کیوں؟“

کار فیروز پور کی جانب تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ پھر بھی جگت کو رفتار کم معلوم ہو رہی تھی۔

”بنو مان! ابھی رفتار کم ہے۔ ذرا اسپینڈ بڑھاؤ۔“ جگت نے کار چلانے کے لیے ایک ڈرائیور رکھا تھا وہ اسے اپنے مرحوم دوست جیسا دکھائی دیتا تھا اس لیے وہ اسے بنو مان کے نام سے پکارتا تھا۔ پہلے وہ بنو مان کہنے پر چونکا کہ جگت اس کو اصلی نام کی بجائے بنو مان کیوں کہتا ہے؟ مگر جب جگت نے بنو مان کی دوستی کی داستان سنائی تو وہ خوش

دو گھنٹے تم کو خوش کرنے آیا ہوں تو اس کی قیمت دے رہے ہو؟

”پاپاجی! تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ہم قیمت دے رہے ہیں؟“ چنا بھیکے ہوئے کنبھ میں بولا۔ ”ہم سب کے پیار کا نذرانہ ہے جگاجی! یہ لینے سے انکار کرو گے تو ہمارے دل دکھیں گے۔“ کچھ بحث کے بعد جگانے رقم لے لی۔

”میں یہ پیسے رکھ لیتا ہوں مگر اپنے لیے نہیں، جیل کانتے ہوئے کسی قیدی کے بٹا سر اخاندان کو تم لوگوں کی طرف سے دے دوں گا۔“ جدا ہوتے وقت جب چنا نے کہا کہ میں ایک ماہ بعد رہا ہوں تو جگت کو خیال آیا کہ دس سال کتنی تیزی سے بیت گئے تھے؟

”چنا! باہر آ کر کام سے لگ جانا۔“ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دروازے تک ساتھ جاتے ہوئے جگت نے سمجھایا۔ ”گھر جاتے ہی تمہاری ماں کو صدمہ ہو کوئی ایسی حرکت نہ کرنا۔“

”بہت کوشش کرتا ہوں پاپاجی!“ چنا نے دل کی بات کہہ دی۔ ”ماں کی جانب سے نفرت نہیں جانی۔ ممکن ہے ماں کی طرف سے نفرت دل سے نکل جائے مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ پنا سنگھ کے لڑکے کو دیکھ کر میری آنکھوں میں خون نہیں اترے گا۔“

جگت تو اس کی حالت پر ہمدردی جاتی۔ باہر نشتے ہی اُتر چنا سنگھ کی آنکھوں میں خون اتر آیا تو زمین ہل جائے گی۔ اس نے فوراً فیصلہ کر لیا۔

”چنا! رہائی کے دن میں تمہیں لینے آؤں گا۔ کچھ دن میرے ساتھ رہنا۔ ٹھیک لگے تو میرے ساتھ کھیتی باڑی کرتا۔“ چنا کو یہ بات پسند آئی۔ جس کے ساتھ ڈاکے ڈالے اس کے ساتھ کھیتی باڑی۔ باقی زندگی گزارنے کو طے تو یہ خوشی کی بات تھی۔ اس نے جگت کا ہاتھ دبا یا۔

”پاپاجی! میرے دل کی بات تمہاری زبان پر آ گئی۔“ پھر دروازے کے پاس سے واپس لوٹتے ہوئے بولا۔ ”مگر تم اس دن جلدی آ جانا! ماں کو میں نہیں سمجھا سکوں گا۔“ جگت ڈرائیور کو اسی لیے جلدی چلانے کو کہہ رہا تھا۔

اچانک کار کو جھٹکا لگا۔ ”کیا ہوا؟ گاڑی کیوں روک لی؟“ وہ چیخ پڑا۔

”گاڑی کے اسپرنگ سے کچھ گرنے کی آواز آئی ہے۔“ ڈرائیور نے باہر آ کر کہا۔ ”میں ذرا دیکھ لوں۔“ نیچے کے دو بولٹ نکل گئے تھے۔ ابھی دس میل کا فاصلہ تھا۔ رہنرنگ کے بغیر آگے بڑھنے میں ڈرائیور کو خطرہ نظر آیا اور ایک گھنٹہ ضائع ہو گیا۔

”چنا تو گھنٹہ بھر پہلے چلا گیا ہے۔“ فیروز پور جیل کے گیٹ پر اسے خبر ملی۔ ”اس کی ماں کل رات سے آئی ہوئی تھی۔ صبح رہا ہوتے ہی اسے اپنے ساتھ لے گئی۔“ مگر میں اسے لینے آنے والا تھا۔“ جگت کو ذرا سا غصہ گیا۔

”چنا نے بہت انکار کیا مگر ماں نے کہا کہ پہلے ایک بار گھر آ جا پھر جہاں بھی جانا ہو چلے جانا۔ وہ پھر بھی نصف گھنٹے تک رکا رہا۔ جاتے ہوئے کہتا گیا پاپاجی! میں تو ہم انیشن پر ہیں۔ وہیں بھیج دینا۔“

”گاڑی کب روانہ ہوتی ہے؟“

”وہ تو اب جا چکی ہوگی۔“ جواب سن کر جگت کار کی جانب جھینا۔

”بھلا! گاڑی امرتسر کی جانب دوڑاؤ۔“ اس کی آواز میں نمر جھب۔ دن کی کسی انجانے ڈرنی وجہ سے۔



”بیٹا! تم آنے والے ہو یہ جان کر اجیت دو دنوں سے کیسا خوش ہے۔ کہتا ہے کہ بڑے بھائی سے ملنے کے لیے میرا دل بے چین ہے۔“ سارے راتے ماں نے یہ بات مختصر طریقے سے دہرائی۔ چنا بار بار اپنے دل کو سمجھا رہا تھا اب پرانی عداوت بھول جا! تجھے پنا سنگھ سے دشمنی تھی مگر اجیت نے تو تمہاری ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ سگا بھائی نہ سہی پھر بھی نصف بھائی تو ضرور ہے۔ امرتسر سے گھر جاتے ہوئے اس نے اپنے دل کو مضبوط کر لیا تھا۔ راستے میں دکاندار ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ دیکھو! پرم جیت کا چنا جیل سے رہا ہو کتا رہا ہے۔ ماں ایک سال

سے اس کی رہائی کے لیے تسبیح پڑھ رہی تھی۔ آخر اس کے سکھ کا سورج مطلوع ہو ہی گیا۔

سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ ماں چنا کو جلدی چلنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

”بیٹا! مغرب کے وقت گھر میں قدم رکھنا نحوست ہوتی ہے۔ پہلے پہنچ جانا بہتر ہے۔“ ماں نے اگلی گلی میں داخل

ہوئے۔ چنا کے دل میں پلچل ہونے لگی۔ سولہ برس کے بعد گھر لوٹا تھا۔ اس کے پیچھے ماضی کی پرچھائیں تھیں اور

سامنے مستقبل نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے گھر کے پاس برسوں سے کسی پہرے سدا کی طرح کھڑے ہوئے اٹلی کے

بوڑھے درخت کو دیکھا۔ اس کے تنے کے پیچھے اس کا سوتیلا بھائی اجیت چھپ کر کھڑا ہوا تھا۔ تنے کے پیچھے

چھپے ہوئے اجیت کے کانوں میں یہ الفاظ سنائی دے رہے تھے۔

”چنا! گھر جاتے ہی اجیت کو سینے سے لگا لینا۔ اپنے رہا ہونے کی خوشی میں اسے منھائی دینا۔ تم دونوں میری دو

آنکھیں ہو۔“ ابھی یہ الفاظ ختم نہیں ہوئے تھے کہ تنے کے پیچھے سے اجیت باہر آ گیا۔ چنا کے سینے پر چھری سے وار

ہوا۔ اس وقت تک دونوں میں سے کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ کیا ہو گیا ہے؟ اجیت کے چہرے پر خون جھلک رہا تھا۔

اس کی آنکھوں سے زہر برس رہا تھا۔ اچانک حملے سے نیچے بیٹھے ہوئے بدحواس چنا کو لات مار کر اجیت نے چت

لٹا دیا اور اوپر بیٹھ کر کئی وار کیے۔ پر م جیت چیخ اٹھی۔

”اجیت! اجیت۔“ وہ اس سے لپٹ کر اسے روکنے لگی مگر سولہ سال کے لڑکے نے ماں کو دھکا دے دیا۔ اس کا چہرہ

غصے اور نفرت سے بگڑ گیا تھا۔ چنانے اس کے حملے کو روکنے کے لیے ہاتھ بلند کیا تو چھری کی تیزانی بازو میں اتر گئی۔

پاگل کی طرح اجیت نے چنا کا سینہ چیر دیا۔

”میں اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے برسوں سے انتظار کر رہا تھا۔ لے... لے... لے...“

منٹ کے درمیان یہ سب کچھ ہو گیا۔ چار چھ آدمیوں نے اجیت کو پکڑ لیا۔

”سالے! بے وقوف۔“ لوگوں نے چائے مارے اور اس سے چھری چھین لی۔ مگر اب اجیت کو اس کی ضرورت نہ

تھی۔ خون میں لت پت چنا کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔ پتھر کے ساتھ سر ٹکرا کر پر م جیت بے ہوش ہو گئی تھی۔

اجیت ہانپتا ہوا خون سے بھرے ہوئے ہاتھ مسل رہا تھا۔ کار کا ہارن سنائی دیا۔ مجمع کے درمیان راستہ پیدا

کرنے کے لیے ڈرائیور نے زور سے ہارن بجایا تو دو چار آدمیوں نے ایک ساتھ کہا۔

”آگے بڑھنے کا راستہ نہیں ہے۔ لاش پڑی ہوئی ہے۔“

جگت کار سے باہر آ کر چھینا۔ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا اندر پہنچا تو قدموں کے قریب چنا کی لاش نظر

آئی اور وہ دل دہلانے والی آواز میں گر جا۔

”چنا...!“ دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے۔ اسے نظر کے سامنے پولیس

کے درمیان کھڑا ہوا اجیت نظر آیا۔ وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ جگت نے منھیاں کس لیس کھائی کی رگیں ابھرائیں۔ اس

کے جزیے بھینچ گئے۔ وہ خونی نظروں سے اجیت کو دیکھنے لگا۔ اجیت نے منہ پھیر لیا جیسے جگت کی تیز نظریں برداشت

نہ کر سکا ہو۔

کچھ ہی دیر میں جگت کے ذہن پر شہنشاہ سوار ہو گیا۔ چنا کے بہیمانہ نکلنے اس کے خون میں آگ لگا دی تھی۔

وہ لاش کے پاس پڑی ہوئی خون آلود چھری کی دھار پر نظر ڈال کر قدم بڑھائے جا رہا تھا اسی لمحے ہوش میں آئی ہوئی

پر م جیت اس سے لپٹ گئی۔

”بیٹا جگا! اس میں کسی کا قصور نہیں یہ میرے گناہ کی سزا ہے۔ میں پیار میں بے قابو ہو کر چنا کو یہاں لے آئی۔ دو

بھائیوں کی دشمنی دور کرنے کی مجھے جلدی تھی۔“ روتی ہوئی تڑپتی ہوئی جگت کے سینے پر سر مارتی وہ بڑبڑا رہی تھی۔ پتھر

دور کر اس نے نیچے سے چھری اٹھالی اور مجرم بیٹے کے

سامنے گرجی۔

رہ گیا۔ پھر مزید کچھ نہ کہنا چاہتا ہوا اس طرح سے پہلو بدل کر سو گیا۔ پھر بھی چند دن سوال پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

”بے چاری چنا کی ماں..... اس پر کیا گزری ہوگی؟“
”وہ پاگل ہو گئی ہے۔“ جگت بڑبڑایا۔ ”سولہ برس بعد گھر آئے بیٹے کو سولہ سال تک جمن سے پالے ہوئے بیٹے نے قتل کر دیا۔ یہ اس سے کیسے برداشت ہو سکتا تھا؟“



دوسرے دن کافی دھوپ نکل آنے کے بعد چند دن نے اسے اٹھایا۔ ”اٹھو! دس بجے ہیں۔ کل سے کچھ کھایا نہیں ہے۔ ناشتہ کر لو۔“ جگت انگڑائی لے کر بیٹھ گیا۔ جسم میں ہلکا سا درد ہو رہا تھا۔ کتنا سویا اسے اس کا ہوش نہیں تھا۔ گل پر جا کر منہ دھونے کے بعد چہرے پر تازگی آ گئی۔ چند دن کور ناشتہ لے کر آئی۔ جگت نے کمر میں نظر گھمائی۔

”بچے اسکول جا چکے ہیں؟“ چند دن نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے بعد کا سوال نہ پوچھا جائے اس لیے ادھر ادھر ہونے کے لیے چند دن نے قدم بڑھائے مگر جگت نے روک دیا۔ ”ارے گروڈ یو کور کیوں نظر نہیں آ رہی؟“ چند دن کا چہرہ اتر گیا پھر بھی کہنا پڑا۔

”اپنے گھر گئی ہے۔“
”مگر میں نے اسے کل بھی نہیں دیکھا تھا۔“ دوسرے سوال سے چند دن اور لرز گئی۔

”کل سے گئی ہے۔“ چند دن کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ گروڈ یو کور ہنسنے میں ایک بار دو چار گھنٹے کے لیے اپنے ماں باپ سے ملنے جاتی تھی مگر کبھی ٹھہرتی نہیں تھی۔ اس لیے جگت کو محسوس ہوا۔

”اس کے گھر سب ٹھیک تو ہیں؟ تم ہوا نہیں؟“
”ہاں.....“ دونوں سوالوں کا جواب دیا گیا مگر دل کی پریشانی کو دبا نہ سکی۔ ”کل ست پال کو بلانے کے لیے بھیجا تھا آج صبح میں خود ہو آئی۔“ جگت کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ہاتھ میں تھا ماہوا پرانے کانگڑا اس نے واپس رکھ

دیا۔ ڈری ہوئی چند دن نے بغیر پوچھے کہہ دیا۔ ”اب وہ واپس نہیں آئے گی۔ اس کے باپ نے بیٹے سے انکار کر دیا

”لے..... اب اسے میرے سینے میں مار دے اور اپنی پیاس بجھالے! مجھے زندہ رکھ کر بھی تو نے مار دیا ہے۔“
جگت نے اسے پکڑ لیا تو پرم جیت باگھوں کی طرح گرجی۔ ”سب بیٹے دشمن بن گئے۔ بھلوان اب کبھی عورت کو جمن نہ دینا۔ اگر دے تو ماں نہ بنانا۔“ اس کی لہرشاں چیخوں تڑپ اور آنسوؤں سے سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جگت کا دل بھی آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔ اس کا جوش ختم ہو گیا۔ اس نے پرم جیت کو نیچے بٹھا کر چنا کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

”دوست! مجھے معاف کرنا..... مجھے دیر ہو گئی۔“ پھر اسی ہاتھ سے اپنے آنسو صاف کر لیے۔



دوسرے دن دوپہر کو سو جی ہوئی سرخ آنکھوں کے ساتھ جگت گھر پہنچا۔

”کل شام سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ چند دن نے ٹوکا پھر جگت کے چہرے پر صدمہ دیکھ کر کچھ نہ کہی۔ اس کا لہجہ بدل گیا۔ ”کیا ہوا..... چنا کو نہیں لائے؟“

جگت چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چند دن نرم آواز میں پھر بولی۔ ”میں کہہ رہی ہوں کہ اس کی ماں اس طرح نہیں بھیجے گی اچھا ہوا گھر چھوڑ آئے۔“

”چھوڑ آیا..... مگر.....“ جگت نے آنکھیں بند کر لیں۔ ”گھر نہیں شمشان میں۔“
”کیا.....؟“ چند دن کی چیخ نکل گئی۔

”اس کے سوتیلے بھائی نے چنا کو گھر پہنچنے ہی نہیں دیا۔ اس سے پہلے ہی ختم کر دیا۔“ جگت بے شکل بولا۔ پھر چارپائی پر لیٹا ہوا بولا۔ ”شراب کی بوتل لے آؤ۔“ چند دن کے پیر زمین سے چپک گئے۔ دل میں گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس نے بے شکل کہا۔

”اور اس لڑکے کا کیا بنا؟“
جگت نے اسے عجیب طرح سے دیکھا پھر ہونٹ چبا کر بولا۔ ”بچ گیا..... میرے ہاتھوں ایک قتل ہونے سے

ہے۔“ چندن ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

”مگر کیوں...؟“ جگت نے تعجب سے پوچھا۔

”کیونکہ...“ چندن ہچکچاتی آواز میں بولی۔ ”یہاں رہنے سے ان کی بیٹی بدنام ہو جائے گی۔ انہیں یہ ڈر لگا ہوا ہے۔“

”مگر گرود یو کور نے کیا کہا؟“ جگت کی آواز میں سختی بھی تھی۔

”وہ بے چاری تو میرے سامنے بری طرح رو رہی تھی۔ اپنی ماں کی موجودگی میں کچھ بول نہ سکی۔“

”یہ بات ہے۔“ جگت نے دانت چیر لیے پھر آگے کچھ کہنے کی بجائے خیالات میں کھو گیا۔ اس کا غضب اور چہرہ دیکھ کر چندن ڈر گئی۔



گھر میں اداسی چکر لگا رہی تھی۔ کوئی اس کا نام نہ لیتا تھا۔ مگر گرود یو کور چاروں طرف چلتی پھرتی نظر آتی تھی چندن کو بے چینی میں اور جگت کو خاموشی میں گرود یو کور کی موجودگی نظر آتی تھی۔ بے چینی کا بوجھ برداشت نہ ہوتا تو چندن چھپ کر رو لیتی۔ خاموشی ناقابل برداشت ہوتی تو جگت گیت گا لیتا۔

”میرے ریت میں تم ہو خیا لوں میں تم ہو۔“

چندن کو روتے میں مہر ہو جانے وہ اس وقت سے یاد آ کر کے ریت گاربا سے؟ ویرو تو یا سرود یو کور؟ مرود یو کور کے جگت کی شاگرد بن کر گھر میں آنے کے بعد ایک دو بار جگت سے چندن نے کہا تھا۔

”اب مجھے موت کا ڈر نہیں ہے۔“

”کیوں... مرنے کی بہت جلدی ہو رہی ہے؟“

جگت نے اسے چڑایا۔ ”دن بدن موتی ہوتی جا رہی ہو۔“

”چرہ بی بڑھنے سے زندگی نہیں بڑھتی۔ کیا سمجھے؟“ چندن نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”عورت کو موت کا ڈر ایک وجہ سے ہوتا ہے۔“

”کون سی وجہ سے؟“ جگت نے پوچھا۔

”بچے بے سہارا ہونے کی۔“ چندن نے نظریں جھکا

کر کہا۔ اب مجھے ڈر نہیں، گرود یو کور نہیں سنبھال لے گی۔“

”بے سہارا ہونے کی عورت کو فکر ہوتی ہے۔“ جگت نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ”مرد کا کیا ہوگا اس کی پروا بھی ہوتی ہے؟“

”جو میرے بچوں کو سنبھالتی ہے وہ شوہر کو بھی سنبھال لے گی۔“ پھر چندن اوپر دیکھ کر بولی۔ ”کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا؟“

”کیا بک رہی ہو؟“ جگت نے غصہ دکھایا۔ ”وہ بھلی لڑکی آواز ٹھیک کرنے آئی ہے اور تم اپنے بچوں کو اس کے گلے باندھ کر اس کی زندگی برباد کرنا چاہتی ہو؟“ چندن کو مستحکم کرنے لگی۔ تب جگت نے سوچا کہ ان دونوں نے آپس میں کچھ طے کر لیا ہے، وہ ناراض ہو کر کچھ کہنا چاہتا تھا مگر چندن کھلکھلا کر ہنس دی۔ ”تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ جیسے میں کل مر جاؤں گی۔“

”چندن! تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے؟“ جگت نے منہ بنا کر کہا۔ ”ایسی بات اگر باہر نکل جائے تو رائی کا پر بت ہو جائے گا۔ پتہ ہے؟“

”باہر والوں نے تو رائی کا پر بت بنانا شروع بھی کر دیا ہے۔ مجھے بہت سی سورتیں بغیر پوچھے مشورہ دے گئیں۔ ارنے تمہارا دامخ پھر گیا ہے؟ گھر میں کنواری لڑکی کو رکھ کر تم زندگی بکا رہا جانتی ہو۔ مرد سے دل لگ گیا تو گھر اور شوہر سب پیٹھ سے کر بیٹھ جائے گی۔ انہیں میں کیا جواب دیتی ہوں بتاؤں؟“ جگت نے تجسس نظروں سے اسے دیکھا تو چندن بولی۔ ”میں کہتی ہوں یہ تم لوگوں کو اچانک میری فکر کیوں ہو گئی؟ تین ماہ ہسپتال میں رہی تو کوئی خبر لینے نہیں آیا۔ کنواری لڑکی کا میرے مرد سے دل لگ جائے تب کی بات الگ ہے۔ مگر فی الحال تو میرے بچوں کا اور میرا دل اس سے لگ گیا ہے۔ وہ ہمیں پرانی نہیں لگتی۔“

جگت دل میں چندن کے غلطوں پر خوش ہوا مگر چہرے پر اقلاتی رہنے دی۔ ”تم نے ایسا کہا؟“

”میں نے سچ کہا۔“ پھر وہ رک گئی۔ مگر چندن لمحے بعد بولی۔ ”یاد ہے کئی سال پہلے ہمالیہ کے سادھو گھر آئے تھے؟“

تب تم ڈاکو تھے۔ سادھو نے کہا تھا کہ جلد یا بدیر گھر میں سوتا آئے گی۔ تم دوسری شادی کرو گے۔“

”تم ابھی تک اس بات کو نہیں بھولیں چندن؟“ جگت جذبات میں بہتا ہوا بولا۔ ”بیس سال بیت گئے ابھی میری دوسری شادی نہیں ہوئی۔ اب تک تمہیں وہ بات سچ معلوم ہوتی ہے؟“

”سادھو بابا کی بہت ساری باتیں سچ نکلی ہیں۔“ چندن پر جوش لہجے میں بولی۔ ”اب ایک ہی بات باقی رہ گئی ہے۔“

”ساری باتیں سچ نہیں ہوتیں چندن۔“ جگت نے جذبات میں کہا۔ ”نہیں تو ویرا تین سال ہم سے دور کیوں رہتی؟“ جگت بات ختم کرنے کے انداز میں کھڑا ہو کر کمرے سے چلا گیا۔ ویرو تھی تو کچھ اور سوال ہی کہاں تھا؟ مگر اب وہ آس دھوکا تھی۔ گرود یوگور کے باپ نے جگت کے گھرائی بیٹی کھانے سے روکا تو چندن کو ہی صدمہ ہوا۔ وہ جھوٹے تصور میں کیوں گم رہی؟ کیوں خواب کے محل تعمیر کئے؟ قدرت نے اسی لیے اسے سزا دی تھی۔ گرود یوگور کے مستقبل سے کھیلنے کی اس نے حسرت کی تھی؟ پرانی لڑائی سے کیوں دل لگا بیٹھی؟

اس وقت جگت اپنے دل کو ملامت کر رہا تھا۔ چنا کی موت کے غم میں اسے ویرا زیادہ یاد آنے لگی تھی۔ گلے میں موجود تعویذ پر ہاتھ پھیرتا ہوا وہ ذہن کو نوٹوں لے لگا۔ گرود یوگور میں ویرو کو دیکھا۔ اپنی ذات کو دھوکا دینے کے برابر تھا۔ اس کی نوٹ ہلکے میں اپنے گیت لکھے ہوئے دیکھے ویرو کی یاد میں لکھا ہوا گیت وہ خوب چاہ سے گاتی تھی اسی لیے گرود یوگور میں ویرو دکھائی دی۔ دل کی خالی جگہ میں کسی کو بسانے سے کسی پوری نہیں ہوتی۔ تمہارے جیون میں اب کبھی ویرو داخل نہیں ہوگی مگر تمہارے دل سے وہ کبھی نہیں جائے گی۔ قدرت نے گرود یوگور کے لیے جو کچھ کیا شاید اچھا ہی کیا۔ چندن کو صدمہ ہوا ہے مگر آئندہ اس کا دل بھر جائے گا۔

”میں گرود یوگور کے گھر ہوائی۔“ باہر سے آ کر چندن جگت کے برابر چار پائی پر بیٹھ گئی۔ سنی ان سنی کر کے جگت

چار پائی پر لیٹ گیا۔ چندن کہنے لگی۔ ”آج مجھے گرود یوگور سے بات کرنے کا موقع ملا ہے۔“

”کیا بات ہوئی؟“ جگت تجسس نہ روک سکا۔

”پہلے چار پائی پر لیٹ کر گرود یوگور کی ماں نے ٹونا دیا۔ مگر آج میں نے سختی کی ہے۔“

”سختی؟“ جگت چونکا۔

”میں نے کہا مجھے گرود یوگور سے ملنے نہیں دو گے تو سردار جی خود آئیں گے۔“

”پھر.....؟“

”پھر کیا؟ یہ سن کر اس کی ماں نرم پڑ گئی۔ وہ تمہارا مزاج جانتی ہے اس لیے ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ بولی کہ بہن! ہم عورتوں کی بات میں مردوں کو درمیان میں کیوں لاتی ہو؟ پھر کچھ بھاری لہجے میں بولی۔ ”میں کے مستقبل کو سوچ کر ماں باپ کو سختی کرنا پڑتی ہے۔ تم اس سے خوشی سے ملو۔“ چندن اتنا کہہ کر رگ گئی۔ جگت کا منہ کھلا ہوا تھا۔

”تم نے میری دھاک استعمال کی؟“

”ہاں اس کی ماں نے کہا کہ گرود یوگور کو سمجھانا! ہم نے ایک لڑکا تلاش کر لیا ہے۔ شادی کی ہاں کر دے۔“ یہ الفاظ چندن نے پچھ غصے میں کہے پھر اصل بات پر آئی۔ ”اسے دیکھ کر دل تڑپ گیا۔ اتنے دنوں میں سوکھ کر کاٹنا ہو گئی ہے۔ جیسے برسوں کی بیمار ہو۔“ دونوں کی آہیں نکل گئیں۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر چندن کہنے لگی۔ ”مجھے دیکھ کر وہ ہلکے ہلکے کر رہے تھی۔ چھوٹے بچے کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے بستے ہوئے آنسوؤں نے مجھے تڑپا دیا۔ جیسے اس کے ضبط کا بند نوٹ گیا ہو۔“ یہ کہتے ہوئے چندن آبدیدہ ہو گئی۔ جگت خاموش رہا اور چندن کو کو بولنے دیا۔ ”رونے کے بعد اس نے بچوں کی اور تمہاری خیریت پوچھی ملازمہ کو تنخواہ دی یا نہیں؟ گھر کا حساب کون رکھتا ہے؟ مجھے یاد کرتے ہیں؟ سردار جی کو پروگرام دینے اکیلے جانا پڑتا ہوگا۔ اس نے بہت سارے سوال کیے۔ میں نے مختصر جواب دیئے۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہارے ماں باپ تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکا بھی تلاش کر لیا ہے۔ تم



دن گزرتے رہے۔ چندن کو گرود یو کور کی جدائی پریشان کرنے لگی۔ آنسو بہاتا اس کا معصوم چہرہ ہر لمحہ اس کی نظر کے سامنے رہنے لگا۔ اب وہ کبھی واپس نہ آئے گی۔ وہ بڑ بڑائی ہوئی آگے بڑھی اور گرود یو کور کے کپڑے واپس دے آنے کے لیے الماری کھولی۔ وہ کم صم بنی کپڑوں کو دیکھ کر اس طرح ہاتھ پھیر رہی تھی جیسے گرود یو کور کو اطمینان دلانے کے لیے اس کی پشت پر ہاتھ پھیر رہی ہو مگر پھر اس کا اطمینان ختم ہو جاتا اور رونے لگتی، نہیں، کپڑے واپس دے آنے کی تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ چندن نے سوچا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ وہ گرود یو کور کا غم بھلانے کے لیے مٹیس مانتے لگی۔ وہ کبھی کسی چیز کسی مہاراج، کسی جوتھی اور کبھی کبھی جاوڈو نے والے سے ملنے لگی۔ کبھی تنہا جاتی اور کبھی جگت کو ساتھ لے جاتی۔ سب امید دلاتے مگر نتیجہ باہمی میں نکلتا۔ جگت نہ کبھی روکتا نہ ٹوکتا۔ البتہ کبھی کبھی الجھن میں ضرور پڑ جاتا۔ چندن کو اس لڑکی کی اتنی چاہت ہوئی ہے؟ ابھی اسے ڈر لگتا کہ اس صدمے میں چندن پاگل تو نہیں ہو جائے گی؟ کبھی خود کو ہر دیش کرتا کہ دوسروں کے لیے بہت کچھ کیا مگر جس عورت نے تمہارے لیے اتنے دکھ برداشت کیے اس کی خاطر ایک قدم نہیں اٹھایا۔ دن تیزی سے گزرتے رہے۔ چندن کی آس ٹوٹنے لگی۔

”خط.....!“ آواز دے کر ڈاکے نے ایک لفافہ دروازے کی جانب پھینکا۔ دوڑ کر لڑکا خط لے آیا۔ تجسس کی خاطر اس نے لفافے پر نام پڑھا۔ ”ارے ماں! یہ تو تمہارا خط ہے۔“

”اے..... یہ تو گرود یو کور کا خط ہے۔“ چندن نے کپکپاتے ہاتھوں سے لفافہ کھولتے ہوئے آنکھیں بند کر کے بھگوان کا نام لیا۔ اندر سے خط نکالتے ہوئے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ خط کے الفاظ پر نظر پڑتے ہی اس کے آنسو بہنے لگے۔ برداشت باوجود اس کی چیخ نکل گئی۔

”کیا ہوا؟“ جگت کمرے میں دوڑ کر آیا۔ چندن کے لرزتے ہاتھوں اور آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ دیکھ کر جگت

کیوں.....؟“ میں اتنا ہی بولی تھی کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ اپنی ماں کو گھورتی ہوئی بولی۔ ”ہن! انہوں نے زبردستی قید میں ڈال رکھا ہے۔ مگر میں نہیں ڈگمگاؤں گی۔ میں ان سے ایک بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔ اگر زبردستی کی تو مجھ سے ہاتھ دھو نہیں گے۔“ چندن جوش میں کہہ رہی تھی۔ جگت کو بھی غصا آ گیا۔

”ویسے لڑکی ہے بہادر۔ یہ سن کر اس کی ماں سنانے میں آگئی ہوگی؟“

”پہلے سنانے میں آگئی پھر چڑھ گئی۔“ چندن کی آواز نرم ہوئی۔ ”اس نے گرود یو کور سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ہم تم سے ہاتھ دھونے کو تیار ہیں مگر عزت نہیں جانے دیں گے۔ اپنی بیٹی کو کہنے سے سکون نہ ہوا تو مجھ سے کہا کہ تمہارے ساتھ چھ ماہ رہی تو ہماری لڑکی کتنی بگڑ گئی ہے۔“

”تمہیں اس نے ایسا کہا؟“ جگت نے منھیاں کس لیں۔

”تمہیں بھی سنانا تھیں، ہم کہاں کہنے آئے تھے کہ اپنی بیٹی کو بھیج دو؟ میں ایسا نہ کہہ سکی جگت سگھ۔“ چندن کی آواز بھرا گئی۔ ”ایسی بے عزتی ہونے کے بعد میں کب تک وہاں رکتی؟ غصے میں پیہر بیٹھتے ہوئے چلی آئی۔“ سنانا چھا گیا۔ چندن کو رکی سانسوں میں درد تھلک رہا تھا۔ جگت خاموش کھڑا رہا مگر پہلے کبھی ایسا ہوتا تو جگت شاید پوری بات بھی نہ سنتا اور ہاتھ میں لاشی اٹھا کر چل پڑتا حساب صاف کرنے، مگر اس کی بجائے وہ چار پائی پر لیٹ گیا۔ چندن ناراضگی کے انداز میں کھڑی ہوئی اور اندر چلی گئی۔

جگت سوچ رہا تھا کہ کون سی کمزوری اسے روک رہی ہے؟ کیا کوئی ان دیکھی قوت؟ ویرو کا دیا ہوا تعویذ؟ مہتا صاحب کی بخشی ہوئی آزادی؟ لوگوں کی طرف سے ملا ہوا پیار؟ یا اولاد کی ذمہ داری؟ نہیں نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ مگر..... مگر کیا؟ اس نے اپنی ذات سے سوال کیا پھر خود ہی جواب دیا۔ آخر میں کس رشتے سے لڑکی کو اس کے ماں باپ سے چھین لوں؟ اسے لا کر گھر میں کس رشتے سے رکھوں؟ سوالوں کے چکر نے جگت کے ذہن کو تھکا دیا۔

کانپ اٹھا۔ ”کس کا خط ہے؟ ماں کی کوئی خبر ہے؟“ جگت نے بیتابی سے پوچھا۔

”نہیں.....“ چندن بلند آواز میں بولی پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر خط اس کی جانب بڑھا دیا۔

”گرود یو کو کا خط ہے۔“ ان الفاظ میں منوں کا وزن تھا۔ جھپٹ کر جگت نے خط لے لیا۔ پڑھنے سے پہلے بچوں کو باہر بھیجنے کی خواہش ہوئی مگر اس نے پڑھنا شروع کر دیا۔

”بہن جی! آخری بار تم سے ملنے کے لیے خط لکھ رہی ہوں۔ ماں نے تمہاری بے عزتی کی پھر تم نہیں آئیں۔ یہ اچھا کیا۔ اس بے عزتی کے بدلے میں خود تمہارے گھر آنا چاہتی تھی مگر قدرت کو یہ منظور نہیں معلوم ہوتا۔ جسم اب زیادہ دکھ نہیں جھیل سکتا۔ جسم کا ایک حصہ سن ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہارٹ فیل کا خطرہ ہے۔ روح تو پہلے ہی ختم ہو چکی ہے اب جسم کی باری ہے۔ یہ بھی اچھا ہوا گھر والے مجھے کسی کے گلے نہیں باندھ سکیں گے۔ ڈوٹی کی تمنا ہی اب جنازے سے ان کو سکون ملے گا۔ ہارٹ فیل ہونے والے کو زیادہ تکلیف بھی نہیں ہوتی۔ اس موت کے لیے تیار ہوں۔ زندگی کی قید سے آزادی چاہتی ہوں مگر اس سے پہلے ایک بار مل جانا۔“

جگت کی پلکیں بھیگ گئیں۔ چندن کور کی آنکھیں سوکھ گئیں۔ پتلیاں پھیلا کر اس نے جگت کی جانب دیکھا جیسے اس کی آنکھیں جگت سے جواب طلب کر رہی ہوں۔ ”بولو اس کا ذمہ دار کون ہے؟“ جگت اس کی آنکھوں کی زبان نہ سمجھا۔ شاید سمجھ کر نالنا چاہتا تھا۔

”چندن تم جاؤ! آؤ۔“ جگت نے کہا اور چندن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ دانت پیسنے لگی۔ آنکھوں سے آگ برسائے لگی۔ وہ جگت کو مرتا پا دیکھنے لگی۔ ”چندن! تمہیں کیا ہو گیا؟“ جگت ڈر گیا۔

”تم کو کیا ہو گیا؟ یہ میں پوچھ رہی ہوں۔“ چندن کے الفاظ سن کر جگت سنانے میں آ گیا۔

”کون کہتا ہے کہ تم ڈاکو تھے؟“ ڈاکو لفظ اس طرح طنز

میں بولا گیا کہ جگت جھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو چندن؟“ اس نے سوال کیا۔

”کیا کہنا چاہتی ہوں؟“ چندن آنکھیں نکال کر بولی۔ ”ویرو کا خط پڑھ کر اسے اغواء کرنے گئے تو تم نے کسی سے یہ سوال کیا تھا؟ نہیں کیونکہ اس وقت تم ڈاکو تھے تمہیں کسی کا ڈر نہیں تھا نہ ہی کسی کی پروا تھی۔“ ہانپ کر وہ سانس لینے کے لیے رکی پھر کچھ بھر کر بولی۔ ”اب یہ گھر شگیت بیوی نے بچے عزت سب تمہارا راستہ روک رہے ہیں یا جیل کا ڈر لگتا ہے؟“

”چندن.....!“ بھیانک گرج کے ساتھ جگت چیخ پڑا بچے لرز گئے چندن کا جسم لرز گیا مگر وہ اسے گھوٹی رہی۔ ”بولو تمہیں کیا کہنا ہے؟ تم نے آج میری مراد کی کافا واڑ دی ہے۔ تم میری خاموشی کو بزدلی سمجھ بیٹھی ہو۔“ چندن خاموش رہی۔ جگت کا جوش کچھ کم ہوا۔ ”چندن! آج تک تم نے مجھے قابو میں رکھا کہیں میں جذبات میں بہہ کر کچھ کرنے گزروں تم اس کے لیے فکر کرنی رہیں۔ اب جبکہ میں اپنی ذات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں جذبات کے زہر کو ہضم کر رہا ہوں تب تم مجھے طعنہ دے کر جوش دلاری ہو؟ یہ پوچھ رہی ہو کہ میں کیسا ڈاکو تھا؟“

”جگت سگھ.....!“ چندن کور نے سر جھکا لیا۔ ”تم کو میں نے کبھی بزدل نہیں سمجھا مگر بار بار گرود یو کور کا چہرہ نظروں میں گھوم جاتا ہے جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہو کیا تم مجھے اس آگ سے نہیں بچاؤ گی تب میں مجرم کی طرح سر جھکا لیتی ہوں۔ آنکھیں بند کر لیتی ہوں مگر اس کی آواز کان سے نکرانی رتی ہے مجھے آزاد کراؤ مجھے رہائی دلاؤ۔“ چندن آنسو پونچھنے کے لیے کچھ دیر رکی پھر کھنکار کر بولی۔ ”اسے پاگل پن سمجھو محبت سمجھو یا حماقت مگر دل دکھتا رہتا ہے۔ گرود یو کور کو کچھ ہو گیا تو اس کی پیاسی روح کی آہ ہمارے خاندان کو تباہ کر دے گی۔“

بچے اب باہر جا چکے تھے۔ جگت زخمی شیر کی طرح آگن میں ٹہلنے لگا۔ چندن جو کچھ بول چکی تھی اسے دل

میں دہرا رہی تھی۔

بار ماں نے چندن کا منہ بند کر دیا تھا اور اس نے ویرو کو گنوا دیا تھا۔ اسے گزشتہ بات یاد آگئی۔

”ہم عورتیں اگر کبھی نیک کام کے لیے سچ کو چھپاتی ہیں مگر نتیجہ اچھا نہ نکلے تو زندگی بھر پچھتاتی رہتی ہیں۔“ چندن مجرم کی طرح بولی۔ ”ایک اور بات تم سے چھپائی ہے۔ وہ آج آٹھ سال بعد قبول کرتی ہوں۔“

”کون سی بات؟“

”ویرو کی بات۔“ چندن کے ہونٹ کپکپائے۔ یہ سن کر جگت کا سانس سینے میں چلا گیا۔ خوف اور شک سے اس کا دل ٹپٹپٹا گیا۔ اس نے آہ بھری۔

”ویرو کی کیا بات ہے؟“ جیسے اسے پوچھتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہو وہ اس طرح ہانپنے لگا۔

”تمہارے فیصلے کے وقت وہ بڑے مندر میں ملی تھی۔“ یہ تو تم نے بہت پہلے بتا دیا تھا۔ کیا وہ جھوٹ بات تھی؟“

”نہیں جگت سنگھ! وہ بات اوجھری تھی۔“ چندن نے ہونٹ چبائے۔ ”ویرو کے ساتھ ایک مرد بھی تھا اور..... اور وہ مرد اس کا شوہر تھا۔ ویرو نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں بتا دوں کہ اس نے شادی کرنی ہے اور کبھی سے مگر..... مگر میں نے تم سے اس لیے کچھ نہیں بتایا کہ یہ سن کر تمہیں دکھ ہوگا۔ تم شاید یہ برداشت نہ کر سکو۔“ وہ ہنسنے لگا۔ جیسے وہ جگت کی نظر کا مقابلہ نہ کرنا چاہتی ہو اس لیے ایک دم اندر دوڑ گئی۔ جگت سنانے میں آ گیا۔ ویرو نے گھر بسایا اس لیے وہ مجھ سے اوجھل رہنا چاہتی ہے؟ ممکن ہے کہ وہ اب تک ماں بن گئی ہو یہ سوچتے ہوئے جگت نے آنکھیں بند کر لیں۔ دل سے اٹھتا ہوا کچھ درد آہ بن کر ہونٹوں تک آیا باقی دل میں ہی دب گیا۔



بیگ بھر کر چندن شام کو گرود کو کور کے گھر گئی۔ ”گرود یو کور کے کپڑے دینے آئی ہوں۔“ چندن نے کہا۔

”آئیے آئیے!“ گرود یو کور کی ماں بڑے پیار سے بولی۔ پھر بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور انیسویں کا اظہار

”پھر ایک بات کا جواب دو چندن!“ جگت اچانک رک کر بولا۔ ”کیا میں اسے ماں باپ سے چھڑا کر یہاں لے آؤں؟ چاہے اس کے لیے مجھے قتل کرنا پڑے، جیل جانا پڑے؟“ چندن لرز گئی۔ جگت بولتا رہا۔ ”مگر یہاں لا کر ہم اس کی زندگی برباد تو نہیں کریں گے؟ یہ سوچ لینا لوگ باتیں بنا میں گئے جگت نے دوسری عورت گھر میں ڈال لی ہے۔ میرے منہ پر بولنے کی تو کوئی ہمت نہیں کر سکتے گا مگر تم ان سب کو کیا جواب دو گی؟ تمہارے پاس دفاع کے لیے کوئی جواب ہے؟“

”ہاں!“ چندن نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میں کہوں گی میں سنا سنی چھوٹی بہن مانتی ہوں۔“

”لوگ مانیں گے؟“ جگت نے ہنس کر پوچھا۔ ”لوگوں کا دل چاہے نہ مانے۔“ چندن اوجھن میں پڑ گئی۔ ”مجھے لوگوں کی پروا نہیں ہے۔ تم اسے نہیں لائے پھر بھی لوگوں کو جو کہتا تھا وہ کہہ چکے ہیں۔ یہاں رہ کر پہلے ہی بیچاری بدنام ہو گئی ہے۔“

”پھر جاؤ! اس سے مل آؤ۔“ جگت نے فیصلہ کر لیا۔ ”پوچھ لو گھر سے نکلنے کے لیے تیار ہے۔“

”تیار ہے۔“ چھپائی ہوئی بات چندن جوش میں بول گئی۔ وہ اس طرح ڈر گئی جیسے زبان کٹ گئی ہو۔ بات نالانے کی خاطر جھوٹ بولنا چاہا مگر جگت کی تیز نظریں اس کے دل میں اتر چکی تھیں۔ جگت اسے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ ”آخری بار ملنے کی تھی تب تو اس نے مجھ سے کہا تھا کہ سردار جی سے کہو مجھے یہاں سے نکال لے جائیں۔ نہیں تو میں زیادہ دن تک جی نہیں سکوں گی۔“

”اور تم نے مجھ سے چھپایا چندن؟“ جگت طویل سانس لے کر بولا۔ ”پہلے بتا دیتی تو اتنے طعنے نہ دیتے پڑتے۔ مجھے اتنی پریشانی برداشت نہ کرنی پڑتی۔“

”مجھے اس نے منع کیا تھا۔“ چندن اچھلی بولی۔ ”اسے ڈر لگا کہ آپ جذبات میں کچھ کرتے نہیں گے۔ اس کی ذمہ دار وہی ہوگی۔“ جگت کو یہ دلیل پسند نہیں آئی۔ ایک

جھوٹے تھے ماں! تمہاری خدمت نے مجھے خطرے سے بچالیا ہے۔“

”بیٹا! دل تو پاگل بننے کی طرح ہوتا ہے۔ جھوٹی لگن باندھ لیتا ہے۔“ ماں نے سمجھائی نے جگا کا پیار بھلا دیا ہے۔ جب سے چندن بیگ دے کر گئی تھی گروڈ یو کور نے جگا کے مشعلق کہنا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے ماں بیٹی کو مشورہ دے رہی تھی۔ ”تھوڑے دنوں کی جدائی میں بات ختم ہو جاتی ہے۔“

”ماں! مگر مجھے باغ میں چلنے پھرنے دو تو دل اور جسم میں تازگی آئے گی۔“

”نہیں بیٹی! ابھی کچھ دن تم کو نیچے نہیں اترنا۔ ٹہلنا ہے تو برآمدے میں ٹہل لو۔“ ماں نے حکمانہ انداز میں کہا۔ اس کے جانے کے بعد گروڈ یو کور نے ایک بار پھر جگت کا بھیجا ہوا خط پڑھا۔

”تمہرات سیاہ کار سوا چار بجے تمہاری کوٹھی کے پچھلے دروازے کی دیوار کے برابر۔“

خط کرتے میں رکھ کر وہ برآمدے میں ٹہلنے لگی۔ ابھی یوں ٹھننے کی دیر تھی۔ ماں نیچے جانے دینے کے لیے راضی نہ تھی۔ یہاں سے نیچے جانے کی راہ نکالنی پڑے گی۔ وہ ذہن میں منصوبہ مرتب کرنے لگی۔

سیاہ کار نظر آئی۔ جگت سٹھ تہانہ تھا۔ اس کے برابر کوئی بیٹھا تھا۔ گروڈ یو کور نے مگرے کا دروازہ لگایا۔ ماں باورچی خانے میں شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ محلے میں سنانا تھا۔ پھرتی سے مگر خاموشی سے تمام کام نمنانا تھا۔

برآمدے کی دیوار کوڈی تو اس کے جسم میں کپکپاہٹ پیدا ہو گئی۔ لڑکی ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ رہی تھی۔ مگر چوکھٹ سے ہاجے گاجے کے ذریعے نہیں برآمدہ کوڈ کر..... جگت نے کار کی کھڑکی سے دیکھا گروڈ یو کے پاؤں کمزوری سے کپکپار سے ہیں۔ اس نے سوچا کہ اس طرح چوری چھپے لے جانے کی بجائے سامنے سے صحیح لاؤں مگر چندن نے منع کیا تھا۔ اس بار طاقت سے نہیں عقل سے کام لینا تھا۔

برآمدے سے کچھ دور ایک درخت تھا۔ ابھی گئے سال

کیا۔ ”مگر اب وہ کھڑی ہوگی یا نہیں؟ بھگوان جانے۔“

”ہن! تم ایسا نہ بولو۔“ چندن جاننے کے باوجود انجان بن کر بولی۔ ”ایسا کوئی روگ تھوڑا ہی ہوا ہے؟“

”روگ تو اس نے اپنے ہاتھوں لگایا ہے۔“ وہ کچھ کڑواہٹ سے بولی۔ ”وہ ضد کر کے خود اپنی ذات کی دشمن بنی ہے۔“

”میں ذرا اس سے مل لوں۔“ چندن جلدی سے بیگ اٹھا کر کمرے میں کھس گئی۔ ”کہہ دوں کہ تمہاری چیزیں لے آئی ہوں سنبھال لو۔“

گروڈ یو کور کے پھیکے چہرے پر روشنی پھیل گئی۔ چندن کوڈیکھتے ہی وہ ہنسنے لگی مگر چندن نے اسے روک دیا۔ ”لیٹی رہو۔“ وہ ارد گرد دیکھ کر بولی پھر پیشانی پر ہاتھ رکھنے کے بہانے کہہ دیا۔

”تمہارا خط ملا۔ بیگ میں تمہارے ریشمی کرتے کی جیب میں اس کا جواب ہے۔ تم تیار رہنا آج سے پانچویں دن۔“ بہت احتیاط سے اس نے کہا۔ ”ڈھلتی دو پہر سردار جی تمہیں لینے آئیں گے۔“

کچھ دیر رک کر بولی۔ ”اب کھانی کر جسم بنانا۔ گھر کے باہر کار کھڑی ہوگی وہاں تک تمہیں پہنچانا ہے۔ پھر سردار جی سنبھال لیں گے۔“

”جج.....؟“ گروڈ یو کور نے ہاتھ دہرایا۔ ”اب میں موت کے فرشتے کو کبھی بھگا دوں گی۔“ پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ گروڈ یو کور کی ماں اند آئی تو چندن نے بات بدل دی۔

”برابر دو! بھگوان جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ مگر ہمیں خیال رکھنا چاہیے۔“ چندن بیگ کی جانب اشارہ کر کے گروڈ یو کور کی جانب دیکھ کر مسکرائی اور چلی گئی۔ ممکن ہے اس کی ماں کو شک ہو جائے چندن نے اس لیے وہاں زیادہ بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔



”ماں! آج میں کھڑی ہو سکتی ہوں۔ میرا چلنے پھرنے کو جی چاہتا ہے۔“ گروڈ یو کور نے احتیاط سے کہا۔ ”ڈائمر

جگت بیج کے پاس گرود یوکور کے بیان لکھوانے گیا تھا کہ وہ راضی خوشی سے اپنا گھر چھوڑ آئی ہے۔ سورج کی روپیلی کرنیں دھرتی پر پڑ رہی تھیں تو دروازے پر کاررکنے کی آواز آئی۔ چندن کو دو چار بار ایسا محسوس ہوا تھا مگر اس بار واقعی دروازہ کھلا اور کار سے گرود یوکور اترتی دکھائی دی۔

”ہن جی!“ ہاتھ پھیلا کر ہنٹے چہرے سے دوڑتی ہوئی وہ اندر آ گئی۔ چندن نے اسے سینے سے لگا لیا۔ چندن کے ہونٹ کپکپائے مگر آواز نہیں نکلی۔ اس نے مسرت کے آنسوؤں سے گرود یوکور کا استقبال کیا۔ چندن کے ہونٹ کپکپائے مگر آواز نہیں نکلی۔ اس نے مسرت کے آنسوؤں سے گرود یوکور کا استقبال کیا۔ دونوں عورتوں کو چوکھٹ پر روتا چھوڑ کر جگت برابر والے کمرے میں گھس گیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کے پردے میں اداسی جھلک رہی تھی۔ اس کا ہاتھ خود بخود گردن کی جانب بڑھا تعویذ سے لگایا۔ اس کے دل میں درد اٹھا۔ آہستہ آہستہ دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے گئے۔ انگلی اور انگوٹھے کے درمیان تعویذ کا ڈورا پکڑا ایک جھکادیا اور ڈورا ٹوٹ گیا۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے دردناک ہنکل گئی۔ تعویذ ہاتھ میں تھامے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

”درو! تم دل میں ہمیشہ رہو گی، مگر پتہ نہیں میں کیوں تعویذ اپنی گردن سے الگ کر رہا ہوں۔“ تعویذ ڈبیہ میں بند کر کے بھیگی پیکوں سے اس نے آنسو پونچھ لیے۔ اس کے دل کے ایوان میں گیت کی آواز گونجنے لگی۔

میرے گیتوں میں تم ہو خیالوں میں تم
میرے دل میں بھی تم ہو جواہوں میں تم
میری سانسوں میں تم میری آہوں میں تم
چاہے مجھ سے دور ہو تم مگر ہونگا ہوں میں تم

(ختم شد)



اس درخت پر چڑھ کر چور گھر میں گھس آیا تھا مگر کمزور درخت نے دغا کیا وہ نیچے گرا۔ بمشکل بھاگ۔ کا تھا بیچارہ۔ گرود یوکور کو یانا یا۔ باپو جی نے تب کہا تھا۔ ”یہ درخت سکون کی نشانی ہے۔ ہم اسے نہیں کاٹیں گے۔“ جب گرود یوکور نے اس کی ڈالی پر قدم رکھا تو اسے باپو جی یاد آئے۔

”سنجھلنا۔“ ایک نرم آواز آئی۔ وہ جگت سنگھ کو صاف دیکھ رہی تھی۔ درخت کی ڈالی کچھ جھکی مگر وہ ہمت کر کے آخری سات فٹ کود گئی۔ باغ کی دیوار زیادہ بلند نہیں تھی پھر بھی ایک بار اس کا پیر پھسلے ہوئے رہ گیا۔ وہ دیوار پر آ گئی تو جگت نے کار کا دروازہ کھولا۔ باہر نکل کر جگت نے ہاتھ بلایا۔ جگت کو قریب دیکھ کر اس کی ہمت بڑھی۔ اس نے خود کو جگت کی بانہوں میں گرا دیا۔ کار کا انجن گر جا کر گرود یوکور نے عقب اسکرین سے اپنے مکان پر دکھ بھری نظر ڈالی پھر جگت کی طرف چاہ بھری مسکراہٹ سے دیکھا۔ کار حرکت میں آئی دھول اڑی اور کار جانندھر کی حد پار کر گئی۔



چندن ساری رات سو نہیں سکی۔ شام سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ گرود یوکور کا بھائی تیز نظروں سے گھر کو دیکھتا ہوا دو پکڑ لگا چکا تھا۔ اس کی ماں ایک بار پوچھنے لگی تھی کہ گرود یوکور یہاں تو نہیں آئی؟ چندن انجان بن گئی۔

”کیوں..... کیا گھر میں نہیں ہے؟“ اس کی ماں نے دانت پیس لیے۔ ”جگت سنگھ کہاں ہے؟“

”وہ تو صبح سے امرتسر گئے ہیں۔“ وہ منہ پھیر کر جھوٹ بولی۔ عزت کے ڈر سے بات پھیلنے نہیں دی۔ مگر گرود یوکور کے گھر والے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ انہوں نے امرتسر کی جانب کار دوڑائی۔ رات گزرنے سے پہلے ان کو گرود یوکور کو پکڑنا تھا ورنہ اس کے بعد کنواری بیٹی کو گھر لانے سے فائدہ بھی کیا؟

چندن کو ہر نصف گھنٹے بعد بھگوان کی پرارتھنا میں دل لگانی تھی۔ درمیان میں لدھیانہ کے خیالات آ جاتے۔

www.pdfbooksfree.pk

سیاسی جرائم

ماہنامہ
خاتون
کئی

PDFBOOKSFREE.PK

aanchalpk.com aanchalnovel.com

قیمت: 50 روپے
www.pdfbooksfree.pk